مدیر

محمد منظور نعمانی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دو معرکۃ الآرا کتابیں

نبی رحمت

نوع انسانی کے سب سے بڑے محسن، نبی رحمت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ و حیات طیبہ کے تاباں و درخشاں نقوش ـــــ جس میں سیرت کو اپنے ذوق و رجحان اور رائج علمی نظریات کا تابع بنانے اور زندہ حقیقتوں اور منہ سے بولتی ہوئی صداقتوں میں فلسفہ آرائی اور رنگ آمیزی سے کام لینے کے بجائے، اپنی حقیقی او واقعی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نئی نسل کے فہم اور نفسیات کی موجودہ سطح اور عصری و علمی اسلوب کا پورا خیال رکھا گیا ہے ـــ قدیم و جدید دونوں قسم کے علمی مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے ــــ بعثت کے وقت عالمگیر جاہلیت، معاصر متمدن حکومتوں اور پڑوسی ریاستوں کا جامع و معلومات افزا جائزہ ـــــ جزیرۃ العرب اور بالخصوص مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا اہم اور تاریخی پس منظر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس کو سمجھے بغیر اسلام کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا پورا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

ایک ایسی کتاب جس میں سیرت خود اپنی ترجمانی کرتی ہے۔ بہترین کتابت، آفسٹ کی عمدہ طباعت

۲۰×۲۶ سائز پر ۶۰۰ صفحات، حصہ اول و دوم یکجا مجلد مع حسین گردپوش قیمت صرف ۳۰/-

عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح

جماعت اسلامی کے بانی و رہنما مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دین کی بنیادی اصطلاحوں (الٰہ، رب، دین عبادت) کی ایک ایسی نئی تشریح کی تھی جو ان سے پہلے کسی مفسر، کسی محدث، کسی مجدد، کسی امام و مجتہد اور کسی فقیہ و متکلم اسلام نے نہیں کی، اور دعویٰ کیا تھا کہ دین کی ان بنیادی اصطلاحوں کا مفہوم و مطلب اُن لوگوں نے صحیح سمجھا تھا جن کے زمانہ میں قرآن کا نزول ہوا، (خواہ وہ مسلمان ہوں جیسے صحابہ کرام یا ابوجہل و ابولہب جیسے دشمنان اسلام)۔ لیکن بعد میں جو لوگ اسلامی معاشرہ میں پیدا ہوئے وہ ان کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے، جس کی وجہ سے اس طویل مدت میں (گویا پہلی یا دوسری صدی سے لیکر اس چودھویں صدی تک) قرآن اور اسلام کی دعوت و تعلیم کو صحیح نہیں سمجھا جاسکا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا مودودی کے اس دعوے کا اور اسی طرح کے ان کے چند اور دعووں کا اپنی اس تصنیف میں کتاب و سنت اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں علمی جائزہ لیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ طرز فکر کتنا غلط، دین کے لیے کسقدر مضر اور دین والی امت کے لیے کسقدر خطرناک ہے۔ اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایسے ہمدردانہ اور شیریں انداز میں لکھا گیا ہے کہ خود مولانا مودودی صاحب اور انکے اہل محبت اسکو پوری خوشگواری کے ساتھ پڑھ سکیں گے

قیمت ۵/-

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی، نظیر آباد - لکھنؤ

چندہ سالانہ
ہندوستان سے 15/-
پاکستان سے 30/-
بنگلادیش سے 16/-
فی شمارہ 1/50

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے چندہ سالانہ
پوسٹل ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح یہ ہے۔
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

جلد (۴۷) بابت جنوری ۱۹۷۹ء مطابق صفر المظفر ۱۳۹۹ھ شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۱۰ تاریخ تک آجانا چاہیے، اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ پچیس ۲۵ روپئے ہندوستانی سکہ میں بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں۔ یا پاکستانی سکہ میں تیس ۳۰ روپئے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور کو بھیجدیں۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

گزشتہ شمارہ میں "الفرقان" کے ابتدائیؔ دور کا ذکر کرتے ہوئے جب یہ لکھا کہ اُس زمانہ میں کتابت کی اجرت فی صفحہ ڈھائی آنے دی جاتی تھی (جس کے اب پونے تین روپے دیے جاتے ہیں) اور کاغذ ساڑھے تین روپے میں ملتا تھا (جو اب "چھتر" میں خریدا جا رہا ہے) تو راقم سطور کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی وہ تقریریں یاد آگئیں جو جنگ آزادی کے سلسلہ میں حضرت مرحوم انگریزی حکومت کے خلاف کیا کرتے تھے، جن میں انگریز مصنفین اور مورخین ہی کے حوالوں سے بڑی تفصیل سے بیان فرماتے تھے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے ہمارے اس ملک ہندوستان میں مختلف حکومتوں کے دور میں کیسی ارزانی رہی تھی اور اب انگریزی حکومت کے دور میں کیسی کمر توڑ گرانی ہے۔

مولاناؒ جب علاء الدین خلجی، محمد تغلق، اکبر اور پھر اورنگ زیب عالمگیرؒ کی حکومتوں کے نرخ بیان فرماتے تھے، تو حیرت ہوتی تھی —— واقعہ یہ ہے کہ اگر بیان کرنے والا کوئی اور ہوتا تو یقین نہ آتا کہ یہ حوالے صحیح دیے جا رہے ہیں اور ان انگریز مورخین اور سیاحوں نے فی الواقع اُن حکومتوں کے دور کے یہی نرخ لکھے ہیں۔ مولانا نے اپنی نوٹ بک میں یہ سب حوالے لکھ رکھے تھے۔ اور بعد میں اپنی خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" میں بھی پوری تفصیل سے محفوظ کر دیئے ہیں، اُن میں سے چند بطور نمونہ یہاں بھی پڑھ لیے جائیں۔

لہ گزشتہ اشاعت سے ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے کہ اب سے ۴۶ سال پہلے محرم ۱۳۵۳ھ (مارچ ۱۹۳۴ء) میں الفرقان بریلی سے جاری ہوا

لکھا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی، کے دور حکومت میں ایک روپیہ میں گیہوں ۲ من ۳۹ سیر۔ دھان چاول ۴ من ۱۹ سیر۔ گھی ۳۱ سیر۔ کڑوا تیل ۴۰ سیر ملتا تھا۔

پھر سلطان محمد تغلق کے زمانہ کے نرخ یہ لکھے ہیں ـــــ گیہوں ۹ر (نو آنے) من۔ دھان ۶ر (سوا چھ آنے) من۔ چاول ۹ر (نو آنے) من۔ بھینس فربہ عہ (دو روپئے)۔ بکری فربہ عہ (ایک روپیہ) مرغی ۰ر (دو پیسے) بکری کا گوشت ایک سیر ۰ر (دو پیسے)

پھر مغلیہ دور میں اکبر کے زمانہ کے نرخ یہ لکھے ہیں۔ گیہوں ۸ر (آٹھ آنے) من۔ میدہ ۱۳ر (تیرہ آنے) من۔ شالی دھان ۱۲ر (سوا بارہ آنے) من۔ خوشبودار چاول عہ (دو روپئے) من بکری فربہ عہ (ڈیڑھ روپیہ) میں۔ گھی، ۳ر (تین روپئے) من۔ تیل، عہ (دو روپئے گیارہ آنے) شکر سفید ۱۲ر (تین روپئے بارہ آنے) من۔ گڑ عہ (ایک روپیہ سات آنے) من۔

پھر اکبر کے بیٹے جہانگیر کے دور حکومت کے بارہ میں لکھا ہے کہ اس دور میں (۱۶۱۲ء میں) ٹامس کورائٹ ہندوستان آیا تھا، اس نے لکھا ہے کہ ایک آنہ روز میں ایک آدمی نہایت آرام سے بسر کر سکتا تھا۔

پھر جہانگیر کے پوتے عالمگیر کے دور حکومت میں مزید ارزانی ہو گئی۔ کپتان الگزینڈر ہلٹن کے سفرنامہ کے حوالہ سے اُن کے دور حکومت کے نرخ یہ لکھے ہیں ـــــ چاول ایک روپیہ کا ۷ من ـــــ کٹک میں مکھن، ایک آنے کا آدھا سیر۔ دو آنے میں ایک سو (۱۰۰) ایسی بڑی مچھلیاں، کہ دو کے کھانے سے پیٹ بھر جائے۔

آگے مولانا نے دکھایا ہے کہ انگریزی اقتدار کے بعد سے ضروریات زندگی مسلسل گراں ہوتی رہیں۔ ۱۸۵۷ء میں گیہوں ایک روپئے کا ۳۶ سیر، چاول ۱۸ سیر، گھی ۴ سیر ملتا تھا۔

پھر ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت ۱۸۸۰ء میں نرخ یہ ہو گیا، گیہوں، ایک روپیہ کا ۲۵ سیر، چاول، ۱۲ سیر۔ گھی ۲ سیر ـــ

جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا نے مختلف کتابوں اور اخبارات کے حوالوں سے یہ نرخ اس سے بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنی خودنوشت سوانح "نقش حیات" جلد اول میں (صفحہ ۲۳ سے

صفحہ (۲۴ تک) لکھ دیے ہیں ـــــ مولانا کو ہندوستان کی کئی مختلف حکومتوں کے دور کے یہ سارے نرخ بالکل حفظ تھے اور وہ اپنی تقریروں میں اکثر بیان فرماتے تھے اور جیسا کہ راقم سطور نے عرض کیا ہم لوگوں کو حیرت ہوتی تھی ـــــ ہمارے نزدیک یہ بات ناقابل فہم تھی کہ اِن چیزوں کے یہ نرخ کبھی رہے ہوں گے، لیکن حضرت مولانا کی زبان سے سنکر ہم تغلیط و تکذیب نہیں کر سکتے تھے ـــ سمجھتے تھے کہ لکھنے والوں نے ایسا ہی لکھا ہو گا۔

مگر اللہ کی شان اپنی ہی زندگی میں آدھی صدی سے بھی کم مدت میں انہی چیزوں کے نرخ میں اتنا تفاوت ہو گیا کہ ہماری نئی نسل کے لیے وہ اسی طرح موجب حیرت اور ناقابل فہم ہے جس طرح حضرت مولانا کے بیان کیے ہوئے نرخ ہمارے لیے ناقابل فہم ہوتے تھے ـــــ جی چاہا کہ یہ اشیاءِ ضرورت اب سے ۴۰-۵۰ سال پہلے جس نرخ سے ہم خریدتے تھے، اُس کو قلمبند کر کے آج کی نئی نسل اور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔

اپنی طالب علمی کے زمانہ میں بلکہ اُس کے بعد بھی کافی مدت تک خانگی ضروریات کی خرید و فروخت سے خود راقم سطور کا کوئی واسطہ نہیں تھا، تاہم اس زمانہ کے بھی بعض چیزوں کے نرخ یاد ہیں۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دور میں غلہ کی سخت گرانی ہو گئی تھی، گیہوں جو جنگ سے پہلے ہمارے وطن میں ایک روپئے میں ۱۷-۱۸ سیر مل جاتا تھا، گراں ہوتے ہوتے اس کا نرخ ۴ سیر تک پہنچ گیا تھا ـ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس گرانی کا ذکر غریب لوگ اس طرح کرتے تھے جیسے قیامت آگئی۔

پھر جنگ ختم ہو جانے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بہت تیزی سے چیزوں کے نرخ گرنا شروع ہوئے اور بعض چیزیں قبل از جنگ سے بھی زیادہ ارزاں ہو گئیں ـــ گیہوں ۲۰ سیر تک فروخت ہونے لگا۔ اسی طرح دوسرے اناج بہت ارزاں ہو گئے تھے ـ میرے والد ماجدؒ نے اسی زمانہ میں اپنے گھرانے کی بعض شادیوں کے لیے سونا خریدا جو غالباً ۲۳ روپئے تولہ کے حساب سے خرید اگیا تھا۔

۱۹۲۱-۲۲-۲۳ء میں اس عاجز کا قیام اپنے خاص استاذ و مربی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ

کے ساتھ (جن سے قرابت بھی تھی) ایک طالب علم کی حیثیت سے مئو ضلع اعظم گڑھ رہا (حضرت مولانا مرحوم وہاں کے دینی عربی مدرسہ دارالعلوم میں صدر مدرس تھے۔) مئو میں اُس زمانہ میں بھی ——— جبکہ ملک میں عام طور سے گائے کا ذبیحہ ہوتا تھا، نہ معلوم کیوں بھینس ہی کا گوشت کھایا جاتا تھا جو اُس وقت گھٹیا قسم کا وہاں ڈیڑھ پیسے سیر، اس سے اچھا تین پیسے سیر اور بہت اچھا چار پیسے سیر ملتا تھا (جو آجکل لکھنؤ میں چار پانچ روپئے سیر ہے) وطن میں ہمارے ہاں گائے کا گوشت کھایا جاتا تھا اور وہ اچھے قسم کا دو ڈھائی آنے سیر ملتا تھا۔

استاذی حضرت مولانا کریم بخش مئو کا بڑا گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے، اُن کے لیے خاص اہتمام سے بکری کا گوشت پکتا تھا، میرا کھانا پینا بھی حضرت مولانا کے ساتھ ہی تھا، جو کچھ صرف ہوتا اُس کا نصف میں ادا کرتا تھا، جہاں تک یاد ہے قریباً چھ روپئے مہینے کا حساب ہوتا تھا۔

مئو کی طالب علمی کے اس زمانہ ہی میں ایک دفعہ مئو سے اپنے وطن سنبھل جاتے ہوئے ایک ساتھی طالب علم کے ساتھ (بلکہ انہی کی ترغیب پر) جو پہلے لکھنؤ میں طالب علمی ہی کے سلسلہ میں رہ چکے تھے، صرف سیر و تفریح کے لیے دو تین دن لکھنؤ میں قیام کیا، خوب یاد ہے کہ اچھا خاصا کھانا چوک بازار میں صرف چار پانچ پیسے میں کھاتے تھے جس میں گرم گرم دو تنوری روٹیاں ہوتی تھیں اور ایک پیالہ میں اچھی لذیذ نہاری، اگر کھانے میں کباب وغیرہ کسی چیز کا اضافہ کرنا چاہا تو بس ایک پیسہ مزید۔

۱۳۴۴-۴۵ھ (۱۹۲۶-۲۷ء) میں یہ عاجز بسلسلۂ طالب علمی دارالعلوم دیوبند میں رہا۔ میں اُن چند طلبا میں سے تھا جو قیمت ادا کر کے دارالعلوم کے مطبخ سے کھانا کھاتے تھے، ایسے طلبہ سے مہینے میں حساب کر کے کھانے کی اصل لاگت لے لی جاتی تھی، مولانا گل محمد خاں صاحب مرحوم مطبخ کے ذمہ دار اور منتظم تھے، بڑے حسابی آدمی تھے، میرا قیام وہاں دو سال رہا، کھانے کی قیمت قریباً ساڑھے تین روپے، کسی مہینے کچھ کم کسی مہینے کچھ پیسے زیادہ مجھ سے وصول کیے جاتے تھے، جہاں تک یاد ہے ایک دفعہ بھی پورے چار روپئے دینے کی نوبت نہیں آئی حالانکہ معلوم ہوا تھا کہ سوختہ لکڑی اور باورچیوں کی تنخواہ کا بھی حساب لگایا جاتا تھا۔

۱۳۵۲ھ (۳۴-۱۹۳۳ء) سے الفرقان بریلی سے جاری ہوا، اور اس کی وجہ سے اہل و عیال کے ساتھ وہیں قیام ہوا۔ بس یہیں سے خانگی ضروریات خود خریدنے یا خریدوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالحق صاحب مرحوم بریلی کے مدرسہ مصباح العلوم کے مہتمم اور صدر مدرس تھے، وہ بازار کا سودا خریدنے میں بڑے ماہر تھے، اُن سے قرابت داری بھی تھی، میری خانگی ضروریات زیادہ تر وہی خریدتے تھے۔ وہ ہر مہینے آٹے کی ایک پوری بوری خرید لیتے تھے جس میں دو من کے قریب آٹا ہوتا تھا، اس میں سے دو تہائی اپنے ہاں رکھ لیتے اور ایک تہائی میرے ہاں بھیج دیتے۔ جو ایک مہینہ کے لیے کافی ہوتا تھا، اس بوری کی قیمت لگ بھگ چھ روپے ہوتی تھی، کبھی کچھ پیسے کم کبھی کچھ پیسے زیادہ۔ گویا صرف دو روپے کا آٹا پورے مہینے کے لیے کافی ہوتا تھا ——— گائے کا گوشت بہت عمدہ قسم کا تین چار آنے اور بکری کا چھ آنے اور بہت اعلیٰ قسم کا خصی کا آٹھ آنے (اور بریلی میں سیر اس زمانہ میں ۱۰۰ تولہ والا مروج تھا) ——— مچھلی اچھی قسم کی چار یا پانچ آنے سیر ملتی ——— قربانی کے لیے گائے ۲۵ پچیس تیس روپے کی اچھی مل جاتی تھی، اور بکری ۵-۶ روپے کی۔ ایک دفعہ دودھ دینے والی ایک اچھی بکری غالباً سات روپے میں خریدی تھی جو کئی سال رہی پھر مع ایک بچہ کے آٹھ روپے میں فروخت ہوئی ——— مرغی ایک روپے میں اچھی مل جاتی تھی۔ انڈا پہلے ایک پیسہ میں ایک ملتا تھا بعد میں دو پیسے میں ملنے لگا تھا۔ عمدہ قسم کا گڑ ایک روپیہ میں ڈیڑھ بارہ ۱۲½ سیر تک مل جاتا تھا ——— چاول بہت اعلیٰ قسم کا ہنسراج (جو باسمتی سے بڑھیا مانا جاتا ہے) ایک روپے کا ساڑھے پانچ سیر ہلدوانی سے خریدنا یاد ہے۔

الفرقان اگرچہ بریلی سے نکلتا تھا لیکن اُس زمانہ میں بریلی میں کوئی اچھا پریس نہیں تھا۔ شروع میں تین سال تک وہ دہلی میں چھپتا رہا، کتابت بریلی ہی میں ہوتی تھی اور راقم سطور کاپیاں لیکر ہر مہینے خود دہلی جاتا اور چھپوا کے لاتا تھا، اس سلسلہ سے ۲، ۳ دن ہر مہینے دہلی میں قیام کا اتفاق ہوتا تھا، کھانا اکثر کسی ہوٹل میں ہوتا۔ بہت اچھے کھانے (روٹی قورمہ) کی قیمت کبھی چار پانچ آنے سے زیادہ دینا یاد نہیں۔ شام کو اکثر ایسا ہوتا کہ مغرب کی نماز کے لیے جامع مسجد جاتا، وہاں مشرقی دروازہ پر کھانے پینے کی طرح طرح کی چیزیں بیچنے والے بیسیوں آدمی چھوٹی چھوٹی دکانیں لگائے بیٹھے ہوتے، مختلف قسم کی پھلکیاں، دہی بڑے، حلیم، پشاوری کباب، مچھلی کے کباب، یہ سب چیزیں بڑی لذیذ ہوتی تھیں ان میں سے ہر چیز دو پیسے کی مل جاتی تھی۔ ایک صاحب رو ہو مچھلی کے سر سالن میں تلے ہوئے بیچتے تھے، چھوٹا سر دو پیسے میں اور اس سے بڑا چار پیسے میں دیتے تھے، ایک عدد دہ بھی لیکر کھانے کا معمول تھا، بس یہی شام کا کھانا ہو جاتا تھا ——— کبھی ناشتہ میں حلوا پراٹھا بھی لے لیا جاتا جو ایک ڈیڑھ آنے

میں آدھا یا ڈلنا تھا۔

۱۹۳۳ء میں جب بریلی میں مستقل وعیال کے قیام ہوا تو غالباً پہلے ہی دن ایک معمولی قسم کا نیا پلنگ بغیر بنا ہوا بازار سے ایک روپیہ دو آنے میں خریدا تھا، جو ۲۵-۳۰ سال تک رہا۔ اُسی کے ساتھ نماز پڑھنے کی ایک نئی چوکی صرف چودہ آنے میں خریدی تھی جو کسی نہ کسی شکل میں اب تک موجود ہے۔ پلنگ کے لیے بہت اعلیٰ قسم کے پائے دو روپے میں خریدے تھے جو آج بھی بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ (اور اس وقت ان کی قیمت پچاس سے کم نہ ہوگی)۔ چولھے میں جلانے والی بہت اچھی بالکل سوکھی لکڑی بریلی میں پہلی دفعہ ایک روپیہ میں تین من خریدنا اچھی طرح یاد ہے۔ (اور ملحوظ رہے کہ اس وقت بریلی کا سیر سوا سیر کا اور من سوا من کا ہوتا تھا)۔

یورپ کی دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی اُس وقت تک ان میں سے اکثر چیزوں کے نرخ قریب قریب یہی رہے۔ چونکہ پہلی جنگ عظیم کا یہ تجربہ تھا کہ بعض چیزیں بہت زیادہ گراں ہوگئی تھیں اُن میں سے کپڑا بھی تھا اس لیے راقم سطور نے چاہا کہ اپنی ضرورت کا کپڑا اپنی استطاعت کے مطابق کچھ زیادہ خرید کر رکھ لیا جائے تو لٹھا، ململ جیسے خاص کپڑوں کے ایک ایک دو دو تھان بازار جاکر خرید لیے، اچھے قسم کے لٹھے کے تھان غالباً چار آنے گز کے حساب سے خریدا تھا، دوسرے کپڑے بھی قریب قریب ایسے ہی نرخوں سے۔

بریلی میں ہمارے پڑوس میں ایک بہت نیک صالح شخصیت عبدالماجد صاحب کی تھی، یہ بریلی کی عدالت ششن میں منصرم تھے، مثالی دیندار تھے، راقم سطور سے بہت محبت فرماتے تھے، ڈالڈا ایجاد ہوچکا تھا، لیکن کھانے پکانے میں ہمارے گھرانوں میں اس کے استعمال کا رواج بالکل نہیں تھا، ہمارے منصرم صاحب کو کسی دوکاندار نے خوشامد اور اصرار کرکے اس کا ایک پورا کنستر دیدیا، وہ لے آئے، انھوں نے چاہا کہ آس پڑوس کے گھر والوں کو بھی اس میں شریک کرلیں۔ مجھ سے بھی فرمایا کہ ایک روپیہ کا اس میں سے آپ بھی لے لیجیے! میں نے صرف اُن کی فرمائش کی تعمیل اور ان کا بوجھ ہلکا کرنے کی نیت سے کہہ دیا کہ اچھا بھیجدیجیے، انھوں نے ایک سیر گیارہ چھٹانک (بریلی کے سیر سے) بھیجدیا (جو آج کے دو کلو سے کچھ ہی کم تھا) یہ صرف ایک روپے کا تھا۔

آخر میں بس ایک بات اور پڑھ لی جائے۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا، جس محلہ (گھیر مولوی عبدالقیوم صاحب مرحوم) میں میری رہائش تھی، اسکی پرانی مسجد کی ازسرِ نو تعمیر کا فیصلہ ہوا، جس دن معماروں مزدوروں نے اسکی چھت کا سلیب ڈالا، جس میں اُن کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی للّٰہ فی اللہ لگے ہوئے تھے، میں نے اُن سب کے لیے ایک روپیہ کی جلیبیاں منگوائیں، خوب یاد ہے کہ سوا تین سیر یا پونے تین سیر آئی تھیں (یعنی سوا تین کلو یا قریباً چار کلو)۔

ظاہر ہے کہ اب سے صرف ۴۰-۵۰ سال پہلے کے یہ نرخ آج کی نئی نسل اور آئندہ نسلوں کے لیے اُسی طرح بعید از قیاس اور ناقابل یقین ہوں گے جس طرح حضرت مولانا مدنیؒ کے بیان فرمائے ہوئے کئی صدی پہلے کے ہندوستان کے نرخ ہم جیسے لوگوں کے لیے ناقابل فہم سے ہوتے تھے — لیکن نصف صدی سے بھی کم مدت میں اشیاء ضرورت کے نرخوں میں جو تفاوت خود دیکھ لیا، اُس کے بعد سیاحوں اور مورخوں کے اُن بیانات پر یقین کرنا آسان ہوگیا جو حضرت

درس قرآن محمد منظور نعمانی

۴؍ شوال المکرم ۱۳۹۸ھ

- قیامت کا دن اور حشر کا منظر کتنا دہشت ناک اور لرزہ خیز ہوگا۔
- کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ زمانہ قدیم کی بعض بڑی طاقتور اور ترقی یافتہ قوموں کا پیغمبروں کی مخالفت کی پاداش میں کیا حشر ہوا۔
- حضرت موسیٰ، فرعون، ہامان، قارون۔

حمد و صلوٰۃ اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِيْنَ ۚ
مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۝ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا
تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۖ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ
لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ
مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَمَا كَانَ
لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ۚ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا
مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا
سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ۚ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ

ضَلٰلٍ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰۤی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ۝

سورۃ المومن (آیات ۱۸-۲۷)

اور (اے ہمارے پیغمبر) آپ ان لوگوں کو آنے والی بڑی مصیبت کے اُس دن (روزِ قیامت) سے آگاہ کیجیے اور ڈرائیے جب یہ حال ہوگا کہ دل (اُچھل کر) گلوں کے پاس آجائیں گے اور وہ کچھ بول نہ سکیں گے، (اُس دن) ان مجرموں کا کوئی مخلص دوست نہ ہوگا (جو ساتھ دے سکے اور کام آسکے) اور کوئی ایسا سفارشی نہ ہوگا جس کی سفارش مانی جائے۔ (جس اللہ سے اُس دن واسطہ ہوگا اس کی شان یہ ہے کہ) وہ آنکھوں کی چوری کو بھی جانتا ہے اور سینوں اور دلوں کے مخفی رازوں کو بھی، —— اور وہ اللہ فیصلہ کرتا ہے اور کریگا حق و انصاف سے، اور یہ مشرکین اللہ کے سوا جن (معبودانِ باطل) کی عبادت کرتے اور جن کو (حاجت روائی کے لیے) پکارتے ہیں وہ کوئی بھی فیصلہ نہیں کرسکتے (اُن کے اختیار ہی میں کچھ نہیں) حق یہ ہے کہ اللہ ہی سب کچھ دیکھنے والا اور سننے والا ہے —— کیا یہ لوگ (اللہ کی) زمین میں چلے پھرے نہیں تو یہ دیکھ لیتے کہ کیسا (برا) انجام ہوا اُن سے پہلے والوں کا (جو حق کے اور ہمارے پیغمبروں کے منکر تھے) وہ ان لوگوں سے قوت و طاقت میں بھی بڑھے ہوئے تھے اور زمین میں (چھوڑی ہوئی) نشانیوں اور یادگاروں کے لحاظ سے بھی (بالاتر تھے) —— پس اللہ نے اُن کے گناہوں اور نافرمانیوں کے سبب ان کو اپنی پکڑ میں لے لیا؛ اور کوئی نہیں تھا اللہ (کے عذاب اور اس کی پکڑ) سے ان کو بچانے والا —— یہ اس لیے ہوا کہ اُن کے پاس اللہ کے پیغمبر آیا کیے کھلی نشانیاں اور واضح ہدایات لیکر تو انھوں نے کفر و انکار کا رویہ اختیار کیا تو اللہ نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا، وہ بڑی قوت والا اور سخت سزا دینے والا ہے ——

اور ہم نے بھیجا (اپنے پیغمبر) موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل و برہان لیکر

فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف تو انھوں نے کہا جادوگر ہے اور قطعی جھوٹا ہے پھر جب وہ اُن کے پاس ہماری طرف سے حق کا پیغام لیکر پہنچا تو انھوں نے کہا کہ جو لوگ ایمان لاکر اس کے ساتھ ہوگئے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دو ——— اور کافروں کی تدبیر و سازش کو رائیگاں ہی جانا ہے۔

اور فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کا خاتمہ کردوں اور وہ (اپنی مدد کے لیے) اپنے خدا کو (بھی) بلالے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمھارے دین کو بدل ڈالے یا ملک میں فساد برپا کردے ——— اور موسیٰ نے کہا کہ میں نے پناہ لے لی اپنے رب کی جو تمھارا بھی (اور سب کا) رب ہے ہر ایسے متکبر و مغرور (کے شر اور شرارت) سے جو یوم حساب (روز قیامت) پر یقین نہ رکھے۔　　　سورۂ مومن (آیات ۱۸ تا ۲۷)

(تفسیر و تشریح) دو تین ہفتے پہلے سورۂ "مومن" شروع ہوئی تھی، اس کے قریباً دو رکوع ہو چکے ہیں۔ پچھلے ہفتے جو درس ہوا تھا اس کی آخری آیتوں کا مضمون یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جنکو رسالت اور پیغمبری کے لیے منتخب فرماتا ہے ان کو وحی کے ذریعہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو قیامت کے دن اور اس کے حساب کتاب اور آخرت کی جزا سزا سے آگاہ کریں اور ڈرائیں اسی کے ساتھ قیامت اور میدانِ حشر کی ہولناکی کا بھی نہایت موثر اور لرزہ خیز انداز میں ذکر فرمایا گیا تھا۔

یہ گویا تمہید تھی ان آیتوں کی جو اس وقت تلاوت کی گئی ہیں ——— ارشاد فرمایا گیا ہے "وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ" یہاں قیامت کا ذکر "يَوْمَ الْاٰزِفَةِ" کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ اس سے دو چار ہی آیتیں پہلے اُس کا ذکر "یوم التلاق" کے نام سے کیا گیا تھا، وہاں میں نے بتلایا تھا کہ قیامت کو قرآن مجید میں بہت سے ناموں سے یاد کیا گیا ہے جیسے "الساعة" "الواقعة" "يَوْمُ الْحِسَابِ" "يَوْمُ التَّلَاقِ" وغیرہ انھی ناموں میں سے ایک "الآزفة" بھی ہے۔ اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اے ہمارے پیغمبر آپ ان لوگوں کو "یوم الآزفہ" یعنی قیامت کے دن سے آگاہ کیجیے اور ڈرائیے جس دن اُس کی ہولناکیاں دیکھ کر لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ گویا اُن کے دل اچھل کر گلوں میں آرہے ہیں، "دلوں کا گلوں میں

آنا عربی زبان کا ایسا ہی محاورہ ہے جیسا کہ ہماری زبان میں "کلیجہ منھ کو آنا" محاورہ ہے۔ جب آدمی کو کسی دہشت ناک حادثہ کا سامنا ہوتا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ گویا دل سینہ سے نکل جانا چاہتا ہے، اسی کیفیت کو اس آیت میں "اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ" کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے اور ایسی حالت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دل کی جگہ کو اوپر سے دبا لیتا ہے۔ اور گلا گھٹا سا معلوم ہوتا ہے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کے لفظ "کاظمین" کا یہی مطلب بیان کیا ہے اور چونکہ اس وقت آدمی کچھ بولنے بات کرنے کے لائق نہیں ہوتا اس لیے بعض مفسرین نے اس کی تفسیر "سَاکِتِیْنَ" "صَامِتِیْنَ" سے بھی کی ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے پیغمبر آپ ان لوگوں کو آنے والے قیامت کے اس دن سے آگاہ کیجیے اور ڈرائیے جب حال یہ ہوگا کہ دل اچھل کر گلوں میں آ رہے ہوں گے یا اپنی زبان کے محاورے کے مطابق کہہ لیجیے کہ کلیجے منھ کو آ رہے ہوں گے، اور وہ اپنے دل کو دبائے ہوئے ہوں گے کچھ بولنے بات کرنے کے حال میں نہ ہوں گے ـــــ آگے فرمایا گیا ہے کہ "مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّ لَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ" مطلب یہ ہے کہ اس وقت ان مجرموں کا کوئی عزیز قریب اور کوئی مخلص دوست ایسا نہ ہوگا جو ان کے کام آسکے، اور نہ کوئی ایسا سفارشی ہوگا جس کی سفارش اللہ کے یہاں قابل سماعت اور قابل قبول ہو ـــــ آگے فرمایا گیا ہے "یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ" یعنی وہاں اس علیم و خبیر خدا سے واسطہ ہوگا جو آنکھوں کی چوری بھی جانتا ہے اور دلوں اور سینوں کے راز بھی جس سے مخفی نہیں ہیں ـــــ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَاللّٰہُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَقْضُوْنَ بِشَیْءٍ ط اِنَّ اللّٰہَ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" ـــــ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ ہی فیصلہ فرمائے گا، اور اس کا فیصلہ حق و انصاف کا ہوگا، اور ان مشرکوں نے جن واقعی یا فرضی ہستیوں کو دیوتا اور معبود بنا لیا ہے اور جن کو یہ مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر پکارتے اور جن کی دہائی دیتے ہیں ان کی وہاں کچھ نہ چلے گی اور وہ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ اللہ سمیع و بصیر ہے وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے، وہی سب کا فیصلہ فرمائے گا اس لیے ان منکرین حق کو اور سب کو اپنا انجام سوچ لینا چاہیے۔

یہاں تک انکارِ حق اور کفر و شرک کے اُخروی انجام کی طرف توجہ دلائی گئی اور اُس سے خبردار کیا گیا۔ آگے فرمایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں اور جن قوموں نے پہلے زمانوں میں انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ حق کے مقابلہ میں کفر و انکار کا رویہ اختیار کیا اور ہر طرح اتمام حجت کے بعد بھی وہ مخالفت اور کفر کے رویہ ہی پر اصرار کرتے رہے اُن پر دنیا میں بھی خدا کی طرف سے عذاب نازل ہوا اور وہ ہلاک و برباد ہوئے، ان کے انجام سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے —— ارشاد فرمایا جا رہا ہے

"اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ کَانُوْا مِنْ قَبْلِہِمْ کَانُوْا اَشَدَّ مِنْہُمْ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِہِمْ ؕ وَمَا کَانَ لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ وَّاقٍ ہ"

مکہ کے لوگ خاص کر بڑے اور دولت مند لوگ، تجارت پیشہ تھے، اُن کے تجارتی قافلے شام اور یمن کی طرف جایا کرتے تھے۔ گرمی کے موسم میں وہ شام کی طرف سفر کیا کرتے تھے جو ٹھنڈا ملک ہے اور سردی کے موسم میں یمن کی طرف۔ اُن کے اِن سفروں کا ذکر سورۂ "ایلٰف" میں "رِحْلَۃَ الشِّتَاءِ وَالصَّیْفِ" کے الفاظ میں کیا گیا ہے، اِن تجارتی سفروں میں وہ اُن علاقوں سے بھی گزرتے تھے جہاں قوم عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ ان قوموں کی تباہ شدہ بستیاں اور اُنکے کھنڈر تھے جنھوں نے حجت حق پوری ہو جانے کے بعد بھی اللہ کے پیغمبروں کی گستاخانہ مخالفت کی اور پھر اُن پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور وہ بستیاں تہس نہس کر دی گئیں، اِن مکہ والوں کے کانوں میں مشہور قصوں کی طرح یہ باتیں بھی پڑی تھیں کہ ان بستیوں پر پیغمبروں کی مخالفت کی وجہ سے خدا کا عذاب آیا تھا —— تو اِس آیت (اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (الخ) میں فرمایا گیا ہے کیا اِن لوگوں نے سفروں میں چل پھر کر دیکھا نہیں کہ ہمارے پیغمبروں کی مخالفت اور ان کی دعوتِ حق کا انکار کرنے والی اُن قوموں کا کیسا انجام ہوا جن کے پاس قوت و طاقت ان مکہ والوں سے بدرجہا زیادہ تھی اور ان کی عظمت و ترقی کی بڑی شاندار یادگاریں اور نشانیاں تھیں، الغرض ان مکہ والوں کے مقابلہ میں وہ قومیں بہت طاقتور اور بڑی ترقی یافتہ تھیں، پھر اُن کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے اُن کے کافرانہ رویہ کی وجہ سے اللہ نے ان کو اپنی پکڑ میں لے لیا، وہ تباہ و برباد کر دی گئیں، اُن کا نام و

نشان مٹ گیا۔ "وَمَا کَانَ لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ وَّاقٍ" اور پھر اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے ان کو بچا سکنے والا کوئی نہیں تھا ——— آگے فرمایا گیا ہے

"ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانَتْ تَّاْتِیْھِمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوْا فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ اِنَّہٗ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ" اس آیت میں پھر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر جو خدا کا عذاب نازل ہوا اور ان کو جو تباہ و برباد کیا گیا تو وہ ان کے اس سنگین جرم کی دنیوی سزا تھی کہ ہمارے پیغمبر ان کے پاس ایسے روشن دلائل اور ایسی واضح ہدایات لیکر آئے جن کے بعد کفر و انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، لیکن انھوں نے ازراہِ ضد و شرارت سرکشی اور کفر و انکار کا رویہ اختیار کیا اور ہمارے پیغمبروں اور ان کی دعوتِ حق کی مخالفت پر کمر باندھ لی، اور اس طرح انھوں نے خود اللہ کے عذاب کو دعوت دی، پھر اللہ کا عذاب نازل ہوگیا اور اللہ کو ہر طرح کی قوت و قدرت حاصل ہے اور وہ شدید العقاب ہے۔ اس کی مار بے پناہ اور اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اہل مکہ کو چاہیے کہ اللہ کے دیے ہوئے کانوں، آنکھوں اور عقل سے کام لیں، ان قوموں اور بستیوں کے انجام سے سبق حاصل کریں جن کے کھنڈر انھوں نے اپنے سفروں میں دیکھے ہیں۔ اگر یہ کفر و انکار سے باز نہ آئے اور اسی طرح ہمارے پیغمبر کی اور دعوت حق کی مخالفت کرتے رہے تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ کا ہوا۔

اس کے آگے خصوصیت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے ان کو اپنا رسول بنا کر اور پیغام ہدایت دے کر فرعون و ہامان وغیرہ کی طرف بھیجا تھا، انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور تکذیب و مخالفت کی، بلکہ ان کو قتل کر دینے تک پر آمادہ ہو گئے، اور وہی رویہ اختیار کیا جو مکہ کے صنادید کفار ابوجہل، ابولہب وغیرہ نے اختیار کیا تھا لیکن انجام یہ ہوا کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں بلکہ سارے لاؤ لشکر پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور وہ سب غرقاب ہو کر موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور موسیٰ علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے اللہ کی مدد سے فتحیاب اور کامیاب ہوئے ——— مقصد یہی ہے کہ مکہ کے ان دشمنانِ حق و صداقت ابوجہل وغیرہ کو اپنے پیشرووں فرعون و ہامان وغیرہ کے انجام سے سبق حاصل کرنا چاہیے ——— ارشاد فرمایا گیا ہے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبر موسیٰ کو "آیات" اور "سلطان مبین" دے کر فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف بھیجا ——— "آیات" اور "سلطان مبین" بظاہر دونوں سے مراد وہ روشن اور کھلے معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے خاصکر عصا کا اژدہا بن جانا اور ہاتھ سے روشنی کا ظاہر ہونا جن کو مختصر لفظوں میں "عصائے موسیٰ اور ید بیضا" کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزے رسالت اور پیغمبری کی سند کے طور پر عطا فرمائے تھے۔ اور حکم دیا تھا کہ سب سے پہلے مصر کے فرمانروا فرعون اور اس کے وزیر اعظم ہامان اور ملک کے سب سے بڑے دولت مند قارون کو جا کر دین حق کی دعوت دو اور رسالت اور پیغمبری کی سند اور دلیل کے طور پر یہ معجزات پیش کرو چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ان کو خدا کا رسول نہیں مانا بلکہ کہا کہ "سٰحِرٌ كَذَّابٌ" یہ جادوگر ہے، یعنی یہ جو کرتب دکھا رہا ہے یہ خدائی معجزے نہیں ہیں بلکہ یہ اس کی جادوگری ہے اور یہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر نہیں ہے بلکہ جھوٹا مدعی ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے۔ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْا اَبْنَاءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَاءَهُمْ ؕ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون، ہامان وغیرہ کو اور قوم کے عوام کو بھی اللہ کے حکم کے مطابق حق کی (یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی اور ایمان کی) دعوت دی اور اللہ کے بندے متاثر ہونے لگے تو انھوں نے اُن لوگوں کو حق و ہدایت سے اور ایمان لانے سے روکنے کے لیے حکم جاری کیا کہ جو کوئی ان کی دعوت کو قبول کر کے اور ایمان لا کے ان کے ساتھ ہو جائے، اُس کے لڑکوں کو قتل کر دیا جائے اور صرف لڑکیوں کو باقی رکھا جائے ——— ظاہر ہے کہ اس فرعونی حکم اور آرڈر کا مقصد یہ تھا کہ لوگ دہشت زدہ ہو جائیں اور کوئی ایمان لانے کی ہمت نہ کرے اور جو لوگ اس کے بعد بھی ایمان لا کر ان کے ساتھ ہو جائیں تو اس نسل کشی کی وجہ سے اُن کی قوت و طاقت بڑھنے نہ پائے ——— بظاہر فرعون اور اس کے حواریوں کا یہ حکم اور اقدام ایسا تھا جس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے "وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ" یعنی دشمنانِ حق کے منصوبے اور ان کے داؤ پیچ فیل ہی ہوتے ہیں ——— اس سے معلوم ہوا کہ فرعونی حکومت کا یہ خونی آرڈیننس بھی اللہ کے بندوں کو ایمان لانے سے نہیں روک سکا اور کچھ لوگ ایمان لا کر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو گئے، اور کچھ خفیہ طور پر ایمان لے آئے انھوں نے ایمان کا اظہار مناسب نہیں سمجھا، جیسا کہ آگے کی آیتوں سے معلوم ہوگا ——— آگے ارشاد ہے ———

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝

واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ حق اور اُن کے روشن معجزات سے متاثر ہو کر ایمان لانے لگے تو فرعون اور اس کے حواریوں کو زیادہ فکر ہوئی، اور معلوم ہوتا ہے کہ خود فرعون کا دل متاثر ہو چکا تھا اور وہ معجزات دیکھ کر سمجھ چکا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی بڑی غیبی طاقت ہے، اس لیے وہ اندر سے خوف زدہ تھا، مگر چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ اس کو خوف زدہ نہ سمجھیں ——— اس لیے اُس نے اپنے لوگوں کو سنا کر کہا کہ "ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ الخ" بھئی مجھے چھوڑ دو میں اس موسیٰ کو قتل کر دوں یا کرا دوں اور وہ اپنی مدد کے لیے اپنے خدا کو بھی بلا لے، مجھے اس سے خطرہ ہے کہ وہ تمھارا دین بدل دے، تمھیں باپ دادا کے دین سے ہٹا کر اپنے دین کا پیرو بنا لے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ ملک میں فساد برپا کر دے یعنی موجودہ حکومت جو قبطی قوم کی اور تمھاری حکومت ہے اس کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کر لے ———

فرعون کے اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کے انداز اور اس کی تاثیر اور ان کے معجزات دیکھ کر اُس کا دل خوف زدہ ہو گیا تھا، اور اُس کے چھپانے ہی کے لیے اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا تھا کہ "مجھے چھوڑ دو میں اس موسیٰ کا خاتمہ کر دوں"۔ ورنہ ظاہر ہے کہ وہاں کوئی بھی اُس کو روکنے والا اور اُس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا ———

اور اپنی بہادری اور بے خوفی ظاہر کرنے کے لیے اس نے یہ بھی کہا کہ موسیٰ اپنی مدد کے لیے

اپنے خدا کو بھی بلا لے ـــــ بہرحال موسیٰ علیہ السلام کو جب اُس کو یہ بات پہنچی تو آپ نے پیغمبرانہ انداز میں اور پورے اعتماد کے ساتھ فرمایا ـــــ اِنِّی عُذْتُ بِرَبِّی وَرَبِّکُمْ مِنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ۝ "یعنی میں نے اپنے اُس پروردگار کی جو تمھارا بھی پروردگار ہے اور جس کے قبضۂ و اختیار میں ہماری تمھاری سب کی موت و حیات ہے پناہ لے لی ہے ہر ایسے متکبر و مغرور کے شر اور اس کی شرارت سے جو قیامت و آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اس وجہ سے وہ ہر ناکردنی کرنے پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے اور ساری کائنات کے پروردگار کی پناہ میں ہوں اس لیے فرعون و ہامان اور اُن جیسا کوئی بھی متکبر و مغرور میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اور فرعون اور اس کی حکومت اور لاؤ لشکر کا جو حشر و انجام ہوا، اُس سے سب کو یہ معلوم ہوگیا کہ حالات کے بالکل برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے پروردگار کی حفاظت اور پناہ پر اعتماد کتنا برحق تھا ـــــ کچھ ہی پہلے سورۂ زمر میں گزر چکا ہے "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ" (کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے) یعنی بلاشبہ کافی ہے۔

اس میں ہمارے اور آپ کے لیے سبق ہے کہ اگر بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق صحیح ہو اور اس کو ایمان و یقین نصیب ہو اور وہ انتہائی ناسازگار اور خطرناک حالات میں بھی پورے اخلاص اور اعتماد و یقین کے ساتھ اللہ کی پناہ پکڑ لے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی حفاظت اور مدد ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی دشمن کے شر اور حملہ کا خطرہ ہوتا تو آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے تھے۔ "اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ وَنَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ" (اے اللہ ہم تیری پناہ لیتے ہیں ان دشمنوں کے شر سے اور تجھے کرتے ہیں اُن کے سامنے اور اُن کے مقابلہ میں) لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اللہ پر یقین و اعتماد اور اُس کے ساتھ بندگی کا صحیح تعلق شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو نصیب فرمائے۔

کتاب المعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

نظام عدالت

لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے مختلف قسم کے نزاعات و خصومات کا فیصلہ کرنے اور حقداروں کو اُن کا حق دلوانے، نیز تعزیر و سزا کے مستحق چوروں، ڈاکوؤں جیسے مجرموں کو سزا دینے کے لیے محکمۂ قضا یعنی نظام عدالت کا قیام بھی انسانی معاشرہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے — اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی معاملات کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی اپنے طرزِ عمل اور ارشادات سے پوری رہنمائی فرمائی ہے —
ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ کی زندگی میں تو اس کا سوال ہی نہیں تھا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آبسے اور یہاں اجتماعیت کی ایک شکل پیدا ہوگئی تو اُس وقت نظام عدالت بھی اپنی ابتدائی سادہ شکل میں قائم ہوگیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی و رسول ہونے کے ساتھ قاضی اور حاکمِ عدالت بھی تھے؛ نزاعی معاملات آپ کے سامنے آتے اور آپ اُن کا فیصلہ فرماتے، حدود جاری کرتے یعنی سزا کے مستوجب مجرمین کو قانونِ خداوندی کے مطابق سزائیں دلواتے — قرآن مجید میں براہِ راست آپ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ
(المائدہ آیت ۴۹)

(اے پیغمبر!) آپ لوگوں کے نزاعات و معاملات کا فیصلہ اللہ کی نازل کی ہوئی ہدایت اور اسکے قانون کے مطابق کیا کریں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء آیت ۱۰۵)	ہم نے نازل کی آپ کی طرف "کتاب" حق (کی ہدایت) کے ساتھ تاکہ آپ لوگوں کے باہمی معاملات کا فیصلہ کریں اللہ کی رہنمائی کے مطابق

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزاعات وخصومات کے فیصلے خود فرماتے تھے۔ نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی حیات طیبہ ہی میں آپ کے حکم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مدینہ طیبہ میں قاضی کی حیثیت سے مقدمات کے فیصلے فرماتے تھے اور جب یمن کا علاقہ بھی اسلامی اقتدار کے دائرہ میں آگیا تو آپ نے حضرت علی اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہما کو بھی وہاں قاضی بنا کر بھیجا۔

آپ نے اُن لوگوں کو جو کسی علاقہ میں عدل وانصاف کے ذمہ دار (قاضی) بنائے جائیں سخت تاکید فرمائی کہ وہ اس ذمہ داری کو اپنے امکان اور اپنی فہم وفکر کی آخری حد تک عدل وانصاف اور خدا ترسی کے ساتھ انجام دینے کی پوری کوشش کریں، اور ایسا کرنے والوں کو آپ نے خدا کی مدد اور رہنمائی کی اور آخرت میں عظیم انعامات اور بلند درجات کی بشارتیں سنائیں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اگر بالفرض ایسے لوگوں سے نادانستہ اجتہادی غلطی بھی ہو جائے گی تو اس پر مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ اپنی نیک نیتی اور حق سمجھنے کی محنت وکوشش کا ان کو اجر وثواب ملے گا ــــــ اور اس کے بالمقابل آپ نے جانبداری اور بے انصافی کرنے والے حاکموں کو اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب سے ڈرایا اور سخت وعیدیں سنائیں ــــــ نیز آپ نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ حاکم اور قاضی ایسے بندگان خدا کو بنایا جائے جو اس منصب اور عہدے کے خواہشمند نہ ہوں، اور جو لوگ اس کے طالب اور خواہشمند ہوں اُن کو ہرگز یہ منصب اور عہدہ نہ دیا جائے ــــــ قضا اور عدالت کے طریقہ کار کے بارہ میں بھی آپ نے رہنمائی فرمائی اور اس کے لیے کچھ بنیادی اصول بھی تعلیم فرمائے ــــــ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھی جائیں۔

عادل اور غیر عادل حاکم و قاضی

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم اِنَّ الْمُقْسِطِیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ عَنْ یَمِیْنِ الرَّحْمٰنِ وَ کِلْتَا یَدَیْہِ یَمِیْنٌ، اَلَّذِیْنَ یَعْدِلُوْنَ فِیْ حُکْمِہِمْ وَاَہْلِیْہِمْ وَمَا وَلُوْا

——— رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (اہل حکومت اور ارباب اقتدار میں سے) عدل و انصاف کرنے والے بندے اللہ تعالیٰ کے ہاں (یعنی آخرت میں) نور کے منبروں پر ہوں گے اللہ تعالیٰ کے داہنی جانب ——— اور اُس کے دونوں ہاتھ داہنے ہی ہیں ——— یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے اہل و عیال اور متعلقین کے معاملات میں اور اپنے اختیارات کے استعمال کے بارہ میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں ——— (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں اُن اہل حکومت اور ارباب اختیار کو جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے اختیارات کے استعمال اور سارے معاملات میں عدل و انصاف کا اہتمام اور اس کی پابندی کریں یہ عظیم بشارت سنائی گئی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کا یہ اعزاز و اکرام ہوگا کہ وہ اُس کے داہنی جانب نور کے منبروں پر بٹھائے جائیں گے ——— اس دنیا کے شاہی درباروں میں کسی کی کرسی کا تخت شاہی کے داہنی جانب ہونا اُس کے خاص الخاص اعزاز و اکرام کی علامت سمجھا جاتا ہے ——— اس بنا پر اس حدیث کا مقصد وہ عایہ ہوگا کہ جو بندے برسر حکومت اور صاحب اختیار ہونے کے ساتھ عدل و انصاف کے تقاضوں کی پوری پابندی کریں، تو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں اُن کا ایسا ہی خاص الخاص اعزاز و اکرام ہوگا اُن کی نورانی نشست گاہیں (منبر کہیئے یا کرسیاں)، اللہ تعالیٰ کے داہنی جانب ہوں گی۔

حدیث کے لفظ "عن یمین الرحمٰن" (خداوند رحمٰن کے داہنی جانب) سے شبہ ہوسکتا تھا کہ

جس طرح ہم لوگوں کے داہنے ہاتھ کے ساتھ دوسرا بایاں ہاتھ ہوتا ہے (جو داہنے ہاتھ کے مقابلہ میں کمزور اور کمتر ہوتا ہے) اسی طرح خداوند رحمٰن کا بھی دوسرا بایاں ہاتھ ہوگا — تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی کہ اُس کا کوئی ہاتھ بھی بایاں نہیں ہے، دونوں ہاتھ داہنے ہی ہیں (کلتا یدیہ یمین) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وضاحت سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ اس حدیث میں یا اس طرح کی دوسری احادیث میں یا قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو "یمین" یا "ید" (ہاتھ یا داہنے ہاتھ) کے الفاظ کہیں استعمال ہوئے ہیں اُن سے ہمارے جیسے ہاتھ مراد نہیں ہیں — قرآن پاک میں بھی فرمایا گیا ہے۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (کوئی چیز بھی اللہ کی مثل یا مثال نہیں ہے) رہی یہ بات کہ پھر "ید" جیسے الفاظ سے کیا مراد ہے؟ — تو اس کے بارہ میں ائمہ سلف کے اس مسلک میں زیادہ سلامتی اور احتیاط ہے کہ ہم اس کا اعتراف اور اقرار کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی نوعیت اور حقیقت کی دریافت سے ہم عاجز ہیں۔

حدیث کے آخری الفاظ ہیں "الذین یعدلون فی حکمھم واھلیھم وما ولوا" یعنی یہ بشارت ان عادل ومنصف بندوں کے لیے ہے جو اپنے عدالتی اور حکومتی فیصلوں میں انصاف کریں اور اپنے اہل وعیال اور اہل تعلق کے ساتھ بھی ان کا رویہ عادلانہ اور منصفانہ ہو، اور اگر وہ کسی کے ولی اور سرپرست ہوں یا کسی جائداد یا ادارہ کے متولی اور ذمہ دار ہوں تو اُس کے معاملات میں بھی عدل وانصاف کے تقاضوں کی پابندی کریں — اس سے معلوم ہوا کہ عدل وانصاف کا حکم اور اس پر بشارت کا تعلق صرف ارباب حکومت اور حاکمانِ عدالت ہی سے نہیں ہے بلکہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں ہر شخص اس کا مکلف ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَی اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَاَقْرَبَھُمْ مِنْہُ مَجْلِسًا اِمَامٌ عَادِلٌ وَاِنَّ اَبْغَضَ النَّاسِ اِلَی اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَاَشَدَّھُمْ عَذَابًا اِمَامٌ جَائِرٌ"

— رواہ الترمذی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنے والے حاکم قیامت کے دن اللہ کو دوسرے سب لوگوں سے زیادہ محبوب اور پیارے ہوں گے اور اُن کو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوگا ——— اور (اس کے برعکس) وہ ارباب حکومت قیامت کے دن اللہ کو سب سے زیادہ مبغوض اور سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے جو ظلم و جور اور بے انصافی کے ساتھ حکومت کریں گے۔ (جامع ترمذی)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِی اَوْفٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْقَاضِیْ مَا لَمْ یَجُرْ، فَاِذَا جَارَ تَخَلّٰی عَنْهُ وَلَزِمَهُ الشَّیْطَانُ۔

——— رواہ الترمذی

حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قاضی (یعنی حاکم عدالت) کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے (یعنی اس کی مدد اور توفیق اس کی رفیق رہتی ہے) جب تک کہ وہ عدل و انصاف کا پابند رہے، پھر جب وہ (عدل و انصاف کی پابندی چھوڑ کے) بے انصافی کا رویہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ اس سے الگ اور بے تعلق ہو جاتا ہے (یعنی اس کی مدد اور رہنمائی اس کو حاصل نہیں رہتی) اور پھر شیطان اس کا ہمدم و رفیق ہو جاتا ہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ حاکم اور قاضی کی نیت اور کوشش جب تک یہ رہے گی کہ میں حق و انصاف ہی کے مطابق فیصلے کروں اور مجھ سے بے انصافی سرزد نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد اور رہنمائی ہوتی رہتی ہے ——— لیکن جب خود اس کی نیت خراب ہو جائے اور ظلم و بے انصافی کا راستہ اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ اُس کو اپنی مدد اور رہنمائی سے محروم فرما دیتا ہے اور پھر شیطان ہی اُس کا رفیق و رہنما بن جاتا ہے اور وہ اس کو جہنم کی طرف لیجانے والے راستہ پر چلاتا ہے۔

قاضی اور حاکم سے اگر اجتہادی غلطی ہو جائے....

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَ إِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ وَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ وَاحِدٌ ــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے دونوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب حاکم (کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا چاہے اور (حق کے مطابق اور صحیح فیصلہ کرنے کے لیے) غور وفکر اور کوشش کرے اور صحیح فیصلہ کردے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ (ایک صحیح فیصلہ کرنے کی نیت اور کوشش ومحنت کا اور دوسرا صحیح فیصلہ کرنے کا) اور اگر اس نے حقیقت کو جاننے سمجھنے اور صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کی اور اس کے باوجود فیصلہ غلط کردیا تو بھی اس کو ایک اجر و ثواب ملے گا۔ (یعنی حق کے مطابق فیصلہ کرنے کی نیت اور محنت کا)

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے مطلب کی بقدر ضرورت تشریح ترجمہ کے ساتھ کردی گئی ہے ــــــ اس حدیث سے ایک بڑی اہم اصولی بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر حاکم اور مجتہد کسی معاملہ اور مسئلہ میں حق وصواب کو جاننے سمجھنے کی امکان بھر کوشش کرے تو اگر وہ صحیح نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تب بھی وہ عند اللہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا کیونکہ اس کی نیت حق وصواب کو سمجھنے کی تھی اور اس کے لیے اس نے غور وفکر اور محنت وکوشش بھی کی ــــــ اور وہ اسی کا مکلف تھا ــــــ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا تعلق انہی لوگوں سے ہے جو اس کے اہل ہوں ــــــ نااہلوں کو اجتہاد کی اجازت تو کوئی بھی نہیں دے سکتا ــــــ جس شخص نے قدیم یا جدید طب کا فن حاصل ہی نہیں کیا وہ اگر مطب کھول کر بیٹھ جائے اور بیماروں کا علاج کرنے لگے تو مجرم اور جیل خانہ کا مستحق ہوگا ــــــ ہماری زبان کی صحیح مثل ہے "نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان" ــــــ آگے درج ہونے والی حدیث میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ضروری درجہ کے علم اور اہلیت کے بغیر فیصلے کرے وہ دوزخ کا مستحق ہے۔

جنتی اور دوزخی قاضی و حاکم

عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - اَلْقُضَاةُ

ثَلٰثَةٌ وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ وَاثْنَانِ فِي النَّارِ، فَأَمَّا الَّذِي فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضٰى بِهٖ وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ ۔۔۔۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قاضی (حاکمانِ عدالت) تین قسم کے ہیں ۔ اُن میں سے ایک جنت کا مستحق اور دو دوزخ کے مستحق ہیں ۔۔۔ جنت کا مستحق وہ حاکم عدالت ہے جس نے حق کو سمجھا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا ۔۔۔ اور جس حاکم نے حق کو سمجھنے کے باوجود ناحق فیصلہ کیا وہ دوزخ کا مستحق ہے، اور اسی طرح وہ حاکم بھی دوزخ کا مستحق ہے جو بے علم اور ناواقف ہونے کے باوجود فیصلے کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ (سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

رشوت لینے اور دینے والے مستحق لعنت

حاکمانِ عدالت کو حق وانصاف کے خلاف فیصلہ پر آمادہ کرنے والے اسباب میں ایک بڑا سبب رشوت کی طمع ہوتی ہے ۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے کو موجبِ لعنت گناہ بتلایا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ ۔۔۔۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ ورواہ ترمذی عنہ وعن ابی ہریرہ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر۔

(سنن ابی داؤد وسنن ابن ماجہ ۔۔۔ اور امام ترمذی نے اس کو حضرت عبداللہ بن عمرو کے علاوہ حضرت ابوہریرہ سے بھی روایت کیا ہے)

(تشریح) کسی مجرم کے لیے اللہ یا اس کے رسول کی طرف سے لعنت، اس سے انتہائی ناراضی و بیزاری کا اعلان اور نہایت سنگین سزا ہے ۔۔۔ اللہ کی طرف سے کسی پر لعنت کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ خداوند رحمٰن و رحیم نے اُس مجرم کو اپنی وسیع رحمت سے محروم کر دینے کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اور اللہ کے رسول یا فرشتوں کی طرف سے لعنت کا مطلب اس شخص سے بیزاری اور اس کے قابل لعنت ہونے کا اعلان اور اس کو رحمت سے محروم کر دیے جانے کی بد دعا ہوتی ہے ——— اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے والوں اور رشوت دینے والوں سے اپنی انتہائی ناراضی و بیزاری کا اظہار فرمایا اور اُن کے لیے بد دعا فرمائی کہ اللہ اُن کو اپنی رحمت سے محروم کر دے ——— اللہ کی پناہ! رحمۃ للعٰلمین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم جس بدنصیب سے بیزاری کا اعلان فرمائیں اور اس کے لیے رحمت خداوندی سے محروم کیے جانے کی بد دعا فرمائیں ——— اُس بدبخت کا کہاں ٹھکانا!

اس حدیث کی بعض روایتوں میں ایک لفظ "والرائش" کا اضافہ بھی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ رشوت لینے اور دینے والے کے علاوہ اُس درمیانی آدمی (دلال) پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی جو رشوت کے لین دین کا ذریعہ اور واسطہ بنے۔

حاکم اور قاضی بننا بڑی آزمائش اور بہت خطرناک

ظاہر ہے کہ قاضی اور حاکم بن جانے کے بعد اس کے بہت امکانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ آدمی کی نیت اور اُس کے اخلاق میں فساد آ جائے اور وہ ایسے غلط کام کرنے لگے جن سے اس کا دین و ایمان برباد اور آخرت خراب ہو جائے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے اس سے بہت ڈرایا ہے اور حتی الوسع اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے ——— اس سلسلہ میں آپ نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ حکومتی عہدے اور عدالتی مناصب اُن لوگوں کو نہ دیے جائیں جو ان کے طالب اور خواہشمند ہوں بلکہ ایسے لوگوں کو یہ ذمہ داری سپرد کی جائے جو اُس کے طالب نہ ہوں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جُعِلَ قَاضِیًا بَیْنَ النَّاسِ فَقَدْ ذُبِحَ بِغَیْرِ سِکِّیْنٍ

——— رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا جو شخص قاضی (حاکم عدالت) بنایا گیا تاکہ لوگوں کے مقدمات نزاعات کا فیصلہ کرے تو وہ بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) جس آدمی کو چھری سے ذبح کیا جائے وہ ۲-۴ منٹ میں ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی کو چھری کے بغیر ذبح کرنے کی کوشش کی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کا جلدی کام تمام نہ ہو سکے گا اور اس کی تکلیف طویل المیعاد ہو گی ـــــ حدیث کا مدعا اور مقصد یہ ہے کہ قاضی اور حاکم عدالت بنا اپنے کو بڑی آزمائش اور مصیبت میں مبتلا کرنا ہے ـــــ اور اس منصب اور ذمہ داری کے قبول کرنے والے کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ سر پہ کانٹوں کا تاج رکھ رہا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّکُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلَی الْاِمَارَةِ وَسَتَکُوْنُ نَدَامَةً یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَنِعْمَتِ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ

ـــــ رواہ البخاری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ آئندہ ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ تم لوگ حکومت اور اس کے عہدوں کی حرص کرو گے اور وہ قیامت کے دن ندامت و پشیمانی کا باعث ہو گی۔ بڑی اچھی لگتی ہے حکومت آغوش میں لیکر دودھ پلانے والی، اور بہت بری لگتی ہے دودھ چھڑانے والی۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف فرمایا تھا کہ آپ کی امت میں حکومت اور اس کے عہدے حاصل کرنے کا شوق اور اس کی حرص پیدا ہو گی۔ ایسے لوگوں کو آپ نے آگاہی دی کہ یہ حکومت قیامت میں سخت ندامت اور پشیمانی کا باعث ہو گی جب ان کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں حکومت کا حساب دینا ہو گا ـــــ آخر میں آپ نے فرمایا کہ حکومت جب کسی کو ملتی ہے تو بڑی اچھی لگتی ہے جیسے بچہ کو دودھ پلانے والی دایہ اچھی لگتی ہے اور جب وہ ہاتھ سے جاتی ہے (خواہ موت کے وقت، یا زندگی ہی میں اس سے محروم یا دست بردار ہونا پڑے) تو بہت بری لگتی ہے جیسے کہ دودھ چھڑانے والی دایہ بچہ کو بہت بری لگتی ہے ـــــ مطلب یہ ہے کہ حکومت کے شوقینوں اور طالبوں کو اس کے اخروی انجام سے غافل نہ ہونا چاہیئے قیامت میں

ان کو اپنے زیر حکومت لاکھوں کروڑوں بندگان خدا کے حقوق کے بارہ جوابدہی کرنی ہوگی۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قسم کے ارشادات کا یہ اثر پڑا تھا کہ بہت سے صحابۂ کرام حکومتی اور عدالتی عہدوں سے دور رہنا چاہتے ــــ امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو قاضی بنانا چاہا لیکن وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔

حکومت کے طالب اللہ کی مدد و رہنمائی سے محروم

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْئَلِ الْإِمَارَةَ فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيْتَهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا وَ إِنْ أُعْطِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے لیے حکومت کا عہدہ طلب مت کرو، اگر تمھارے طلب کرنے پر تم کو حکومت کی ذمہ داری سپرد کی گئی تو تم اس کے حوالے کردیے جاؤگے (اللہ کی طرف سے تمھاری کوئی مدد اور رہنمائی نہیں ہوگی) اور تمھاری طلب کے بغیر تم کو کوئی حکومتی ذمہ داری سپرد کی گئی تو اللہ کی طرف سے اُس میں تمھاری مدد ہوگی۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتَغَى الْقَضَاءَ وَسَأَلَ وُكِلَ إِلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ أُكْرِهَ عَلَيْهِ أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مَلَكًا يُسَدِّدُهٗ

ــــ رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی منصب قضا کا طالب ہوگا اور درخواست کرکے اس کو حاصل کرے گا تو اُس کو اس کے نفس اور اس کی ذات کے حوالے کردیا جائے گا (کہ وہ خود ہی اُس کی ذمہ داریوں سے نمٹے جو بہت مشکل اور بڑا خطرناک کام ہے) اور جس شخص کو مجبور کرکے قاضی اور حاکم عدالت بنایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی کے لیے خاص فرشتہ نازل فرمائے گا جو اُس کو

ٹھیک ٹھیک چلائے گا۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) دونوں حدیثوں کا مدعا اور مطلب یہی ہے کہ حکومتی عہدہ یا عدالتی منصب اپنے نفس کی خواہش سے نہیں لینا چاہیے جو کوئی اس طرح حاصل کرے گا، اس کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی کوئی مدد نہ ہوگی، اور جس کو بغیر اس کی ذاتی خواہش کے یہ ذمہ داری سپرد کی جائے وہ متوکلاً علی اللہ اس کو قبول کرلے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایسے بندوں کی مدد اور رہنمائی فرمائی جائے گی۔

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

ایک نومسلمہ انگریز خاتون

(۲)

مولانا عزیر گل صاحب سے استفادہ و تعلق

مولانا سیاح الدین صاحب کاکاخیل جو مولانا عزیر گل مدظلہ کے قریبی عزیز ہیں اپنے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

قصبہ منگلور (جہاں ان نومسلمہ خاتون کا قیام تھا) دیوبند سے تقریباً ۲۴ میل دور ہے مگر یہ راستہ پیدل کا ہے۔ اس زمانہ میں کسی قسم کی سواری کے لیے دونوں قصبوں کے درمیان کوئی سڑک نہیں تھی۔ دیوبند تک ریل کے ذریعہ آنا جانا ہوتا تھا تو رڑکی اور سہارنپور ہوتے ہوئے دیوبند جانا پڑتا تھا اس طرح فاصلہ ۵۰ میل سے زائد بنتا تھا۔ ان دنوں مولانا عزیر گل صاحب مدرسہ رحمانیہ واقع جامع مسجد رڑکی میں صدر مدرس تھے۔ اس لیے حضرت مدنیؒ نے ان نومسلمہ خاتون کو مشورہ دیا کہ قرآن مجید کا مزید تحقیقی مطالعہ کرو اور جہاں کہیں مضامین قرآنی سمجھنے میں کوئی اشکال پیش آجائے، تو یہاں کی بہ نسبت رڑکی آپ سے قریب ہے۔ وہاں جاکر حضرت مولانا عزیر گل صاحب کے سامنے اپنا اشکال پیش کرکے اسے حل کیا کرو۔ اور ان کی رہنمائی میں دینی کتب کا مطالعہ کرکے تحقیقی طور پر دینی مسائل کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ آپ کے لیے علمی طور پر زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔ یہاں دیوبند آنا جانا راستہ کی دوری کی وجہ سے مشکل ہے۔ اور ان کو میرا قائم مقام سمجھو۔ اور ان سے استفادہ کرو۔

ان کا شوہر اگرچہ ریٹائر ہو کر انگلینڈ چلا گیا لیکن ان کے گذارے کے لیے دو سو[1] ماہوار پابندی سے بھیجتا رہا۔ اس ماہوار آنے والی رقم سے وہ منگلور میں اچھی طرح گذارا کرتی رہیں اور شب وروز مطالعۂ قرآن مجید اور دینی مسائل کی تحقیق میں مشغول رہا کرتی تھیں۔ دوران مطالعہ کوئی خاص اشکال پیش آتا یا کوئی مسئلہ قابل تحقیق ہوتا تو حضرت مدنیؒ کے مشورہ کے مطابق بہ آسانی رڑکی جاکر مولانا عزیر گل مدظلہ سے پورے طور پر علمی اطمینان حاصل کر لیا کرتی تھیں۔ اس آمدورفت میں حضرت مولانا کی اہلیہ (مرحومہ) سے بھی اچھا خاصا تعارف وتعلق پیدا ہو گیا اور اسی طرح مولانا کے چھوٹے بچے بچیوں سے بھی خوب مانوس ہو گئیں اور بچے ان سے مانوس ہو گئے۔

اس زمانہ میں مولانا کے یہ بچے ان کو "ممدز" کہا کرتے تھے۔ چھوٹے بچے زُہیر کو جس کی عمر تقریباً پانچ سال تھی بارہا وہ رڑکی سے منگلور لے جاتیں اور یہ بچہ اپنے گھر کی طرح دو دو تین تین راتیں وہاں ہنسی خوشی گذارتا۔ سب چھوٹے بڑے اہل خانہ ان کو "ممدز" کہتے۔ اور وہ ان سب کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آیا کرتی تھیں۔ مولانا عزیر گل صاحب کے علمی اور عملی کمالات وفضائل کی خوب معتقد ومعترف ہو گئی تھیں۔ پورے خاندان کے ساتھ آمدورفت، محبت وخلوص اور ارسالِ ہدایا وتحائف کا یہ سلسلہ دو تین سال تک چلتا رہا۔

نکاح کی تحریک

مولانا عبداللہ کاکاخیل نے اپنی چچی نومسلمہ کی زبانی ان کے اسلام اور ازدواجی زندگی کی جو کہانی قلمبند کی ہے اس میں وہ رقمطراز ہیں: ہماری تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ ہماری چچی کا مختصر سی بیماری (غالباً ولادت کی بیماری) کے بعد انتقال ہوا۔ اس حادثہ سے میری تعلیم کا متاثر ہونا بھی ایک طبعی امر تھا۔

[1] اس زمانہ کے دو سو اشیاء ضرورت کی قوتِ خرید کے لحاظ سے آج کے چار ہزار کے برابر ہوتے تھے، یہ بات پورا حساب لگا کے عرض کی جارہی ہے۔ "الفرقان"

کچھ عرصہ ایسا ہی گذرا اس کے بعد حضرت مدنیؒ نے مجھے بلا کر سمجھایا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کا نکاح سابق شوہر سے، جو اپنے کفر پر قائم ہے، ٹوٹ چکا ہے۔ میں آپ کے دین کی بہتری اس میں سمجھتا ہوں کہ آپ ازدواجی زندگی میں آجائیں۔ اور جس شخص کو میں نے آپ کا مربی مقرر کیا ہے اگر اس کے ساتھ آپ کا نکاح ہو جائے تو یہ آپ کے لیے باعث سعادت ہو گا جس دین کی تعلیمات کے حصول کے لیے آپ پریشان و سرگرداں ہیں، جس کی خاطر آپ نے اپنی دنیا کی ہر دولت اور ہر راحت کو قربان کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس کی تعلیم و تربیت کا ایک مستقل انتظام ہو جائے گا۔

الغرض میرے شیخ و مرشد حضرت مدنیؒ نے اس نکاح کی اہمیت کو میرے دل میں کچھ اس طرح اتارا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میری اخروی سعادت کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔ کہ میں اپنی آرام و آسائش کی زندگی، اپنی دولت، دنیوی وجاہت، خویش و اقارب اور ملک و وطن کو خیرباد کہہ کر اس غریب انسان کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کر دوں، جو مجھے دنیا کی راحت تو نہیں پہنچا سکے گا۔ لیکن علم دین اور خشیت الہی کی دولت سے مجھے ضرور مالا مال کر دے گا۔

میں نے حضرت مدنیؒ سے عرض کیا کہ مجھے اتنی مہلت دی جائے کہ میں اپنے بچوں کو جو ملک گئے ہوئے ہیں، صورت حال سے آگاہ کر کے اجازت طلب کر لوں۔ حضرت نے اس کو تسلیم کر لیا۔ گو بچوں کی اجازت پر اصل مسئلے کا توقف کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ تاہم میری یہ خواہش تھی کہ ان کی اجازت ہونے کے بعد یہ کام ہو۔

اس دوران حضرت مدنیؒ نے تمہارے تایا (مولانا عزیز گل مدظلہ) کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی اور جب وہ آمادہ ہو گئے تو حضرت مدنیؒ نے مجھے پیغام بھیجا کہ وہ آمادہ ہیں اور آپ بھی آمادہ ہیں۔ بچوں کے جواب میں تاخیر ہو گی اور اصولاً ان کے جواب پر کوئی توقف بھی نہیں ہے یہ محض تطییب خاطر کے لیے ہے۔ ہم مجلس نکاح کا انعقاد فلاں تاریخ کو کریں گے آپ کو قبول کرنا ہو گا۔ اور یہ تاریخ بہت ہی قریب کی تاریخ تھی۔

یہ حکم نامہ جب وصول ہوا تو میرے لیے مزید کلام کی گنجائش نہ تھی۔ مقررہ تاریخ

کو نکاح ہو گیا۔ نکاح ہو جانے کے چند روز بعد بچوں کا خط آیا کہ ہماری طرف سے بالکل اجازت نہیں ہے۔ اس میں بھی قدرت کی طرف سے بہتری تھی۔ اگر ان کے جواب کا انتظار کیا جاتا اور جواب پھر نفی میں ملتا۔ تو حضرت مدنیؒ کے حکم پر عمل کرنے میں جو خود میری ہی سعادت کا باعث تھا، مزید مجاہدہ کی ضرورت پیش آتی۔

نکاح کے سلسلے میں خط وکتابت

اوپر کی تفصیلات سے اتنی بات واضح ہو چکی کہ نکاح کے اصل محرک حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ انھوں نے نومسلمہ انگریز خاتون مس جینی کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ مولانا عزیر گل صاحب سے نکاح کر لینا تمھارے لیے بہت سعادت کی بات ہوگی۔ چنانچہ نومسلمہ نے مولانا کو نکاح پر آمادہ کرنے کے لیے خط وکتابت شروع کر دی مولانا سیاح الدین صاحب کاکاخیل نے اپنے مقالے میں خط وکتابت کی تفصیل درج کی ہے۔ ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ نکاح کس جذبہ کے تحت کیا گیا۔

مولانا عزیر گل صاحب کی پہلی اہلیہ کی وفات غالباً رجب ۱۳۵۵ھ میں قصبہ دیوبند میں اپنے میکے میں ہوئی۔ مولانا عزیر گل صاحب اس وقت مدرسہ رحمانیہ رڑکی کے کسی کام سے راندیر (گجرات) گئے ہوئے تھے۔ ان کو تار کے ذریعہ اس حادثہ کی اطلاع دی گئی۔ تیسرے دن وہ پہنچ گئے۔ گھر اجڑ چکا تھا، چھوٹے چھوٹے معصوم بچے رہ گئے۔ مولانا نے اس عظیم سانحہ کو بہت صبر واستقامت کے ساتھ برداشت کیا۔ رجب اور شعبان کے دو مہینے گزر جانے کے بعد مولانا مدظلہ دیوبند میں مقیم تھے کہ منگلور سے نُور کا خط آپ کے نام دیوبند آیا جس کا مضمون یہ تھا:

"آپ کی اہلیہ محترمہ کی وفات کے حادثہ کے بعد آپ کا گھر اجڑ گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے رہ گئے ہیں، جن کا سنبھالنے والا گھر میں کوئی نہیں۔ مجبوراً آپ کو گھر آباد کرنے اور بچوں کی خاطر دوسرا نکاح کہیں نہ کہیں کرنا ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ جو بیوی بھی آئے گی وہ ان بچوں کی سوتیلی ماں ہوگی۔ اور سوتیلی ماں کی روش عموماً بچوں کے بارے میں فطری طور پر اچھی

نہیں ہوتی۔ اور پھر اگر اس کی اولاد بھی ہوئی تو ان بچوں کے لیے اور مشکلیں پیش آئیں گی۔ میں اس وقت اسلام قبول کرنے کی وجہ سے آزاد ہوں۔ کسی کے نکاح میں نہیں۔ میری عمر قریباً پچاس برس ہے۔ اس لیے مجھے ویسے نکاح کا کوئی خیال نہیں تھا۔ لیکن اب مجھے یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر جن کو اب تک میں نے اپنے بچوں کی طرح سمجھا تھا، آپ کے نکاح میں آجاؤں، اور آپ کے گھر کو آباد کروں۔ مجھے نہ تو اولاد کی خواہش ہے اور نہ اب میری عمر اولاد پیدا ہونے کی ہے۔ اس لیے میں ان بچوں کے لیے کبھی بھی سوتیلی ماں نہیں بنوں گی۔ بلکہ ان کی پرورش ان کی اپنی ماں کی طرح کروں گی۔ نیز میرا نظریہ یہ بھی ہے کہ میں آپ جیسے شخص کے سایہ میں آجاؤں، اس لیے آپ نکاح کے لیے میری یہ درخواست ضرور قبول کیجیے"

مولانا مدظلہ نے اس خط کے جواب میں انکار لکھا۔ اور انکار کی متعدد وجوہ میں سے چند اہم باتیں یہ لکھیں کہ میرے ہاں پردہ کی بہت زیادہ پابندی ہے اور آپ عمر بھر بے پردہ رہنے کی عادی رہی ہیں، آپ سے اتنی شدید پابندی نہ ہو سکے گی۔ میرا اپنا ذاتی مملوکہ مکان بھی نہیں۔ مدرسہ کے ایک تنگ مکان میں زندگی گذار رہا ہوں ـــــ آپ نے اب تک بڑی بڑی کوٹھیوں اور باغوں اور پارکوں میں ساری زندگی گذاری ہے۔ ایسے مختصر مکان میں بود و باش کس طرح کرسکو گی۔ نیز میری آمدنی بالکل محدود ہے۔ مدرسہ سے معمولی تنخواہ ملتی ہے۔ جس سے آپ کے معیار کے مطابق گذارا بالکل نہیں ہوسکتا۔ انھی وجوہ کی بنا پر میں نکاح کی یہ بات منظور نہیں کرسکتا"

اس خط کے جواب میں اس نے پھر منگلور سے ایک مفصل خط لکھ کر بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ "آپ نے اپنے خط میں جتنی بھی شرطیں لکھی ہیں، وہ سب مجھے منظور ہیں۔ نکاح سے پہلے پردہ کروں گی اور عمر بھر شریعت اسلامیہ کے مطابق پردہ کرتی رہوں گی۔ اس بارہ میں آپ بالکل مطمئن رہیں، ذرہ برابر خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ میں ہر طرح کے مکان میں رہ سکتی ہوں اور ہر طرح کا گذارا کرسکتی ہوں۔ مجھے خوراک، پوشاک یا کسی اچھے معیار زندگی کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ کے بچوں کی صحیح تربیت کروں، اور ازدواجی تعلقات کی بنا پر آپ کا سایۂ شفقت و رحمت میرے سر پر ہو۔ اور میں اس سعادت کے حصول کے لیے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں"

مولانا نے اس خط کے جواب میں مزید اعذار رکھے، اور اس معاملہ کو مختلف طریقوں سے ٹالنا چاہا۔ اس کے بعد کافی دنوں تک مکاتبت ہوتی رہی۔ ان کا اصرار برابر جاری تھا، اور مولانا مدظلہٗ کوئی عذر لکھ کر یا کوئی شرط لگا کر ٹالتے رہے۔ اس کا آخری خط جو اس سلسلے میں مولانا کے نام آیا وہ بہت زوردار، موثر اور فصیح و بلیغ تھا۔ اس میں چند خاص موثر جملے اس مضمون کے تھے۔

"اچھا میں نے آپ کی عائد کردہ تمام شرطیں قبول کیں۔ جو مانع آپ نے بتایا میں نے اسے دور کر دیا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ آپ کے پاس نکاح نہ کرنے کے لیے عذر کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ اس کے باوجود اگر آپ میری اس درخواست کو قبول نہیں فرماتے تو قیامت کے روز اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس بات پر گرفت کرے کہ تو نے اسلام قبول کرنے کے بعد زندگی کے دن کسی خاوند کے سایہ میں رہ کر کیوں نہیں گذارے اور اس لباس کے بغیر کیوں رہی۔ تو میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی طرف سے معذرت پیش کروں گی اور عرض کر دوں گی کہ میں نے تو اپنے لیے ایک بہترین شخص کو منتخب کر کے اس سے نکاح کرنے کی ہر طرح کوشش کی تھی۔ مگر بلا وجہ اس نے انکار کیا۔ اور مجھے اپنے سایہ میں لے آنا قبول نہیں کیا۔ تو آپ ابھی سوچ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ کیا عذر پیش کر سکیں گے"۔

مولانا عزیز گل صاحب کی نکاح پر آمادگی اور عقد نکاح

یہ خط و کتابت انگریزی میں ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا مدظلہٗ خود تو انگریزی لکھ اور پڑھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ان کے مخلص دوست اور خاص معتقد مولانا طفیل احمد صاحب بی اے (جو اُس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں تھے اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں اور بہت سے دینی ادارے قائم کیے ہیں، صاحب ارشاد بزرگ ہیں۔) منگلور سے آنے والے خطوط کا مضمون سنا دیتے تھے اور آپ کی طرف سے پھر جواب میں انگریزی خطوط لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ان سارے خطوط کے مضامین اور موثر انداز میں اصرار اُن کے سامنے تھا، اس لیے اس آخری خط کے بعد انھوں نے بھی اصرار کے ساتھ مولانا کو مشورہ دیا کہ نکاح ضرور کر لیجیے۔ مولانا کے دوسرے مخلصوں اور

خیر خواہوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مولانا عزیر گل صاحب کو نکاح پر آمادہ کرنے میں سب سے زیادہ حصہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا تھا بلکہ نکاح کے اصل محرک حضرت مدنیؒ ہی تھے۔[1]

آخر کار رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ کے آخری ایام میں چند دوستوں کو ساتھ لے کر آپ منگلور تشریف لے گئے۔ "مدر" نے پہلے تو باقاعدہ پردہ کیا۔ اور پھر اس کے بعد مسنون طریقہ سے نکاح پڑھا گیا۔ شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے نکاح پڑھایا۔

نکاح کے بعد

نکاح ہو جانے کے بعد "مدر" نے منگلور کی کوٹھی اور باغیچہ متبنّیٰ لڑکے محمد علی کو دیدیا، جس کو اس نے بچپن سے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اور وہاں سے صرف اپنا عظیم کتب خانہ بیل گاڑی میں لاد کر منگلور سے رڑکی لے آئیں، رڑکی آکر مدرسہ کے چھوٹے سے مکان میں رہائش اختیار کی۔ اس نکاح کے بعد سابق خاوند نے دو سو روپیہ ماہوار کی رقم بند کر دی۔ اور وہ مولانا کی محدود اور معمولی سی آمدنی پر انتہائی تنگی کے ساتھ گزارا کرتی رہیں۔ الغرض خدا کی اس مومنہ بندی نے مومنات قانتات کی طرح اپنی گھریلو زندگی میں ہر طرح کی تنگی ترشی بہ صد خوشی برداشت کی، اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ انھوں نے مولانا کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھ کر ان کی تربیت کا خاص اہتمام کیا

نکاح کا یہ واقعہ غالباً نومبر ۱۹۳۶ء کا ہے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۵ء تک مولانا کا رڑکی ہی میں قیام رہا۔ تنخواہ بہت کم تھی، اخراجات بڑھ رہے تھے۔ ۱۹۳۹ء کے بعد جنگ عظیم دوم کی وجہ سے اشیائے ضرورت کے نرخ بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ اور مدرسہ کی قلیل تنخواہ پر گزارا سخت مشکل ہو رہا تھا۔ آپ نے سوختنی لکڑیوں کی تجارت بھی کی، مگر اس میں بھی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر نو مسلمہ بیوی کے مشورہ سے فیصلہ ہوا کہ رڑکی کے بجائے (صوبہ سرحد میں)

---

[1] مولانا عزیر گل مدظلہ کے بھتیجے مولانا عبداللہ کاکا خیل کے مذکورہ بالا بیان میں اس خط کتابت کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ حضرت مولانا مدنیؒ کے توجہ دلانے کے بعد ہی جنہوں نے مولانا عزیر گل صاحب سے نکاح کے سلسلہ میں اس طرح کی خط و کتابت کی تھی اور اس کے بعد ہی مولانا موصوف آمادہ ہوئے تھے۔ نعمانی

سخاکوٹ منڈی کے پاس اپنی آبائی زمین میں مکان بنوا کر رہائش اختیار کی جائے۔ وہاں سے آکر وقت وفات اکتوبر ۱۹۶۶ء تک وہاں اس چھوٹی سی بستی میں اللہ کی اس بندی نے زندگی کے یہ دن گذارے۔ وہاں وہ دیہاتی عورتوں کا فی سبیل اللہ مفت علاج ہومیوپیتھک طریقہ سے کرتی رہیں، اور ساتھ ہی غریب دیہاتیوں کی ہر طرح کی امداد و اعانت اور خبر گیری کیا کرتی تھیں۔ کسی معاملہ میں اور کسی موقعہ پر بھی اس نے "میم صاحبہ" ہونے کا مظاہرہ نہیں کیا اسلام نے اس کی پوری زندگی اور سیرت و اخلاق میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا تھا۔ اس خاتون کی مومنانہ زندگی دیکھ کر بڑے بڑے اہل اللہ رشک کرتے۔

اکتوبر ۱۹۶۶ء میں طویل بیماری کے بعد اسّی برس سے زائد عمر پا کر اس خوش نصیب نو مسلمہ خاتون کا اسی گاؤں میں انتقال ہوا۔ اور وہاں کے ایک ٹیلہ پر واقع قدیم قبرستان میں درختوں کے جھنڈ میں تدفین عمل میں آئی۔

کہاں پیدا ہوئیں، کہاں پرورش پائی، کہاں کہاں رہیں اور آخر کار کس خاک میں مدفون ہوئیں۔ وفات سے قبل تین چار سال متواتر شدید بیماری میں مبتلا رہیں۔ اس بیماری کے دوران انھوں نے صبر و استقامت اور اعتماد علی اللہ کا ایسا مظاہرہ کیا کہ خاندانی مسلمانوں کو ایسے مظاہر صبر و تقویٰ پیش کرنے کی توفیق کم ملتی ہے۔ اس تیس ۳۰ سال میں انھوں نے اپنی زندگی کا معاشی و معاشرتی معیار حضرت مولانا مدظلہ کی آمدنی کی مناسبت سے بہت معمولی رکھا تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ سلیقہ شعار تھیں، اور ہر معاملہ میں سلیقہ مندی اختیار کرنے سے معمولی آمدنی ہوتے ہوئے بھی عزت و آبرو قائم رہی اور کسی نے کوئی کمی محسوس نہیں کی۔

مومنانہ زندگی

اسلام لانے کے بعد مس جینی کی زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ان کی پوری زندگی اسلامی سانچے میں ڈھل گئی۔ ان کے شب و روز ذکر و عبادت، اور خدمت و مجاہدہ سے معمور تھے وہی خاتون جو بچپن سے آزاد ماحول میں پلی اور بڑھی تھی شرعی پردہ کی اتنی پابند ہو گئی کہ خاص دینی گھرانوں کی خواتین میں بھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

ایک ملاقات کے موقعہ پر مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی نے مجھ سے بیان فرمایا کہ اب سے تقریباً چالیس ۴۰ سال قبل کی بات ہے کہ مولانا عزیر گل صاحب سے میری آخری ملاقات ہوئی، میں سفر میں تھا کسی ٹرین سے مرادآباد کے اسٹیشن پر اترا، یہ فجر کا وقت تھا، پلیٹ فارم پر نماز ادا کی، نماز سے فارغ ہوا تو میری نگاہ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبہ پر پڑی جو پلیٹ فارم کی دوسری جانب کھڑا تھا، مجھے نظر آیا کہ اس میں ہمارے مولانا عزیر گل صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ میں سوچنے لگا یہ مولانا عزیر گل صاحب کے ہم شکل کوئی صاحب ہوں گے کیونکہ مولانا تو ایک معمولی سے عربی مدرسہ کے مدرس ہم ہی جیسے غریب بلکہ درویش آدمی ہیں وہ فرسٹ کلاس میں کیسے سفر کر سکتے ہیں ــــ بہرحال میں اپنا شک دور کرنے کے لیے اس ڈبہ کی طرف بڑھا، قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ ہمارے مولانا عزیر گل صاحب ہی ہیں، میں السلام علیکم کہہ کے بے تکلف ڈبہ کے اندر داخل ہو گیا، مصافحہ اور معانقہ ہوا اور میں ان کے برابر ہی میں بیٹھ گیا، کمپارٹمنٹ کی دوسری سیٹ پر میری نگاہ پڑی تو معلوم ہوا کہ کوئی خاتون ہیں جو سر سے پاؤں تک کا کھدر کا برقعہ پہنے ہوئے لیٹی ہوئی ہیں۔ فوراً میرا ذہن اس طرف گیا کہ ہو نہ ہو یہ مولانا کی نومسلمہ انگریز بیوی ہیں (میرے علم میں یہ بات تھی کہ کسی انگریز خاتون نے اسلام قبول کر کے مولانا سے نکاح کر لیا ہے) میں فوراً نیچے اتر آیا۔ مولانا بھی میرے ساتھ اتر کے پلیٹ فارم پر تشریف لے آئے، اور بات چیت ہوتی رہی۔ مولانا نے بتایا کہ میری ان اہلیہ کی ایک بہن رامپور میں ہیں[1]، انھوں نے اصرار کر کے ان کے ساتھ ہی مجھے بھی بلایا تھا، ہم لوگ وہیں سے آرہے ہیں، انھوں نے فرسٹ کلاس کا یہ پورا ڈبہ رڑکی تک کے لیے رزرو کرا دیا ہے۔ رڑکی کی طرف جانے والی فلاں ٹرین میں یہ جوڑ دیا جائے گا ــــ غالباً اسی ملاقات میں یا کسی دوسری ملاقات میں مولانا نے اپنی ان نومسلمہ اہلیہ کا حال بیان کرتے ہوئے ذکر فرمایا تھا کہ اللہ کی یہ بندی جب نماز کے لیے کھڑی ہوتی ہے تو چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور اکثر آنسو جاری رہتے ہیں۔

(مولانا نعمانی مدظلہ کا بیان ختم ہوا۔)

مولانا سیاح الدین کاکاخیل اپنا چشم دید واقعہ لکھتے ہیں: "مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مولانا رڑکی سے دیوبند تشریف لائے تھے، وہ بھی ساتھ آئی تھیں۔ جب دونوں دیوبند سے

---

[1] یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ ان کی ایک بہن ریاست رامپور کے انگریز ریذیڈنٹ کی بیوی تھیں۔

رڑکی واپس جارہے تھے تو مولانا مدظلہ کے ایک خادم و کفش بردار کی حیثیت سے میں بھی اسٹیشن تک گیا تھا۔ اسٹیشن پر میں نے دیکھا کہ از سرتا قدم نہایت ہی ساتر برقع میں مستور، پوری پابندی کے ساتھ پردہ کئے ہوئے ایک گوشہ میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ دیکھیے خداوند تعالیٰ کی قدرت عظیم کا کرشمہ کہ یہ وہ عورت ہے کہ اسلام قبول کرنے سے قبل کس آزادی اور بے پردگی کے ساتھ ہندوستان بھر کے اسٹیشنوں پر پھری ہو گی اور اب ایمان کی دولت نصیب ہو جانے کے بعد رضائے الٰہی کی خاطر شرعی پابندیوں کو اس نے کس جذبۂ ایمانی کے ساتھ بصد خوشی قبول کیا ہے۔

علمی سرگرمیاں

بیگم مولانا عزیر گل ایک اونچے علمی خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھیں بچپن سے مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا شوق تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندو مذہب (ویدانت) کا بھی مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں مجاہدات کیے لیکن قرآن کا ایک بار مطالعہ کرنے کے بعد ان کا دل اسلام کی حقانیت کا قائل ہو گیا۔ اسلام لانے کے بعد تو قرآن ہی اُن کے مطالعہ و تحقیق کا خاص موضوع بن گیا۔ قرآن فہمی کے بارے میں انھوں نے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عزیر گل مدظلہ سے کافی استفادہ کیا۔ مولانا سراج الدین کا خیال لکھتے ہیں

"انھوں نے انگریزی زبان میں محققانہ انداز سے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تفسیری نوٹ بھی لکھے ——— اس ترجمہ و تفسیر کے دوران حضرت مولانا کے ساتھ علمی مذاکرہ رہتا تھا۔ بحث و تحقیق ہوتی تھی۔ اور اس کے بعد نتیجہ میں جو آخری اور قطعی رائے قائم ہو جاتی اس کی روشنی میں قرآن مجید کے مطالب صاف و سلیس اور فصیح و بلیغ انگریزی میں لکھ لیتی تھیں۔ وہ تفسیر مکمل ہو گئی تھی۔ اور اس زمانہ میں بمبئی کی ایک طابع و ناشر کمپنی کو طباعت و اشاعت کے لیے حوالہ کر دی تھی۔ ... ...

... ... اس ترجمہ و تفسیر کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ جناب افتخار فریدی صاحب مرادآبادی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مولانا عزیر گل کے بعض اعزا کے پاس اب بھی

یہ ترجمہ و تفسیر پاکستان میں موجود ہے۔ (غالبًا اُس کی محفوظ کاپی ہوگی)

محترمہ نے انگریزی زبان میں اسلام اور عیسائیت کے بارے میں ایک کتاب (صراط مستقیم) لکھی تھی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں مشہور علمی اشاعتی ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے یہ کتاب شائع ہوئی اور مدتوں تک ماہنامہ برہان میں اس کتاب کا اشتہار آتا رہا۔

حرفِ آخر

یہ ایک ایسی خاتون کی مختصر سرگزشتِ حیات ہے جس نے محض حق کی خاطر اپنے خاندان، وطن، عیش و آرام، مال و دولت سب کو قربان کر دیا۔ شاہی خاندان کے ناز و نعم میں پلی ہوئی خاتون نے اُخروی سعادت و سرخروئی پر دنیا کی تمام آسائشوں کو قربان کر دیا۔ اسلام لانے کے بعد اس نے گمنامی کی زندگی گزاری۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو اُنھیں ان حالات کی اشاعت بھی ناگوار ہوتی۔ ان کی داستانِ حیات کو اس لیے شائع کیا جا رہا ہے تاکہ گمراہی میں پھنسے ہوئے لوگوں کو حق کو اختیار کرنے اور اس کا اظہار کرنے کی جرأت ہو۔ اور اہل ایمان کے اعتقاد و یقین میں پختگی اور تازگی پیدا ہو اور خاندانی اور پشتینی مسلمان سبق حاصل کریں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ ھُوَ شَھِیْدٌ ۝

محمد منظور نعمانی

بابا رتن الہندی

الفرقان کے نومبر کے شمارہ میں بابا رتن ہندی پر ایک مضمون شائع ہو چکا ہے اس سے مندرجہ ذیل باتیں ناظرین کے علم میں آچکی ہیں۔

(۱) بابا رتن ہندی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قریباً چھ سو سال کے بعد، ہمارے اسی ملک ہندوستان میں ساتویں صدی ہجری میں ظاہر ہوئے[1]

(۲) انھوں نے دعویٰ کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا ہے اور تین دفعہ ملک حجاز جا کر آپ سے ملاقات کی ہے اور آپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا ہوں، میں پہلی دفعہ مکہ معظمہ اپنے والد کے ساتھ تجارت کے سلسلہ سے اُس زمانہ میں گیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمسن بچے تھے اور اونٹ چراتے تھے۔ میں نے آپ کو مکہ کی ایک وادی میں اونٹ چراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اتفاق سے اُس وقت تیز بارش ہو گئی جس کی وجہ سے وادی میں سیلاب کا پانی بھر گیا۔ میں نے دیکھا کہ اونٹ چرانے والا بچہ گھبرا گیا ہے وہ سیلاب کے پانی کو عبور نہیں کر سکتا تو میں نے اس کو اٹھا کر سیلاب سے باہر اس کے اونٹوں کے پاس پہنچا دیا ——— اُس بچہ نے مجھے درازی عمر کی دعا دی ——— پھر میں اپنے والد کے ساتھ اپنے ملک اور وطن واپس آگیا۔

پھر ایک طویل مدت کے بعد (قریباً ۳۰۔۴۰ سال کے بعد) جبکہ میں اپنے گھر پہ تھا اور مہینے کی چودھویں رات تھی، پورا چاند روشنی پھیلا رہا تھا کہ اچانک۔۔ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے، ایک مشرق کی طرف چلا گیا اور ایک مغرب کی طرف، پھر کچھ دیر بعد وہ دونوں

[1] مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے "نخبۃ دخائر" کے حوالہ سے ان کا وطن بھٹنڈا لکھا ہے، جو پنجاب کا مشہور شہر ہے (نزہۃ الخواطر ج۱، ص۱۲۰)

ٹکڑے آکر مل گئے اور چاند ویسا ہی ہوگیا جیسا تھا۔ میں نے خاص کر مسافروں اور سیاحوں سے اس واقعہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عرب کے شہر مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے ـــــ اُس کی قوم نے اس سے فرمائش کی تھی کہ اگر تم سچے نبی ہو تو چاند کو حکم دو کہ وہ دو ٹکڑے ہو جائے، اس نے ایسا ہی کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ پھر اُن لوگوں نے کہا کہ اب ان ٹکڑوں کو جوڑ کے ایک کردو۔ اُس نے یہ بھی کر کے دکھا دیا۔ یہ سنکر مجھے اُس شخص کی ملاقات کا اشتیاق ہوا۔ میں نے کچھ سامانِ تجارت لے کے مکہ کی طرف سفر کیا اور وہاں جا کر آپ سے ملا ـــــ میں نے تو آپ کو نہیں پہچانا لیکن آپ نے مجھے پہچان لیا اور فرمایا کہ تم وہی شخص تو ہو جس نے مجھے اٹھا کے سیلاب کے پانی سے نکالا تھا ـــــ اس وقت آپ کے سامنے کھجوروں کا ایک طبق رکھا تھا اور آپ کھجوریں تناول فرما رہے تھے، مجھے بھی آپ نے چند کھجوریں کھلائیں ـــــ اسی ملاقات میں آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور کلمۂ شہادت کی تلقین فرمائی، میں کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام لے آیا ـــــ آپ نے اس موقعہ پر بھی مجھے درازیٔ عمر کی دعا دی۔

تیسری ملاقات کے بارہ میں بابا رتن نے بیان کیا ہے کہ ہجرت کے کئی سال بعد جب غزوۂ خندق ہوا ہے تو اس وقت میں نے مدینہ منورہ پہونچکر آپ سے ملاقات کی۔

(۳) بابا رتن نے ان ملاقاتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی بہت سی حدیثیں" بھی روایت کی ہیں۔ جن کو "رتنیات" کہا جاتا ہے۔

(۴) کچھ لوگوں نے ان کے اِن دعووں اور ان باتوں کی تصدیق کی اور ان کی روایت کردہ "حدیثوں" یعنی رتنیات کی روایت بھی کی ہے۔

(۵) کچھ حضرات نے اُن کی اِن باتوں کو سراسر افترا پردازی اور خالص جھوٹ قرار دیا ہے اور اُن کے لیے، کذّاب و دجّال اور ابلیس جیسے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔

نومبر کے شمارہ میں شائع ہونے والے مضمون میں یہ سب باتیں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی کتاب "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" اور مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی "نزہتہ الخواطر" کے حوالہ سے لکھی گئی ہیں۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) کی کتاب "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" صحابہ کرام کے تذکرہ اور تعارف میں جامع ترین اور سب سے زیادہ منقح اور مستند کتاب ہے انھوں نے اس کے دیباچہ میں اُن تمام کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اُن کے زمانے (نویں صدی ہجری) تک صحابہ کرام کے تذکرہ میں لکھی گئیں اور اُن کے علم میں آئیں اور اُن کو انھوں نے قابل ذکر سمجھا —— اس سلسلہ میں سب سے آخر میں انھوں نے نقد رجال اور جرح و تعدیل کے مشہور امام حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) کی تالیف "تجرید" کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ذہبی کے دور تک یعنی آٹھویں صدی تک صحابہ کرام کے تذکرہ میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں۔ اُن میں سے کسی میں بھی "بابا رتن ہندی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے —— اس سلسلہ میں سب سے پہلے حافظ ذہبی ہی نے "تجرید" میں ان کا ذکر کیا ہے —— حافظ ابن حجر "الاصابہ" میں رقمطراز ہیں کہ

رتن —— ولم اجد له فی المتقدمین فی کتب الصحابه ولا غیرهم ذکراً لکن ذکره الذهبی فی تجریده فقال "رتن الهندی شیخ ظهر بعد ستمائة بالشرق وادّعی الصحبة فسمع منه الجهال ولا وجود له بل اختلق اسمه بعض الکذابین وانما ذکرته تعجباً کما ذکر ابوموسی سرباتک الهندی"[1]

صحابہ کے تذکرہ میں لکھی ہوئی متقدمین کی یا دوسرے لوگوں کی کسی کتاب میں میں نے اس شخص (بابا رتن) کا ذکر نہیں دیکھا۔ لیکن ذہبی نے اپنی کتاب "تجرید" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ —— "رتن الہندی" ایک بوڑھا شخص تھا جو چھٹی صدی ہجری کے بعد مشرق میں (یعنی ہندوستان میں) ظاہر ہوا تھا اور اس نے صحابیٔ رسول ہونے کا دعویٰ کیا تھا تو کچھ جاہلوں نے (اس کو اس دعوے میں سچا سمجھ کر) اس سے (اگلی

[1] الاصابہ فی تمییز الصحابہ - طبع مطبعۃ السعادۃ، مصر (۱۳۲۳ھ) جلد ثانی ص ۲۲۵

بیان کی ہوئی روایتیں ہیں ۔ یا ہو سکتا ہے کہ اس کا نام بعض کذابین نے گھڑا ہو (فی الواقع اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو) میں یہاں اس کا ذکر صرف اظہار تعجب کے لیے کر رہا ہوں جس طرح ابو موسیٰ مدینی نے صحابہ سے متعلق اپنی کتاب میں "سرباتک ہندی" کا ذکر کیا ہے[1]۔ (حالانکہ وہ بھی ایک گھڑا ہوا افسانہ ہے۔)

حافظ ذہبی نے اپنی دوسری کتاب "میزان الاعتدال" میں بھی (جس کا موضوع ہی راویان حدیث کی جرح و تعدیل ہے) بابا رتن کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اُن کے الفاظ یہ ہیں۔

رتن الهندی، وما ادراک ما رتن شیخ دجّال بلا ریب ظهر بعد الستمائة فادعی الصحبة والصحابة لا یکذبون، وهٰذا جرئ علی الله ورسوله، وقد الفت فی امره جزءًا، وقد قیل انه مات سنة اثنتین وثلثین وستمائة، ومع کونه کذّابًا فقد کذبوا علیه جملة کبیرة من اسمج الکذب (میزان الاعتدال ص۴۲)

رتن ہندی! اور تم کو کچھ خبر ہے کہ یہ رتن ہندی کیا تھا اور کیسا تھا؟ یہ ایک بوڑھا دجّال تھا، اس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ شخص چھٹی صدی ہجری کے بعد ظاہر ہوا، اور دعویٰ کیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، میں حضور کا صحابی ہوں — حالانکہ صحابہ کرام ہرگز جھوٹ نہیں بولتے، اور یہ شخص "بابا رتن" اللہ و رسول سے متعلق

---

[1] ابن اثیر جزری نے "اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ" میں ذکر کیا ہے کہ ابو موسیٰ مدینی نے اپنی کتاب میں ایک شخص اسحاق بن ابراہیم طوسی سے نقل کیا ہے کہ میں ہندوستان میں قنوج کے راجہ "سرباتک" سے ملا تھا (جو بہت بوڑھا تھا) اور مسلمان تھا وہ اپنی عمر نو سو پچیس ۹۲۵ سال بتلاتا تھا اور کہتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خط دے کر اپنے نو صحابیوں کا ایک وفد میرے پاس بھیجا تھا۔ اس خط میں مجھے اسلام لانے کی دعوت دی گئی تھی تو میں نے اس کو قبول کر لیا اور اسلام لے آیا تھا یہ قصہ نقل کرنے کے بعد ابن اثیر نے لکھا ہے کہ میں اس کو صرف اس لیے نقل کر رہا ہوں کہ ابو موسیٰ مدینی نے اسکا ذکر کر دیا تھا، ورنہ یہ کہانی ذکر کے قابل نہیں تھی۔ (اسد الغابہ ص۲۶۶ ج۲ مطبوعہ جمعیۃ المعارف مصر) حافظ ذہبی نے اسی کے بارہ میں لکھا ہے کہ ابو موسیٰ مدینی نے "سرباتک" کے اس افسانہ کا ذکر اظہار تعجب اور عبرت کے لیے کیا ہے اسی طرح میں رتن کے قصہ کا ذکر کر رہا ہوں۔

---

[2] جو میرے نزدیک ایک گھڑا ہوا افسانہ ہے۔ [3] میزان الاعتدال طبع لکھنؤ ص۲۹۹ ج۱

جھوٹ بولنے میں سخت بیباک ہے ـــــ اور میں نے اس بوڑھے دجال کے بارہ میں ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے ـــــ اور کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ اس کا انتقال ۶۳۲ھ میں ہوا ـــــ اور باوجودیکہ وہ خود بہت جھوٹ بولنے والا تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اُس کے بارہ میں نہایت بیہودہ قسم کی گپیں اڑائی ہیں اور ایسی باتیں بیان کی ہیں جو محالات کے قبیل سے ہیں۔

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "بابا رتن ہندی" کے بارہ میں حافظ ذہبی نے کوئی مستقل رسالہ بھی لکھا تھا ـــــ "میزان الاعتدال" کی یہ عبارت حافظ ابن حجر نے "الاصابہ" میں بھی لفظ بہ لفظ نقل کی ہے [1] ـــ اس کے بعد لکھا ہے کہ

وما زلت اطلب الجزء المذکور حتی ظفرت بہ بخط مؤلفہ فکتبت منہ ما امرتہ ھھنا [2]	اور مجھے (بابا رتن سے متعلق) حافظ ذہبی کے لکھے ہوئے اس رسالہ کی برابر تلاش رہی جس کا انھوں نے اس عبارت میں ذکر کیا ہے یہاں تک کہ مجھے خود مولف (حافظ ذہبی) کے قلم کا لکھا ہوا، وہ رسالہ حاصل ہو گیا

اس میں سے میں نے جو کچھ یہاں لکھنا چاہا وہ انھی کے الفاظ میں لکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد قریباً پونے دو صفحہ میں حافظ ابن حجر نے حافظ ذہبی کے اس رسالہ کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس رسالہ میں انھوں نے شروع میں "رتنیات" یعنی وہ روایتیں نقل کی ہیں جو ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں بعض لوگ مختلف واسطوں اور سندوں سے "بابا رتن" کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بتا کر روایت کرتے تھے ـــــ ان میں سے دو چار نمونے کے طور پر آپ بھی پڑھ لیں۔

قال رتن حضرت فی زفاف فاطمۃ وجماعۃ من الصحابۃ وکان ثم من یغنی شیئاً فطابت	بابا رتن نے بیان کیا کہ میں حضرت فاطمہ کی رخصت کی تقریب میں شریک تھا اور صحابہ کی ایک جماعت بھی موجود تھی اور وہاں

[1] [2] الاصابہ ج ۲ ص ۲۲۵

قلوبنا ورقصنا فلما کان الغد سألنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم عن لیلتنا فدعا لنا ولم ینکر علینا فعلنا ۱؎

کوئی گانے والا تھا جو کچھ گا رہا تھا تو ہمارے دلوں میں بڑا سرور و وجد پیدا ہوا اور (اس سرور و سرمستی کی حالت میں) ہم ناچے۔ پھر جب اگلا دن آیا تو ہم نے آپ سے اس ناچ گانے کے بارہ میں دریافت کیا جو رات کو ہم نے کیا تھا تو آپ نے ہم کو دعا دی اور ہمارے فعل کو آپ نے غلط نہیں بتایا۔

یہ رتنی حدیث حافظ ذہبی نے چالیس "حدیثوں" کے اُس مجموعہ کے حوالہ سے نقل کی ہے جس کو "رتنیات" کے خاص راوی محمد ابو القاسم کاشغری نے تاج الدین محمد ابن احمد خراسانی کے واسطے سے ابو الفتح موسیٰ بن مجلی صوفی سے روایت کیا ہے، جو براہِ راست "رتن" سے روایت کرتے ہیں، گویا اُن کے "تابعی" ہیں۔

حافظ ذہبی نے "رتنیات" کے ایک دوسرے مجموعہ سے بھی جس میں بابا رتن کی روایت کی ہوئی تین سو حدیثیں جمع کی گئی تھیں چند رتنی حدیثیں نقل کی ہیں، ان میں مندرجہ ذیل حدیثیں بھی ہیں۔

ما من عبد یبکی یوم اصیب ولدی الحسین الا کان یوم القیمۃ مع اولی العزم من الرسل ۲؎

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) جو بندہ اس دن روئے گا جس دن میرے بیٹے حسین شہید کیے گئے، وہ قیامت کے دن انبیائے اولو العزم کے ساتھ ہوگا

البکاء فی یوم عاشوراء نور تام یوم القیمۃ ۳؎

(اور حضور نے فرمایا) عاشورائے محرم کے دن رونے کا اجر و ثواب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن اس رونے والے کو نورِ تام حاصل ہوگا۔

من اعان تارک الصلوٰۃ بلقمۃ فکانما اعان علی قتل الانبیاء کلّھم ۴؎

(اور آپ نے فرمایا) جس کسی نے ایک لقمہ سے بھی کسی بے نمازی کی امداد کی تو اُس نے اتنا بڑا گناہ کیا کہ گویا اللہ کے تمام پیغمبروں

۱؎ ۲؎ ۳؎ ۴؎ الاصابہ ص ۲۲۶/۲۲

ظاہر ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دین کے علم و فہم کا کچھ بھی حصہ عطا فرمایا ہوگا وہ ان خرافات کو سنکر یہی کہے گا کہ ـــــ اِنْ ھٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ" (یہ سب جھوٹ تراشی ہوئی باتیں ہیں) اور "سُبْحَانَكَ ھٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ" (خداوندا تیری ذات پاک! یہ خرافات (تیرے سچے رسول پر) سراسر بہتان ہے)۔

حافظ ذہبی نے اپنے رسالہ میں یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سی "رتنیات" نقل کرنے کے بعد اس سلسلہ میں جو اصولی کلام کیا ہے ہم کسی قدر تلخیص و توضیح کے ساتھ اُس کا صرف ترجمہ ذیل میں پیش کر رہے ہیں ـــــ فرماتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ یہ خرافات (یعنی بابا رتن کے نام اور ان کی روایت سے چلی ہوئی یہ جعلی حدیثیں) اسی جاہل شخص موسیٰ بن مجلی صوفی کی گھڑی ہوئی ہیں (جو اپنے کو ان کا تابعی بتلاتا ہے اور ان کے حوالہ سے یہ حدیثیں روایت کرتا ہے) یا پھر ان کو اُس شخص نے وضع کیا اور گھڑا ہے جس نے بابا رتن کا پورا افسانہ گھڑا ہے جبکہ سمجھا جائے کہ فی الحقیقت اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا ـــــ اور اگر ہم اس بات کو صحیح مان لیں کہ "بابا رتن" نام کا کوئی شخص ساتویں صدی ہجری میں فی الواقع ظاہر ہوا تھا اور اُس نے مذکورہ بالا باتوں کا دعویٰ کیا تھا، تو پھر ہم سمجھیں گے کہ فی الحقیقت وہ شیطان تھا جو لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک بوڑھے آدمی کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور صحابیت کا دعویٰ کیا تھا اور آپ کی طرف نسبت کر کے یہ خرافات بیان کی تھیں ـــــ یا پھر ہم یہ سمجھیں گے کہ وہ کوئی سخت گمراہ اور نا خدا ترس بوڑھا آدمی ہی تھا جس نے خود ہی گھڑ گھڑ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے یہ گمراہ کن خرافاتی باتیں بیان کیں اور ارشادِ نبوی "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" کے مطابق جہنم میں اپنا ٹھکانا بنایا۔

آگے امام ذہبی فرماتے ہیں:-

یہ رتنیات (بابا رتن کی روایت سے نقل کی جانے والی یہ جعلی حدیثیں) اپنے مضامین کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ، اگر امت کے سلف صالحین میں سے بھی کسی کی طرف ایسی خرافی باتیں

منسوب کی جاتیں تو ہم اُن کو اِن خرافات سے بری قرار دیتے اور ہرگز اُن کی طرف اِن باتوں کی نسبت کو صحیح تسلیم نہ کرتے۔ چہ جائیکہ اِن خرافات کی نسبت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جائے ۔۔۔ لیکن افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ بے علم صوفی ایسی واہیات خرافات باتوں کی روایت کرتے رہے ہیں ۔۔۔ اور اِن "رتنیات" کی روایت کا سلسلۂ اسناد ۔۔۔ یعنی کاشغری۔ طیبی۔ موسیٰ بن مجلی۔ رتن یہ "سلسلۃ الذہب" نہیں بلکہ "سلسلۃ الکذب" ہے۔

اس کے آگے حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ

یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ یہ بابا رتن ہندی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات اور صحابیت کا دعویٰ ساتویں صدی ہجری میں کیا، آپؐ کے عہد مبارک سے لیکر ساتویں صدی تک پورے چھ سو سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک کہاں بند رہا کہ عرب و عجم میں کہیں کسی کو اس کا پتہ نہیں چلا، کسی علاقہ کے لوگوں نے اس کا ذکر بھی نہیں سنا ۔۔۔ اگر لوگوں کو اس کے بارہ میں معلوم ہوتا تو یقیناً دور دراز سے سفر کر کے اُس کے پاس پہنچتے .... فاتحِ ہندوستان محمود سبکتگین کو بھی اس اعجوبۂ روزگار (ہندوستانی صحابی) کا کچھ پتہ نہیں چلا .... اس دور کی لکھی ہوئی تاریخیں بھی موجود ہیں لیکن کوئی مورخ اس عجیب وغریب شخصیت کا ذکر نہیں کرتا ۔۔۔ (حالانکہ اس طرح کے عجائبات و نوادرات کا ذکر اہل تاریخ خاص طور سے کرتے ہیں۔

اس کے بعد حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔

تو جب صورت حال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے بعد سے، دن رات، مہینے اور سال اور پھر صدیوں پر صدیاں گزرتی رہیں اور چھ سو سال تک کسی نے اس شخص (بابا رتن) کا نام بھی نہیں سنا، نہ کسی سیاح یا مورخ یا مصنف نے اس کا تذکرہ کیا (حالانکہ اس سے کئی سو سال پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور اسلام ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گیا تھا اور اِن دنوں میں تاریخیں لکھی جا رہی تھیں) تو ایسی صورت میں ساتویں صدی ہجری میں کسی شخص

کا ایک دم نمودار ہو کر یہ دعویٰ کرنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے بار بار ملاقات کی ہے، اور آپ کے ہاتھ پر شرف باسلام ہوا ہوں، اور میں غزوۂ خندق کے موقعہ پر آپ کے ساتھ تھا۔ اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی رخصتی کی تقریب میں بھی شریک ہوا تھا، کیونکر قابل قبول ہو سکتا ہے۔

آگے حافظ ذہبی کہتے ہیں

میں قسم کے ساتھ کہتا ہوں کو اس شخص (بابا رتن) کے صحابی رسول ہونے کے دعوے کو وہی لوگ (یا دین کے علم و فہم اور عقل و خرد سے محروم اُن جیسے لوگ ہی) قبول کریں گے جو شیعوں کے بارھویں امام محمد بن الحسن کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ (قریباً ۱۲ سو سال سے) ایک غار میں چھپے ہوئے ہیں، اور ایک وقت وہ اپنے غار سے نکل کر دنیا بھر میں عدل و انصاف کی حکومت قائم کریں گے ـــــ اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) قیامت سے پہلے پھر اس دنیا میں واپس آئیں گے۔ اور جو لوگ عقل و خرد سے اتنے محروم اور بے بہرہ ہوں اُن کا کوئی علاج نہیں۔ (اولٰئک لا یوشر فیہم علاج)

آخر میں اس بحث کو ختم کرتے ہوئے حافظ ذہبی کہتے ہیں۔

اور صحیحین بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے ایک رات میں ارشاد فرمایا تھا۔

ارئیتم لیلتکم ھٰذہ فانہ علی رأس مائۃ سنۃ لا یبقی علی وجہ الارض ممن ھو الیوم علیہا ــــ فانقطع المقال وماذا بعد الحق الا الضلال[1]	کیا تمہیں آج کی اس رات کی خصوصیت و اہمیت کچھ معلوم ہے (اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے) کہ روئے زمین پر آج جو لوگ زندہ اور موجود ہیں، سو برس پورے ہونے پر ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔

(اس لیے اس حدیث نبوی کی رو سے بھی بابا رتن کے افسانہ کے جھوٹ ہونے میں کوئی شک شبہ نہیں) بس بات ختم ہو گئی۔ وماذا بعد الحق الا الضلال۔

[1] الاصابہ $\frac{227}{22}$

بابارتن سے متعلق ہم نے حافظ ذہبی کا جو کلام (تلخیص کے ساتھ) یہاں نقل کیا ہے وہ اُن کے اس رسالہ کے حوالہ سے جو انھوں نے "بابارتن ہندی" کے متعلق لکھا تھا (جس کا ذکر) انھوں نے میزان الاعتدال میں بھی کیا ہے، حافظ ابن حجر نے تلخیص کے ساتھ "الاصابہ" میں نقل کیا ہے —— اور اُس کے کسی جزء سے بھی انھوں نے اپنا اختلاف ظاہر نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی حافظ ذہبی کی رائے سے پورا اتفاق ہے —— بلکہ حافظ ابن حجر نے "الاصابہ" ہی میں اسی سلسلہ کلام میں آگے ایک دو ایسے صاحبوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے بابارتن کے بارہ میں حافظ ذہبی کی رائے سے اختلاف کیا تھا، لیکن حافظ ابن حجر نے ان کے اختلاف اور اعتراض کو غلط قرار دیا ہے اور حافظ ذہبی کی طرف سے جواب دہی کی ہے، (اس کی پوری تفصیل ناظرین کے سامنے انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آجائے گی۔

بہرحال "الاصابہ" میں بابارتن کے تذکرہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ حافظ ابن حجر نے بابارتن کے دعوائے صحابیت کو تسلیم کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

جلد (۴۷) | بابت فروری ۱۹۷۹ء مطابق ربیع الاول ۱۳۹۹ھ | شمارہ (۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۵ تاریخ تک آجانا چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ پچیس روپے ہندوستانی سکہ میں بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں — یا پاکستانی سکہ میں تیس روپے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ اسٹریلین بلڈنگس لاہور کو بھیج دیں۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمن سنبھلی
(مقیم حال لندن)

بالآخر شاہ ایران بھی گئے، جن کا شمار دنیا کے چند مضبوط ترین بادشاہوں میں تھا اور جنھوں نے "اپنے تخت کی حفاظت کے لیے بقول ایک برطانوی اخبار کے" وہ سب کچھ کر رکھا تھا جو موجودہ مغربی سیاست کا باوا آدم میکاویلی بتا سکتا تھا!" ——— اور اس سے زیادہ عبرت کی بات یہ ہے کہ ان کا یہ جانا ایک ایسے فردِ واحد کے مقابلے میں شکست کھا کر ہوا ہے جسے انھوں نے پندرہ سال سے جلا وطن کر رکھا تھا۔ ———

ایک جلا وطن نے بادشاہ کو جلا وطن کر دیا۔ اور تاجِ خسروی کُلاہِ قلندری سے مات کھا گیا۔

کوئی حربہ اور کوئی حیلہ نہ تھا جو شاہ نے اپنی برقراری کے لیے خوب خوب آزما نہ لیا ہو۔ مہینوں وہ ہر وہ داؤں کھیلتے رہے جو ان کے اور ان کے مشیروں کے خیال میں انھیں ہارے بچا سکتا تھا۔ لیکن "وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَقْدُورًا" ہر داؤں ہارتے ہارتے وہ آخر کو ہمت بھی ہار ہی گئے۔ اور قبل اس کے کہ تخت و تاج کے ساتھ جان بھی ہاریں ملک چھوڑنے کے فیصلے پر گامزن ہو گئے۔

ملک ایک دفعہ انھوں نے کچھ ایسے ہی مخالف حالات میں جان بچانے کے لیے پہلے بھی چھوڑا تھا، جس کے چند ہی دن بعد انھیں فاتحانہ واپسی کا موقع بھی مل گیا، لیکن ——— غیب کا حال تو اللہ جانے ——— بظاہر اس دفعہ کے اور اُس دفعہ کے چھوڑنے میں بڑا فرق ہے۔ اس دفعہ بظاہر واپسی کے آثار نہیں ہیں۔

ایران کے اس قضیے کے بہت سے پہلو ہیں۔ سب سے پہلی بات جو عالم اسلام کی ایک مشترک سی اور نہایت ہی رسوا کن خصوصیت بن گئی ہے، یہ ہے کہ یہاں اقتدار کی تبدیلی پُرامن اور آئینی ذرائع سے نہیں ہوتی یا تو فوج کا کوئی عنصر بندوق کے زور سے ——— کبھی دکھا کر اور کبھی چلا کر ——— اقتدار کا تختہ الٹتا ہے اور یا عوام اپنا خون بہا کر کسی حکمراں سے آزادی حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے حکمراں، الا ماشاء اللہ، سبھی چیزوں میں مغرب کی نقالی کرتے ہیں، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اسی معاملہ میں وہ مغرب کی نقل کیوں نہیں کر سکتے؟ واقعہ تو یہ ہے کہ آئینی حکومت اور عوام کی رائے سے حکمراں کا انتخاب اور اس کی معزولی کا اصول تو سب سے پہلے اسلام ہی نے قائم کیا اور برت کے دکھایا۔ لیکن اس اصول کی اسلامیت اگر بدقسمتی سے اپیل نہیں بھی کرتی تو مغربی دنیا میں اس اصول کے عمومی رواج ہی سے اس کی پیروی کم از کم گوارا ہو ہی جانی چاہیے۔ اقتدار اگر بڑے ذائقہ کی چیز ہے تو صرف مسلم حکمرانوں ہی کے لیے تو نہیں ہے، مغربی سیاست دانوں کے لیے بھی اس میں اتنی ہی لذت ہے۔ مگر وہ اس لذت سے چمٹے رہنے کی کوشش میں رائے عامہ کو کم از کم کھلے طور پر پامال نہیں کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اگر ہٹنا پڑا تو کل پھر آ گئے۔ مگر ہمارے یہاں مصیبت یہ ہے کہ جب تک مار کر اور دھکے دے کر نہ نکالا جائے کسی اصول اور ضابطے کے تحت اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے۔ چنانچہ خون خرابہ بھی ہوتا ہے اور آئندہ واپسی کا کوئی امکان بھی نہیں رہتا۔

اور مغرب ہی کے مقابلہ سے نہیں بلکہ خود مشرق میں بھی جب ایسی مثالوں پر نظر جاتی ہے تو دل کڑھ کے رہ جاتا ہے کہ دو سال پہلے قریباً ایک ہی وقت میں ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ جنرل الیکشن ہوا۔ لیکن پاکستان میں حکمراں جماعت نے الیکشن بہرحال جیتنے کے لیے دھاندلی اور اندھیر گردی کا وہ ریکارڈ قائم کیا کہ اور تو اور الیکشن کمیشن بھی اسے ایک واقعہ ماننے پر مجبور ہو گیا۔ دوسری طرف ہندوستان میں کوئی ایک شکایت ایسی سننے میں نہیں آئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ مہینوں تک احتجاجی تحریک پاکستان میں چلی، جان و مال کی بے پناہ بربادی ہوئی اور ساتھ ہی، بھٹو صاحب بھی بظاہر ہمیشہ کے لیے گئے۔ جبکہ اندرا گاندھی آج بھی ہندوستان کی کئی ریاستوں پر حکومت کر رہی ہیں اور مرکزی حکومت پر واپسی کے لیے کم از کم جدوجہد کا

میدان پوری طرح اُن کے لیے کھلا ہوا ہے —— اِس کھُلی بے عقلی کو ایک عذابِ الٰہی کے سوا اور کیا کہا جائے؟ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ (انھوں نے اللہ کو بھلایا تو اللہ نے اُنھیں اُن کا آپا ہی بھلا دیا۔ خود اپنے لیے اچھے اور بُرے کا شعور تک اُنھیں نہ رہا۔)

شاہ ایران یقیناً اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے کہ کم از کم اُن کے ملک کا باشعور طبقہ اُن سے سخت ناراض اور بیزار ہے۔ اور یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اب شہنشاہیت کا زمانہ نہیں رہا۔ اب اگر کسی شاہی اور شہنشاہی کے لیے گنجائش ہے تو وہ آئینی شاہی اور شہنشاہی ہے۔ عملی اختیارات اور حکمرانی والی شاہی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا اپنی اور اپنے خاندان کی قبر کھودنا ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنے تحفظ کا راستہ پہلی شکل میں اختیار کرتے اور اپنی بادشاہت کو آئینی بادشاہت بنانے والے اقدامات کرنے لگتے تو بظاہر وہ اپنا تخت و تاج محفوظ رکھ سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے مستقبل کو درپیش خطرات پر قابو پانے کے لیے فوج کی وفاداری اور امریکہ و برطانیہ کی پشت پناہی کے بل پر وہ اقدامات کیے جن سے اُن کی علی الاطلاق اور مکمل حکمرانی کا رنگ کچھ پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا۔ اور پھر اُنھیں ہوش اس وقت آیا جب ملک میں کسی ہلکی سے ہلکی آئینی بادشاہت کو بھی قبول کیے جانے کا وقت گزر چکا تھا۔

ایک رائے یہ ہے۔ اور یہ بالکل واقعہ بھی ہو سکتی ہے —— کہ شاہ کا رویہ اقتدار کی لذت اور تخت و تاج کی حفاظت ہی کے لیے نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس اندیشے کے پیش نظر تھا کہ اُن کے ہٹنے یا نام کا بادشاہ بن کر رہنے سے ایران ہی کا نہیں بلکہ اس پورے خطّے کا سیاسی نقشہ، جس میں ایران واقع ہے، نہایت تباہ کن تبدیلی سے دوچار ہو جائے گا، اس لیے وہ اپنے اقتدار کی حفاظت اور اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے جو کچھ بھی کر رہے تھے وہ دراصل ایک ذاتی جذبہ سے کہیں زیادہ قومی اور قومی سے بھی آگے بڑھ کر پورے خطہ سے متعلق اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے تھا۔ ایران روس کا پڑوسی ہے اور روس کی ہمیشہ سے اُس پر نگاہ رہی ہے۔ یہاں اگر روس کو اثر و نفوذ کا موقع مل جاتا ہے تو مشرق وسطیٰ کے علاقے میں بسنے والی

پوری اسلامی دنیا کا دروازہ اُس پر کھل جاتا ہے۔ اور اس کے نتائج کو بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ پس یہی چیز تھی جو شاہ کو ہر قیمت پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے مجبور کرتی تھی

جیسا کہ ہم نے کہا یہ رائے عین حقیقت ہو سکتی ہے۔ مگر نیت اچھی ہونے کی صورت میں بھی طریقۂ کار اس قدر غلط تھا کہ اس سے سوائے اس نتیجے کے جو برآمد ہوا کسی دوسری بات کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ زمانہ تو نام کی بادشاہت کو بھی برداشت نہ کیے جانے کا ہے چہ جائیکہ بادشاہ اپنی علی الاطلاق حکمرانی اور سخت گیری میں ترقی کرتا جا رہا ہو۔ واقعی اگر شاہ کے سامنے اپنے اقتدار کی حفاظت کا نہیں بلکہ علاقے کی خیر و عافیت کا مسئلہ تھا تب تو اُن کے لیے بس ایک ہی نیک راہ تھی کہ آئینی بادشاہت پر راضی ہونے کا فیصلہ کر کے ایسی عوامی قیادت اپنے زیر سایہ اُبھارنی شروع کریں جو ملک میں جمہوریت کی مانگ کو بھی پورا کرے اور اس مقصد کو بھی نگاہ میں رکھے جو شاہ کو عزیز تھا۔ یہ واحد راستہ تھا جسے اختیار کر کے وہ اپنے مقصد میں کامیابی کی، جس درجہ بھی کر سکتے ہوں، امید کر سکتے تھے۔ اس کو نہ اختیار کر کے وہ جس راہ پر چلے اس کا انجام زمانہ کے رُخ اور خود ایران کے رُخ کو دیکھتے ہوئے سوائے اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بہ دیر یا سویر شاہ اور شاہ کے افکار کا کوئی دخل ہی ملک میں نہ رہے۔ اور وہاں کا اونٹ جس کروٹ چاہے خود ہی بیٹھے۔

جو بھی کچھ ہو۔ خواہ اپنے تخت و تاج کی حفاظت شاہ کا اصل مقصود رہی ہو یا مشرق وسطیٰ کی حفاظت دونوں صورتوں میں شاہ کی حکمت عملی اس قدر صاف طور پر غلط نظر آتی ہے کہ اُن کے جیسے زیرک اور جہاندیدہ حکمراں سے بس یونہی ایسی غلطی کا سرزد ہو جانا اور ہوتے رہنا آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ البتہ یہ اُن مغربی طاقتوں کی اُکساہٹ کا نتیجہ ہو سکتی ہے جن سے انھوں نے اپنے آپ کو وابستہ کر رکھا تھا۔ اِن طاقتوں کے جیسے مفادات اُن کی حکومت اور اُن کے ملک سے وابستہ تھے۔ اور اِن مفادات کے سلسلے میں وہ شاہ کو جس درجہ قابل اعتماد پاتے تھے، اُس کا بالکل یہ نتیجہ ہو سکتا تھا کہ وہ شاہ کو مضبوطی سے اپنی جگہ جمے رہنے اور اس کے لیے سب کچھ کر گزرنے کا مشورہ دیں۔ جس کا بالکل کھلا قرینہ ایک تو ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت

کا تختہ اُلٹوا کر شاہ کو اُن کا تخت واپس دلانے میں ان طاقتوں کا کردار ہے جو خود ان کے ذرائع سے بھی اب مصدّق (تصدیق یافتہ) ہو چکا ہے۔ اور اسی طرح کا دوسرا قرینہ ایران کے موجودہ بحران میں ان طاقتوں کی طرف سے آخر آخر تک شاہ کی علانیہ حمایت ہے ـــــ اور یہ (مغربی طاقتوں کی اس قدر اثر اندازی اور اُن سے ایسی وابستگی) وہ دوسرا اہم پہلو ہے جو ایران کے موجودہ قضیے میں عالم اسلام کی ایک دوسری عمومی حالت کو بیحد فکر کے لائق بناتا ہے۔

مسلمان ملکوں کی بڑی تعداد امریکہ اور اس کے مغربی ساتھیوں سے کم و بیش ایسی ہی وابستگی رکھتی ہے جو ایران کی اب تک رہی ہے۔ اور اس معاملے کے بعض ایسے شرمناک مظاہرے تک بعض وقت ہوتے ہیں کہ احساس ذلت سے دیکھے نہیں جاتے۔ تازہ مثال شاہ ایران کی رخصتی کے بعد امریکہ کا یہ اعلان ہے کہ وہ (سعودی عرب کے سلسلے میں اپنی سرپرستانہ ذمہ داریوں میں سنجیدگی اور مضبوطی کا اظہار کرنے کے لیے) اپنے جدید ترین جنگی جہازوں کا بیڑا کچھ دن کے لیے سعودی عرب کے دورے پر بھیج رہا ہے!! ـــــ ہم نہیں سمجھتے کہ ایک آزاد اسلامی ملک کے لیے (اور وہ بھی سعودی عرب) ایک غیر مسلم طاقت کی طرف سے سرپرستی ہی نہیں، دوستی یا حلیفی کی نمائش کے بھی اس انداز سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہو سکتی ہے۔ اور کیونکر اسے گوارا کیا جا سکتا ہے؟

اس مثال سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے معاملات کے لیے کس درجہ کا انحصار مغربی طاقتوں پر کیے ہوئے ہیں۔ اور اسی انحصار کا یہ نتیجہ ہے کہ ہماری سیاست بیشتر انہی کے تابع ہو کر رہ گئی ہے۔ "بادشاہتیں اور سیاسی شیختیں (KINGDOM اور SHEIKHDOM) اب قائم نہیں رہ سکتیں۔ ان کے ذریعہ اگر کچھ اچھے مقاصد کا تحفظ مقصود ہے تو وقت کے لیے قابل قبول نظام حکومت کے ذریعہ ان مقاصد کے تحفظ کا بندوبست کرو!" یہ آج کا نوشتہ دیوار ہے۔ ـــــ لیکن ان طاقتوں کے مختلف قسم کے اور نہایت اہم مفادات چونکہ ہمارے ان ملکوں سے وابستہ ہیں اور ان مفادات کے تحفظ کی وہ سب سے زیادہ قابل اطمینان شکل انہی فرسودہ نظامہائے حکومت میں دیکھتی ہیں اس لیے ان کی اثر اندازی ہمیں یہ جلی نوشتۂ دیوار بھی آج تک دیکھنے نہیں دے رہی۔ کاش ایران میں پیدا ہونے والے حالات کی آگاہی ہمارے ان حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہو جائے!

تیسرا اہم پہلو ایران کے ان واقعات کا یہ ہے کہ کم از کم ہمیں کبھی یہ تصور نہیں

تھا کہ اسلام کے نام پر ایسی بے پناہ تحریک کبھی ایران سے کبھی اُٹھ سکتی ہے۔ اس سے پہلے تک ہمارے زمانے کی اس عنوان کی سب سے زیادہ جاندار اور کفن بردوش عوامی تحریک ۱۹۷۷ء کی پاکستانی تحریک تھی۔ لیکن ایران کی اس تحریک نے اسے بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ تمام اندازوں اور تصورات سے آگے بڑھ گئی۔ اور اسی لیے سارا یورپ تلملایا ہوا ہے کہ یہ کیسا ہونے جا رہا ہے۔ جس طرح کے مضامین اور تبصرے یورپین اخبارات و رسائل میں ان دنوں نکلتے رہے ہیں انھیں پڑھ کر بے اختیار علامہ اقبال کا وہ مصرع یاد آ جاتا رہا ہے، جو انھوں نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی زبان سے اُس کی مجلس شوریٰ میں مستقبل کے خطرے سے اپنے چیلوں کو آگاہ کرتے ہوئے کہلوایا کہ

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے!

ایسا لگتا ہے جیسے ابلیس کے عصری چیلے استاد کی اس پیشین گوئی کے ظہور کا وقت قریب آتا محسوس کر رہے ہیں۔

بہرحال بیحد خوش آئند بات ہے اور اس یقین اور عقیدے کو نئی زندگی بخشتی ہے کہ اسلام سدا کے لیے آیا تھا اور ایک دن پھر اُسی کو غالب و جہانگیر ہو کر رہنا ہے۔ لیکن یہ بات ابھی دیکھنے کو باقی ہے کہ جو عنوان اس تحریک میں اختیار کیا گیا تھا تحریک کی کامیابی کی صورت میں اس کی لاج کہاں تک رکھی جاتی ہے؟ بار بار یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اسلام کے نام پر ہمارے عوام اور نوجوانوں کی طرف سے خون بہا دینا تو آسان ہوتا ہے لیکن معاملہ عملاً اسلام کی تابعداری کا آتا ہے تو جہاد بالنفس کا یہ مرحلہ ہمارے اُس مجاہدانہ جوش و جذبے سے طے نہیں ہو پاتا۔ پاکستان میں وہ لوگ برسراقتدار بھی آ گئے ہیں جن کی قیادت میں تحریک چلی تھی اور اسلامی قانون سازی بھی ہونے لگی ہے۔ مگر جو صورت حال نظر آ رہی ہے اس میں اس بات کا اطمینان کر لینا آسان نہیں ہے کہ یہ گاڑی اگلے مراحل سے بھی بخیر گزر جائے گی۔ ایران میں معاملہ اس لیے اور بھی پیچیدہ ہے کہ وہاں کی تحریک میں تمام بادشاہت دشمن لادین عناصر بھی موقع پرستی کے ماتحت شریک ہو گئے تھے۔ اور بادشاہ کے جاتے ہی انھوں نے اپنی صفوں کو علاحدہ کر کے اسلام پسندوں سے معرکہ آرا ہونا بھی شروع کر دیا ہے۔ بہرحال آگے جو کچھ بھی ہو اسلام کے نام پر اتنی زبردست تحریک بھی کچھ کم خوش آئند بات نہیں ہے۔

درس قرآن - محمد منظور نعمانی

● فرعون اور اُس کے ارکانِ حکومت کو آلِ فرعون کے اُس مردِ مومن کا خطاب جس نے اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا تھا۔

● حکمت کے ساتھ دعوت اور موعظہ حسنہ کا بہترین نمونہ

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَمَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ وَقَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ —— (سورۃ المومن آیات ۲۸-۳۱)

اور ایک مردِ مومن جو فرعون کے لوگوں میں سے تھا اور اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا اس نے کہا کہ کیا آپ لوگ ایک شخص کو صرف اس بات پر قتل کر ڈالیں گے کہ وہ کہتا ہے، میرا رب بس اللہ ہے، حالانکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے (اپنی صداقت کے ثبوت میں) روشن دلائل و معجزات بھی لایا ہے۔ (ایسی حالت میں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ عجلت میں

اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کرو) اگر بالفرض وہ کاذب اور مفتری ہے تو اس کے جھوٹ (اور خدا پر افترا پردازی) کا وبال اُس پر پڑ کے رہے گا (جس خدا پر وہ افترا کر رہا ہے وہ ہی اُس کو نیست ونابود یا ذلیل ورسوا کر دے گا) اور اگر فی الواقع وہ سچا اور راستباز ہے تو پھر (یہ بات یقینی ہے کہ تکذیب وانکار اور مخالفانہ رویہ پر برے عواقب اور دنیا وآخرت کے مصائب کی) وہ تمھارے بارہ میں جو پیشین گوئی کر رہا ہے اس میں سے کچھ ضرور تمھارے سامنے آجائے گا ـــــ اور یہ بات حق ہے کہ اللہ کسی ایسے شخص کو راہ یاب اور کامیاب نہیں کرتا جو حد سے گزرنے والا اور سراسر جھوٹا ہو۔

اے میری قوم آج تمھاری حکومت ہے اور تم کو پورا اقتدار حاصل ہے ملک میں (اور تم بظاہر جو چاہو کر سکتے ہو، مگر بتاؤ) اگر ہم پر عذاب الٰہی آجائے تو کون ہماری مدد کر سکے گا اور ہم کو اُس سے بچا سکے گا؟ (لہٰذا جو کچھ کرنا ہو خوب سوچ سمجھ کے کرو)

فرعون نے کہا کہ میں تم کو وہی سمجھاتا ہوں اور وہی رائے دیتا ہوں جو میری (سوچی سمجھی) رائے ہے اور میں تم کو اس راستہ کی رہنمائی کرتا ہوں جو صحیح راستہ ہے۔

اور اس شخص نے جو ایمان لے آیا تھا کہا کہ اے میری قوم والو مجھے تم پر ایسے روزِ بد کا اندیشہ ہے جو اگلی قوموں پر آیا تھا، جیسا کہ قوم نوح اور عاد وثمود اور اُن کے بعد والی قوموں کا حال ہوا، اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا بالکل نہیں چاہتا (وہ خود سرکشی اور نافرمانی کر کے عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں) 　　　(سورۂ مومن آیات ۲۸ تا ۳۱)

(تشریح وتفسیر) یہ سورۂ مومن کے چوتھے رکوع کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ ان سے اوپر کی آیتوں میں یہ مضمون تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو نبی بنا کر اور ہدایت کا پیغام اور معجزات دے کر مصر کے ارباب حکومت فرعون، ہامان وغیرہ کی طرف بھیجا، آپ نے ان لوگوں کو خدا پرستی اور توحید کی دعوت دی اور اپنی صداقت کے ثبوت میں وہ معجزات بھی پیش کئے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے تھے، لیکن وہ بدبخت بہت گستاخی سے پیش آئے اور آپ کو خدا کا نبی ماننے کے بجائے "ساحر کذاب" کہا ـــــ اور آخر میں فرعون نے آپ کو قتل کر ڈالنے کی دھمکی دی، بلکہ اِس کے لیے اپنے قطعی عزم اور فیصلہ کا اظہار کیا اور کہا "ذَرُونِي

اُقْتُلْ مُوسٰی وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ" ـــــ حضرت موسیٰ نے کہا میں خدا کی پناہ لیتا ہوں وہ میری حفاظت فرمائے گا۔

اس کے آگے کا واقعہ ان آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے جن کی اس وقت تلاوت کی گئی ہے ـــــ اور یہ واقعہ جو یہاں ان آیتوں میں بیان ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں جہاں تک میرا خیال ہے قرآن پاک میں کسی دوسری جگہ بیان نہیں فرمایا گیا ہے۔
موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے قرآن مجید میں بیسیوں جگہ بیان ہوا ہے، بعض سورتوں میں جیسے سورۂ اعراف، سورۂ طٰہٰ اور سورۂ قصص وغیرہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے، لیکن اس واقعہ کے سلسلہ کی یہ کڑی جس کا سورۂ مومن میں یہاں ذکر فرمایا گیا ہے (جہاں تک میرا خیال ہے) اس کا ذکر کسی دوسری جگہ نہیں فرمایا گیا۔

ان آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ کو قتل کر ڈالنے والی بات کہی تو فرعون ہی کے لوگوں میں سے (من آل فرعون) غالباً اُس کے بہت قریبی رشتہ داروں میں سے ایک شخص نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان لا چکا تھا مگر ابھی تک اس نے اپنے ایمان کو چھپایا تھا ظاہر نہیں کیا تھا، فرعون اور دوسرے ارکان حکومت کو مخاطب کر کے کہا کہ "أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ" یعنی کیا آپ لوگ اللہ کے ایک بندہ کو صرف اس جرم میں قتل کر دیں گے کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب اور مالک و معبود مانتا ہے اور اسی کی بندگی اور پرستش کی دعوت دیتا ہے اور وہ اپنی صداقت کے ثبوت میں خدا کی طرف سے روشن دلائل اور معجزات بھی لے کر آیا ہے ـــــ مطلب یہ ہے کہ آپ لوگ ذرا سوچیں کہ یہ بات عقل اور انسانیت کے کس قدر خلاف ہے ـــــ آگے اس مرد مومن نے یہ بھی کہا کہ "وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَإِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ" مطلب یہ ہے کہ یہ شخص یا تو اپنے اس دعوے میں کہ "خدا نے اُس کو رسول مقرر کر کے اور ہدایت کا پیغام دے کر بھیجا ہے" سچا ہے، یا جھوٹا اور مفتری ہے ـــــ اگر بالفرض یہ جھوٹا ہے اور خدا پر افترا کرتا ہے تو اُس کا اتنا بڑا جھوٹ اور خداوند تعالیٰ پر افترا یہ خود ہی اس کو لے ڈوبے گا ـــــ اور اگر یہ سچا ہے اور فی الواقع خدا کا رسول

ہے تو پھر یقیناً ایسا ہو گا کہ انکار و تکذیب کرنے والوں کے لیے یہ دنیا میں جس بُرے انجام کی اور آخرت کے جس عذاب کی پیشین گوئی کرتا ہے اور وعیدیں سناتا ہے اُس میں سے کچھ ضرور اسی زندگی میں تمھارے سامنے آجائے گا ــــ یعنی آخرت کے عذاب کی بات تو مرنے کے بعد کی ہے، لیکن جس دنیوی عذاب کی پیشین گوئی کرتا ہے کم از کم وہ تم پر اسی دنیا میں اور اسی زندگی میں آجائے گا۔ (" یُصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ " کا یہی مطلب ہے)

آگے ہے کہ فرعون کے گھرانے کے اس "مردِ مومن" نے یہ بھی کہا کہ " اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ " یعنی یہ بات یقینی ہے اور اس کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ خدا کسی ایسے شخص کو راہ یاب اور مقصد میں کامیاب نہیں کرتا اور نہیں کرے گا جو " مُسْرِف و کذاب " یعنی حد سے گزرنے والا بے لگام اور بے تحاشا جھوٹ بولنے والا ہو۔ بس اس شخص (موسیٰ) کے ساتھ جو خدا کا معاملہ نظر آرہا ہے کہ اس کو معجزات دیے گئے ہیں اور اس کی دعوت میں تاثیر اور کشش ہے، یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ شخص " مسرف اور کذاب " نہیں ہے بلکہ اللہ کا صادق بندہ ہے، جب ہی تو خدا اس کی مدد کر رہا ہے۔ آگے ہے کہ اس " مردِ مومن " نے اس خطاب میں آخری بات یہ کہی کہ " یٰقَوْمِ لَکُمُ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ظٰھِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ فَمَنْ یَّنْصُرُنَا مِنْ بَاْسِ اللّٰہِ اِنْ جَاءَنَا " یعنی اے میری قوم یہ صحیح ہے کہ اس وقت حکومت اور بادشاہت تمھاری ہے اور بظاہر تم سیاہ و سفید کے مالک ہو اور جو چاہو کر سکتے ہو، کوئی تمھارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے، لیکن ذرا یہ سوچو کہ اگر خدا کی طرف سے ہم پر کوئی عذاب بھیجا گیا (جیسا کہ بہت سی قوموں پر پہلے خدا کا عذاب آیا ہے) تو اُس وقت کون ہماری مدد کرے گا اور کون ہم کو اُس عذاب الٰہی کی زد سے بچا سکے گا؟ ــــ

جس ماحول میں اس " مردِ مومن " نے فرعون اور فرعونیوں کے سامنے یہ تقریر کی تھی اُس ماحول اور اُس فضا میں یہی بہترین انداز ہو سکتا تھا۔ لیکن فرعون پر بدبختی سوار تھی اس نے یہ سب کچھ سُن کر کہا ۔ " مَآ اُرِیْکُمْ اِلَّا مَآ اَرٰی وَمَآ اَھْدِیْکُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ " اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے تمھاری بات سن لی تم کچھ نہیں سمجھتے، ہم جانتے اور سمجھتے ہیں، اور ہم جس راستہ کی طرف قوم کی رہنمائی کر رہے ہیں وہی صحیح راستہ ہے۔ یعنی موسیٰ کی بات نہ ماننا اور اس کی

تکذیب و مخالفت کرنا ہی ٹھیک ہے۔

فرعون کا جواب سنکر پھر اُس مرد مومن نے کہا ـــــ "یٰقَوْمِ اِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ ہ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ہ" ـــــ مرد مومن نے جو بات پہلے اشاروں میں کہی تھی اب اس کو کھل کر صاف لفظوں میں کہا کہ ـــــ اے میری قوم والو مجھے ڈر ہے کہ موسیٰ کی تکذیب اور مخالفت کے نتیجہ میں تم پر اس طرح کا روز بد اور ویسا عذاب نہ آجائے جیسا اگلی سرکش اور نافرمان قوموں پر آیا تھا، جیسا کہ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور اُن کے بعد آنے والی اُن قوموں پر آیا جنھوں نے خدا کے پیغمبروں کی گستاخانہ تکذیب اور خدا کے مقابلہ پر سرکشی کی تھی ـــــ اور اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، لیکن جب بندے اپنی سرکشی اور شرارت سے اُس کے عذاب کو دعوت دیتے ہیں تو پھر اُن پر عذاب نازل کر دیا جاتا ہے۔

تو اے میری قوم کے لوگو، عذاب الٰہی سے ہلاک و برباد ہونے والی ان قوموں کے انجام سے سبق حاصل کرو، اور اللہ کے اس پیغمبر اور داعی (موسیٰ) کے مقابلہ میں وہ رویہ اختیار نہ کرو جو قوم نوح اور قوم عاد و ثمود وغیرہ نے اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا، ورنہ تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو انکا ہوا۔

اس مرد مومن کی تقریر کا سلسلہ ابھی جاری ہے، بلکہ اس کا جو حصہ اِن آیتوں میں آیا ہے وہ تقریر کا چوتھائی حصہ بھی نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ پوری تقریر عجیب و غریب ہے ـــــ "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" کا بہترین نمونہ ہے۔ (با

کتاب المعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

نظام عدالت (۲)

قاضیوں کے لیے رہنما اصول اور ہدایات

مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ کرنے والے قاضیوں اور حاکموں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رہنما اصول مقرر فرمایا اور جو ہدایات دیں اُن کے لیے مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھی جائیں۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَهُ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ كَيْفَ تَقْضِيْ اِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ، قَالَ اَقْضِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ، قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ؟ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ اَجْتَهِدُ بِرَاْيِيْ وَلَا اٰلُوْ قَالَ فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى صَدْرِهٖ وَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لِمَا يَرْضٰى بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ــــــــ رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قاضی بنا کر یمن کے لیے روانہ فرمایا تو آپ نے اُن سے دریافت کیا کہ جب تمہارے

سامنے کوئی مقدمہ اور قضیہ پیش ہوگا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟ تو انھوں نے عرض کیا کہ میں اللہ کی کتاب (قرآن مجید کی ہدایت) کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں تمھیں (اس کے بارہ میں کوئی حکم اور ہدایت) نہ ملے؟ (تو کیا کرو گے) انھوں نے عرض کیا کہ پھر میں اللہ کے رسول کی سنت سے فیصلہ کروں گا —— آپ نے فرمایا اور اگر اللہ کے رسول کی سنت میں بھی تمھیں (اس بارہ میں) حکم اور ہدایت نہ ملے (تو کیا کرو گے؟) انھوں نے عرض کیا تو پھر میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لوں گا اور اجتہاد کروں گا اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا —— یہ جواب سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا سینہ ٹھوکتے ہوئے شاباشی دی اور فرمایا حمد و شکر اُس اللہ کے لیے جس نے اپنے رسول کے فرستادہ کو اس بات کی توفیق دی جو اُس کے رسول کو پسند ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، مسند دارمی)

(**تشریح**) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان چند ممتاز صحابہ کرام میں سے ہیں جن کو اپنے طالب علمانہ مزاج اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت اور خصوصی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں کتاب و سنت کے علم اور تفقہ فی الدین میں امتیازی مقام حاصل تھا —— اسی سلسلہ معارف الحدیث میں پہلے بھی متعدد حدیثوں میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری دور میں اُن کو یمن کا قاضی اور حاکم بنا کر بھیجا تھا —— ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کے طریقۂ کار کے مسلسل مطالعہ سے اُن کو یہ اصول معلوم ہو چکا تھا کہ جب کوئی فیصلہ طلب معاملہ پیش آئے تو اس کے بارہ میں ہدایت حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جائے، اگر وہاں سے ہدایت نہ مل سکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے طریق کار سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، وہاں بھی نہ ملے تو کتاب و سنت کی روشنی میں اجتہاد و قیاس کیا جائے —— تو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تو امتحان کے طور پر اُن سے دریافت کیا کہ تمھارے سامنے جو معاملات

اور مقدمات آئیں گے تم اُن کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟ ــــــ انھوں نے اُس کا وہ جواب دیا جو حدیث میں مذکور ہوا ــــــ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شاباش دی اور ان کا سینہ ٹھوکا، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ انھوں نے آپ کی مرضی اور منشا کے مطابق جواب دیا جس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے آپ کی تعلیم اور صحبت سے اچھا استفادہ کیا ہے۔

اس حدیث کی اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت ہے کہ دین و شریعت میں اجتہاد و قیاس کی یہ سب سے زیادہ واضح بنیاد ہے، اور امت کے ہر دور کے فقہاء و مجتہدین نے اسی حدیث کو بنیاد بنا کر اجتہاد و قیاس سے کام لیا ہے اور اُن ہزاروں مسائل و معاملات کا فیصلہ کیا ہے جن کے بارہ میں واضح ہدایت اور حکم کتاب و سنت میں نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرات محدثین کے مقررہ معیار کے لحاظ سے اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے بلکہ اس میں ضعف ہے (جس کی تفصیل شروحِ حدیث میں دیکھی جاسکتی ہے) لیکن اس کے باوجود امت کے ائمہ و فقہاء نے اس کو قبول کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر قیاس و اجتہاد کا سلسلہ چلا ہے۔ شیخ ابن القیم وغیرہ محققین نے لکھا ہے کہ ائمہ فقہا کے اس کو قبول کر لینے کے بعد اس کی صحت کے لیے کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی معاملہ اور مسئلہ میں قیاس و اجتہاد کی گنجائش جب ہی ہے جبکہ اس کے بارہ میں کتاب و سنت میں کوئی حکم و ہدایت نہ مل سکے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ الْخَصْمَيْنِ يَقْعُدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَاكِمِ ــــــ رواہ احمد وابوداؤد

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مقدمہ کے دونوں فریق حاکم کے سامنے بیٹھیں۔ (مسند احمد، سنن ابی داؤد)

تشریح مطلب یہ ہے کہ حاکم کو چاہیے مقدمہ کے دونوں فریقوں (مدعی اور مدعا علیہ) کے ساتھ اس کا برتاؤ مساویانہ ہو، کسی فریق کی کسی خصوصیت یا تعلق کی وجہ سے اُس کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ ہو تا قاضی کے سامنے دونوں کی نشست یکساں ہو۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَقَاضٰى اِلَيْكَ

رَجُلَانِ فَلَا تَقْضِ لِلْاَوَّلِ حَتّٰی تَسْمَعَ كَلَامَ الْاٰخَرِ فَسَوْفَ تَدْرِیْ كَيْفَ تَقْضِیْ، قَالَ عَلِیٌّ فَمَا زِلْتُ قَاضِيًا بَعْدَ هٰذَا ــــ رواہ الترمذی

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا، جب تمہارے پاس دو آدمی (کوئی نزاعی معاملہ اور مقدمہ لیکر) فیصلہ کرانے کے لیے آئیں، تو تم پہلے ہی فریق کی بات سنکر فیصلہ نہ دیدو جب تک کہ دوسرے کا بیان نہ سن لو، ایسا کروگے تو تم سمجھ لوگے اور جان لوگے کہ تم کس طرح اور کیا فیصلہ کرو، ــــ

حضرت علی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میں برابر قاضی رہا ہوں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث سنن ابی داؤد اور ابن ماجہ میں بھی ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو قاضی بنا کر یمن بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو انھوں نے عرض کیا کہ حضرت میری عمر بہت کم ہے اور میں مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ کرنا نہیں جانتا، تو آپ نے ان کو اطمینان دلایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد اور رہنمائی فرمائے گا اور تم سے صحیح فیصلہ کرائے گا۔ اور ساتھ ہی یہ اصولی ہدایت فرمائی کہ جب کوئی قضیہ تمہارے سامنے آئے تو جب تک تم دونوں فریقوں کا بیان نہ سن لو اُس وقت تک کوئی رائے قائم نہ کرو اور نہ فیصلہ دو، جب دونوں کی بات سننے کے بعد معاملہ پر غور کروگے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ہوگی اور صحیح فیصلہ کی توفیق ملے گی ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں حضرت علی مرتضیٰ کے بارہ میں جو فرمایا تھا اُس کا ظہور اس طرح ہوا کہ مقدمات و نزاعات کے فیصلہ کے باب میں طبقۂ صحابہ میں آپ کو خصوصی امتیاز حاصل تھا اور آپ کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

عَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اِثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ کوئی قاضی اور حاکم (کسی معاملہ کا فیصلہ) ایسی حالت میں ہرگز نہ کرے کہ وہ غصہ کی حالت میں ہو۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) غصہ کی حالت میں آدمی کا ذہنی توازن صحیح نہیں ہوتا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ ایسی حالت میں کوئی حاکم عدالت کسی مقدمہ اور قضیہ کا فیصلہ نہ کرے۔ ایسے وقت میں غور و فکر کر کے رائے قائم کرے اور فیصلہ کرے جب دماغ ٹھنڈا اور اعتدال و سکون کی حالت میں ہو۔ (اور اگر حاکم کو غصہ مقدمہ کے کسی فریق پر ہو تو اس کا بھی خطرہ ہے کہ فیصلہ میں ناانصافی ہو جائے۔)

دعوے کے لیے دلیل اور ثبوت ضروری:۔

اگر کوئی شخص حاکم اور قاضی کی عدالت میں کسی دوسرے آدمی کے خلاف کوئی دعویٰ یا شکایت کرے تو خواہ دعویٰ کرنے والا کیسا ہی ثقہ صالح اور کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو محض اس کے دعوے کی بنیاد پر قاضی اُس کے حق میں فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ اسلامی قانون میں ہر دعوے کے لیے ضابطہ کے مطابق ثبوت اور شہادت ضروری ہے ــــــ اگر مدعی شہادت اور ثبوت پیش نہ کر سکے تو مدعا علیہ سے کہا جائے گا کہ اگر اس کو دعویٰ تسلیم نہیں ہے تو وہ حلف کے ساتھ کہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے ــــــ اگر مدعیٰ علیہ اس طرح کے حلف سے انکار کرے تو دعویٰ صحیح سمجھ کے ڈگری کر دیا جائے گا اور اگر وہ حلف کے ساتھ مدعی کے دعوے کو غلط قرار دے تو دعویٰ خارج کر دیا جائے گا اور مدعیٰ علیہ کے حق میں فیصلہ دیدیا جائے گا ــــــ یہ عدالتی قانون اور ضابطہ ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی اور جو خود آپ کا طریقۂ کار بھی تھا۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعَى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَاَمْوَالَهُمْ وَلٰكِنَّ الْيَمِيْنَ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ ــــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ــــ اگر محض دعوے پر لوگوں کے حق میں فیصلہ کر دیا جایا کرے تو لوگ دوسروں کے خلاف (دنیا کی سے) خون یا مال کے (جھوٹے سچے) دعوے کرنے لگیں گے۔ لیکن (محض

کسی کے دعوے پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا بلکہ ثبوت طلب کیا جائے گا اور ثبوت وشہادت نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ سے حلفیہ انکاری بیان لیا جائے گا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) صحیح مسلم کی اس روایت کے الفاظ میں مدعی سے ثبوت وشہادت طلب کرنے کا ذکر نہیں ہے، صرف مدعیٰ علیہ سے حلفیہ انکاری بیان لینے کا ذکر ہے، لیکن صحیح مسلم کے شارح امام نوادی نے اپنی شرح مسلم میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی اسی حدیث کو امام بیہقی نے بھی حسن یا صحیح سند سے روایت کیا ہے اور اس میں پہلے مدعی سے ثبوت وشہادت طلب کرنے کا ذکر ہے، اس کے آخری الفاظ یہ ہیں "ولکن البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر"—— امام نوادی کا یہ کلام صحیح مسلم کی اس حدیث کے ساتھ ہی مشکوٰۃ المصابیح میں بھی نقل کیا گیا ہے، اسی لیے حدیث کے ترجمہ میں ہم نے قوسین میں اس کا اضافہ کردیا ہے —— متعدد دوسرے صحابہ کرام سے بھی اس مضمون کی حدیثیں مروی ہیں۔

عَنِ الْاَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَ رَجُلٍ مِنَ الْيَهُودِ اَرْضٌ فَجَحَدَنِي فَقَدَّمْتُهُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلَكَ بَيِّنَةٌ قُلْتُ لَا قَالَ لِلْيَهُودِيِّ اِحْلِفْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ اِذًا يَحْلِفُ يَذْهَبُ بِمَالِي —— فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِهِمْ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

—————— رواہ ابو داؤد وابن ماجۃ

(ترجمہ) اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے بیان کیا کہ ایک زمین میری اور ایک یہودی کی مشترکہ ملکیت تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کردیا (اور تنہا اس کا مالک بن بیٹھا) میں اس یہودی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا (اور اپنا مقدمہ آپ کے سامنے پیش کیا) آپ نے مجھ سے فرمایا کہ "تمھارے پاس اپنے دعوے کی کوئی دلیل (یعنی گواہ شاہد) ہے؟" میں نے عرض کیا کہ کوئی گواہ شاہد تو نہیں ہے۔ آپ نے یہودی سے فرمایا، کہ (اگر

تمہیں اس سے انکار ہے تو) تم قسم کھاؤ (کہ زمین میں مدعی کا کوئی حصہ نہیں ہے تنہا میری ہے)" —— اشعث کہتے ہیں کہ) میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ حضرت یہ یہودی (جھوٹی) قسم کھا لیگا اور میرا مال یعنی میری جائداد ہڑپ کرلے گا —— تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی "إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ ...... وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" (جو لوگ اللہ کے عہد و پیمان کو توڑ کر، اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے ذریعہ "ثمنِ قلیل" یعنی دنیا کا تھوڑا سا نفع حاصل کرتے ہیں، آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ اُن سے کوئی بات نہ فرمائے گا اور وہ اس کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے اور وہ اُن کو پاک صاف بھی نہ کرے گا اور ان کو نہایت دردناک عذاب ہوگا۔ (سنن ابی داؤد و سنن ابن ماجہ)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی قضیہ میں مُدعی مسلم اور مدعا علیہ غیر مسلم ہو تب بھی اس قانون کے مطابق کارروائی کی جائے گی اور مدعی کے پاس ثبوتِ شہادت نہ ہونے کی صورت میں اگر غیر مسلم مدعی علیہ حلف کے ساتھ انکاری بیان دے گا تو اس کو قبول کر لیا جائے گا۔ اور اگر فی الواقع اس نے بددیانتی کی ہے اور جھوٹا حلفیہ بیان دیا ہے تو آخرت میں وہ اس کی سخت ترین سزا پائے گا۔

عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَائِلٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَمَوْتَ وَرَجُلٌ مِنْ كِنْدَةَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ هٰذَا غَلَبَنِي عَلَى أَرْضٍ لِي فَقَالَ الْكِنْدِيُّ هِيَ أَرْضِي وَفِي يَدِي لَيْسَ لَهُ فِيهَا حَقٌّ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْحَضْرَمِيِّ أَلَكَ بَيِّنَةٌ؟ قَالَ لَا قَالَ فَلَكَ يَمِينُهُ، قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ الرَّجُلَ فَاجِرٌ لَا يُبَالِي عَلَى مَا حَلَفَ عَلَيْهِ وَلَيْسَ يَتَوَرَّعُ مِنْ شَيْءٍ قَالَ لَيْسَ لَكَ مِنْهُ إِلَّا ذَالِكَ فَانْطَلَقَ لِيَحْلِفَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا أَدْبَرَ لَئِنْ حَلَفَ عَلَى مَالِهِ لِيَأْكُلَهُ ظُلْمًا لَيَلْقَيَنَّ اللّٰهَ وَهُوَ عَنْهُ مُعْرِضٌ۔ رواہ مسلم

علقمہ بن وائل نے اپنے والد وائل کی روایت سے بیان کیا کہ ایک شخص حضرموت کے رہنے والے اور ایک قبیلہ کندہ کے (اپنا مقدمہ لیکر) حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرمی نے (جو مدعی تھا) عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس کندی نے میری ایک زمین پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے —— کندی نے (جو مدعا علیہ

تھا) جواب میں کہا کہ وہ زمین فی الواقع میری ہی ملکیت ہے اور میرے قبضہ میں ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی حضرمی سے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس دعوے کی دلیل (گواہ شاہد) ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ گواہ شاہد تو نہیں ہیں، ـــــ آپ نے فرمایا کہ پھر تو تم کو صرف یہ حق ہے کہ اپنے مدعا علیہ کندی سے قسم لے لو، حضرمی نے عرض کیا کہ حضرت یہ آدمی تو فاجر (بدکار و بدچلن اور بددیانت) ہے اس کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ کس بات کی قسم کھا رہا ہے اور کسی بھی (بری) بات سے اس کو پرہیز نہیں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (کچھ بھی ہو جب تمہارے پاس دعوے کے گواہ شاہد نہیں ہیں تو) تم کو بس یہی حق ہے کہ اس آدمی سے قسم لے لو! ـــــ تو جب وہ کندی حلف اٹھانے کے لیے دوسری طرف کو چلا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کو آگاہی دیتے ہوئے) ارشاد فرمایا کہ اگر اس نے حضرمی کا مال ظالمانہ اور ناجائز طور پر ہڑپ کرنے کے لیے جھوٹی قسم کھائی تو اللہ کے حضور میں یہ اس حال میں پیش ہوگا کہ اللہ تعالیٰ (غضب و ناراضی کی وجہ سے) اس کی طرف سے رخ پھیر لیں گے۔ (صحیح مسلم)

تشریح) بلاشبہ آخرت میں کسی بندے کی یہ انتہائی بدبختی اور بدنصیبی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ غضب ناراضی کی وجہ سے اسکی طرف سے رخ پھیر لیں، یہ اُسکے مردود بارگاہ اور ناقابل معافی ہونے کی علامت ہوگی ـــــ اس سے پہلی اشعث بن قیس کی حدیث میں ایسے لوگوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آیت تلاوت فرمائی تھی (اولٰئک لاخلاق لھم فی الآخرۃ ولا یکلمھم اللہ .... ولھم عذاب الیم) وائل کی اس حدیث میں "وھو عنہ معرض" اسی کی اجمالی تعبیر ہے، اور آیت کا مضمون گویا اسکی تفصیل ہے۔
صحیح مسلم کی اس حدیث میں ایک جملہ یہ تھا "فانطلق لیحلف فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما ادبر ..... الخ" جس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے "کہ جب وہ کندی حلف اٹھانے کے لیے دوسری طرف کو چلا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ....." غالباً اس کندی سے کہا گیا ہوگا کہ مسجد چل کر نماز کے بعد سب کے سامنے قسم کھاؤ، یا یہ کہ منبر کے پاس کھڑے ہو کر قسم کھاؤ ـــــ تو جب وہ قسم کھانے کیلئے اُدھر کو چلا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو آگاہی دی کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر پرایا مال ناجائز طور پر حاصل کرے گا آخرت میں اُس کا یہ انجام ہوگا۔
صحیح مسلم کی اس حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ پھر اُس شخص نے قسم کھائی یا قسم کھانے سے باز آ گیا ـــــ لیکن سنن ابی داؤد میں حضرمی اور کندی کے اسی مقدمہ سے متعلق اشعث بن قیس کی ایک حدیث ہے، اس کے آخر میں یہ ہے کہ*

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے بُرے انجام کی وعید سنائی تو کندی قسم کھانے سے رک گیا اور

*اس نے اقرار کیا کہ وہ زمین مدعی حضرمی کی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی کے حق میں فیصلہ فرما دیا۔

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

کاروانِ اہل فضل وکمال

تلامذۂ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی مہاجرؒ

(۱۳)

شاہ عبد الغنی صدیقی مہمیؒ

مآثر الاجداد مؤلفہ و مرتبہ پروفیسر منظور الحق صدیقی مطبوعہ لاہور میں صفحہ ۱۲۳ سے صفحہ ۱۲۶ تک آپ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ ذیل میں ان ہی صفحات کی تلخیص پیش کی جارہی ہے۔

آپ شاہ محمد اسمٰعیل صدیقی شہید مہمیؒ[1] کے سات بیٹوں میں سے سب بڑے بیٹے تھے۔ ۱۲۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "ذوالفقار علی" ہے۔ آپ نے منجملہ بہت سے اساتذہ کے حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی مہاجرؒ سے بھی فیضِ علم حاصل کیا۔ شاہ احمد سعید مجددی دہلوی مہاجرؒ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ مہاجر اور شاہ اللہ بخش تونسویؒ سے آپ کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے آپ شاہ محمد غوث[2] گنگوہیؒ ابن شاہ عبد الکریم چشتی نبیرۂ شاہ عبد القدوس گنگوہیؒ کے خلیفۂ مجاز تھے زہد و اتقاء، صبر و شکر، حلم و میانہ روی، علم و فضیلت جیسے اخلاق

---

[1] آپ کو ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے پھانسی دی تھی ——— روزنامہ الجمعیۃ دہلی بابتہ ۱۹۵۶ء میں احقر نے آپ کے کچھ حالات شائع کرائے ہیں۔

[2] شاہ محمد غوث گنگوہیؒ، شاہ محمد رمضان شہید مہمیؒ (بادلی ہریانہؒ) کے خلیفہ مجاز تھے۔ (مآثر الاجداد ص۱۲۴)

درویشانہ کے حامل تھے۔ جے پور، جاورہ، دوجانہ اور فرخ نگر کے والی و حاکم آپ کے معتقدین میں سے تھے۔ آپ کے تعمیری کاموں میں تھم کے مدرسۂ رمضانیہ کا قیام بھی تھا۔

آپ کے بہت سے خلفاء تھے جن سے تشنگانِ معرفت کو بہت کچھ فیض پہونچا۔

آپ کا انتقال ۲۰؍ رجب ۱۳۰۰ھ کو بمقام دوجانہ ہوا۔ اپنے خسر اور تایا شاہ محمد رمضانؒ بادیٔ ہریانہ کی خانقاہ واقع تھم میں دفن ہوئے۔ رشید الرحمٰن صاحب نے آپ کا قطعۂ تاریخ وفات اس طرح کہا:

شمع بزمِ معرفت حضرت شہ عبدالغنی ‌ ‌ ‌ رو نہاد از قضائے ایزدی سوئے عدم

روشنیٔ نورِ عرفاں گشت پنہاں از نظر ‌ ‌ ‌ خاک بر سر تخت ہر اہلِ ارادت از الم

زانکہ رسید ند ہر یک سالِ ترحیل از رشید

او پئے تفہیم گفتہ بلبلِ باغِ ارم

۱۳۰۰ھ

مولانا سبحان بخش شکارپوریؒ

آپ شکارپور ضلع مظفر نگر کے باشندے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن کتب حدیث کا درس حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے لیا۔ جمادی الآخر ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۵؍ اکتوبر ۱۸۳۴ء) کو دہلی کالج میں عربی کے مدرس دوم مقرر ہوئے اور تمام زندگی اسی عہدے پر بسر کی۔

اپنی کتاب محاوراتِ ہند میں لکھتے ہیں:-

لہ آپ شاہ عبدالعظیم صدیقی پھلتیؒ کے صاحبزادے اور شاہ محمد اسمٰعیل صدیقی شہیدؒ کے بڑے بھائی تھے۔ آپکے نام سے آپ کی تاریخ ولادت (۱۱۹۳ھ) نکلتی ہے۔ آپ سلسلۂ تعلیم دہلی میں چودہ سال تک رہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدثؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے پورا پورا استفادہ کیا۔۔۔ تذکیر و تبلیغ میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ بادیٔ ہریانہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ۲۰؍ جمادی الاول ۱۲۴۶ھ میں مخالف مسلک بوہروں کے ہاتھوں مندسور میں شہید ہوئے۔ تھم ضلع رہتک میں مزار ہے۔ (ماخوذ از مآثر الاجداد)

"بندہ بیچمیرز سبحان بخش ساکن شکارپور ضلع مظفرنگر کہ غدر سے پہلے کالج دہلی میں مدرس دوم عربی اور بعد غدر پھر کالج دہلی میں مدرس عربی، فارسی و اردو تھا، اور اب پنشن دار ہے"
مولانا محمد احسن نانوتوی کو ان سے اجازت حصن حصین حاصل تھی جس کا ذکر مولانا محمد احسن نانوتوی نے خیر متین میں کیا ہے۔ اس میں مولانا سبحان بخش صاحب کے شاہ محمد اسحٰق کا تلمذ ہونے کی تصریح ہے۔ آپ نے دہلی کالج کی طرف سے متعدد کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان کے علاوہ آپ کی اور کئی تالیفات بھی ہیں۔ جن میں تذکرۃ الحکما، تذکرۃ المفسرین اور ترجمہ تاریخ ابن خلکان کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں کیا ہے۔

(خطبات، اشاعت اول ص۱۰۹، ص۱۶۲)

ڈاکٹر عبد الحق نے ان کی تالیفات میں ترجمۂ تزک تیموری کو بھی بتایا ہے (مرحوم دلی کالج ص۱۶۱ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء)

محاورات ہند۔ مولانا سبحان بخش کی مشہور تالیف ہے جو ۱۳۰۲ھ میں مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا ہے۔ آپ نے کتاب تنبیہات کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا جو مطبع مجتبائی سے ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوا۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ ترمذی شریف کی دوسری اشاعت کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی ہے ترمذی شریف کے شروع میں فرماتے ہیں:

"یقول العبد الضعیف الراجی الی رحمۃ رب العرش سبحان بخش الساعی فی انطباع ھذہ الکتاب المستطاب ثانیاً وتصحیحہ ومقابلتہ بالطبع الاول، انی سمعت اکثرھذا الکتاب من الشیخ المکرم المفخم المشتھر بین الآفاق المرحوم المغفور مولینا محمد اسحق واجازنی بہ (الخ)"

اس کی طباعت شوال ۱۲۶۹ھ میں شروع ہو کر ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ میں مکمل ہوئی اور مطبع فخر المطابع دہلی سے حافظ نیاز احمد کیرانوی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔
مولانا سبحان بخش کے مفصل حالات و تالیفات اور سنہ وفات کا اس سے زیادہ پتا نہیں چل سکا۔

[1] اس تحریر سے بھی مولانا سبحان بخش کا تلمیذ حضرت شاہ محمد اسحٰق ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا عبدالرزاق باغپتیؒ

مولانا عبدالرزاق باغپتیؒ نے ملتقی الابحر کی تصحیح کی اور اس پر حاشیہ لکھا جو فخر المطابع دہلی سے باہتمام حافظ عبداللہ کیرانویؒ شائع ہوا۔ اس کے آخر میں آپ کا شاگردِ شاہ محمد اسحٰق ہونا بیان کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے حالات نہیں ملے۔

الحمد للہ! کاروان اہل فضل و کمال، منزل مقصود پر پہونچ گیا۔ تلامذۂ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی مہاجرؒ کا تذکرہ اور ان کے حالات جس جس کتاب سے مل سکے ان کو قسط وار ہدیۂ ناظرین کیا گیا۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی سلمہ نے اس سلسلے میں بہت مدد دی۔ اگر وہ تلاش و جستجو کے بعد حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کے تلامذہ کی فہرست ارسال نہ کرتے تو شاید میں چند نامور شخصیات پر ہی اکتفا کرتا۔ مولانا راشد سلمہ نے اس آخری قسط کی شخصیات کی بھی خاص طور پر رہنمائی فرمائی ہے۔ بلکہ مولانا سبحان بخش شکارپوریؒ اور مولانا عبدالرزاق باغپتیؒ کے مختصر حالات انھوں نے ہی تحریر کر کے بھیجے۔

میں نے اس سلسلے میں جن کتابوں سے فائدہ اٹھایا وہ حسب ذیل ہیں:۔

نزہۃ الخواطر (جلد ۷، ۸)، روضۃ الممطورہ مؤلفہ مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی، تذکرہ علمائے ہند مترجمہ محمد ایوب قادری۔ تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرۂ رحمانیہ مؤلفہ قاری محمد عبدالحلیم انصاری پانی پتی۔ تذکرۂ کاملان رامپور مؤلفہ احمد علی شوق رامپوری، مقالات طریقت مؤلفہ محمد عبدالرحیم ضیاء، تاریخ مظاہر جلد اول مؤلفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم سرگذشت مجاہدین مؤلفہ غلام رسول مہر، تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی زید مجدہم، تذکرۂ مشاہیر کاکوری مؤلفہ مولانا حافظ محمد علی حیدر علوی کاکوروی، اتحاف النبلاء مؤلفہ نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی، تراجم علمائے اہل حدیث مؤلفہ ابو یحییٰ نوشہروی، حالات مشائخ کاندھلہ مؤلفہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، تذکرۃ الکرام مؤلفہ محمود احمد عباسی امروہی، دہلی اور اس کے اطراف مؤلفہ حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی،

آثار الاجداد مولفہ و مرتبہ پروفیسر منظور الحق صدیقی لاہور، مزارات اولیائے دہلی مؤلفہ شاہ عالم فریدی، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی۔

ناظرین کرام میں سے اگر کوئی صاحب حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کے کسی اور شاگرد کی نشان دہی کریں گے تو میں ممنون و متشکر ہوں گا۔

استدراک: ــــــ حضرت مولانا عالم علی محدث نگینوی ثم مرادآبادیؒ کے تذکرے میں آپ کی وفات کے بارے میں دو قول لکھے گئے ہیں۔ تذکرہ علمائے ہند میں تاریخ وفات ۲۰ رمضان ہے اور نزہۃ الخواطر میں ۱۴ رمضان لکھی ہے۔ مولانا حکیم صدیق احمد قاسمی مرادآبادیؒ کا حسب ذیل قطعہ تاریخ وفات ۲۰ رمضان المبارک کی تائید کر رہا ہے۔ یہ قطعہ رسالہ دارالعلوم دیوبند بابتہ اپریل ۱۹۵۶ء میں زیر عنوان تحفۂ قاسمی کا ایک جرعہ نوش، شائع ہو چکا ہے ؎

بعد عصر از پنجشنبہ بستم از ماہِ صیام　　سال و حال آں ز صدیقؔ حزیں باید شنید
شد ز دردِ واقعِ جانکاہِ عالم مستلی　　آہ رحلت کرد سید مولوی عالم علی

۱۲　　۵　　۹۵

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

ایک مثالی شخصیت

مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ

ہندوستان کے چند شہرۂ آفاق خاندانوں میں سے ایک نہایت برگزیدہ اور عالی نسب خاندان سادات حسنی کا وہ مبارک سلسلہ ہے جس کا پہلا وطن نصیر آباد اور دوسرا تکیہ کلاں (دائرہ شاہ علم اللہؒ) رائے بریلی ہے، اس خانوادۂ علم وعمل کی مشہور شخصیات حضرت شاہ علم اللہ (خلیفہ حضرت سید آدم بنوری مجددی) اور حضرت شاہ ابو سعید (تلمیذ حضرت شاہ ولی اللہ کے مرتبہ ومقام سے کون اہل نظر ناواقف ہے۔

اس طرح اس خاندان کے افراد نسبت ولی اللہی اور مجددی کے جامع، اور ان کے علوم ومعارف کے امین تھے اور بقول علامہ سید سلیمان ندوی:۔

"اس میں مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا فیض آکر مل گیا تھا"[1]

تیرھویں صدی ہجری میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی تحریک اور توحید وسنت کی تجدید اسی مبارک خانوادہ کے ذریعہ ہوئی، حضرت سید احمد شہیدؒ اسی گھرانے کے لعل شب چراغ تھے جن کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا ٹمٹماتا چراغ روشن، توحید کا غلغلہ بلند، اور اتباع سنت کا ولولہ تازہ ہوا، ان کی کاوشوں کا عکس آج بھی دل فروز اور ملت کے لیے مینارۂ نور ہے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اس برصغیر کے بیشتر تعلیمی وتبلیغی سلسلے انھیں کے سوز دروں کی بازگشت۔ اور انھیں کی کاوشوں کا پرتو ہیں، جس کے اثرات سے ہندو پاک کا خطہ

---

[1] مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ صـ ۱۶-۱۷ (لکھنؤ، ۱۳۹۰ھ)

منورہ اور ذرہ ذرہ درخشاں ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند!

حضرت سید احمد شہیدؒ کی قدر دانی میں اہل خاندان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، چنانچہ خاندان کے ان خوش نصیب افراد میں جو حضرت سید صاحب سے بیعت اور خلافت باطنی سے سرفراز ہوئے۔ مولانا میر عبد العلیؒ[1] اپنے علمی و عملی کمالات میں ممتاز تھے۔ ان کے صاحبزادے مولانا حکیم فخر الدین خیالیؒ[2] اور ان کے نامور فرزند مولانا عبد الحئیؒ[3] رائے بریلوی تھے، مولانا

---

[1] حضرت سید احمد شہید کے ہم جد ہیں ان کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت پر حضرت سید احمد شہید سے مل جاتا ہے، مولانا میر عبد العلی فاضل عالم، شعر و سخن کے ذوق سے بہرہ ور نہایت خلیق و فیاض، درویش صفت اور نیک و صالح بزرگ تھے۔ باوجود تحصیلدار ہونے کے (جو اس زمانہ میں بڑا اعزاز اور اہم عہدہ سمجھا جاتا تھا) فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، نقاشی و خوش خطی کا بھی عمدہ ذوق تھا، عربی میں علی اور ریختہ میں ہجر تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں وفات پائی۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ نزہۃ الخواطر ج۷ ص۲۸۶ اور حیات عبد الحئی ص۸-۱۱

[2] مولانا حکیم فخر الدین خیالی ۱۲۵۶ھ میں ولادت ہوئی، نامور اساتذہ اور ممتاز علماء سے تعلیم پائی۔ وہ جید عالم، ادیب و انشاپرداز اور فارسی، اردو، اور بھاشا کے باکمال شاعر تھے، امیر اللہ تسلیم لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور مولانا سید محمد ظاہر نقشبندی حضرت مولانا خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی سے طریق نقشبندیہ میں اجازت حاصل تھی، اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے نسخ و نستعلیق اور خط شفیعہ بہت عمدہ لکھتے تھے۔ تصانیف کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا جس میں "مہر جہانتاب" اس عہد کا عظیم ترین علمی اور تاریخی کارنامہ ہے۔ ۱۰ رمضان ۱۳۲۶ھ ۶ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں وفات پائی، مفصل حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ نزہۃ الخواطر ج۸ ص۳۵۴-۳۵۸ اور حیات عبد الحئی ص۱۴-۲۶

[3] خانوادہ حسنی کے نامور فرزند، ندوۃ العلماء کے ناظم، اسلامی ہند کی تاریخ کے رمز آشنا، نزہۃ الخواطر، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، جنۃ المشرق اور گل رعنا جیسی قیمتی کتابوں کے مصنف، اور گوناگوں علمی و مذہبی خدمات کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہیں۔ ۱۸ رمضان ۱۲۸۶ھ (۲۲ دسمبر ۱۸۶۹ء) میں ولادت ہوئی، اور تقریباً پچپن سال کی عمر میں ۱۰ جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ ۲۲

(۲ فروری ۱۹۲۳ء) میں وفات پائی۔ مزید معلومات کے لیے دیکھیے حیات عبد الحئی از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی۔

عبدالحیؒ کے دو صاحبزادے ہوئے (مولانا) ڈاکٹر سید عبدالعلی (انھیں کا تذکرہ یہاں مقصود ہے)
اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

الخیل واللیل والبیداء تعرفھم
والسیف والرمح والقرطاس والقلم

ولادت و مکتب نشینی!

ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ (یکم دسمبر ۱۸۹۳ء) کو دین و دیانت کے گہوارہ اور علم و معرفت کے ماحول فتحپور ہسوہ[۱] میں جو ان کا ننھیالی وطن تھا پیدا ہوئے، ہسوہ ہی میں بسم اللہ خوانی کے بعد مولانا عبدالحکیم صاحبؒ کیرانوی[۲] کے پاس مکتب نشینی ہوئی، قرآن پاک اور اردو کی تعلیم ان ہی کے زیر سایہ حاصل کی۔

وہیں فارسی کی ابتدا ہوئی، مولانا عبدالحیؒ اس وقت لکھنؤ میں تھے، وہ ان کی تربیت اور تعلیمی کیفیت کی نگرانی رکھتے۔ اور خطوط کے ذریعہ رہنمائی فرماتے رہتے، ایک خط میں (جو ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوا) لکھتے ہیں:۔

"صبح کو پہلے تلاوت قرآن شریف مکتب میں جاکر کیا کرو، ربع سے کم نہ ہو، اس کے بعد اصول فارسی

---

[۱] قصبہ ہسوہ ضلع فتحپور کا ایک مردم خیز علاقہ ہے۔ ساتویں صدی میں ایک بزرگ سید علاء الدین شہید جو مجاہد کبیر امیر قطب الدین المدنی کی جماعت میں سے تھے یہاں آئے اور اس کے قلعے کو فتح کیا اور شہید ہوئے اس کے بعد اس علاقہ میں بے شمار بزرگ اور علماء پیدا ہوئے جو سادات حسینی واسطی کے چشم و چراغ تھے اس خاندان میں مولانا سید محمد مہدی، مولانا ابوالقاسم، مولانا سراج الدین (خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) مولانا عبدالسلام صاحب (خلیفہ شاہ احمد سعید مجددی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

[۲] کیرانہ ضلع مظفر نگر (یوپی) کے رہنے والے بابرکت بزرگ اور حقانی عالم تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ ڈاکٹر عبدالعلی ان سے بے حد متاثر ہوئے، آخر عمر تک بہت بلند الفاظ سے ان کا تذکرہ کرتے تھے۔

مستفاد از حیات عبدالحیؒ ص ۴۴۳

شروع کرو، اور دوسرے وقت فارسی کی دوسری، اور برابر لکھتے رہو کہ کس قدر ہوئی، اصول فارسی کو سمجھ کر پڑھنا اور زبانی یاد کرنا، علاوہ اس کے اپنے خط کو درست کرو اور فارسی رقعے لکھو،"ے

اس کے بعد والد ماجد نے یہ پسند کیا کہ ان کا زیادہ وقت حکیم فخر الدین خیالی کے پاس جو ان کے دادا تھے گزرے تاکہ یہ ان کے ذوق ادب سے استفادہ کریں اور فارسی ادب و انشا میں کمال اور خوشنویسی میں پختہ استعداد بہم پہنچائیں۔ فارسی کی تکمیل کے بعد لکھنؤ چلے گئے، تھے جہاں اس وقت والد محترم ناظم ندوۃ العلماء تھے، اور نامور اساتذہ درس کی مجلسیں سجائے ہوئے تھے۔ ان سے فیضان پایا۔ اسی دوران مشہور محدث شیخ حسین بن محسن یمانی لکھنؤ آئے تو ان سے اجازت حدیث حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند میں!

اس وقت دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا دریائے فیض جاری تھا، اور تشنگان علم سیراب ہو رہے تھے، اسی دریائے فیض سے استفادہ کے لیے ڈاکٹر عبد العلی بھی ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم پہنچے، حضرت شیخ الہند نے سید احمد شہید کی نسبت اور مولانا عبد الحئی کے تعلق سے، بیحد اکرام فرمایا، ان کے لیے گھر سے کھانا بھی اکثر خود ہی لاتے جس سے ڈاکٹر صاحب کو نہایت شرمندگی ہوتی، حضرت کے یہاں قیام بڑی سعادت تھی مگر حضرت کی اس تکلیف فرمائی کے خیال سے دارالاقامہ منتقل ہو گئے، اور وہاں ایک سال قیام کیا، بخاری و ترمذی مولانا محمود الحسن سے، ابوداؤد حضرت علامہ انور شاہ کشمیری سے پڑھی اور سالانہ امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کے حسن اخلاق اور علمی انہماک سے اساتذہ بیحد متاثر ہوئے، انکی سلامت طبع اور علوئے استعداد کی وجہ سے اساتذہ خصوصاً حضرت شیخ الہند کو ان کی دینی و علمی مصروفیات پر نظر اور اس مقصد میں مشغول رہنے کی فکر رہی جس کے لیے دیوبند کا سفر ہوا تھا، حضرت شیخ الہند خطوط کے ذریعہ اس کی معلومات فرماتے رہتے۔

ے حیات عبد الحئی صفحہ ۳۴۷

طب یونانی کی تعلیم!

طب خاندانی مشغلہ تھا، والد صاحب اور دادا دونوں فاضل طبیب تھے، یوں بھی طب اس زمانہ میں آزاد اور باعزت ذریعہ معاش سمجھا جاتا تھا، اور اس کے ساتھ دینداری اور عملی مشاغل کے لیے بڑی گنجائش تھی۔ اس لیے والد صاحب سے طب کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کی مشق شروع کی، پھر والد ماجد کے مشورہ سے دہلی پہنچکر مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی بے نظیر حذاقت ومہارت اور وسیع تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور ساتھ ہی ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری سے ایلوپیتھک میں استفادہ کیا۔

انگریزی تعلیم!

دہلی سے واپس آئے تو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا، نہایت خوشی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر سٹی نیل اسکول میں داخلہ لے لیا، یہ مشنری اسکول تھا جس میں طلبا، زیادہ تر خوشحال اور مغربی ماحول کے پروردہ تھے۔ اور اکثر استاد بھی عیسائی اور یوروپین تھے، یہ فضا دینی مزاج رکھنے والے طلبا کے لیے بڑی امتحان گاہ تھی، لیکن خاندانی اثرات اور تربیت کا کمال تھا جس نے اس ماحول میں بھی مذہبی معمولات، وضع قطع اور لباس میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ سادہ معمولی لباس، اور نمازوں کی پابندی اسی طرح رہی جس طرح اس سے پہلے تھی۔

اس اسکول سے امتیازی حیثیت سے میٹری کولیشن کا امتحان ۱۹۱۵ء میں پاس کیا، اور قیمتی کتابیں انعام میں حاصل کیں، اس کے بعد لکھنؤ کے مشہور کرسچین کالج میں انٹرمیجیٹ کے لیے داخلہ لیا، اور عربی فارسی تاریخ، ادب وغیرہ مضامین (جو نسبتہ ان کے لیے سہل تھے) کے بجائے انگریزی لٹریچر، علم الحیات، طبعیات، اور کیمیا کے مشکل موضوعات کا انتخاب کیا جس سے ان کی عالی ہمتی اور بلند نگہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایف ایس سی کے بعد اسی سال کینگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے، اور ۱۹۱۹ء میں بی ایس سی کے امتحان میں اس امتیاز سے کامیاب ہوئے کہ کنگ کالج میں پہلی اور الہ آباد یونیورسٹی میں جس سے یہ کالج ملحق

تھا۔ دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس میں خاص مضمون علم نباتات تھا، اس کامیابی پر ۱۹۱۹ء کے جلسہ تقسیم اسناد میں دو تمغے ملے جس میں ایک تمغہ سونے کا تھا۔

میڈیکل کالج میں داخلہ

اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں بھی اسی مومنانہ شان سے وقت گزارا اور مذہبی معمولات میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیا، جو بجائے خود ایک بڑا کارنامہ، پختگی ایمان اور سلامت طبع کی دلیل ہے۔

ایک مرتبہ امتحان ہال میں نماز کا وقت آگیا تو انھوں نے وہیں شیروانی بچھا کر نماز شروع کر دی، نگراں امتحان نے دیکھا اور جب یہ نماز سے فارغ ہو گئے تو آ کر معذرت کی اور کہا کہ "اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ آپ کی عبادت اور نماز کا وقت ہے تو ہم چٹائی یا فرش کا انتظام کر دیتے۔"

کالج کا انگریز پرنسپل ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی فن سے مناسبت اور اصابت رائے کا بیحد معترف تھا، بعض مرتبہ پرنسپل کی طبیعت خراب ہوتی یا کوئی اہم کام ہوتا تو مریض کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو بھیجدیتا۔

والد صاحب کا انتقال

میڈیکل کی تعلیم کا تیسرا چوتھا سال تھا ڈاکٹر صاحب کالج کی طرف سے زنانہ امراض کے مطالعہ کے لیے مدراس میڈیکل کالج کے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ اور وہاں سے گول کنڈہ حیدرآباد وغیرہ کے تاریخی مقامات دیکھتے ہوئے واپس ہو رہے تھے کہ بمبئی میں والد ماجد کے انتقال کی الم ناک خبر ملی، فوراً لکھنؤ پہونچے تو گھر کی بساط الٹ چکی تھی اور چمن اجڑ گیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے بڑی پامردی اور استقلال سے اس افتاد کا مقابلہ کیا اور خاندان کی کفالت و معاش کی ذمہ داریوں سے بڑی حد تک کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے۔

ایم بی بی ایس کی ڈگری اور مطب!

۱۹۲۵ء (۱۳۴۳ھ) میں میڈیکل کے آخری سال کا امتحان دیا، اور ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی، اور رجب ۱۳۴۴ھ (جنوری ۱۹۲۶ء) میں اپنا مطب (پریکٹس) شروع کیا، چونکہ یونانی اور ایلوپیتھک دونوں کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی اور دونوں ہی میں مہارت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا مطب کم از کم لکھنؤ میں اس طرح کا پہلا مرکز تھا، عرصہ تک اسی جامعیت کے ساتھ مطب کرتے رہے غالباً ۱۹۳۰ء میں ہومیو پیتھک طریقہ علاج کا مطالعہ کیا اور اس کی تاثیر کے قائل ہو گئے تھے۔ اس لیے آخری سالوں میں اسی طریقہ علاج کو ترجیح دینے لگے تھے، حالانکہ اس سے آمدنی کو خاصا نقصان پہنچا مگر انھوں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ وہ دیانت دارانہ علاج اور مریض کے نفع کو اپنی آمدنی سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔

مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت

خاندانی ماحول، تربیت اور ذہنی افتاد کا تقاضا تھا کہ خود کو کسی مرد باخدا کے حوالہ کر کے ان کے زیر سرپرستی مراحل حیات اور راہ سلوک طے ہو، اس کے لیے نظر انتخاب مولینا محمود الحسن دیوبندی (شیخ الہند) پر گئی، مگر ان سے بیعت ہونے کا موقعہ نہیں آیا تھا کہ وہ رحلت فرما گئے۔ اس لیے ان کے جانشین اور ان کے علم و معرفت کے امین مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، اور زندگی بھر اس تعلق کو نبھایا، اور حضرت مولانا مدنی کو بھی ان سے بے حد محبت و مناسبت اور قلبی تعلق تھا جو سخت ترین حالات سے بھی متاثر نہیں ہوا۔

مشائخ عصر کی خدمت میں!

حضرت مولانا مدنی سے بیعت و استفاضہ کے تعلق کے ساتھ ساتھ دوسرے اہل اللہ اور مشائخ عصر سے بھی بڑی عقیدت و محبت تھی، ان کی خدمات میں حاضری اور ملاقات کو باعث سعادت اور سرمایۂ آخرت جانتے تھے، چنانچہ جب حکیم الامت مولانا اشرف علی

تھانوی ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ تشریف لائے تو ڈاکٹر صاحب کا ان کی مجلس میں روزانہ حاضری کا معمول تھا، اور حضرت بھی شفقت فرماتے، حضرت تھانوی لکھنؤ کے اس چالیس روزہ قیام میں کسی کے مکان پر نہیں گئے، لیکن ایک روز خود ہی ڈاکٹر صاحب سے فرمایا "میرا آپ کے گھر آنے کا جی چاہتا ہے، اور میں بعد مغرب چلوں گا" حسب ارشاد مغرب کے بعد تشریف لائے اور ایک گھنٹہ قیام کے بعد واپس ہو گئے[1]۔

اس کے بعد دوبارہ جب ۱۹۴۱ء میں حضرت تھانوی کی لکھنؤ تشریف آوری ہوئی تو اس دوران بھی ڈاکٹر صاحب پابندی سے حاضر ہوتے رہے اور حضرت کی مجالس میں شرکت کرتے رہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے قیام لکھنؤ کے موقعہ پر بھی ڈاکٹر صاحب بہت اہتمام سے مولانا کی مجالس میں شریک ہوتے، اور حضرت مولانا بھی کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے، ایک مرتبہ فرمایا: "ڈاکٹر صاحب بڑے بابرکت آدمی ہیں"۔

خاندان فرنگی محل سے دیرینہ روابط اور خاندانی مراسم تھے، ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں یہ تعلق اور زیادہ قریبی ہو گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب فرنگی محل کے عمومی معالج بن گئے تھے۔

مولانا عبدالشکور صاحب کاکوروی سے بھی قدیم تعلقات تھے، ان کی پاکیزہ نفسی للہیت اور بے غرض خدمات کے ڈاکٹر صاحب بے حد معترف تھے۔

مولانا محمد الیاس صاحب سے عقیدت!

ڈاکٹر صاحب کو حضرت مولانا محمد الیاس سے بیحد عقیدت اور ان کی تبلیغی جماعت سے گہری وابستگی تھی، جب مولانا محمد الیاس رجب ۱۳۶۲ھ جولائی ۱۹۴۳ء میں لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام ہوا تو کچھ وقت ڈاکٹر صاحب کے مکان پر بھی گزارا۔ ڈاکٹر صاحب کو مولانا سے کچھ ایسی محبت و انسیت تھی کہ باوجود سفر کی عادت نہ ہونے کے نظام الدین تشریف لے گئے۔ اور کئی روز مولانا کی خدمت میں رہے۔ مولانا کو اس آمد سے بیحد مسرت ہوئی، اور جب ڈاکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو مولانا نے یہ شعر پڑھا

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے جو تعلق تھا وہ ان کے وصال کے بعد مولانا کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یوسف

---

[1] اور اسی موقع پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے صاحبزادے مولانا محمد الحسنی کی جو اس وقت ۳ سال کے تھے بسم اللہ کرائی۔

کے طرف منتقل ہوگیا تھا اور تبلیغی کاموں میں ... (ہاشیہ پر قلمی تحریر، جزوی طور پر ناخواندہ)

مولانا وحید الدین خاں

متحدہ محاذ کی سیاست

یہ دوسری صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے۔ لوگ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے اور ہر صبح شام ایک نئی حکومت کے منتظر تھے جس کی ایک روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی ___ دوسری طرف ہاشمی (یا عباسی) خاندان کے کچھ لوگ بنی امیہ کے کھنڈر پر اپنی شاہی عمارت اٹھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس صورت حال نے ایک طرف عوام اور دوسری طرف عباسی حوصلہ مندوں کے لیے ایک مشترک نقطہ فراہم کر دیا ___ بنی امیہ کا خاتمہ۔ اگرچہ مظلوم عوام کے لیے اس کا محرک کچھ اور تھا اور عباسی حوصلہ مندوں کے لیے کچھ اور ___ اس مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں ۱۳۲ھ میں خلافت بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور سفاح تخت نشین ہوا، جو عباسیوں کا پہلا خلیفہ تھا۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ ہوا۔ ۱۳۶ھ میں اس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ بنو امیہ کے آخری زمانہ میں جو لوگ ان کے خلاف تحریک چلا رہے تھے ان میں محمد بن عبد اللہ (نفس ذکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ لوگ امام حسن ابن علی کی اولاد سے تھے۔

بنو عباس جو نسلی وجوہ سے اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے اور اموی سلطنت کو ختم کرنا چاہتے تھے، جب انھیں مذکورہ بالا دونوں بھائیوں کی خفیہ تحریک کا علم ہوا تو وہ ان سے مل گئے۔ حتی کہ خود المنصور (جو بعد کو خلیفہ ہوا) نے نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اموی سلطنت ختم ہوئی اور عباسی سلطنت اس کی جگہ قائم ہو گئی۔ مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ مظالم اور زیادہ بڑھ گئے۔ حتی کہ شاعر کو کہنا پڑا:

فمہلاً یا بنی العباس مہلاً   لقد کویت بغدرکم الصدود

(اے بنی عباس اپنا ظلم چھوڑ دو تمھاری غداری سے سینے داغدار ہو چکے ہیں۔)

چنانچہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی دونوں روپوش ہو گئے اور جو "انقلابی تحریک" پہلے وہ بنی امیہ کے خلاف چلا رہے تھے اس کو اب بنو عباس کے خلاف چلانے لگے۔ یہاں تک کہ موقع پاکر انھوں نے خروج (سلطنت سے بغاوت) کا اعلان کر دیا اور مدینہ میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد ان کا جو انجام ہوا وہ یہ کہ نفس زکیہ ۱۴۵ھ میں مارے گئے اور ان کا سر منصور کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہی منصور جس نے ان کے ہاتھ پر نوجوانی کی عمر میں بیعت کی تھی۔

عباسی سلطنت کے قیام سے پہلے نفس زکیہ کی تحریک اور عباسی تحریک دونوں کا مشترک دشمن ایک تھا۔ یعنی بنو امیہ۔ مگر جب عباسی تحریک نے بنو امیہ کی تحریک کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور عباسی سلطنت قائم ہو گئی تو اب صورت حال بدل گئی اب عباسی سلطنت کے لیے نفس زکیہ دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیوں کہ وہ موجودہ عباسی سلطنت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ وہی المنصور جو "انقلاب" سے پہلے نفس زکیہ کا حلیف تھا، اب ان کا دشمن بن گیا۔ اس نے ان کی تحریک کو ختم کرنے میں اتنی سرگرمی دکھائی کہ دو مہینے تک لباس نہیں بدلا اور بستر پر نہیں سویا۔ اس کو اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک اس نے اس تحریک کو ختم نہ کر لیا۔

تاریخ کا یہ تجربہ ایک ہزار سال پہلے پیش آچکا تھا جو بتا رہا تھا کہ مختلف محرکات رکھنے والے لوگ جب کسی مقصد کے لیے متحدہ محاذ بناتے ہیں تو اس کا فائدہ ہمیشہ اس فریق کو حاصل ہوتا ہے جو زیادہ زور آور اور ہوشیار ہو ــــــ مگر عجیب بات ہے کہ اس تجربے سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور لوگ بار بار اسی ناکام تجربہ کو دہراتے رہے۔

جمال الدین افغانی (۱۸۳۸-۱۸۹۷) نے مصر میں احیائے ملت کا علم بلند کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے قوم پرستوں کی ایک انجمن الحزب الوطنی کے نام سے قائم کی جس کے ممبروں کی تعداد کافی وسیع تھی۔ اس میں شیخ محمد عبدہ، سعد زاغلول پاشا، عبد اللہ نعیم بے اور احسان بے جیسے ممتاز لوگ شامل تھے۔ مصر میں جمال الدین افغانی کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ وہاں کی با اثر جماعت تھیست انو سیہ نے ان کو اپنا صدر نامزد کیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب جمال الدین افغانی کی انجمن کا ایک خفیہ رکن توفیق پاشا مصر کے تخت حکومت پر متمکن ہو گیا۔

اگرچہ اس کامیابی میں فرانس اور برطانیہ کا زیادہ ہاتھ تھا۔ اس واقعہ کے بعد جمال الدین افغانی اور ان کے "قوم پرست" ساتھی بہت خوش ہوئے۔ انھیں نظر آیا کہ ان کی دیرینہ آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ یہ محض سراب تھا —— توفیق پاشا نے تخت پر بیٹھتے ہی جمال الدین افغانی اور ان کے مخصوص خادم ابو تراب کو مصر سے جلا وطنی کا حکم دے دیا۔ توفیق پاشا، سید جمال الدین افغانی کی خفیہ مجلسوں میں شریک ہو چکا تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لوگ امپیریلزم کے شدید مخالف ہیں۔ چوں کہ توفیق پاشا کو انھیں امپیریلسٹ طاقتوں (فرانس اور برطانیہ) کی حمایت سے کام کرنا تھا، اس لیے اس نے مصر میں ان کی موجودگی کو حکومت کے لیے ایک خطرہ سمجھا۔ اس نے فوج اور پولس کی کڑی نگرانی میں جمال الدین افغانی اور ان کے خادم کو سوئز بھیج دیا اور وہاں انھیں بجبر کشتی پر سوار کر کے روانہ کر دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ صرف نصف صدی بعد اسی مصر میں ٹھیک اسی غلطی کو دوبارہ اس سے زیادہ بری شکل میں دہرایا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جب مصر میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور فوجی افسروں نے ملک میں حکومت قائم کر لی تو ایک صاحب مجھ سے ملے۔ "مولانا ..... مصر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔" انھوں نے بہت رازدارانہ انداز میں کہا

"کیوں خیریت تو ہے" میں نے پوچھا۔

"یہ جو مصر میں انقلاب ہوا ہے، بظاہر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ فوجی انقلاب ہے، مگر حقیقۃً اخوانی اس انقلاب کے ہیرو ہیں۔ اب مصر میں اخوان المسلمین کی حکومت ہو گی، مولانا اس لیے جانا چاہتے ہیں کہ اس نازک اور تاریخی موقع پر اخوانی لیڈروں کو نصیحت کریں اور اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے انھیں مفید مشورے دیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ مصر میں جو فوجی افسر انقلاب لائے تھے ان میں ایسے بھی تھے جن کے اخوان المسلمین سے تعلقات تھے۔ وہ اخوانی تحریک کی تائید کرتے تھے۔ حتی کہ خود جمال عبد الناصر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخوانیوں کے اجتماعات میں شریک ہوتے تھے۔ موجودہ صدر سادات کا بیان ہے کہ فوجی افسروں کی "انقلابی کونسل" نے ان کو مامور کیا تھا کہ وہ اخوانیوں سے رابطہ قائم

کریں اور انقلابی جدوجہد کے سلسلہ میں ان کی تائید حاصل کریں۔ چنانچہ جس رات کو شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹا گیا ہے۔ اخوانی رضا کار قاہرہ کی سڑکوں پر پہرہ دینے میں مشغول تھے۔ وہ ان خفیہ باتوں کے بھی رازدار تھے جن میں شاہ فاروق کو تخت سے معزول کرنے کی اسکیم بنائی گئی تھی۔

"جب اخوان المسلمین اور فوجی افسروں کے اشتراک سے مصر میں انقلاب آیا تھا تو کیوں ایسا ہوا کہ فوجی افسروں نے برسر اقتدار آنے کے بعد اخوانیوں کو ختم کر دیا"۔ یہ سوال اکثر لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ جواب بالکل سادہ ہے۔ یہ "اشتراک" اسی قسم کی ایک غلطی تھی جس کا نمونہ اوپر کی مثالوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

شاہ فاروق کی فوج کے کچھ جونیر افسر فاروق کی قبر کے اوپر اپنی حکمرانی کا تخت بچھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر انھیں شبہ تھا کہ وہ تنہا اپنے اس خواب کو عملی شکل دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف اخوان المسلمین مصر میں اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی اس تمنا کو کس طرح واقعہ بنائیں۔ دونوں کی راہ کی رکاوٹ بظاہر صرف ایک چیز تھی، شاہ فاروق کی حکومت۔ اس صورت حال نے دونوں گروہوں کے لیے ایک مشترک نقطۂ اتحاد فراہم کر دیا۔ باہم ملاقاتیں اور دوستیاں شروع ہو گئیں۔ خفیہ مجالس میں شاہ کے خلاف اسکیمیں بننے لگیں۔ دونوں خوش ہو گئے کہ مقصد کے حصول کا قریبی موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر جب حکومت بدلی تو فطری طور پر وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو زیادہ ہوشیار اور عملی طور پر حکومت سے قریب تر تھے اور اتفاق سے یہ وہی لوگ تھے جن کو اسلامی یگانگت سے زیادہ ذاتی حوصلوں کی تکمیل کے شوق نے فریق ثانی سے قریب کیا تھا۔ انقلاب کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ ان حوصلوں کی تکمیل میں پہلے جہاں شاہ فاروق کی شخصیت حائل تھی وہاں اب یہ "قدیم دوست" آ کر کھڑے ہو گئے ہیں یا کم از کم کھڑے ہو سکتے ہیں۔ حل بہت آسان تھا۔ پہلے کے فوجی افسر اب ملک کے حکمراں بن چکے تھے۔ انھوں نے اپنے قدیم دوستوں کو اس سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹا دیا جس کا مظاہرہ انھوں نے شاہ فاروق کی معزولی کے وقت کیا تھا۔

اسی اتحادی سیاست کو مزید بدتر شکل میں پاکستان میں دہرایا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا اور صدر ایوب کی "ڈکٹیٹر شپ" ملک میں قائم ہو گئی۔ یہ صورت حال ملک کے بہت سے لوگوں کے لیے پریشان کن تھی۔ ان میں ایک طبقہ "اسلام پسند" حضرات کا تھا، یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام لانے کے علم بردار تھے اور صدر ایوب اور ان کی "بنیادی جمہوریت" ان کے نزدیک اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ دوسرا گروہ سیکولر اور سوشلسٹ ذہن رکھنے والوں کا تھا۔ ان کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ "بنیادی جمہوریت" کے ہوتے ہوئے وہ ملک کے اقتدار پر قبضہ نہ کر سکیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کو ختم کیا جائے۔ دونوں گروہ آخری منزل کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف نقطہ نظر رکھتے تھے۔ تاہم دونوں محسوس کرتے تھے کہ "صدر ایوب" کی ذات دونوں کے لیے یکساں رکاوٹ ہے۔ اشتراک کی اس منفی بنیاد نے دونوں کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر یکجا کر دیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر ملک میں وہ طوفان مچایا کہ خود ملک دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ یہ متحدہ محاذ جو بڑے بڑے وعدوں کے ساتھ بنایا گیا تھا جب اپنے آخری انجام کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کا سارا فائدہ سیکولرزم اور سوشلزم کے علمبرداروں کے حصہ میں آیا ہے اور اسلام پسند گروہ کو اس کے سوا کچھ نہیں ملا کہ ساری طاقت خرچ کر کے سیاست کے صحرا میں ملوما محسورا بنے رہیں۔

اب اسی نادان سیاست کو ہندوستان کے کچھ مسلم قائدین نے اس ملک میں درآمد کیا ہے۔ وہ معاہداتی سیاست کے نعرے لگا رہے ہیں۔ الیکشن کے موقع پر وہ ایک سیاسی پارٹی سے مل کر دوسری پارٹی کو شکست دیتے ہیں۔ مگر قوم کے بے شمار وسائل کو خرچ کرنے کے بعد ان کے حصہ میں جو چیز آئی ہے وہ صرف یہ کہ الکشن کے بعد جب لوگ اسمبلیوں پر قبضہ کر لیں اور وزارتیں بنا لیں تو ہمارے لیڈر اسٹیج پر نمودار ہو کر یا پریس کانفرنس کر کے یہ "انکشاف" کریں کہ جیتنے والوں نے ہم سے فلاں فلاں وعدے کیے تھے جو پورے نہیں کیے گئے۔ ۱۹۶۷ء کے الکشن میں معاہداتی سیاست کے رہنماؤں نے دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر ریاستوں میں حکمراں کانگرس کو شکست دی۔ ۱۹۷۷ء کے الکشن میں اندرا گاندھی کی شکست کے بعد ایک مسلم رہنما نے کہا "آج ہم نے ظلم کا بیڑا غرق کر دیا" مگر ان فتوحات کے باوجود اصل صورت حال آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ وہ پہلے تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی غلطی کو ہم کب تک دہراتے رہیں گے۔ اصل سیاست یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو طاقتور اور مستحکم بنایا جائے۔ سیاسی اشتراک یا متحدہ محاذ ہمیشہ اس فریق کے لیے مفید ہوتا ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فیصلہ کن پوزیشن کا حامل ہو، اندرونی کمزوری اور انتشار کو درست کرنے سے پہلے متحدہ محاذ کی طرف دوڑنا نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس سلسلہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جہاں تک جزوی امور میں تعاون کا تعلق ہے۔ اس قسم کا تعاون ہر ایک سے لیا جاسکتا ہے، حتیٰ کہ کافر و مشرک سے بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے نازک سفر میں عبداللہ بن اُرَیقِط کو رہنما بنایا جو کہ مشرک تھا۔ صفوان بن امیہ آپ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ حالانکہ اس وقت تک وہ مشرک تھے۔ امام زہری نے روایت کیا ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعان بناس من الیھود فی حربہ فاسھم لھم (رواہ سعید فی سننہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض یہودیوں سے جنگ کے موقع پر مدد لی تو ان کے لیے مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا۔

مگر یہ جزوی اور انفرادی تعاون کی مثالیں ہیں۔ کلی جدوجہد کے سلسلہ میں کبھی اغیار پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر وہ جدوجہد جو "غیر صالح حکمراں" کو ہٹا کر اس کی جگہ "صالح حکمراں" کو لانے کے لیے کی جائے۔ اس قسم کی سیاسی جدوجہد تمام تر جماعت صالحہ کی اپنی طاقت پر ہونا چاہیے۔ کوئی جماعت صالح اگر اپنے بل پر انقلاب لانے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس کا غیر سیاسی دائرہ عمل میں کام کرنے پر قانع رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ غیر صالح عناصر کو لے کر عملی سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ یہ غیر صالح عناصر اپنے مزاج کی بنا پر ایسا کبھی نہیں کر سکتے کہ "غیر صالح حکمراں" کو بے دخل کرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور خالی شدہ تخت کو تمام تر جماعت صالحہ کے حوالے کر دیں۔ وہ لازماً یہ چاہیں گے کہ تخت پر خود قبضہ کریں۔ اس وقت "متحدہ محاذ" کے اندر باہمی کشمکش شروع ہو گی جو یقینی طور پر غیر صالح عناصر کے غلبہ پر ختم ہو گی۔ ساری تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے۔

("الرسالہ دہلی" کے شکریہ کے ساتھ)

محمد منظور نعمانی

بابا رتن الہندی

(۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے "الاصابہ فی تمیز الصحابہ" میں امام جرح و تعدیل حافظ ذہبی کی تصانیف، "تجرید"، "میزان الاعتدال" اور پھر اس رسالہ سے جو انھوں نے مستقل طور سے "بابا رتن" کے بارہ میں لکھا تھا۔ جو کچھ نقل کیا ہے (جو پہلی قسط میں ذکر کیا جا چکا ہے) اس سے ناظرین کو معلوم ہو چکا کہ حافظ ذہبی نے بابا رتن کے قصہ سے متعلق تین احتمال ذکر کیے ہیں۔

ایک یہ کہ یہ ساری کہانی اول سے آخر تک کسی کذاب و وضاع کی گھڑی ہوئی ہو اور فی الواقع بابا رتن کا کوئی وجود ہی نہ ہو (جس طرح کہ کذابین و وضاعین نے بہت سے قصے اور بیشمار موضوع حدیثیں گھڑی ہیں، جنکی کوئی اصل نہیں۔)

دوسرا احتمال انھوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان میں کسی مکار و فریب کار، بوڑھے فنکار نے بیچارے بے علم اور کم عقل مسلمانوں کو عقیدت کے جال میں پھانسنے کے لیے یہ سوانگ بھرا ہو اور اپنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی بتایا ہو

تیسرا احتمال یہ ذکر کیا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان ابلیس سیدھے سادے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک بوڑھے بزرگ کی صورت میں ظاہر ہوا ہو۔ (کتاب و سنت سے یہ بات ثابت ہے کہ شیطان کو اس کی قدرت دی گئی ہے۔)

بابا رتن کے بارہ میں حافظ ذہبی کی اس رائے کی تین دلیلیں اور بنیادیں ہیں ——

اول یہ کہ ان کے دعوائے صحابیت کو تسلیم کرنے والے ان کے عقیدت مندوں نے موسیٰ بن مجلی جیسے لوگوں کی سند سے جو "رتنیات" (یعنی ان کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے جو "حدیثیں" نقل کی ہیں، ان میں ایسی ایسی لغویات ہیں جنکی نسبت کسی اچھے مسلمان کی طرف بھی نہیں کی جا سکتی چہ جائیکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ (ان کا نمونہ ناظرین کرام اس سلسلہ کی پہلی قسط میں ملاحظہ فرما چکے ہیں)

اُن کی دوسری دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان میں ظاہر ہونے والے اس شخص (بابا رتن) کے ان دعووں کو صحیح مانا جائے (کہ "میری عمر سات سو سال ہے، اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی ہوں، میں نے آپ کو اپنے ایک تجارتی سفر میں مکہ کی ایک وادی میں اونٹ چراتا ہوا اُس وقت بھی دیکھا تھا جب آپ کم سن بچے تھے۔ —— اور پھر دعوائے نبوت کے بعد بھی مکہ جا کر میں نے آپ سے ملاقات کی اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، اور پھر اس کے بہت مدت بعد میں ہندوستان سے "مدینہ منورہ جا کر بھی آپ سے ملا اور میں غزوۂ خندق میں آپ کے ساتھ تھا، اور آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کی رخصتی کی تقریب میں بھی شریک ہوا تھا —— الغرض اگر اس کے ان دعووں کو تسلیم کیا جائے)۔ تو اس کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی اور اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے پورے چھ صدیوں تک یہ شخص (بابا رتن) کہاں چھپا رہا کہ عرب و عجم میں کسی کو اس کا پتہ نہیں چلا، کسی نے اس کا نام بھی نہیں سنا، ان صدیوں کے کسی مورخ اور مصنف نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ ساتویں صدی سے بہت پہلے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی اور اس کے طول و عرض میں اسلام پھیل چکا تھا اور تاریخیں بھی لکھی جا رہی تھیں۔)

ظاہر ہے کہ یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ ایک ایسی عجیب و غریب شخصیت دنیا میں موجود ہو اور ایک نہ دو پورے چھ سو سال تک کسی کو اُس کا پتہ نہ ہو۔

حافظ ذہبی کی تیسری دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں (اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مروی ہے کہ وفات شریف سے ایک مہینہ پہلے آپ نے ایک رات میں ارشاد فرمایا کہ

"روئے زمین پر اس وقت جو لوگ زندہ اور موجود ہیں آج سے

سو برس پورے ہونے پر اُن میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔"

پس جس شخص نے پورے چھ سو برس گزر جانے کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ میں حضورؐ کے عہد مبارک میں تھا اور میں نے آپ سے بار بار ملاقاتیں بھی کی ہیں اور میں آپ کا صحابی ہوں، وہ اس صحیح حدیث نبوی کی رو سے یقیناً جھوٹا اور کذاب ہے۔

حافظ ابن حجر نے حافظ ذہبی کا وہ پورا کلام جس کا حاصل اوپر کی سطروں میں لکھا گیا، "الاصابہ" میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حافظ ذہبی نے (موسیٰ بن مجلی صوفی سے روایت کیے جانے والے) "رتنیات" کے جس مجموعہ کا ذکر اپنے رسالہ میں کیا ہے وہ مجھے بھی مل گیا، اس میں تین سو سے کچھ زیادہ رتنی "حدیثیں" ہیں —— اس کے بعد حافظ ابن حجر نے ان "رتنیات" کے روایت کرنے والے بعض اور لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی بہت سی روایتیں بھی الاصابہ کے کئی صفحات میں نقل کی ہیں —— ان میں سخت متضاد روایتیں بھی ہیں —— ان سب کو صبر کے ساتھ پڑھ کر ہر صاحبِ عقل و فہم اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ جن لوگوں نے یہ روایتیں گھڑی ہیں ان میں ناخدا ترسی کے علاوہ عقل عام کی بھی بہت کمی تھی۔

ان میں بابا رتن کی بیان کی ہوئی وہ روایتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کافی زیادہ تھی اور انھوں نے آنحضرتؐ کو پہلی دفعہ اُس وقت دیکھا تھا جب آپ کم سن بچے تھے اور مکہ کی ایک وادی میں اونٹ چرا رہے تھے۔ (یہ روایت پوری تفصیل کے ساتھ ناظرین کرام الفرقان کے نومبر کے شمارہ میں "الاصابہ" ہی کے حوالہ سے پڑھ چکے ہیں۔)

اور اسی میں وہ روایتیں بھی ہیں جن میں بابا رتن نے بتایا ہے کہ میں جب ہندوستان سے مدینہ منورہ پہنچکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غزوہ خندق کے موقع پر ملا تو اُس وقت میری عمر چودہ سال کی تھی (الاصابہ ص۲۳۱ ج۲)، اُن کے اس بیان کے حساب سے اُن کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً ۴۰۔۴۵ سال کم ہوتی ہے۔

علیٰ ہذا اس میں وہ روایت بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مکہ معظمہ کا پہلا

سفر اپنے باپ کے ساتھ تجارت کے سلسلہ سے کیا تھا، اور اسی سفر میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کی ایک وادی میں اونٹ چراتا ہوا دیکھا تھا جبکہ آپ کم سن بچے تھے۔

(الاصابہ ص ۲۲۸ ج ۲)

اور اسی میں وہ روایت بھی ہے جس میں بابا رتن نے اپنے اس پہلے سفر کا قصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ "میں نے سنا کہ "خاتم النبیین" حجاز میں ہیں تو میں ان کی ملاقات کے لیے سمندر کے راستہ سے روانہ ہوا اور تین دفعہ ایسا ہوا کہ جس کشتی پر میں سوار ہوا وہ ٹوٹ ٹوٹ گئی، پھر میں چوتھی کشتی میں سوار ہوا تو اُس نے مجھے جدہ پہنچایا، تو میں نے جدہ اور مکہ کے درمیان ایک وادی میں ایک کم سن بچے کو اونٹ چراتا ہوا دیکھا (آگے وادی میں سیلاب آجانے اور حضور کو گود میں اٹھا کے سیلاب سے نکالنے کی وہی کہانی ہے جو ناظرین کرام الفرقان میں پہلے پڑھ چکے ہیں) (الاصابہ ص ۲۲۳ ج ۲)

اسی طرح "رتنیات" کے اس ذخیرہ میں وہ روایت بھی ہے جس میں بابا رتن نے بیان کیا ہے کہ میں نے ایک رات کو اپنے مکان ہی پر دیکھا کہ چاند آسمان پر دو ٹکڑے ہو گیا، تو میں نے اُس کے بارہ میں تحقیق کی تو بعض مسافر تاجروں اور سیاحوں سے معلوم ہوا کہ عرب کے شہر مکہ میں ایک نبی ظاہر ہوا ہے اور اس نے اپنی قوم کے مطالبہ پر شق القمر کا معجزہ دکھایا تھا تو میں آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے مکہ روانہ ہو گیا اور میری آپ سے مکہ مکرمہ میں ملاقات ہوئی اور یہ میری آپ سے دوسری ملاقات تھی اور اسی ملاقات میں نے آپ کی دعوت پر آپ ہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا (الاصابہ ص ۲۲۹ ج ۲)

اور اسی صفحہ پر یہ روایت بھی ہے کہ بابا رتن نے بیان کیا کہ میں پہلے بت پرست تھا، ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تو بت پرستی چھوڑ دے اور دوسرا دین تلاش کر! میں نے پوچھا کہ دوسرا دین کہاں تلاش کروں؟ اُس نے جواب دیا کہ ملک شام میں! تو میں شام پہنچا، میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ عیسائی ہیں، تو میں عیسائی ہو گیا اور مدت تک عیسائی رہا، پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سنی اور سنا کہ وہ عرب کے شہر مدینہ میں ہیں تو میں آپ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا اور میں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا (الاصابہ ص ۲۲۹ ج ۲)

اسی طرح اس میں بابا رتن کے دو لڑکوں کا بھی ذکر ہے اور اُن کا نام محمود اور عبد اللہ بتلایا گیا ہے اور اس ذخیرہ میں بہت سی روایتیں انہی کے واسطہ سے نقل کی گئی ہیں۔

اور پھر اسی میں بابا رتن سے ملاقات کرنے والے اور ان سے روایت کرنے والے اُن کے ایک "تابعی" موفق الدین علی بن محمد خراسانی، کی یہ روایت بھی سند کے ساتھ نقل کی گئی ہے کہ انھوں نے بابا رتن کے بارہ میں بیان کیا کہ

انہ لم یتزوج قطّ ولا احتلم الا مرۃً فی الجاھلیۃ (الاصابہ ج۱ ص۲۳)	بابا رتن نے کبھی شادی ہی نہیں کی اور ان کو زندگی بھر کبھی احتلام بھی نہیں ہوا، سوائے ایک دفعہ کے جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ہوا تھا۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ حافظ ابن حجر نے اِن "رتنیات" کو الاصابہ کے پورے ۴-۵ صفحوں پر اسی لیے نقل کر دیا ہے کہ ان کو دیکھ کے اور پڑھ کے ہر شخص کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جائے کہ بابا رتن کے قصّے اور اُن کی رتنیات کی حیثیت اور حقیقت کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے "بابا رتن" سے متعلق حافظ ذہبی کا مذکورہ بالا کلام اور اس کے بعد رتنیات کا وہ ذخیرہ نقل کرنے کے بعد جس کا نمونہ ناظرین کرام نے ابھی دیکھا ــــــ لکھا ہے کہ

"صلاح صفوی نے اپنے "تذکرہ" میں بابا رتن کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور (حافظ ذہبی وغیرہ) اُن لوگوں کا رد کرنا چاہا ہے جنھوں نے اُس کے وجود ہی سے انکار کیا ہے ــــــ لیکن اُن کی دلیل صرف یہ ہے کہ کسی شخص کی عمر چھ سو سات سو سال ہونا عقلاً ناممکن نہیں ہے" ــــــ

حافظ ابن حجر اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:-

"جن لوگوں نے "بابا رتن" کا انکار کیا ہے انھوں نے صرف اس بنیاد پر انکار نہیں کیا کہ اتنی عمر ہونا عقلاً ناممکن ہے، بلکہ اُن کے انکار کی بنیاد، ایک تو وہ حدیث صحیح ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر جو لوگ زندہ اور موجود ہیں آج سے سو سال پورے ہونے پر اُن میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا ــــــ اور دوسری

بنیاد یہ ہے کہ یہ بات قطعاً ناقابل یقین بلکہ ناقابل فہم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحابی دنیا میں موجود تھا اور چھ سو سال تک کسی کو اُس کا پتہ نہیں چلا۔"

اس کے آگے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ :-

"قاضی برہان الدین ابن جماعہ نے صفوی کے "تذکرہ" پر جو حاشیہ لکھا ہے اُس میں اس موقع پر لکھا ہے کہ بابا رتن کے بارہ میں حافظ ذہبی کی بات ہی صحیح ہے ــــــ اور "بابا رتن" کے قصے کے ثبوت کے لیے صرف عقلی امکان کافی نہیں۔"

اس کے آگے حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ :-

"میں جب اپنے شیخ مجد الدین شیرازی (صاحب قاموس) سے زبید میں ملا جو یمن کے علاقہ کا مشہور شہر ہے اور وہ اس وقت یمن کے قاضی القضاۃ تھے) تو میں نے دیکھا کہ وہ حافظ ذہبی کی اس رائے کو غلط کہتے ہیں کہ "بابا رتن" کا کوئی وجود ہی نہ تھا اور شیخ ممدوح نے بیان کیا کہ میں جب ہندوستان گیا تھا تو میں بابا رتن کے موضع میں بھی گیا تھا اور وہاں میں نے ایسے بہت سے لوگوں کو پایا جو اپنے آباء و اسلاف سے بابا رتن کا قصہ نقل کرتے تھے اور اُس کا وجود تسلیم کرتے تھے۔"

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ :-

"میں نے اپنے شیخ (مجد الدین شیرازی) سے کہا کہ حافظ ذہبی نے قطعیت کے ساتھ یہ حکم نہیں لگایا ہے کہ "بابا رتن" کا وجود ہی نہیں تھا بلکہ انھوں نے تردد ظاہر کیا ہے (اور وہ تین احتمال لکھے ہیں جو ابھی ذکر کیے گئے)۔

بابا رتن سے متعلق یہ سب قیل و قال نقل کرنے کے بعد آخر میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے :-

والذی یظھر انہ کان طال عمرہ	اور بظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس شخص
فادعیٰ ما ادعیٰ فتمادیٰ علیٰ	(بابا رتن) کی عمر بہت ہوئی، تو اُس نے وہ
ذالک حتی اشتھر، ولو کان	دعوے کیے (جو ذکر کیے جا چکے ہیں) اور وہ
صادقاً لاشتھر فی المائۃ	برابر یہ دعوے کرتا رہا، یہاں تک کہ اس کی
الثانیہ اوالثالثہ، والرابعہ	شہرت ہوگئی۔ اور اگر وہ ان دعووں میں

اواخر الخامسة ولكنه لم ينقل عنه شيئ الا فی اواخر السادسة ثم فی اوائل السابعة[1]

(الاصابہ ج۲ ص۲۳۲)

سچا ہوتا تو دوسری یا تیسری یا چوتھی یا پانچویں صدی میں اس کی شہرت ہو جانی چاہیے تھی۔ (نا ممکن تھا کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہوتی) لیکن چھٹی صدی کے آخری حصہ اور ساتویں کے شروع سے پہلے کہیں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

بابارتن الہندی سے متعلق راقم سطور نے ان صفحات میں اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ حافظ ابن حجر کی "الاصابہ" ہی سے لکھا ہے —— انھوں نے اُن کے بارہ میں حافظ ذہبی کی رائے ان کی تصانیف "تجرید" و "میزان الاعتدال" سے بھی نقل کی اور اُن کے اس رسالہ سے بھی مفصل کلام نقل کیا جو انھوں نے بابارتن کے بارہ میں مستقل طور سے لکھا تھا اور کہیں بھی اُن سے اپنا اختلاف ظاہر نہیں کیا ——

پھر حافظ ذہبی کی رائے سے صفوی اور شیخ مجدالدین شیرازی کا اختلاف بھی نقل کیا اور ذہبی کی طرف سے خود اُس کی جواب دہی کی —— آخر میں اپنی رائے وہ ظاہر کی جو ناظرین نے اوپر کی سطروں میں ابھی پڑھی —— حیرت ہے کہ "الاصابہ" میں یہ سب کچھ ہوتے ہوئے ہمارے ایک عزیز دوست کو (جن کا مضمون بابارتن سے متعلق نومبر کے شمارہ میں شائع ہوا تھا) یہ غلط فہمی کیسے ہوئی کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ میں بابارتن کے دعووں کو تسلیم کیا ہے اور ان کو صحابی رسول مانا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں حروف تہجی کے لحاظ سے صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے اور ترتیب یہ قائم کی ہے کہ ہر حرف کے ذیل میں انھوں نے چار فصلیں قائم کی ہیں —— فصل اول میں وہ اُن صحابہ کرام کا ذکر کرتے ہیں جن کا صحابی رسول ہونا روایت وغیرہ کے ذریعہ ثابت و معلوم ہے۔ (جیسے کہ تمام معروف صحابہ کرام) دوسری فصل میں اُن صحابہ کا ذکر کرتے ہیں جو حضور کے زمانہ میں پیدا ہوئے لیکن شعور کو نہیں پہنچے تھے۔

تیسری فصل میں ایسے حضرات کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق تاریخ وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلا دور بھی پایا ہے اور حضور کا زمانۂ مبارک بھی پایا ہے اور انھوں نے اسلام بھی قبول کیا لیکن حضور کی خدمت میں حاضری اور ملاقات ثابت نہیں۔ (ایسے حضرات کو "مُخَضْرَمِین" کہا جاتا ہے۔

چوتھی فصل میں حافظ ابن حجر ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو غلطی سے کسی پہلے مصنف نے صحابیوں میں سے شمار کر لیا ہے یا کسی کا صحابی ہونا غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے ——
(حافظ ابن حجر نے الاصابہ کے دیباچہ میں یہ پوری وضاحت کر دی ہے) اور بابا رتن کا ذکر حافظ نے حرف ر کی فصل چہارم میں کیا ہے۔

بہر حال اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں "بابا رتن الہندی" کے افسانہ کو "واقعہ" سمجھ کر ذکر کیا ہے اور ان کے صحابی رسول ہونے کے دعوے کو تسلیم کیا ہے۔

بابا رتن کے بارہ میں طبقۂ محدثین میں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر کے علاوہ ہمارے ملک ہندوستان کے مایہ ناز محدث وفقیہ صاحب "مشارق الانوار" علامہ حسن بن محمد صغانی (م ۶۵۰ھ) کی رائے کی اس لحاظ سے بہت اہمیت ہے کہ وہ بابا رتن کے ہم زمانہ ہیں اور انہی کے دیس (ہندوستان) کے باشندے ہیں، اس قصہ سے اُن سے زیادہ واقف کوئی نہیں ہو سکتا۔
اُن کی کتاب "تبیین الموضوعات" کے حوالہ سے صاحب نزہۃ الخواطر نے، بابا رتن سے متعلق ان کا جو کلام نقل کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے:۔

> "ایک جاہل آدمی (بابا رتن) کے متعلق جو یہ بات نقل کی جاتی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی تھی اور آپ کے ارشادات سنے تھے اور آپ نے "عمرک اللہ" کہکر اس کو درازیٔ عمر کی دعا دی تھی —— تو اہل حدیث کے نزدیک یہ بات بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے۔"

آگے فرماتے ہیں:۔

> "اور یہ اس طرح کی باتیں ہیں جو بے علم فقیر لوگ اپنے تکیوں اور خانقاہوں میں عوام کے سامنے بیان

کیا کرتے ہیں — اور اللہ کا دین اس سے اعلیٰ و اشرف ہے کہ اس کو جاہلوں سے حاصل کیا جائے اور بے عقل اور ہر ہو قسم کے لوگوں کی باتوں پر اس کی بنیاد ہو۔

واقعہ یہی ہے کہ بے علم صوفیوں اور بھولے درویشوں کے حلقوں میں اس طرح کی کہانیاں خوب چلتی ہیں اور یہ لوگ شیطان کے فریب کا بڑی آسانی سے شکار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے الاصابہ میں بابا رتن کا قصہ اور ان کی رتنیات کے روایت کرنے والے ساتویں آٹھویں صدی کے جن لوگوں کے نام ذکر کیے ہیں وہ اگر خود مکار اور فریبی نہیں تھے تو سمجھنا چاہیے کہ اسی قبیل کے "بھولے بزرگ" تھے۔ بابا رتن کے خرافاتی قصہ کو واقعہ سمجھ کر قبول کرنا اور اس کی بنا پر بابا رتن کو صحابیٔ رسول ماننا ہی اس کی کافی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دینی فہم و فراست اور تفقہ و درایت کا کوئی حصہ عطا نہیں فرمایا تھا گویا یہ سب اپنے وقت کے روایتی "ملا جیون" تھے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کر کے اس سلسلہ کلام کو ختم کیا جاتا ہے۔

فرض کیجیے کہ اس وقت جبکہ چودھویں صدی ہجری ختم ہو رہی ہے ہمارے اسی ملک ہندوستان کے کسی گاؤں میں کوئی بہت بوڑھے بزرگ ظاہر ہوں، بڑھاپے سے جنکی ٹانگیں لرزتی ہوں، بھویں بھی سفید ہوں، اور آنکھوں پر لٹک رہی ہوں، — الغرض دیکھنے میں اُن کا وہی حال ہو جو "بابا رتن" کا بیان کیا گیا ہے، اور وہ آپ سے بیان کریں کہ میری عمر چودہ سَو (۱۴۰۰) سال سے کچھ زیادہ ہے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور شرف صحبت سے مشرف ہوا ہوں، اور ہندوستان سے عرب جا کر میں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، اور فلاں فلاں غزوات میں بھی میں آپ کے ساتھ تھا — تو ان بوڑھے بزرگ کے بارہ میں آپ کی عقل و دانش کا فیصلہ کیا ہو گا ؟ — اور جو بیچارے سیدھے بھولے لوگ، اُن کو صحابیٔ رسول مان کر اُن کے ہاتھ پاؤں چومنے لگیں اور ان کی خدمت میں نذرانے پیش کرنے لگیں، اور اُن سے ملاقات کے بعد اپنے کو "تابعی" سمجھنے لگیں تو ان کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہو گی — ؟ کیا "بابا رتن" کا قصہ اس سے کچھ بھی مختلف ہے ؟ ؟

مدیر

محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

پاکستان میں ہمارے ایک بہت مخلص اور قدیم دوست حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہیں، راقم سطور نے گزشتہ شعبان (جولائی) میں پاکستان کا جو سفر کیا تھا (جس کا کچھ حال "الفرقان" میں آپ نے بھی پڑھا ہوگا) اُس میں حکیم صاحب کا اور ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "المنبر فیصل آباد" کا نیز اُن کے قائم کیے ہوئے "جامعہ تعلیمات اسلام" کا تذکرہ بھی کیا گیا تھا ——— کئی مہینے ہوئے ان کے ہفت روزہ "المنبر" کا ایک ضخیم خصوصی شمارہ جامعہ نمبر موصول ہوا تھا، اس کے تمام مضامین و مقالات" جامعہ تعلیمات اسلامیہ" ہی سے متعلق ہیں ——— اس میں حکیم صاحب کی ایک تقریر بھی ہے جو کسی خاص موقع پر "جامعہ" ہی میں کی گئی تھی، اس میں حکیم صاحب نے اُن دواعی اور محرکات کو بیان کیا تھا جنھوں نے اُن کو خاص عزائم اور تصوّرات کے ساتھ یہ جامعہ قائم کرنے پر آمادہ کیا ——— اس سلسلہ میں پانچواں محرک بیان کرتے ہوئے حکیم صاحب نے فرمایا:-

ہم خلوص نیت سے وہ ماحول از سر نو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اس صدی کے شروع میں اہل اللہ کے یہاں موجود تھا۔

مولانا مفتی محمد حسن[1] رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی مسلک کے جید عالم اور پایہ کے بزرگ تھے،

---

[1] حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے جلیل القدر خلیفہ و اجازت تھے ملک کی تقسیم سے پہلے امرتسر میں قیام رہا، جب پاکستان بنا تو لاہور تشریف لائے اور "جامعہ اشرفیہ" کی بنیاد ڈالی۔

مولانا ظفر احمد عثمانی سے زیادہ مولانا کو مقبولیت عطا فرمائی تھی۔ عثمانی

لیکن ان کا تعلق شاگرد ہونے کا بھی اور محبت رکھنے کا بھی امام عبدالجبار غزنویؒ[1] رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، اور اس تعلق کو انھوں نے اس قدر عظیم جانا اور اتنا عزیز رکھا کہ وفات کے مہینے تک آپ مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمہ کے ہاں ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے اور اسی طرح مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی طرح محبت سے اُن کے ہاں آتے جاتے ــــــ ان کے باہمی ربط کی کیفیت یہ رہی کہ تقریباً ہر مہینے مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ مولانا داؤد علیہ الرحمہ کے ہاں ملنے جاتے اور مولانا داؤد بھی اسی طرح کوشش کرتے کہ ملاقات کا سلسلہ جاری رہے۔ مفتی محمد حسن نور اللہ مرقدہ کی زندگی کے آخری مہینے کی یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی گاڑی پر تشریف لے گئے پہلے وہ شیرانوالے دروازے سے مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے ــــ اس کے بعد جب مفتی صاحب، عبدالرحیم شیخ علی دوڑ مولانا سید داؤد غزنوی کے یہاں تشریف لے گئے تو مولانا غزنوی نے فرمایا کہ حضرت آپ نے زحمت گوارا فرمائی مجھے پیغام بھیجدیا ہوتا میں حاضر ہو جاتا، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، طبیعت کا تقاضا یہی تھا کہ خود آؤں ــــــ

یہ تھا وہ ماحول جو ابھی کل تک ہمارے ہاں موجود تھا، اور اسی ماحول کا یہ ایک ثمر بھی ہم نے دیکھا کہ مولانا احمد علی علیہ الرحمہ جو پاک وہند میں عظیم شہرت رکھتے تھے اور لاہور میں تو آپ نے نصف صدی سے زائد قرآن مجید کا درس دیا، ہزاروں شاگرد آپ کے حلقہ درس کے تھے اور لاکھوں معتقد، مگر آپ نے اس وجاہت ومقبولیت کے باوجود عید کی نماز کا کوئی الگ اہتمام نہیں فرمایا اور آپ ہمیشہ اقبال پارک میں مولانا سید داؤد غزنوی کے پیچھے ہی ادا فرماتے رہے۔ تا آنکہ آپ اپنے آقا کے حضور حاضر ہو گئے "

(المنبر فیصل آباد جامعہ نمبر [illegible])

---

[1] حضرت مولانا عبدالجبار غزنویؒ برصغیر میں اہل حدیث مسلک کے ربانی عالم تھے بہت ورع وتقوی اور تعلق باللہ میں بھی [illegible] نمونہ تھے مولانا سید داؤد غزنویؒ انہی کے گھرانے کے چشم وچراغ تھے جو [illegible] صفات وخصوصیات میں بھی ان کے وارث تھے۔

ان واقعات کے ذکر کے بعد حکیم صاحب نے اس تقریر میں اپنا یہ حال بیان کیا ہے کہ ان حنفی و سلفی مخلص علماء ربانیین (حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا احمد علیؒ، حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ) کی یکے بعد دیگرے وفات ہوگئی تو میرے قلب میں اس کا شدید داعیہ اور تقاضا پیدا ہوا کہ اپنے امکان بھر ایسے علما تیار کرنے کی فکر اور کوشش کی جائے جو "حنفیت" یا "اہلحدیثیت" جیسی کسی فرقہ وارانہ نسبت کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور تقوے و تعلق باللہ کو اخوت و مودت کی بنیاد بنائیں اور مسلمانوں کو "امت واحدہ" بنانا جن کا نصب العین ہو۔

اللہ تعالیٰ حکیم صاحب کے مخلصانہ جذبے اور عزم و ارادہ کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے اور اپنی خاص نصرت سے اس عظیم مقصد میں کامیاب فرمائے۔

واقعہ یہ ہے کہ حنفیت اور اہلحدیثیت کے مسلکی اختلاف کا درجہ وہی ہے جو ہمارے ان قریبی اکابر کے طرز عمل سے سامنے آیا جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں حکیم صاحب نے کیا ہے۔

اس برصغیر میں فقہ حنفی کو کتاب و سنت پر مبنی یقین کرتے ہوئے اس پر عمل کرنے والے علماء احناف خاص کر وہ جو دیوبند کے تعلیمی سلسلہ اور مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں (اور یہ عاجز بھی اسی سلسلہ کے ادنیٰ تلامذہ میں سے ہے) اور اسی طرح حضرات علماء اہلحدیث، ان دونوں طبقوں میں جو واقعی اصحاب علم ہیں جہاں تک راقم سطور کا علم و اندازہ ہے وہ سب اس کے معترف اور اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان دیار میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کو دین اور کتاب و سنت کے علم میں امامت کا درجہ عطا فرمایا تھا اور جن اہل علم نے ان کی کتابوں اور ان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے ان میں سے کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ اُن کے ہاں دونوں طریقوں کی گنجائش ہے ـــــ وہ کسی متعین امام و مجتہد کی تقلید کے بغیر کتاب و سنت اور صحابہ و تابعین کے فتاویٰ کی پیروی کو بھی حق اور سلف امت کا طریقہ بتلاتے ہیں ـــــ اور اس کو بھی حق و صحیح اور دین و اہل دین کی مصلحت قرار دیتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کی فقہ کا (اور خاص کر ہمارے اس برصغیر میں فقہ حنفی کا) اتباع کیا جائے، کہ ان ائمہ کے

فقہ کی بنیاد بھی کتاب و سنت اور صحابہ و تابعین کے فتاویٰ پر ہے ___ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُن کے علم سے بلا واسطہ اور بالواسطہ روشنی حاصل کرنے والوں میں وہ اہل علم بھی تھے جن پر اپنے ذوق و رجحان کی بنا پر پہلا رنگ غالب تھا اور انھوں نے اسی کو اپنایا اور وہ بھی جنھوں نے دوسرے طریقہ میں زیادہ سلامتی سمجھی اور اسی کو اختیار کیا (اور خود حضرت شاہ صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا۔
پھر درمیان میں اُن تاریخی اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں بدقسمتی سے ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اس ذوقی و مسلکی اختلاف نے بہت ہی نامناسب شقاق و افتراق کی شکل اختیار کرلی، ایک طرف کی شدت و جارحیت دوسری طرف کی جارحیت اور بے اعتدالی کا سبب بنی اور بارہا نوبت سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک پہنچی اور کفر کی عدالتوں نے فیصلے کیے۔ ___ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

الحمدللہ وہ زمانہ ہم سے پہلے گزر گیا، اللہ تعالیٰ موجودہ دور کے دونوں طبقوں کے اہل علم رہنماؤں کو توفیق دے کہ وہ مسلک و طرز عمل کے اس اختلاف کو اسی حد تک رکھیں جو اس کا درجہ اور مقام ہے اور دینی اخوت و مودت پر اس کو اثر انداز نہ ہونے دیں ___

حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے حضرت مولانا مفتی محمد حسن، حضرت مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مولانا سید داؤد غزنوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا جو طرز عمل بیان کیا ہے، وہ ہم سب کے لیے "اسوۂ حسنہ ہے" ___ واللہ یقول الحق و ھو یھدی السبیل۔

درسِ قرآن ۔ محمد منظور نعمانی

فرعون کے دربار میں ایک مردِ مومن کا خطاب

مجھے ڈر ہے کہ تم پر خدا کا عذاب نہ آجائے پھر کوئی اس سے تم کو بچا نہ سکے

ایسا نہ ہو کہ تمھاری اس روش کی وجہ سے ہدایت کا دروازہ ہی تم پر بند ہو جائے

حمد و صلوٰۃ　اعوذ　اور　بسم اللہ　کے بعد

وَيٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۝ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ۝

(سورۃ المؤمن آیات ۳۲ — ۳۷)

اور اے میری قوم کے لوگو مجھے ڈر ہے کہ تم پر چیخ (اور) پکار کا دن آجائے جس دن تم پیٹھ پھیر کے بھاگو گے اور تم کو خدا (کی پکڑ اور عذاب) سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور جس کو خدا ہدایت سے محروم کردے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اور (اللہ کے ایک پیغمبر) یوسف اس سے پہلے تمہارے پاس آئے تھے کھلی نشانیاں لیکر تو تم انکی لائی ہوئی تعلیمات کے بارہ میں برابر شک ہی میں رہے (ایمان نہیں لائے) یہانتک کہ جب اُن کی وفات ہوگئی تو تم نے کہا کہ اب ان کے بعد اللہ کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کردیتا ہے جو حدود سے تجاوز کرنے والے اور شک شبہ میں پڑے رہنے والے ہوتے ہیں۔ جو اللہ کی آیات کے بارہ میں اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی سند اور دلیل کے بغیر جھگڑتے (اور کٹ حجتی کرتے) ہیں۔ اللہ کے نزدیک اور ایمان والوں کے نزدیک (ان کی یہ کٹ حجتی) بڑی مبغوض ہے (اور وہ اس سے سخت بیزار ہیں) اللہ اسی طرح مہر کردیتا ہے ہر مغرور و سرکش کے دل پر ——

اور فرعون نے کہا اے ہامان میرے لیے ایک بلند عمارت بناؤ کہ میں اُن راہوں تک پہنچ جاؤں آسمانوں کی راہوں تک پس وہاں سے موسیٰ کے رب کو دیکھ لوں اور میں تو اس کو جھوٹا ہی خیال کرتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کی بدعملی اُس کے لیے (اس کی نگاہ میں) خوشنما کردی گئی اور وہ راہِ حق سے روک دیا گیا۔ اور فرعون کا داؤں برباد ہی ہو کر رہا۔

(سورۂ مومن آیات ۳۲ تا ۳۷)

(تفسیر و تشریح) یہ آیتیں جو اس وقت تلاوت کی گئی ہیں سورۂ مومن کے چوتھے رکوع کی آیتیں ہیں —— ان سے اوپر کی آیتوں میں یہ مضمون تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو پیغمبری عطا فرمائی اور حکم دیا کہ مصر جاکر وہاں کے ارباب حکومت فرعون ہامان وغیرہ کو اور ان کی قوم کو ایمان اور خدا پرستی کی دعوت دو، اور حضرت موسیٰ نے آکر ان لوگوں کو دعوت دی اور اُن کے مطالبہ پر عصائے موسیٰ اور ید بیضا وغیرہ معجزات بھی دکھائے تو ان لوگوں نے بہت ہی گستاخانہ رویہ اختیار کیا اور فرعون نے حضرت موسیٰ کو قتل کرا دینے کا اعلان کردیا، تو فرعون کے گھر ہی کے لوگوں میں سے ایک بندے نے جو حضرت موسیٰ کی

نبوت اور معجزات سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا تھا، مگر اُس نے اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا تھا اُن لوگوں یعنی فرعون اور اُس کے درباریوں کے سامنے بظاہر ایک دوراندیش اور خیرخواہ قوم کی حیثیت سے ایک بڑی دانشمندانہ اور موثر نصیحت کی اور ان کو سمجھانا چاہا کہ آپ لوگ جس ڈھنگ سے سوچ رہے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر یہ شخص (موسیٰ) سچا نہیں ہے مفتری اور کذاب ہے تو اس کا نبوت کا جھوٹا دعویٰ اور خدا پر اس کی افترا پردازی خود ہی اس کو لے ڈوبے گی اور اگر یہ خدا کا سچا رسول اور پیغمبر ہے تو اس کی تکذیب اور مخالفت کے نتیجہ میں تم پر خدا کا عذاب آجائے گا جیسا کہ پیغمبروں کی مخالفت کرنے والی پہلی بہت سی قوموں پر آیا ہے ـــــ لیکن ان لوگوں نے اس کی نصیحت کو قبول نہیں کیا اور فرعون نے کہا۔ تم نہیں سمجھتے میں سمجھتا ہوں، میری ہی رائے ٹھیک ہے یعنی ہمیں اس موسیٰ کو ختم ہی کر دینا چاہیے ـــــ تو اُس مردِ مومن نے پھر تقریر شروع کی اور صاف صاف کہا "يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ" مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور اللہ کے اس بندے موسیٰ پر جو اپنی صداقت کے ثبوت میں معجزے بھی دکھا چکا ہے تم نے ہاتھ ڈالا تو مجھے ڈر ہے کہ جس طرح اللہ کے اگلے پیغمبروں کی مخالفت کرنے والی اور اُن کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے والی قوموں پر عذاب آیا تھا جیسا کہ قوم نوح اور عاد و ثمود پر آیا تھا، اسی طرح کا عذاب تم پر آجائے ـــــ تقریر کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اُس مردِ مومن نے کہا

"وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ...... وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ"

مطلب یہ ہے کہ اے میری قوم والو سن لو اور سمجھ لو کہ اگر تمھارا رویہ یہی رہا اور تم نے اللہ کے اس پیغمبر موسیٰ کے خلاف کوئی گستاخانہ اقدام کیا جیسا تم سوچ رہے ہو تو ایک دن تم پر خدا کی طرف سے ایسا عذاب آجائے گا جس میں تم چیخو چلاؤ گے اور ایک دوسرے کو پکارو گے اور کوئی اُس دن تمھاری مدد نہ کر سکے گا، تم اُس دن خدا کے عذاب سے بھاگنا چاہو گے مگر بھاگ کے کہیں نہ جا سکو گے اور اللہ کی پکڑ سے کوئی تم کو بچانے والا نہ ہو گا۔

آیت کے آخری جز "وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی سنت اور اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ حق کی مخالفت پر تلے رہنے اور باطل پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں اور اس عقل سے کام نہیں لیتے جو اللہ نے ان کو حق و باطل میں امتیاز کرنے اور اپنا بھلا برا سمجھنے کے لیے دی ہے تو اللہ ان کو ہدایت سے محروم کر دینے اور گمراہی میں پڑے رہنے کا فیصلہ فرما دیتا ہے، پھر کہیں سے ان کو نور ہدایت نہیں مل سکتا ـــــ تو اگر تم لوگ استکبار اور ضد کی بنا پر اسی ظالمانہ اور گمراہانہ روش پر قائم رہے تو پھر تمہارے لیے ہدایت کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔

آگے ہے "وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ .... كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قَلْبِ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ" مطلب یہ ہے کہ اس مرد مومن نے تقریر کرتے ہوئے فرعون اور اس کے درباریوں سے یہ بھی کہا کہ پہلے زمانہ میں بھی اللہ کے ایک پیغمبر یوسف (علیہ السلام) تمہارے پاس یعنی تمہارے آباء و اجداد کے پاس اسی مصر میں ہدایت کا پیغام اور واضح دلیلیں لیکر آئے تھے تو تم نے ان کی ہدایت کو بھی قبول نہیں کیا، ایمان نہیں لائے، شک شبہ ہی میں پڑے رہے، پھر جب وہ وفات پا گئے تو تم نے (یعنی اس زمانہ کے تمہارے آباء و اجداد اور قوم کے بڑوں نے) کہا کہ اللہ اب ان کے بعد کوئی رسول نہیں بھیجے گا، یعنی حضرت یوسف کے زمانہ کے مصر کے اور قبطی قوم کے لوگوں نے ان کی زندگی میں تو ان کو خدا کا رسول مانکر اُن کی ہدایت کو قبول نہیں کیا اپنے باپ دادا ہی کے مشرکانہ طریقہ پر قائم رہے لیکن جب مصر ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام وفات پا گئے تو ظاہر و باطن کے لحاظ سے اُن کی حسین جمیل شخصیت ان کی پاکیزہ زندگی اور اُن کے زمانہ کی برکتوں کو یاد کر کے اُن سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے اور کہنے لگے بڑے ہی بابرکت تھے، ان کی برکتیں انھیں کے ساتھ ختم ہو گئیں اب ان کے بعد اللہ کی طرف سے کوئی ایسا رسول نہیں آئے گا ـــــ اس مرد مومن کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں پرانے زمانہ کے اس واقعہ سے سبق لینا چاہیے اور اللہ نے تمہارے پاس جو پیغمبر ہدایت لیکر بھیجا ہے (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اس پر ایمان لاکر اس کی ہدایت کی پیروی کرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ کل کو جب یہ موسیٰ نہ رہیں تو تم بھی اسی طرح پچھتاؤ اور افسوس کرو

جس طرح حضرت یوسف کی وفات کے بعد تمھارے اُن آباء و اجداد نے کیا تھا جنھوں نے زندگی میں اُن کی بات نہیں مانی تھی۔

آگے ہے۔ کَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ ...... كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی حقیقت کو بھول کے حد سے تجاوز کریں اور اللہ اور اس کے رسولوں کی باتوں پر ایمان لانے اور یقین کرنے کے بجائے اُن میں شک شبہ پیدا کریں اور کسی الٰہی اور آسمانی سند کے بغیر اللہ کی آیات کا انکار اور اس سلسلہ میں کٹ حجتی کریں تو اللہ کے نزدیک اور اللہ والوں کے نزدیک ایسے لوگ بہت ہی مبغوض ہیں اور وہ ان لوگوں سے انتہائی ناراض اور بیزار ہیں اور ایسے لوگوں کے لیے اللہ ہدایت سے محرومی کا فیصلہ کر دیتا ہے، اسی طرح جو لوگ تکبر اور ظلم و جباریت کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں اور اس کی وجہ سے پیغمبران حق کی دعوت اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے بلکہ اُن کے ساتھ گستاخانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، ان کے دلوں پر بھی اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے ایمان اور ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

میں نے آپ کے سامنے بار بار یہ مضمون بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جو قوانین نافذ اور جاری ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی آدمی حق و ہدایت کو قبول نہ کرنے اور اس کی مخالفت کرنے ہی کا فیصلہ کر لے اور سرکشی و بدکرداری کو اپنا شیوہ بنا لے اور ان چیزوں میں حد سے بڑھ جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا ہی میں اُس پر کبھی یہ عذاب بھی آتا ہے کہ اُس کے قلب سے ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ دل پر مہر لگنے کا اور کسی بندے کو گمراہی میں ڈال دینے کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ تو فرعون کے گھرانے کے اُس مردِ مومن نے، فرعون اور اُس کے درباریوں سے اپنی اس تقریر میں پہلے تو کہا کہ اللہ کے پیغمبر موسیٰ کے ساتھ تمھارا جو رویہ ہے اسے دیکھتے ہوئے مجھے ڈر ہے کہ تم پر اگلی قوموں، قوم نوح اور عاد و ثمود وغیرہ کی طرح عذاب نہ آ جائے اور ایسا وقت نہ آ جائے کہ تم چیخو چلاؤ، ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکارو اور کوئی اس وقت تمھیں خدا کے عذاب سے نہ بچا سکے ـــــ اس کے بعد اللہ کے پیغمبر یوسف علیہ السلام کا واقعہ یاد دلایا

کہ وہ اسی مصر میں آئے تھے، اس دور کے تمہارے آبا و اجداد نے ان کی زندگی میں تو اُن کی دعوت و ہدایت کو قبول نہیں کیا پھر جب ان کی وفات ہوگئی تو ان پر عقیدت کے پھول چڑھائے اور ان کی بات نہ ماننے پر پچھتائے اور یہاں تک کہا کہ پیغمبری بس یوسف ہی پر ختم ہوئی اب اللہ کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔

اس کے بعد اُس مرد مومن نے اپنی اس تقریر میں فرعون اور اس کے درباریوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اس کفر و طغیان اور متکبرانہ و جبارانہ رویہ کی سزا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے دلوں پر مہر لگ جائے اور ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محرومی کا فیصلہ ہو جائے کیونکہ اللہ کی یہ سنت اور اس کا قانون ہے کہ حق کے مقابلہ میں سرکشی کرنے والوں اور باطل پر اڑے رہنے والوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے اور اُن سے ہدایت کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے ـــــ لیکن اُن بدبختوں پر "مرد مومن" کی اس مخلصانہ نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ فرعون نے غالباً اس اندیشہ سے کہ لوگ اس شخص کی مخلصانہ اور موثر نصیحت سے متأثر نہ ہو جائیں یہ نیا شگوفہ چھوڑا، اس نے اپنے وزیر اور رفیق کار ہامان کو مخاطب کر کے کہا کہ "ہامان تم ایک بہت بلند عمارت بنوانے کا انتظام کرو، میں اس پر چڑھ کے آسمان پر موسیٰ کے خدا کو دیکھنے کی کوشش کروں گا، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ جو کچھ کہتا ہے جھوٹ ہے" ـــــ جیسا کہ میں نے کہا فرعون کا ہامان سے یہ کہنا صرف ایک فریب تھا تاکہ درباریوں کے ذہن کو دوسری طرف موڑ دے ـــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے صرف تمسخر اور مذاق کے طور پر کہا ہو، اور اس تمسخر کا مقصد بھی یہی ہو کہ اُس مرد مومن کی تقریر سے متأثر ہو کر لوگ حضرت موسیٰ کی دعوت کو قبول نہ کر لیں۔

آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ" مطلب یہ ہے کہ فرعون نے جو رویہ اختیار کیا وہ بہت برا تباہی اور بربادی کا رویہ تھا، لیکن جب کوئی آدمی غلط روی اور بدعملی ہی کو اپنا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے نور عقل سلب کر لیتا ہے اور پھر اس کو برائی ہی میں بھلائی اور ہلاکت ہی میں خیریت نظر آتی ہے۔ تو فرعون کے ساتھ بھی یہی ہوا اُس نے اسی میں اپنی خیریت

سمجھی کہ حضرت موسیٰ کی دعوت کو خود بھی قبول نہ کرے اور ایسی تدبیریں کرے اور چالیں چلے کہ دوسرے لوگ بھی قبول نہ کریں، لیکن اس کی یہ تدبیریں اور چالیں چلنے والی نہیں تھیں، سب ناکام ہوگئیں اور انجام یہ ہوا کہ وہ مع اپنے لاؤ لشکر کے غرقاب ہوا۔

یہ بات آپ کے ذہن میں رہے کہ فرعون کے گھرانے کے مردِ مومن کی تقریر ہو رہی تھی، درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے فرعون نے لوگوں کا ذہن موڑنے کے لیے ہامان سے بلند عمارت بنوانے کی بات کہی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارہ میں فرمایا کہ یہ اس کی ایک چال تھی جس کو وہ سمجھتا تھا کہ کامیاب ہوگی لیکن وہ ناکام ہو کے رہ گئی ــــ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ۝) آگے پھر اس مردِ مومن کی تقریر ہے اور بڑی موثر تقریر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ دل سے نکل رہا ہے۔

کتاب المعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

نظام عدالت (۳)

جھوٹے دعوے اور جھوٹی قسم والوں کا ٹھکانا جہنم

جیسا کہ معلوم ہے تمام انبیاء علیہم السلام کی عموماً اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصاً اصل حیثیت نبی و رسول اور بشیر و نذیر کی ہے[1] ——— وہ اللہ کے حکم سے اُس کے بندوں کو ایمان اور اعمال صالحہ و اخلاق حسنہ کی دعوت و ترغیب دینے اور ان پر خداوندی فضل و انعام اور رحمت و جنت کی بشارت سناتے ہیں۔ اور کفر و شرک اور بداعمالیوں و بداخلاقیوں اور جرائم سے بندگان خدا کو روکتے، اُن کے برے انجام سے آگاہ ہی دیتے اور خدا کے غضب و عذاب سے ڈراتے ہیں، یہی ان کی دعوت و ہدایت کی بنیاد اور یہی ان کا سب سے کارگر ہتھیار اور یہی اُن کی اصل طاقت ہوتی ہے۔

---

[1] سورۂ نساء میں تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا گیا۔ "رُسُلاً مبشرین ومنذرین" اور سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ فرقان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا۔ "وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔"

عدالت میں جھوٹا دعویٰ کرنا اور اسی طرح ناجائز طور پر کسی کی چیز حاصل کرنے یا اس کو نقصان پہنچانے کے لیے جھوٹی قسم کھانا، بدترین اور شدید ترین گناہوں میں سے ہے ——— ان کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ذیل میں پڑھے جائیں

عن ابی ذر انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من ادعیٰ مَا لَيْسَ لَه فليس منّا و ليتبوّأ مقعدهٗ من النّار ——— رواہ مسلم

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا آپ فرماتے تھے کہ جو کوئی کسی ایسی چیز پر دعوے کرے جو فی الحقیقت اُس کی نہیں ہے، تو وہ ہم میں سے یعنی ہمارا آدمی اور ہمارا ساتھی نہیں ہے، اور اُس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔　　(صحیح مسلم)

(تشریح) اپنے کو مسلمان کہنے اور مسلمانوں میں شمار کرنے والے کسی شخص کے لیے اس سے زیادہ سخت و شدید وعید کیا ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے بارہ میں فرما دیں کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے، ہماری جماعت سے خارج ہے اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہے ——— اللہ کی پناہ! ———

عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اقتطع حق امرئٍ مسلمٍ بیمینہٖ فقد اوجب اللہ لہ النار وحرّم علیہ الجنّۃ فقال لہ رجل وان کان شیئًا یسیرًا یا رسول اللہ قال وان کان قضیبًا من اراکٍ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی نے جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا کوئی حق مارا (اور عدالتی فیصلہ سے اس کی کوئی چیز حاصل کر لی) تو اللہ نے اُس شخص کے لیے دوزخ واجب کر دی ہے اور جنت حرام ——— ایک شخص نے سوال کیا یا رسول اللہ اگرچہ وہ چیز بالکل معمولی اور تھوڑی سی ہو (تب بھی یہی سزا ہوگی؟) آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ وہ (جنگلی درخت) پیلو کی ایک ٹہنی ہی ہو۔　　(صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے عدالت میں جھوٹی قسم کھا کے کسی دوسرے بندے کی بالکل معمولی اور بے قیمت چیز بھی حاصل کی تو اُس نے بھی اتنا بڑا گناہ کیا جس کی سزا میں اُس کو دوزخ کا عذاب ضرور بھگتنا ہوگا اور مومنین صالحین والی جنت سے محروم رہے گا۔

حدیث میں "مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ" فرمایا گیا، یہ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ منورہ کا معاشرہ اسلامی معاشرہ ہی تھا اور آپ کے سامنے عموماً مسلمانوں ہی کے باہمی مقدمات آتے تھے ـــــ ورنہ کسی غیر مسلم کی چیز بھی جھوٹی قسم کھا کر حاصل کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح مسلمان کی چیز حاصل کرنا ـــــ اس کی واضح دلیل قرآن پاک کی وہ آیت ہے جس کا حوالہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک حدیث میں جو پہلے درج ہو چکی ہے) جھوٹی قسم کے عذاب ہی کے سلسلہ میں دیا ہے۔

یعنی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ" (آل عمران ۷۷)۔

خود حضورؐ کے فیصلہ سے بھی دوسرے کی چیز حلال نہیں ہوسکتی:۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چالاک مقدمہ باز آدمی دوسرے کی چیز پر جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اور اس کا ایسا ثبوت پیش کرتا ہے کہ قاضی اس کو برحق سمجھ کر اُس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہے ـــــ اور اسی طرح کبھی کوئی جھوٹا مدعا علیہ اپنی چرب زبانی سے اور جھوٹی قسم کھا کر اپنی سچائی کا قاضی کو یقین دلا دیتا ہے اور وہ اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے، تو قاضی شریعت کے اس فیصلہ سے وہ چیز اس جھوٹے مدعی یا مدعا علیہ کے لیے حلال اور جائز نہیں ہو جاتی، حرام ہی رہتی ہے اور جھوٹا مقدمہ لڑانے اور جھوٹی قسم کھانے سے وہ جہنمی بن جاتا ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں بھی ایک بشر ہوں اور کسی مقدمہ بازکی چرب زبانی سے متاثر ہو کر مجھ سے بھی

ایسا فیصلہ ہو سکتا ہے تو میرے فیصلہ سے بھی وہ چیز اس کے لیے حلال نہ ہوگی حرام ہی رہے گی —— حدیث یہ ہے۔

عن ام سلمۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انما انا بشر وانکم تختصمون الیّ ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علی نحو ما اسمع منہ فمن قضیت لہ بشیئ من حق اخیہ فلا یاخذنہ فانما اقطع لہ قطعۃ من النار

—— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک بشر ہوں، اور تم لوگ میرے پاس اپنے نزاعات اور مقدمات لاتے ہو، اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک زیادہ اچھا بولنے والا اور بہتر انداز میں تقریر کرکے اپنی دلیل پیش کرنے والا ہو دوسرے سے، اور پھر میں اس کی بات سنکر اسی کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ دیدوں تو اس طرح میں جس کے لیے اس کے بھائی کی چیز کا فیصلہ کردوں تو وہ اس کو ہرگز نہ لے، (اس کے جھوٹے دعوے یا جھوٹی قسم کے نتیجہ میں) میں اس کو جو دیتا ہوں وہ انجام کے لحاظ سے، اس کے واسطے دوزخ کا ایک حصہ ہے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ میں ایک انسان اور بندہ ہوں عالم الغیب نہیں ہوں، ہو سکتا ہے کہ کسی مدعی یا مدعا علیہ کی تقریر و استدلال سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ دیدوں اور فی الواقع وہ اس کا حق نہ ہو تو میرے فیصلہ سے بھی دوسرے فریق کی چیز اس کے لیے حلال اور جائز نہ ہوگی بلکہ وہ اس کے حق میں دوزخ ہوگی۔

جھوٹی قسم شدید ترین گناہ کبیرہ

عن عبد اللہ بن انیس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من اکبر الکبائر الشرک باللہ وعقوق الوالدین والیمین الغموس

وما حلف حالف بالله يمين صبر فادخل فيها مثل جناح بعوضة الا جعلت نكتة فى قلبه الى يوم القيمة ـــــ رواه الترمذى

حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے اور سب سے خبیث گناہ یہ ہیں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ـــــ اور ماں باپ کی نافرمانی ـــــ اور حاکم کے سامنے جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا ـــــ اور عدالت میں جو قسم کھانے والا قسم کھائے اور اس میں مچھر کے پر برابر گڑبڑ کرے (یعنی ذرہ برابر بھی جھوٹ یا خیانت شامل کرے) تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) اس کے دل میں قیامت تک کے لیے ایک داغ بنا دیا جاتا ہے۔ (یعنی اس کا وبال قیامت میں ظاہر ہوگا۔) (جامع ترمذی)

عن خريم بن فاتك قال صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوة الصبح فلما انصرف قام قائما فقال عدلت شهادة الزور بالاشراك بالله ثلث مرات ثم قرأ فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور حنفاء لله غير مشركين به ـــــ رواه ابوداؤد

خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن) صبح کی نماز پڑھی، جب آپ فارغ ہوئے تو اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ جھوٹی گواہی شرک کے برابر کر دی گئی ـــــ یہ بات آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائی، پھر آپ نے (قرآن پاک کی) یہ آیت پڑھی "فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور حنفاء الله غير مشركين به" (اے لوگو بت پرستی کی گندگی سے بچو اور جھوٹ گواہی سے بچو، یکسوئی کے ساتھ بس اللہ ہی کے ہو کے اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے والے نہ ہو) (سنن ابی داؤد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آیت اس خطاب میں تلاوت فرمائی اس میں شرک و بت پرستی کے ساتھ "قول زور" سے بچنے اور پرہیز کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے

اور دونوں کے لیے امر کا ایک ہی صیغہ اور ایک ہی کلمہ اِجْتَنِبُوا استعمال فرمایا گیا ہے، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا اور مخاطبین کو سمجھایا کہ شہادتِ زُور (جھوٹی شہادت) ایسا ہی گندہ اور خبیث گناہ ہے جیسا کہ شرک وبت پرستی، اور ایمان والوں کو اس سے ایسا ہی پرہیز کرنا اور دور رہنا چاہیے، جتنا کہ شرک وبت پرستی سے۔

کن لوگوں کی گواہی معتبر نہیں

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تجوز شہادۃ خائن ولا خائنۃ ولا زانٍ ولا زانیۃ ولا ذی غِمرٍ علی اخیہ ورد شہادۃ القانع لاھل البیت — رواہ ابوداؤد

عمرو بن شُعیب نے اپنے والد شعیب سے نقل کیا اور انھوں نے اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عَمْرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خیانت کرنے والے کسی مرد اور (اسی طرح) خیانت کرنے والی کسی عورت کی شہادت درست نہیں (یعنی قابل قبول نہیں) اور کسی زانی اور زانیہ کی شہادت بھی (قابل قبول نہیں) اور کسی دشمنی رکھنے والے کی شہادت بھی اُس بھائی کے خلاف جس سے اس کو دشمنی ہو قابل قبول نہیں، اور جو شخص (اپنی روزی اور ضروریات زندگی کے لیے) کسی گھرانے سے وابستہ ہو کر پڑ گیا ہو اس گھر والوں کے حق میں اس کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقابل قبول قرار دیا۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث میں پہلے خیانت اور زنا کا ارتکاب کرنے والے مردوں اور عورتوں کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی شہادت قابل قبول نہیں۔ ان دونوں گناہوں کو بطور مثال کے سمجھنا چاہیے، اصول اور قانون یہ ہوگا کہ جو شخص ایسے کبائر اور فواحش کا مرتکب ہو، دوسرے لفظوں میں فاسق وفاجر ہو اس کی شہادت قبول نہ ہوگی کیونکہ ایسے گناہوں کا ارتکاب اس کی دلیل ہے کہ اس کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے اس لیے اس کی سچائی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی دشمنی رکھنے والے کی مخالفانہ گواہی کے قابل قبول نہ ہونے کی وجہ ظاہر ہے۔ اسی طرح جو آدمی کسی گھرانے سے وابستہ ہو، اس کا رہنا سہنا کھانا پینا انھیں کے ساتھ ہو وہ گویا اُسی گھرانے کا ایک فرد ہے اسلیے اس گھرانے کے حق میں اسکی شہادت بھی قبول نہیں کی جائے گی، اس سے معلوم ہوگیا کہ گھر

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

کاروانِ اہل فضل و کمال

تلامذہ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی مہاجرؒ

پچھلے دنوں احقر کو "تذکرہ علماء اعظم گڑھ" مؤلفہ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی جگدیشپوری حاصل ہوا تھا۔ یہ ضلع اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے حضرات علمائے کرام کا ایک مبسوط تذکرہ ہے اور خاصی محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے، اور محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے دعائیہ کلمات، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے "مقدمے" اور مولانا نجم الدین اصلاحی کی "تقریب" کے ساتھ یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کے بہت سے مندرجات کو پڑھوا کر سننے کا اتفاق ہوا۔ اس میں مولانا محمد طاہر معروفیؒ کا بھی ذکر خیر ہے جو کہ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کے باکمال تلامذہ میں سے تھے۔ اور میرے علم میں نہ ہونے کی وجہ سے ان کا تذکرہ "کاروانِ اہل فضل و کمال" کے سلسلہ میں نہیں کیا جاسکا تھا ـــــ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کتاب میں سے حضرت معروفیؒ کا تذکرہ چند جملوں کے معمولی حذف و اضافہ کے بعد بعینٖہٖ "کاروان اہل فضل و کمال" میں شامل کردوں اگر یہ تذکرہ نظر سے نہ گزرتا تو ایک بڑی شخصیت تلامذۂ شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ میں شامل کرنے سے رہ جاتی۔

اس سلسلہ کی گذشتہ قسط میں بھی لکھ چکا ہوں اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی صاحب حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے شاگردوں میں سے کسی ایسے شاگرد کا علم رکھتے ہوں کہ جن کا ذکر کاروان اہل فضل و کمال میں ابھی تک نہیں آسکا تو وہ مہربانی فرماکر الفرقان

کے پتے پر مطلع کریں تاکہ ان کا بھی تعارف کرا دیا جائے۔

محقق و محدث شہیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم سے بھی خاص طور پر التماس ہے کہ وہ بھی اپنی وسعتِ نظر کے ذریعے اس سلسلے میں میری نصرت فرمائیں۔

حضرت حاجی حکیم مولانا محمد طاہر ابن شیخ پیر محمدؒ

۱۲۴۴ھ میں پورہ معروف (ضلع اعظم گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ (پورہ معروف، مئو سے بجانب شمال مغرب ۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے)۔

ابتدائی تعلیم مقامی اساتذہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد جون پور جا کر اولاً حضرت مولانا کرامت علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ) سے حفظ و قرأت کی تحصیل کی، اور ساتھ ہی مولانا کرامت علیؒ سے فن کتابت و خطاطی اور بنوٹ سیکھا۔ مولانا کرامت علی جونپوری فن خطاطی اور بنوٹ میں یگانۂ روزگار تھے۔ چنانچہ آگے چل کر مولانا معروفی بھی ان فنون میں نادرِ روزگار ہو کر اطراف و جوانب میں مشہور ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ عربی تعلیم کی جانب بھی متوجہ رہے اور اس وقت کے شہرۂ آفاق عالم حضرت مولانا سخاوت علی جون پوریؒ (متوفی ۱۲۷۴ھ)[1] سے فنونِ متداولہ کی تعلیم پائی۔ حضرت مولانا سخاوت علیؒ آپ کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر بڑے اہتمام اور محنت و شفقت سے پڑھاتے تھے۔ مولانا معروفی نے یہیں درس نظامیہ کے اکثر حصے کی تحصیل کی اور بقیہ کتابیں مدرسہ غفاریہ مئو (ضلع بلیا) میں مولانا تراب علی لکھنویؒ (متوفی ۱۲۸۱ھ) سے پڑھ کر فراغت حاصل کی۔ تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد ۱۲۵۸ھ[2] میں حرمین شریفین کا مقدس سفر فرمایا اور وہاں رہ کر علمی و روحانی فیوض سے اپنے دامنِ مراد کو بھر لیا اور جمادی الاولیٰ

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں مولانا سخاوت علی کا سال وفات ۱۲۷۴ھ لکھا ہے۔ تذکرہ علمائے ہند میں سال وفات ۱۲۷۴ھ ہی ہے۔

[2] اسی سال حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ نے دہلی سے مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی تھی۔

[illegible]ھ میں وطن مالوف کی جانب مراجعت فرمائی۔ اس مبارک سفر میں انھوں نے حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث مہاجر مکی سے مکہ معظمہ میں حدیث کی تکمیل کی اور سند و اجازت حاصل کی۔ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب نے اس موقع پر مولانا معروفی کو سند حسب ذیل عطا فرمائی۔

بسم الله الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمین والصلوٰة علی سید المرسلین محمد وآله وصحبه
اجمعین اما بعد فیقول خادم علماء الآفاق محمد اسحٰق عفا الله عنه وتجاوز
عن السیئات ان المولوی محمد طاهر طهّره الله فی الباطن والظاهر قد قرء
علیّ الاحادیث النبویه علی صاحبها الف الف تحیة وصلوٰة زکیة، فعلیه
ان یشتغل بقراءة علم الاحادیث وتعلیمه بشروطه المعتبرة عند اهله،
واُوصی له بتقوی الله وسنة رسول الله وان یداوم علی طاعة الله و
ذکره فی الخلوات والجلوات وان یجتنب عن المعاصی والبدعات و
آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

حرره فی الثانی من شهر جمادی الاولیٰ سنة ستین بعد الالف والمأتین۔

(ترجمہ) بسم الله الرحمٰن الرحیم الحمد لله رب العالمین والصلوٰة علی سید المرسلین محمد وآله وصحبه اجمعین۔ اما بعد

خادم علمائے آفاق محمد اسحٰق عفا اللہ عنہ کہتا ہے کہ مولوی محمد طاہر معروفی نے — اللہ تعالیٰ ان کے باطن اور ظاہر دونوں کو پاک و صاف کرے — احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وصلوٰۃ زکیۃ مجھ سے پڑھیں۔ پس ان کے لیے لازم ہے کہ وہ ان شروط کے ساتھ جو عند المحدثین معتبر ہیں قراءۃ علم احادیث اور تعلیم احادیث کا شغل رکھیں۔ میں ان کو تقویٰ اللہ، پابندی سنت رسول اللہ اور مداومت طاعت و ذکر اللہ کی وصیت کرتا ہوں خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی — اور اس بات کی بھی وصیت کرتا ہوں کہ وہ معاصی اور بدعات سے اجتناب اور پرہیز کریں — و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین — تحریر بتاریخ ۲ جمادی الاول ۱۲۶۰ ہجری —

آپ نے حرمین شریفین سے واپسی کے بعد اپنے آبائی وطن کو اپنی دینی وعلمی خدمات کا مرکز بنایا، اور تقریباً نصف صدی تک درس کلام اللہ اور دینی تعلیمات میں سرگرم عمل رہے، ساتھ ہی اہل بستی کی عمومی اصلاح کی غرض سے ہر جمعہ کو وعظ فرماتے جس میں بدعات اور غلط رسم ورواج کی برائیاں مؤثر انداز میں بیان کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے اصلاحی وعظوں کا یہ اثر ہوا کہ پورہ معروف میں اب تک بدعات کا نام ونشان نہیں ہے۔

مولانا معروفی کو قرآن حکیم سے اس درجہ شغف تھا کہ طلبہ کو قرآن خود پڑھاتے اور ایک پارہ کی روزانہ کتابت کرتے تھے۔ مولانا فن کتابت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کے دست خاص کے لکھے ہوئے قرآن حکیم کے چند نسخے اور بخاری، مسلم، موطا امام مالکؒ، الجامع الصغیر، مشکوٰۃ، مسند امام اعظمؒ، مجالس الابرار، حصن حصین، مواہب الحکم کے نسخے اب بھی موجود ہیں۔ سہ رنگ وہفت رنگ کے بیل بوٹے بھی بہت خوب بناتے تھے جو آج بھی اسی چمک دمک کے ساتھ آپ کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا علم ظاہر کے ساتھ سلوک وطریقت میں بھی اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور حضرت مولانا کرامت علی جون پوریؒ کے مجاز تھے۔ راتوں کو بہت کم سوتے تھے۔ رات کے پچھلے پہر بستر سے الگ ہو جاتے اور نماز تہجد کے بعد قرآن کریم کی تلاوت میں منہمک ہو جاتے۔ دس پاروں کی تلاوت نہایت انشراح وانبساط سے کرتے۔ بعد ازاں نماز فجر باجماعت ادا فرماتے اور پھر اوراد ووظائف میں مشغول ہو جاتے۔

چونکہ آپ ایک ماہر طبیب بھی تھے اس لیے اوراد ووظائف سے فارغ ہو کر مریضوں کو دیکھتے اور نسخہ لکھتے تھے۔ غریب اور نادار مریضوں کو دوائیں مفت دیتے تھے۔ ان جملہ امور کے بعد زائرین ومتوسلین سے ملتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ مولانا علمی وروحانی کمال کے علاوہ جسمانی طاقت میں بھی نادرۂ روزگار تھے اور اس سلسلے میں ان کے ایسے ایسے واقعات مشہور ہیں جن کو لوگ مشکل سے باور کریں گے۔ پہلوان ہونے کی بنا پر روزانہ ورزش کا بھی معمول تھا۔

مولانا محمد طاہر مرحوم مقامی اصلاح کے ساتھ حسب موقع اطراف وجوانب کا بھی اصلاح

وتربیت کے سلسلے میں دورہ فرماتے تھے جس سے خلق خدا کو بہت نفع پہونچتا تھا۔

۲۴ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو ۷۰ سال کی عمر میں آپ کا وصال ہوا۔ اسی دن اپنے آبائی مقبرے متصل محلہ بلوہ میں بجانب مشرق املی کے درخت کے زیر سایہ دفن کیے گئے۔ آپ کے جنازے میں اتنا بڑا اجتماع تھا کہ پورہ معروف میں شاید ہی کسی کے جنازے میں اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو ——— مرور ایام کی وجہ سے آپ کی قبر کا نشان اب موجود نہیں ہے۔

آپ کا مادہ تاریخ وفات حافظ محمد طاہر ہے۔ آپ کے مزید اور مفصل حالات کے لیے حیات طاہر کا مطالعہ کیا جائے۔

(ماخوذ از تذکرۂ علماء اعظم گڑھ۔ صفحہ ۲۰۳ تا ۲۰۶)

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

ایک مثالی شخصیت

مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ

(۲)

سفر حج!

مطب شروع کئے ہوئے ابھی چھ سات مہینے گزرے تھے کہ زیارت حرمین کا خیال ہوا، اور ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں حج کے لیے روانہ ہوگئے، مدینہ طیبہ میں وہاں کے مشہور شیوخ محمد بن احمد العمری المغربی المالکی، مدرس حرم نبوی، اور شیخ محمود بن احمد الشبیر...... باسم السنوسی التیجانی مہاجر سے حدیث کی سند و اجازت حاصل کی، اور شیخ الاسلام کے مشہور کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

اس سفر میں حرمین کے برکات و انوار کے نزول اور کیفیات و تجلیات کے مشاہدہ کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اسی سال سلطان عبد العزیز نے موتمر اسلامی منعقد کرانے کا فیصلہ کیا تھا جس میں جمعیۃ علماء ہند کا وفد مولانا مفتی کفایت اللہ کی قیادت میں، خلافت کا وفد مولانا سید سلیمان ندوی کی امارت میں جا رہا تھا، اور مولانا خلیل احمد انبہوٹی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا حبیب الرحمان خان شروانی (صدر یار جنگ) مولانا محمد علی جوہر، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ علماء ہندوستان سے اور بہت سے علماء مصر و شام سے اس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر سے ملاقاتیں

ہوئیں۔ اور سلطان ابن سعود سے بھی ملے، اور یہ سفر دینی وعلمی برکات کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور ناظم ندوہ

مولانا عبد الحیؒ کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے لیے انتخاب ہو چکا تھا۔ اس وقت نواب سید حسن علی خاں ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔ نواب صاحب کی خرابی صحت کی بنا پر ربیع الآخر ۱۳۴۲ھ (اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں ڈاکٹر صاحب نائب ناظم منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۳۴۹ھ میں نواب صاحب کی مسلسل علالت کی بنا پر آٹھ نو مہینے بحیثیت قائم مقام ناظم فرائض انجام دیتے رہے، محرم ۱۳۵۰ھ میں نواب صاحب نے اپنی معذوری کی وجہ سے استعفیٰ دیدیا، مجلس منتظمہ نے استعفیٰ منظور کر لیا، اور اس کے ساتھ ہی دوسری تجویز کے ذریعہ ڈاکٹر عبد العلی صاحب کو بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء منتخب کیا گیا۔[1] ڈاکٹر صاحب تیس برس اس ممتاز عہدہ پر فائز رہے۔ اور اس تیس سالہ عہد نظامت میں ان کی اصابت فکر، دور بینی و دور اندیشی، معاملہ فہمی اور حسن انتظام سے ندوۃ العلماء کو بے حد فائدہ پہنچا۔ ندوہ نے ان کے عہد میں بے حد ترقی کی۔ ان کے دور کو ندوۃ العلماء کا زریں عہد اور یادگار زمانہ کہا جا سکتا ہے۔

ان کے دور کی اہم خدمات وخصوصیات!

ان کے دور انتظام کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ انھیں ندوہ کے ارکین انتظامی اور فرزندان ندوہ کی بڑی تعداد کا اعتماد اور تعاون حاصل رہا۔ جس میں خصوصیت سے علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی قابل ذکر ہیں۔

طلبہ میں اسلامی ماحول کا احیاء

ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں ندوہ کو منجملہ دوسری کامیابیوں کے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی تحسنگی، دینی مزاج، اور تبلیغی کوششوں سے طلباء میں دینی رجحان

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں نظامت کے لیے ۱۳۴۷ھ میں منتخب ہونا ذکر کیا گیا ہے جو بظاہر سہو ہے۔

بیدار ہوا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندرونی ماحول اور طلباء میں حسن اخلاق و معاشرت، معیار اور شعائر دین کے مزید احترام و عمل کا جذبہ نمایاں ہوا جس سے بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ "دارالعلوم (ندوۃ العلماء) کو ہر حیثیت سے بیش قیمت فائدہ حاصل ہوا"۔

عربی کے نئے نصاب کی تدوین

ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں ندوہ نے اپنا عربی نصاب تیار کیا، جو نہ صرف ہندوستان بلکہ متعدد عرب ممالک کے اسکولوں اور کالجوں میں داخل درس ہے، اس نصاب کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:۔

"ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں کئی مفید اور اہم اقدامات عمل میں آئے جن کا اثر ندوۃ العلماء کے حلقہ کے حدود سے متجاوز ہو کر دور دراز گوشوں تک پہنچا، ان میں سے ایک اہم اقدام عربی زبان وادب کے مستقل نصاب اور درسی کتب کی تیاری تھی جو خود دارالعلوم کے اساتذہ کے ہاتھوں عمل میں آئی"[1]

چند سطروں کے بعد اس کی تفصیل ان الفاظ میں قلمبند ہے:۔

"ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں یہاں عربی کی پہلی کتاب سے لیکر نثر عربی کی آخری کتاب تک ایک ایسا مکمل نصاب تیار ہو گیا، جس نے عرب فضلاء اور مصر و شام کے ماہرین تعلیم سے بھی داد تحسین حاصل کی، اور ان میں سے متعدد جامعات و مدارس کے نصاب میں داخل کی گئیں"[2]

ڈاکٹر صاحب ہی کے دور نظامت میں ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان "ماہنامہ البعث الاسلامی" اور "پندرہ روزہ الرائد" جاری ہوئے جو اپنی اصابت و صلابت، دینی مزاج اور ادبی حیثیت سے دنیائے اسلام کے ممتاز و باوقار مجلات میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کے لیے ڈاکٹر صاحب کی خدمات ایک وسیع باب کا موضوع ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ:۔

---

[1] و [2] ندوۃ العلماء کے پچاسی سال ص۸۲

> دارالعلوم کا یہ نیا عہد اور اس کا نیا دینی رجحان انھیں کے خلوص و فکر کا رہین منت ہے، اور جب کبھی ندوۃ العلماء کی تاریخ مرتب ہوگی، اور اس کی ترقیات و اصلاحات کا سراغ لگایا جائے گا، تو ان میں سے اکثر کا تعلق انھیں کی ذات اور انھیں کے دور نظامت سے ثابت ہوگا۔[1]

تبلیغی جدوجہد!

مسلمانوں میں دینی حمیت، مذہبی بیداری، اور اسلامی زندگی کے احیاء کے لیے مولانا محمد الیاس کے برپا کردہ تبلیغی نظام کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتے، خود بھی اس میں وقت لگاتے اور رفقاء و متعلقین کو بھی اس طرف متوجہ کرتے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندرونی ماحول اور طلبا کی دینی اصلاح کے لیے بھی اس کو بہت ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے ندوہ کے دینی ماحول میں غیر معمولی بہتری اور اصلاح ہوئی۔ اس سے ایک طرف تو سلسلۂ تبلیغ کو ذی علم اور مخلص کارکن ملے جن کے تعاون سے کام کے پھیلانے میں بے حد مدد ملی اور دوسری طرف ندوۃ العلماء کے عزت وقار میں اضافہ ہوا، اور بڑے منافع حاصل ہوئے، جس کا اعتراف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> "دوسری چیز جس نے دارالعلوم کو دینی حلقوں اور عامۃ المسلمین میں روشناس و مقبول بنایا وہ حضرت مولانا محمد الیاس کی دینی دعوت سے اس کا تعلق ہے۔ دعوت کے اس تعلق نے اس کے دینی رجحان کو بڑی قوت بخشی، اور خود اس کے اندر نئے جذبات، اور نئی زندگی پیدا ہوئی اور اس کے طلبا، اساتذہ اور کارکنوں کو عام دینی خدمت کا موقعہ ملا۔"[2]

غیر مسلموں میں تبلیغ!

مسلمانوں کی اصلاح کے لیے تعلیمی و تبلیغی کوششوں کے ساتھ ہی ساتھ غیر مسلموں کے

---

[1] روداد جلسہ انتظامیہ ندوۃ العلماء منعقدہ اگست ۱۹۵۰ء صفحہ [illegible] [2] ایضاً صفحہ [illegible]

پسماندہ طبقوں اور برادریوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے، اس موضوع میں ان کے لیے بڑی کشش تھی، اس کے لیے خود بھی ممکنہ سعی کرتے۔ اور ندوۃ العلماء کے فضلاء کی بھی خدمات حاصل کرتے، اور ان کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتے رہتے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں جب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پہلی مرتبہ مصر کے سفر پر گئے، تو ان کے نام خطوط میں بڑی دل سوزی کے ساتھ اس موضوع کی طرف توجہ دلاتے تھے، بالخصوص افریقہ میں اشاعت اسلام کے لیے سازگار فضا اور ان میں قبول حق کی استعداد، اور اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پر مفصل خطوط لکھتے تھے۔

مدینہ طیبہ کے مدرسہ علوم شرعیہ سے شغف!

ندوہ کی نظامت و مصروفیات کے بعد سب سے زیادہ دلچسپی اور محبوب کام مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ طیبہ کی امداد و اعانت سے تھی، بڑے ذوق و شوق سے اس کی خدمت میں مصروف رہتے تھے، اور اس کے لیے "معین مدرسہ علوم شرعیہ" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ جس کے وہ خود صدر، مولوی اشرف علی دیوبندی ناظم، اور مولوی عبدالرؤف سرگرم کارکن تھے۔

ملکی اور سیاسی خدمات!

ندوۃ العلماء کی نظامت، مطب، تبلیغی اور تعلیمی مصروفیات، اور تھکا دینے والے معمولات کے باوجود ملکی اور سیاسی خدمات کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے، اپنے وقت کا ایک حصہ اور پوری توجہ اس کے لیے بھی صرف کرتے۔

چنانچہ جب ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء) میں جمعیۃ علمائے ہند کا کل ہند اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو ڈاکٹر عبدالعلی اس کے صدر استقبالیہ منتخب ہوئے، اور اجلاس میں خطبہ استقبالیہ پڑھا جو مجالس استقبالیہ کے خطبات میں منفرد، بڑا حقیقت پسندانہ، پرمغز اور نہایت فکر انگیز تھا؛ انھوں نے اپنے اس خطبہ میں اس نکتہ پر خاص طور سے زور دیا تھا کہ سیاسی قوت کی

اخلاقی بنیاد ہونی چاہیے۔

ذوق علمی اور استعداد!

اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی درس و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ نہیں رکھا۔ لیکن نہایت سہولت و اطمینان سے تمام درسی کتابیں پڑھا سکتے تھے علمی استعداد اور درس کی صلاحیت کا تو اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کنگ میڈیکل کالج کی طالب علمی کے دوران ہی ۱۹۲۱ء میں ایک عرصہ تک تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ایک سال دارالعلوم (دیوبند) کے ایک منتہی طالب علم کو صحیح مسلم پڑھائی، حکیم عبدالقوی صاحب (مدیر صدق جدید لکھنؤ) نے طب کی اکثر کتابوں کا درس انھیں سے لیا، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ان سے متعدد کتابیں پڑھیں۔

عربی اور انگریزی کے مقابلہ میں فارسی کی استعداد عمدہ اور زیادہ پختہ تھی، فارسی میں بڑی رواں اور بے تکلف گفتگو کرتے تھے، جس کا مشاہدہ افغانستان کے مشہور ادیب و شاعر محمد سرور خاں کی لکھنؤ آمد کے موقعہ پر ہوا۔

توازن و جامعیت!

وہ دارالعلوم (دیوبند) اور ندوۃ العلماء کے فارغ ان درسگاہوں کی خصوصیات کے جامع انگریزی کے فاضل، مغربی علوم سے واقف، اور تہذیب مغرب کے رمز آشنا تھے، مشرق و مغرب کے اس امتزاج سے ان میں وسیع المشربی، کشادہ دلی، اور اعتدال و توازن کی صفات جمع ہو گئی تھیں۔

وہ ایک طرف تو نہایت متقشف، اسلامی عقائد و نظریات کی ابدیت پر گہرا یقین رکھنے والے اسلامی تہذیب کی پاکیزگی و برتری اور اسلاف متقدمین کی اخلاقی اور روحانی قوت، اور انسانی عظمت کے شدت سے قائل تھے، دوسری طرف تعلیمی اصول و خیالات جدید چیزوں کے مطالعہ اور دنیا سے واقفیت کے بارے میں اتنے ہی وسیع الخیال، حقیقت پسند اور غیر متعصب تھے۔

انداز تربیت!

ان کا انداز تربیت بڑا حکیمانہ اور گہری نفسیاتی واقفیت پر مبنی تھا، اس خوبصورتی وہ لطف و انداز سے تعلیم دیتے کہ وہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں گھر کر لیتی۔ اس عنوان کی تفصیلات میں جائے بغیر یہ کہدینا زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کے کمال تربیت کا نمونہ مخدومنا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بابرکات ہے۔ حضرت مولانا نے ان بلیغ الفاظ میں ڈاکٹر صاحب کے کمال تربیت کا ذکر کیا ہے،

وقد کان رحمہ اللہ وکان اباہ افضل مکافأة عطوفا
رؤفا مربیا حکیما من افضل ما عرفت من المربیین[1]

وفات!

مولانا سید حسین احمد مدنی کی رحلت اور اسی سال اہلیہ کی وفات نے بہت مضمحل و افسردہ کر دیا تھا جس کے اثر سے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت پیدا ہوئی بعد میں قلب بھی متاثر ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء میں مرض کا سخت حملہ ہوا مگر پھر افاقہ ہو گیا۔ اس کے بعد مرض عود کرتا رہا۔ ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ ۸ مئی ۱۹۶۱ء کو مرض کا شدید ترین دورہ ہوا اور وہ مسیحا نفس جس کے دست شفا سے نجانے کتنے مریضوں نے شفا پائی تھی کوئی طبی امداد ملنے سے پہلے اپنے رب کے حضور جا پہنچا۔

حلیہ اور خصوصیات!

ڈاکٹر صاحب نہایت خوبصورت، صحتمند، سرخ و سفید رنگ، دہرا بدن اور قد مائل بہ پستی تھا، طبیعت بڑی سادہ و جفاکش پائی تھی، اپنے تمام ضروری کام کپڑے سینا، کھانا پکانا، کپڑے دھونا بوقت ضرورت خود ہی کر لیتے تھے گفتگو بہت دھیمی کیا کرتے تھے، اعزہ کی تیمارداری، صاحب والا اور والدہ صاحبہ کی اطاعت و خدمت گزاری کے لیے بچپن ہی سے مشہور اور ضرب المثل تھے جس کا [illegible] واقعہ ہے جب ان کے [illegible] کے امتحانات ہو رہے تھے [illegible] صاحب [illegible] تقریب میں جانے کی ہدایت کی انہوں نے [illegible]

[1] [illegible] ندوی، [illegible] نقوش [illegible]

جانے کے لیے فوراً آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ وہاں جانے سے پورا تعلیمی سال ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بعد میں جب والد صاحب کو امتحان کا علم ہوا تو انھیں منع کیا۔

تصانیف!

ڈاکٹر صاحب کی متنوع مصروفیات کے بعد اس بات کے لیے بہت کم گنجائش تھی کہ وہ تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکال سکیں۔ مگر ان کی عالی ہمتی اور علمی ذوق اس منزل میں بھی پیچھے نہیں رہا، ان کی علمی صلاحیتوں کی سب سے پہلی یادگار علامہ انور شاہ کشمیری کی تقاریر درس تھیں، جنھیں حضرت علامہ نے دیکھا اور پسند فرمایا تھا اور کہیں کہیں اپنے قلم سے تصحیح و اضافہ بھی کیا تھا، افسوس ہے یہ گنجینۂ علوم ضائع ہو گیا۔

اردو میں پہلی تالیف مولانا عبد الحئیؒ رائے بریلوی کے حالات پر مفصل مقالہ ہے، یہ مقالہ اسی سال لکھا گیا جس سال انھوں تعلیم سے فارغ ہو کر مطب کی ابتدا کی تھی۔ یہ مقالہ "یادایام" (تاریخ گجرات) کے ساتھ شاہی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس عام منعقدہ لکھنؤ ۱۹۴۸ء کا خطبۂ استقبالیہ ان کی قلمی یادگار ہے۔ — — —

ایک رسالہ، ان کے علاوہ حکیم اجمل خاں کے مطب کے نسخے بھی ان کے قلم کے شاہکار ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ادبی ذوق، عربی مذاق، عالم اسلام سے واقفیت اور تاریخ کے وسیع مطالعہ و تحقیق کا صحیح اندازہ ان کی تالیف "جغرافیہ جزیرۃ العرب" سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے والد ماجد کی فرمائش پر لکھی تھی افسوس اس پر نظر ثانی اور طباعت کا موقع نہیں ملا۔

پسماندگان میں ایک صاحبزادہ مولانا محمد الحسنیؒ اور پانچ صاحبزادیاں یادگار ہیں۔

ع مولانا محمد الحسنی [illegible] ادیب و انشاپرداز کی حیثیت سے متعارف ہیں [illegible]

ترتیب مولانا مجیب اللہ ندوی (اعظم گڑھ)

مجلس بقیۃ السلف

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی دامت فیوضہم

الفرقان کے بہت سے ناظرین جن کو حضرت مولانا پرتاب گڈھی مدظلہٗ کے ملفوظات سے دینی نفع پہنچا ہو ان کا تقاضا رہتا ہے کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے، ذاتی طور پر راقم الحروف بھی حضرت مولانا کی صحبت اور آپ کے ملفوظات عالیہ کو خود اپنے لیے ازدیاد ایمان کا سامان سمجھتا ہے مگر مدرسہ کی اور بعض دوسری اجتماعی مشغولیتوں کی وجہ سے اس سلسلہ میں لمبے لمبے وقفے ہو جاتے ہیں جس کا خود مجھے بڑا قلق ہے۔ مگر

"وتجری الریاح بما لا تشتھی السفن"

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہوائیں کشتی کے رخ کے خلاف چلتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو تھوڑا بہت دین کا علم اور کچھ سمجھ عطا فرمائی ہے اور ایک مدت سے بزرگوں کی خدمت میں جو آنے جانے کا اتفاق ہوا ہے اس کی بنا پر میں اگر یہ کہوں تو ذرہ بھر بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا نے خلوت اور جلوت کی تقسیم اور فرق کو جس طرح ختم کر ڈالا ہے اور جس طرح انھوں نے "خلوت در انجمن" کے طریق پر اپنی پوری زندگی اتباع سنت کے ساتھ گزار دی اور مرض، ضعف اور نقاہت کے باوجود اب تک وقت کے کسی تحفظ کے بغیر روزانہ زندگی گزار رہے ہیں، ہم لوگ اگر چاہیں بھی تو ایک دن ویسی زندگی گزارنا مشکل ہے، ہم جیسوں کو جو راحت خدمت لینے میں محسوس ہوتی ہے مولانا کو اس سے بڑھکر راحت خدمت کرنے میں ملتی ہے۔

حدیث شریف میں جو یہ آتا ہے کہ

من یخالط الناس و یحمل	جو لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور ان کی تکلیفیں
اذاھم خیر ممن لم یخالط	برداشت کرتا ہے وہ اس شخص سے بہتر ہے جو نہ
الناس ولا یحمل اذاھم	ملتا جلتا ہے اور نہ ان کی تکلیفیں برداشت
	کرتا ہے۔

مولانا کی پوری زندگی اس کی مصداق ہے۔

مولانا کو اگر کوئی شبہ بھی ہو جائے کہ میری کسی بات سے فلاں کو تکلیف ہوئی ہوگی تو اس کی تلافی کے لیے سو سو جتن کرتے ہیں ـــــ ایک دن اپنے کسی مخلص کو کسی غلطی پر تنبیہ فرمائی پھر اس کے کچھ دیر بعد ان سے بار بار فرمایا کہ اگر کوئی تکلیف ہوئی ہو تو بھائی معاف کرنا میں نے خیر خواہی سے یہ بات کہی تھی، انھوں نے عرض کیا نہیں حضرت آپ کی تنبیہ سے تو ہم لوگوں کی اصلاح ہوتی ہے آپ ذرہ بھر اس کا خیال نہ فرمائیں۔

فرمایا کہ مولانا گنگوہی نے لکھا ہے کہ شیخ اور مرید دونوں کے اوپر ایک دوسرے کے حقوق ہیں، اور مولانا تھانوی نے لکھا ہے کہ مرید غلام نہیں بلکہ دوست ہوتا ہے اس لیے اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے، پھر فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم تھے مگر آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو وہ اس کا بدلہ مجھ سے دنیا ہی میں لے لے پھر فرمایا اگر میں قسم کھاؤں تو حانث نہیں ہوں گا کہ میرے کسی طرز عمل سے کسی کو تکلیف پہنچ جاتی ہے تو میں جب تک راضی نہیں کر لیتا چین نہیں آتا، دیر تک حضرت مولانا اسی طرح کی بات فرماتے رہے، آخر میں فرمایا کہ آپ لوگ یہ باتیں پھر نہ پائیں گے، یہ جملہ مولانا نے بہت دھیمی آواز سے فرمایا مگر ہم لوگوں پر بجلی کوند گئی اور بے اختیار زبان پر حضرت سید صاحبؒ کا یہ شعر آ گیا[1]

جی بھر کے دیکھ لو یہ جمال جہاں فروز ـــــ پھر یہ جمال نور دکھایا نہ جائے گا

---

[1] حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے یہ شعر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے آخری دور حیات میں کہا تھا۔

مولانا کئی برس سے بیمار رہا کرتے ہیں کبھی کبھی ۔۔۔ ۳۔۴ گھنٹے تک غشی کی کیفیت طاری رہتی ہے ان کو کسی آنے جانے والے کا پتہ تک نہیں چلتا۔ مگر اس حال میں بھی نماز کے وقت وہ آنکھ کھول دیتے ہیں اور وضو کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔

ہمارے جیسے معمولی طالبین بھی جب پہنچ جاتے ہیں تو مولانا اتنا مسرور ہوتے ہیں کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کسی ماں باپ کو اپنے کسی لائق بیٹے کے آنے پر جو مسرت ہوتی ہوگی اس سے بھی زیادہ مولانا کو کسی طالب صادق کے آنے سے خوشی ہوتی ہے، تقاہت و ضعف کے باوجود خود اپنے ہاتھ سے چائے دینا، کھانا لانا، جب تک مہمان کھانا کھاتا رہا پوری مسرت کے ساتھ اس کے قریب بیٹھے رہنا روزانہ کا ان کا ایسا معمول ہے کہ اس پر حیرت ہوتی ہے ۔۔۔۔ جب کوئی صاحب علم و فہم آدمی آجاتا ہے تو پھر مولانا کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ جدا ہو اگر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا علی میاں یا مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہم العالی کے آنے کی اطلاع مل گئی (یہ حضرات اکثر تشریف لایا کرتے ہیں) تو پھر آمد سے کئی دن پہلے سے مولانا کی مسرت اور ان کے لیے اہتمام دیکھنے کے قابل ہوتا ہے یہ حضرات جب تک رہتے ہیں تو وہ خود سراپا تواضع بنے رہتے ہیں مجلس میں جب تک یہ حضرات اصرار نہیں کرتے کم ہی بولتے ہیں اور پھر ان حضرات کے جانے کے بعد مولانا پر جو غم کی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ شاید کسی ماں کو اپنے بچے کو جدا کرنے پر بھی نہیں ہوتی ہوگی ۔۔۔۔ بار بار اپنی حسرت اور غم کا اظہار فرماتے رہتے ہیں ۔۔۔۔ اکثر ہم لوگ واپس جانے کی اجازت لے لیتے ہیں، مولانا ہم لوگوں کی رعایت کر کے اجازت تو دیدیتے ہیں مگر ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش یہ کچھ اور ٹھیرتے مگر عملاً روکتے نہیں، مولانا کی یہ کیفیت اگر محسوس کر کے کسی آنے والے نے اپنے قیام کی مدت بڑھا دی تو پھر مولانا کے نشاط کا اندازہ لگانا مشکل ہے، پھر اس وقت جو مجلسیں ہوتی ہیں اور جو حقائق وہ بیان کرتے ہیں ان کا قلم سے ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

مولانا کی مجلس میں کبھی مال و دولت یا زندگی کی آسائش کی چیزوں کا ذکر نہیں سنا اور نہ کبھی ان کی طرف کوالتفات پایا، لوگ مولانا کو بڑے بڑے ہدایا پیش کرتے ہیں مگر مولانا کو

جو خوشی کسی صاحب علم کے آنے پر ہوتی ہے وہ بڑے سے بڑے ہدیے سے نہیں ہوتی اور پھر ان ہدایا کا بیشتر حصہ یا تو وہ ہندوستان کے دینی اداروں کو بھیج دیتے ہیں یا پھر طالبین پر خرچ کر دیتے ہیں غالباً اس کا بہت قلیل حصہ اپنی ذات اور اہل و عیال پر صرف کرتے ہیں ما شاء اللہ ان کے بال بچوں کو اللہ نے بے نیاز بھی فرمایا ہے۔

مولانا پر جب کبھی قلم اٹھانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے تو اس میں ایسی حلاوت محسوس ہوتی ہے کہ ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا، شاعر نے شاید اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

کبھی جب ذکر آ جاتا ہے ان کا زباں دو دو پہر ہوتی نہیں بند

اب وہ مجلسوں کے جو ملفوظات میں محفوظ کر سکا ہوں وہ پیش خدمت ہیں امراض اور ضعف کی شدت کی وجہ سے بہت کم باقاعدہ مجلس ہو پاتی ہے مگر جو کچھ کبھی متفرق اوقات فرمایا ہے اس کا جتنا حصہ قلم بند ہو سکا ہے وہ پیش خدمت ہے۔

فرمایا کہ ایک صاحب ایک بزرگ کے پاس صبح کے وقت گئے، دیکھا کہ وہ کچھ مشغول ہیں، پھر دوبارہ گئے پھر مشغول پایا، پھر تیسری بار گئے پھر انھیں مشغول دیکھا، پھر چوتھی بار گئے تو فارغ بیٹھے تھے پوچھا حضرت میں کئی بار آیا اور آپ کو مشغول پایا اس لیے واپس چلا گیا، آپ اتنی دیر کیا کر رہے تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ "اپنی روح کو ناشتہ کرا رہا تھا" مولانا واقعہ نقل کرنے کے بعد اس جملہ کا دیر تک لطف لیتے رہے کہ "میں روح کو ناشتہ کرا رہا تھا" فرمایا کہ اگر وہ یہ کہتے کہ میں ذکر کر رہا تھا تو بالکل صحیح ہوتا مگر انھوں نے تو اضعاً اور تعلیماً اس کو یوں ادا کیا کہ روح کو ناشتہ کرا رہا تھا، ہم اپنے جسم کے غذا کے لیے تو نہ جانے کتنا جتن کرتے ہیں جب کہ وہ فنا ہو جانے والا ہے مگر روح کو جن اعمال سے زندگی اور تازگی ملتی ہے اس کا اہتمام ہم کتنا کرتے ہیں اس سے ہم بالکل غافل رہتے ہیں —

اسی ضمن میں فرمایا کہ قرآن پاک میں "قبل طلوع الشمس وقبل الغروب" اللہ کی یاد کا ذکر آیا ہے جس سے ذکر کا دوام ظاہر ہوتا ہے اس پر دوسری آیات بھی دلالت کرتی ہیں۔

فرمایا کہ ایک بزرگ کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ آیا اور کسی نے ان سے کہا کہ چلیے جنت میں، انھوں نے کہا کہ بھائی فلاں فلاں کہاں ہیں؟ جب تک ... سے

دوستوں کو جمع کر لیا تو پھر جنت میں گئے، انہی صاحب نے ایک دوسرے بزرگ کو خواب میں دیکھا کہ ان سے کسی فرشتہ نے کہا کہ جنت میں چلیے تو وہ اٹھے اور چلے گئے اس خواب کو سنکر کسی نے کہا کہ پہلے بزرگ کا طرزِ عمل زیادہ اچھا تھا کہ سب کو لیکر جنت میں گئے اور دوسرے بزرگ کو صرف اپنی ہی فکر رہی، مگر کسی اہل دل نے دونوں کے طرزِ عمل کے بارے میں یہ توجیہ کی کہ پہلے بزرگ پر خوف کا غلبہ تھا وہ ڈرے کہ کہیں ہمارے ساتھی رہ نہ جائیں اور دوسرے بزرگ پر رحمت کا غلبہ تھا انھوں نے سوچا کہ اللہ اپنی رحمت سے ہمارے دوستوں کو بھی محروم نہیں کرے گا۔

فرمایا کہ میں اختلاف کو بڑھانا پسند نہیں کرتا خواہ اختلاف عقیدہ و مسلک کا ہو یا ذوق وطبیعت کا۔ بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔ مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری ایک عالم اور شاعر تھے مسلکاً بدعت کی طرف مائل تھے انھوں نے "انوار ساطعہ" کتاب بھی لکھی جس میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا گنگوہی کے فتوے کا رد کیا تھا۔ مولانا خلیل احمد صاحب نے "براہین قاطعہ" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر اس کا جواب دیا ہے۔ یہی مولانا عبدالسمیع صاحب کسی تقریب کے سلسلہ میں گنگوہ آئے اور پھر مولانا گنگوہی سے بھی ملنے گئے، مولانا نے اُن کو کھانے کی دعوت دی انھوں نے قبول کر لیا، اس موقع پر بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ آ گئے ہیں آپ ان کے مسلک کے بارے میں کچھ گفتگو کر لی جائے۔ فرمایا بھائی یہ میرے مہمان ہیں" یہ بات اکرام ضیف کے خلاف ہے کہ ان سے اختلافی گفتگو کروں، پھر فرمایا کہ یہ انہی کا شعر ہے

بیدلِ خستہ کو پاؤ گے کہاں

سن لو اس کی یہ کہانی چند روز

جیسا کہ راقم الحروف نے اوپر لکھا ہے خود مولانا کی ذات اس شعر کی مصداق ہے۔

فرمایا کہ ماں باپ کے بارے میں آیا ہے "ولا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما" اور صحابہ کرام میں اکثر وہ تھے جن کے ماں باپ مشرک تھے، اور خصوصیت سے اُن ماں باپ کے لیے جو مشرک ہوں اور بیٹے پر شرک کے لیے دباؤ ڈالیں۔ فرمایا گیا کہ اُن کی یہ بات

تو نہ مانی جائے، لیکن "وصاحبهما فی الدنیا معروفاً" جب مشرک ماں باپ کے بارے میں یہ فرمایا گیا تو پھر مومن ماں باپ کا کیسا حق ہوگا؟ ماں باپ کا یہ درجہ اسی لیے ہے کہ وہ مادی طور پر اس کی پرورش کا سامان کرتے ہیں اور کسی حد تک تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے ہیں، تو کیا اساتذہ و مشائخ اور مربی جو اس کی روحانی پرورش اور تربیت کرتے ہیں وہ اس کے مصداق نہ ہوں گے اور ان کے حقوق و آداب و دست نہ ہوں گے۔ جو مادی ماں باپ کے ہیں؟ بلکہ ان کی تربیت ہی سے تو ماں باپ کا بھی حق پہچانا جاتا ہے۔

فرمایا کہ کبھی آدمی خود اپنا معتقد بن بیٹھتا ہے اس کو دو چار آدمی جب بزرگ کہنے لگتے ہیں تو وہ بھی اپنے کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے، اصل چیز اپنے کو کچھ نہ سمجھنا ہے مگر ہے یہ بہت مشکل کام۔

فرمایا کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ ایک دن مجلس میں فصوص الحکم کی عبارت پڑھکر اہل مجلس کو سنا رہے تھے مگر کتاب نقل کرنے والے سے اس میں غلطیاں رہ گئی تھیں اسی بنا پر شیخ عبارت ذرا اٹک اٹک کر پڑھ رہے تھے، حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ جو ان کے جانثار اور مرید خاص تھے انھوں نے کہا کہ حضرت فلاں جگہ اس کا ایک نسخہ ہے وہ بہت صحیح ہے، حضرت گنج شکر کو ان کی اس بات سے تکدر پیدا ہو گیا فرمایا کہ ہاں بھائی میرے اندر اتنی لیاقت کہاں کہ میں کتاب صحیح پڑھ سکوں، میرے اندر اتنی استعداد کہاں کہ کتاب کی عبارت درست کروں! حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ سمجھ گئے کہ حضرت کو تکدر ہو گیا پھر تو ان پر گریہ طاری ہو گیا اور ان کا کھانا پینا سب چھوٹ گیا، جب کئی دن گزر گئے تو صاحبزادے نے عرض کیا کہ ابا آپ نظام الدین سے کیوں ناخوش ہو گئے، ان کا مطلب تو یہ تھا کہ آپ کو زحمت نہ ہو، خدانخواستہ یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ عبارت صحیح پڑھ نہیں سکتے حضرت گنج شکر نے فرمایا کہ میں بھی سمجھتا ہوں، میں نے ان کے فائدے ہی کے لیے ایسا کیا ہے، یعنی اس جملہ سے اپنے علم اور بڑائی کا اظہار ہو رہا تھا اس لیے شیخ نے یہ علاج کیا۔

فرمایا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک صاحب بہت دنوں تک رہے مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور بہت سے لوگ تھوڑے دنوں میں تعلق مع اللہ

کی بیعت لیکر چلے گئے، ایک دن انھوں نے کہا کہ حضرت میں اتنے دنوں سے ہوں مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا، فرمایا کیا مقصد ہے؟ کہا میں ابھی تک اجازت کے قابل نہیں ہوسکا، اگر اس لائق ہوجاتا اور آپ اجازت دیتے تو میں جاکر لوگوں کو بیعت کرتا اور دینی فائدہ پہنچاتا فرمایا کہ تم کو مرشد اور بڑا بننے کی خواہش ہے تم اسی وجہ سے کامیاب نہیں ہوئے، اچھا ایک علاج ہے اگر تم ایسے کرلو تو کامیاب ہوجاؤ گے، بولے وہ کیا حضرت بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک ٹوکری کھجور لو اور بازار میں ایسی جگہ بیٹھ جاؤ جہاں تمھارے جاننے والے اور ماننے والے موجود ہوں اور یہ اعلان کردو کہ جو ایک دھول یا چپت مارے گا اسے ایک کھجور دوں گا اور جو زیادہ مارے گا اسے اتنی ہی کھجوریں زیادہ دوں گا۔ انھوں نے کہا کہ حضرت یہ تو مجھ سے نہیں ہوسکے گا۔ حضرت بغدادی نے فرمایا کہ پھر تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ —— فرمایا کہ اسی لیے بزرگوں کے یہاں اپنے کو خالی کرکے جانا چاہیے پانی اسی زمین میں جاتا ہے جو نشیب میں ہوتی ہے اونچی زمین پر پانی نہیں چڑھتا۔ یہی مطلب ہے صوفیا کے قول کا کہ نزول عروج سے بہتر ہے۔

فرمایا کہ محبت فنا فی المحبوب کا نام ہے یعنی محبوب کی مرضی میں فانی ہونا مگر بھائی محبت بڑی نازک چیز ہے محبت میں جذبات پر قابو پانا بہت ضروری ہے جذبات پر آدمی قابو اس وقت پاتا ہے۔ جب شریعت پر نظر ہو میں نے اس مفہوم کو اپنے بہت سے اشعار میں ظاہر کیا ہے اور خدا کے فضل سے میرے اشعار سن کر بہت سے اہل دل نے سند دی ہے،

بھٹک کر منزل جاناں سے دور جا پہنچے
جو جوشِ عشق میں جذبات کو دبا نہ سکے

سرور و کیف کا عالم نہ پوچھیے ان سے
جو آستانِ محبت سے سر اٹھا نہ سکے

نظر کو ان کی جو اپنی نظر بنا نہ سکے
لطیف جلوے نگاہوں میں ان کی آ نہ سکے

——— (باقی)

بیگم مولانا عزیز گل کی آپ بیتی

الفرقان کے دسمبر ۶۸ء اور جنوری ۶۹ء کے شمارہ میں "ایک نومسلمہ انگریز خاتون" کے زیر عنوان بیگم مولانا عزیز گل (مس جینی) کے حالات اور ان کے اسلام قبول کرنے اور اسیر مالٹا مولانا عزیز گل کی زوجیت میں آنے کی تفصیلات ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں، اسی مضمون کے آخری حصہ میں، انگریزی زبان میں ان کی تصنیف "دی بلینڈ وے" (صراط مستقیم) کا ذکر بھی کیا گیا تھا، جو اب سے چالیس سال پہلے ۱۹۲۹ء میں دہلی کے مشہور تصنیفی اور اشاعتی ادارہ "دار المصنفین" سے شائع ہوئی تھی ـــــ اس کتاب میں انھوں نے اسلام کی طرف آنے سے پہلے کی اپنی زندگی کے حالات بہت تفصیل سے لکھے تھے۔ اُن کے مطالعہ سے موصوفہ کی شخصیت اور زندگی اور بھی زیادہ غیر معمولی اور عظیم سبق آموز نظر آتی ہے۔

حیدرآباد سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ "قرطاس و قلم" کے ۱۰ر جنوری کے شمارہ میں اسی کتاب "دی بلینڈ وے" (صراط مستقیم) سے اخذ کرکے یہ حالات ایک مضمون کی شکل میں "بیگم عزیز گل کی آپ بیتی" کے عنوان سے شائع کیے گئے ہیں ـــــ

ادارہ قرطاس و قلم کے شکریہ کے ساتھ یہی مضمون ـ ان صفحات کے ذریعہ نذر ناظرین الفرقان کیا جا رہا ہے۔

میں اپنے والد چارلس ایڈورڈ اسٹیفورڈ ڈاشیل کی ساتویں لڑکی ہوں۔ میں ۱۸۸۰ء میں حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئی۔ میرے والد بڑے انصاف پسند اور بات کے پکے انسان

تھے۔ انھیں ہندوستان اور ہندوستانی لوگوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی تو وہ خود کو سدھی کہہ دیا کرتے تھے۔ ہماری خاندانی نسبتیں بڑی عظیم تھیں مگر ہمارے والد کا کہنا تھا کہ شرافت کا معیار کردار ہے نہ کہ خون۔ بہرحال میں چھ سال کی رہی ہوں گی کہ مجھے تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا گیا۔ مجھے یہی بات سے ہمیشہ سے پیار رہا۔ میں ہر بات کا سبب کھوجنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ میرے دوست احباب مجھے شفقت سے لکو کہا کرتے تھے کیوں کہ میں ہر بات میں کیا، کیوں اور کیسے جیسے سوال کرنے کی عادی تھی۔

میں ایک عیسائی کنبے میں پیدا ہوئی تھی۔ مگر سب عیسائی متحد نہ تھے۔ عیسائیوں کے بہت سے فرقے تھے جو ایک دوسرے کو جہنمی کہتے تھے۔ اس لیے عیسائی مذہب مجھے گورکھ دھندا سا لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے کیسے ہو سکتے تھے۔ مگر مجھے دعا سے بڑا شغف تھا اور میں اکثر ان دیکھے مالک سے لو لگا کر دعائیں کرتی رہتی تھی۔ جب میں جوان ہو گئی تو میں نے بائبل کو تنقیدی نظر سے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے بائبل کے بہت سے بیانات ایک دوسرے سے ٹکراتے محسوس ہوئے۔ مجھے بائبل کے کلام خدا ہونے میں شک ہونے لگا۔

کچھ عرصہ کے بعد میری شادی ہو گئی۔ مگر میرے شوہر ایک دنیا دار عیسائی تھے وہ میرے فکر و خیال کے ساتھی نہ بن سکے۔ اس لیے میں نے فرصت کے وقت میں فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا اور اسپنسر ہکسلے اور دوسرے فلاسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ مگر ان خیالی بھول بھلیوں سے مجھے کچھ نہ ملا۔

انھیں دنوں میں اپنے والد کے پاس ہندوستان آئی میری بارہ سالہ لڑکی اور دس سالہ لڑکا میرے ساتھ تھے۔ یہاں مجھے ویدانت پڑھنے کا موقع ملا۔ مجھے اس کے پڑھنے سے بڑی تسکین ملی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ چیز مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ ویدانت کے مطالعے نے مجھے ہندو دھرم کے قریب کر دیا۔ کچھ عرصہ کے لیے ایک ہندو خانقاہ میں مہمان بن کر رہی اور بالآخر ہندو ہو گئی۔ مجھے راما کرشن کے ویدانتی سلسلے میں داخل کر لیا گیا مگر مجھے یہ شرک سا محسوس ہوا چنانچہ میرا یقین ہل گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ حقیقت ابھی اور آگے ہے۔ اسی زمانے میں بیمار ہو گئی۔ مجھے علاج کے لیے فرانس جانا پڑا۔ وہاں میرے سات آپریشن ہوئے۔ ہر آپریشن پر موت سامنے

کھڑی نظر آتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میں موت کے لیے تیاری کر لوں میں نے سوچا کہ دنیا ترک کر دوں اور آخرت کی تیاری میں لگ جاؤں۔ لہٰذا میں واپس جب ہندوستان آئی تو میں نے سنیاس لے لیا۔ میں نے ایک سو آٹھ اپنشد پڑھے۔ لیکن یہ کیا۔۔۔۔ یہاں بھی بائبل کی طرح کے ان گنت تضاد تھے۔ ان میں کون سی بات حق ہے اور کون سی غلط ہے، یہ کیسے معلوم ہو، میں ایک بار پھر اُلجھ گئی۔ مجھے خوف ہو گیا کہ اسی ذہنی الجھن میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ سنیاس سے میری روحانیت نہیں بڑھ رہی ہے۔ نفسیاتی کش مکش بڑھ رہی تھی۔ اسی زمانہ میں ہندوستان میں عدم تعاون کی تحریک چل پڑی۔ ہندوستانی ہندوستانیوں سے لڑ پڑے۔ الموڑہ بھی فسادات سے بچا نہ رہا۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ یہ خانقاہ میں بیٹھ کر دھیان گیان کا وقت نہیں ہے۔ بلکہ باہر نکل کر زخمیوں اور دکھیوں کی مدد کرنے کا وقت ہے۔ میں نے اپنے گروجی سے یہ بات کہی۔ مگر انھوں نے کہا کہ ہم لوگ دنیادار نہیں ہیں۔ تم جن باتوں کے کرنے کو کہہ رہی ہو، سیاست کی باتیں ہیں، ہم ان باتوں میں نہیں پڑتے۔

مجھے ان کے سوچنے کے اس انداز پر حیرت ہوئی میں انھیں تو خانقاہ چھوڑ کر زخمیوں کی مدد پر آمادہ نہ کر سکی مگر میں خود خانقاہ سے نکل آئی اور میں نے زخمیوں، مریضوں اور دکھیوں کی امداد کی، مجھے اس سے دل کا چین ملا۔ اور میں نے طے کیا کہ روحانی ترقی انسانیت کی خدمت کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ خانقاہوں کی زندگی سے نہیں، چنانچہ میں نے ایک آشرم کھولنے کا فیصلہ کیا جس میں نوجوان لڑکوں کی اخلاقی تربیت کی جائے۔ اس آشرم میں میں نے ہندو مسلمان کی قید نہیں رکھی۔ وہاں ایک مسلمان لڑکا داخلے کے لیے لایا گیا۔ یہ لڑکا اپنے والدین کے لیے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب تک میں مسلمانوں کے نظامِ حیات کے بارے میں معلومات حاصل نہ کروں، میں اس لڑکے کی تربیت کا حق ادا نہ کر سکوں گی۔ اس نیت سے میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ اب تک میں مسلمانوں سے ڈرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ مسلمان ایک قسم کے "ڈاکو" ہوتے ہیں جو ہر قسم کا ظلم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کتاب نے میری آنکھیں کھول دیں، یہ تو سراسر حق تھا اور دل میں اترتا چلا جاتا تھا۔ یہ عمل ہدایت تھا۔ آہ۔ میں اب تک کن اندھیروں میں تھی۔ افسوس کہ یورپی مستشرقوں نے اسلام کی کتنی

غلط تصویر پیش کی ہے وہ مذہب جسے میں خونخوار بھیڑیوں کا مذہب سمجھتی تھی مکمل سچائی کا دین تھا۔ میرے اللہ میں اب کیا کروں، میں نے تو ساری زندگی اکارت کر دی۔ میں نے سوچا میں ہندو ہی رہوں یا ہندومت کو چھوڑ دوں۔ میں نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ یہ ایک طرح کی موت تھی۔ قرآن مجھے زندگی کی طرف بلا رہا تھا۔ ایسی زندگی کی طرف جو آخرت کی زندگی کی بنیاد بنتی ہے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میں ایک مقدس خانقاہ کی راہبہ تھی۔ لوگ مجھے پیارے ماں کہتے تھے میں مسلمان ہو جاؤں گی تو دنیا کیا کہے گی؟ مگر مجھے اپنی روح کو تھلجان سے بچانا تھا میں نے لوگوں کے کہنے کی پروانہ کی۔ میں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

میرے گرو بھائی بڑے وحشت زدہ ہوئے مگر میں نے انھیں خلوص سے بتایا کہ اصل ویدانت یہ ہے جواب میں قبول کر رہی ہوں۔ میرے گرو بھائیوں نے کہا کہ یہ کام مسلمان ہوئے بغیر بھی جاری رہ سکتا ہے۔ ویدانتی رہ کر بھی تم قرآن کی راہ اختیار کر سکتی ہو۔ یہ بھی ویدانت کا ہی ایک سلسلہ ہوگا۔ لیکن یہ بات میرے دل میں نہ اتر سکی۔ میں سمجھ رہی تھی راما کرشن نے حقیقت کا راستہ نہیں اختیار کیا تھا۔ بلکہ وہ خود اُن کے ذہن کی اپج اور ایک بھرم تھا ہو سکتا ہے کہ کسی نام نہاد صوفی نے انھیں یہ بھرم دلا دیا ہو۔ میرے ہندو دوستوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے آپ کو مسلمان نہ کہوں تو وہ مجھے آگرہ میں راما کرشن مشن کا مہنت بنا دیں گے۔ مگر مجھے دنیا کی لالچ نہ تھا۔ مجھے روح کے آرام کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے اُن کی بات کو رد کر دیا۔

مگر اب ایک اور مشکل آئی۔ مسلمانوں نے مجھے مسلمان ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ہمیں ہندو بنانے کے لیے یہ روپ دھارن کر رہی ہے۔ میں خود شبہ میں پڑ گئی۔ میں قرآن کو اپنا ہادی اور رہنما مان رہی تھی تو کیا یہ بات مسلمان ہونے کے لیے کافی نہ تھی۔ اپنے دل کی بے قراری کو دور کرنے کے لیے میں دیوبند گئی۔ میری لڑکی میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں بے پردہ تھیں۔ ہم نے مولانا حسین احمد مدنی سے ملاقات کی۔ اپنی بات اُن کے سامنے رکھی اور پوچھا "کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟" "تم حقیقتاً مسلمان ہو!" ——— مولانا نے ایک زوردار نعرہ لگا کر کہا۔ "تمھیں اس میں شک کیوں ہے؟" مولانا حسین احمد صاحب کی عظمت ہم دونوں کے دل میں بیٹھ گئی۔ انھوں نے ہماری بہت خاطر کی۔ بعد کو وہ ایک بار مجھ سے ملنے منگلور بھی

آئے تھے۔ انھیں کے ساتھ مولوی عزیر گل بھی تھے مولانا حسین احمد انھیں بہت چاہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ دو دوست لڑکے ہوں۔ وہ ایک دوسرے سے معصوم مذاق کرتے، ایک دوسرے کی ہنسی اڑاتے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کو چڑھاتے بھی تھے۔ مجھے ان کی محبت پر رشک ہوتا تھا۔ وہ دن بھر ہمارے یہاں رہے جب وہ چلنے لگے تو میں نے مولانا حسین احمد صاحب سے کہا کہ وہ پھر تشریف لائیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میں تو زیادہ نہ آسکوں گا مگر عزیر گل کبھی کبھی آیا کریں گے۔ چنانچہ مولوی عزیر گل صاحب آتے رہے میں ان سے پردہ اور دوسرے مسائل پر بے جھجک بات چیت کرتی رہی۔ شروع میں میں سمجھتی تھی کہ یہ مولوی بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔ مگر بعد کو پردے کی حقیقت مجھ پر کھلی تو میں انکی وسعت نظر کی قائل ہوگئی۔ یہاں میں اسلام کے مطالعہ میں لگی ہوئی تھی کہ اچانک میرے شوہر کا خط آیا کہ اگر میں فوراً انگلستان نہ لوٹی تو وہ مجھے خرچ دینا بند کردیں گے۔ بچوں کی تعلیم کا خرچ مجھ سے وصول کریں گے اور مجھ سے تعلق توڑ لیں گے۔ اس خبر پر مجھے نہ تعجب ہوا نہ افسوس —— میں مسلمان ہوچکی تھی۔ اب میں کسی عیسائی شوہر کی بیوی کیسے رہ سکتی تھی۔ رہا رزق۔ تو یہ اللہ کی دین ہے۔ کم یا زیادہ ملے گا ہی۔ عزیر گل کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے میرا ہاتھ تھامنے کی پیش کش کی۔ میں نے بڑے احترام سے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔ میں جانتی تھی کہ ان کے یہاں غربت ہے افلاس ہے، پردہ ہے۔ مگر میرے لیے تو یہی اللہ کی پسندیدہ جگہ تھی۔ عزیر گل کے گھر میں میں نے سیکھا کہ خود بھوکے رہ کر مہمانوں کی تواضع میں کیا لذت ہے! عزیر گل کے گھر میں مجھے زندگی کی حقیقی راحت ملی۔ وہ نہایت شریف اور مہربان شوہر ثابت ہوئے۔

یوں بھی وہ سید ہیں۔ اور انھوں نے سیادت کی لاج رکھی ہے۔ ان کے اجداد عرب سے افغانستان اور افغانستان سے ہندوستان آگئے تھے۔ اب تو ہم دونوں راہِ حق کے مسافر تھے اور راہِ حق کی مسافت میں مشرق مغرب کیسے؟ ہماری راہ ایک تھی، ہماری منزل ایک تھی، ہماری روحیں ہم آہنگ تھیں۔ ہم دونوں اللہ کے پیارے نبیؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا ارادہ لے کر اٹھے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس راہ میں میری بیٹی میرا بیٹا اور

میرا بھائی سب مجھ سے ہمدردی کرتے رہے۔ انھوں نے مجھے حق کی راہ میں قدم بڑھانے سے روکا نہیں۔ میری زندگی ایک سفر ہے وہ "برسوں کی محرابوں" سے گذر کر اسلام کی حسین وادی میں ختم ہو رہا ہے۔ مگر ختم کہاں ہو رہا ہے۔ زندگی تو موت کے بعد بھی چلتی رہے گی۔ میری راہ اسلام کی راہ ہے۔ یہی ایک سیدھی راہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر راہ کج ہے اور انسان کو اللہ کی راہ سے بہتر راہ نہیں مل سکتی۔ خدا کرے کہ میں جب تک زندہ رہوں اسی راہ پر چلتی رہوں۔ پھر میں اس راہ سے بھاگوں بھی تو بھاگ کر کہاں جاؤں گی۔ مجھے اللہ نے پیدا کیا ہے اور مجھے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ

بسلسلہ بابا رتن الہندی

ڈاکٹر مولوی ماجد علی خاں کا مکتوب بنام مدیر الفرقان

(محترم مکتوب نگار کی فرمائش پر یہ مکتوب شائع کیا جا رہا ہے)

معظمی و مخدومی حضرت مولانا - دامت برکاتہم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔ میرے مضمون "بابا رتن الہندی" (مطبوعہ الفرقان نومبر ۱۹۷۹ء) پر شائع شدہ حضرت والا کا استدراک نظر سے گزر چکا تھا لیکن چونکہ مجھے آپ کے مضمون کا انتظار تھا اس وجہ سے اس وقت استدراک کے بارہ میں کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے بعد مضمون کی پہلی قسط گزری۔ احقر نے اس کے بعد ایک خط بھی لکھا لیکن آپ نے تحریر فرمایا کہ دوسری قسط دیکھنے کے بعد الفرقان میں طبع ہونے کے لیے خط لکھنا زیادہ مناسب ہے۔ پھر چند روز قبل ۱۸ فروری ۱۹۸۰ء کا تحریر کردہ آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا اور آج الفرقان کا فروری ۱۹۸۰ء کا شمارہ بھی ملا جس میں "بابا رتن الہندی" پر آپ کے مضمون کا دوسرا حصہ شائع ہوا ہے۔ آپ نے اس مضمون کو لکھ کر میری ایک بڑی غلط فہمی کو دور کر دیا۔

دراصل میرے کچھ احباب نے مجھ سے "بابا رتن" پر تفصیلی مضمون تحریر کرنے کا اصرار کیا تھا کیونکہ مستشرقین اور انگریزی کے بعض مورخین کی کتابوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ میں نے "الاصابہ" اور "نزہۃ الخواطر" وغیرہ کو سامنے رکھ کر مضمون لکھ دیا۔ "الاصابہ" کا مقدمہ میں نے کافی عرصے قبل پڑھا تھا اور اس کا مضمون اس مضمون کو لکھتے وقت ذہن میں نہیں رہا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنے مقدمہ میں القسم الرابع کے بارہ میں تحریر کیا ہے۔

"القسم الرابع: فیمن ذکر فی الکتب المذکورۃ علی سبیل الوہم والغلط وبیان ذالک البیان الظاہر الذی یعول علیہ علی طرائق اہل الحدیث ولم اذکر فیہ الا ما عان الوہم فیہ بینا .... الخ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ج ۱ ص ۴)

اور بابا رتن کا تذکرہ انھوں نے القسم الرابع میں ہی کیا ہے۔ آپ کی اس بات پر میں نے دوبارہ مقدمہ دیکھا اور اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں کہ حافظ ابن حجرؒ نے ان کو صحابہؓ میں شمار نہیں کیا ہے جہاں تک مختلف فیہ روایات کا تعلق ہے ان کی توجیہ کی جا سکتی ہے اس لیے احقر کے نزدیک روایات کا اختلاف اس بارے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا میں نے خیال کیا تھا کہ اس سلسلہ میں انگریزی کے کسی رسالہ میں بھی مضمون بھیجوں گا کیونکہ انگریزی داں طبقہ بھی حقیقت سے پوری طرح واقف

انتخاب

مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادی کی سچی باتیں:-

"اسلام میں داڑھی کا کیا درجہ ہے؟ میں خود اگرچہ داڑھی رکھائے ہوئے ہوں لیکن ساتھ والے ہنستے ہیں اور مقابلہ کے امتحان میں اگر شریک ہوں تو شاید داڑھی کی وجہ سے نمبر کم آئیں"

اقتباس ایک انگریزی کالج کے مسلمان طالب علم کے ایک خط کا ہے۔ داڑھی کی فقہی حیثیت سے قطع نظر کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا سوال پیدا کہاں سے ہوا؟ جواب سوال کے اندر ہی موجود ہے۔ سائل کو بذات خود کوئی اعتراض نہیں۔ محض کسی کی ہنسی، اور کسی کی طرف سے اندیشۂ نقصان نے ذہن میں تردد پیدا کر دیا ہے ـــــ کیا فی الواقع داڑھی ایسی چیز ہے جس پر ہنسا جائے؟ اگر نہیں تو پھر کم فہموں کی ہنسی سے متاثر ہم کیوں ہوں؟ متاثر ہونے کے تو معنی یہ ہوئے کہ ہنسنے والوں کی وقعت کسی درجہ میں ہم نے اپنے ذہن میں تسلیم کر رکھی ہے۔ آخر اس کی تو ہم پروا نہیں کرتے کہ ہماری وضع قطع سے متعلق ادنیٰ درجہ کے قلی اور مزدور پاسی اور چمار کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں سوچنے بیٹھتے کہ ہمارا لباس چو پایوں اور درندوں کو اچھا لگتا ہے یا بُرا۔ پھر یہ کمزوری تو خود اپنی ہی ہوئی جس چیز کو ہم ضعف کے ساتھ نہیں زور و قوت کے ساتھ ـــــ اور شرما کر نہیں فخر کے ساتھ پیش کریں اور جس کے ساتھ ہم اپنی شان اور عزت کو وابستہ کر دیں کس کی مجال ہے کہ اس پر ہنس سکے؟ ہنسی کی جرأت تو ہم ہی نے اپنی کمزوری سے دلائی۔

سکھوں کے ہاں داڑھی تو جزو مذہب ہے کیا کسی ممتحن کو آج تک یہ ہمت ہوئی ہے کہ کسی سکھ طالب علم کو داڑھی کی بنا پر، امتحان میں فیل کر دے یا کچھ نمبر ہی کاٹ لے؟

ہمت کے، مردانگی کے، مستعدی کے، اولوالعزمی کے کن کاموں میں داڑھیوں والے دوسروں سے پیچھے رہے ہیں؟ پھر آخر، ہم آپ نے کہاں سے دل میں بٹھا لیا ہے کہ آپ جب اپنی قومی خودداری کا کوئی بھی ثبوت پیش کریں گے تو دوسرے آپ کو حقیر ذلیل اور قابل مضحکہ سمجھنے لگیں گے؟ کوئی جومن سا ہی آج اپنے دل میں یہ خیال لا سکتا ہے کہ وردی تو روس والوں کی اچھی ہوتی ہے ہمیں بھی اس کی نقل کرنا چاہیئے؟ کوئی انگریز اس کا وہم بھی کر سکتا ہے کہ لباس تو جاپانیوں کا بہت خوشنما ہوتا ہے لاؤ اسی کو انگلستان میں جاری کر دیا جائے؟ ایسے غداروں کا کسی قوم میں بھی گزر ہو جائے گا؟ خودداری کا درس صرف دوسری قوموں کے لیے ہے اور ہمارے ہاں صرف خود فراموشی، خود فروشی اور خودکشی؟

داڑھی کا مسئلہ تو بس ایک مثال ہے۔ اس سے کہیں بڑھ بڑھ کر اہم تر مسائل کے ساتھ ہم نے کیا معاملہ رکھا؟ صاحب نے کہا "جہاد، اُف کیسا ظالمانہ حکم!" ہم نے جھٹ کہا کہ "حضور، کہاں؟ ہمارے ہاں یہ حکم ہی کہاں؟ وہ جو عرب میں چند لڑائیاں لڑنی پڑیں وہ تو محض مجبوراً حفاظت خود اختیاری کی مد میں تھیں!" اُدھر سے آواز آئی "پردہ" یہ تو عورتوں کے لیے کیسی قید سخت" ہم نے بڑھ کر گزارش کی کہ "پیر و مرشد یہ تو محض کٹھ ملاؤں کی تاریک خیالی تھی۔ آپ ذرا سا اشارہ گوشۂ چشم سے فرما دیں۔ دیکھیے آپ کی گارڈن پارٹی میں آپ کے کلب میں، آپ کے پارک میں، کاؤنسل میں، اسمبلی میں، کالجوں میں، کچہریوں میں، دربار میں سب کہیں ہماری بیویاں اور بہنیں اور بیٹیاں دوڑ دوڑ کر حاضر ہوتی ہیں یا نہیں" ارشاد ہوا "کافر حکومت کی اطاعت" جواب عرض ہوا کہ "بدگمانی! اور ہم خانہ زادوں سے! بادشاہ کے لیے کفر اور اسلام کیا! اولوالامر کی اطاعت تو ہمارے ہاں عین خدا اور رسول کی اطاعت ہے!" ـــــ سوال صرف داڑھی اور مونچھوں کا رہا کب ہے؟ عبادات میں، معاملات میں، اخلاق میں، عقائد میں، شعائر میں، اپنی کون سی چیز ہم نے اپنی رہنے دی ہے!

[صدق جدید لکھنؤ ۹ر فروری ۱۹۵۹ء
بحوالہ "صدق" ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء]

پیغمبر بطور سیاسی لیڈر

اڈیٹر "صدق جدید" حکیم عبدالقوی صاحب کے قلم سے۔

"مسیحی دنیا (فرقہ کیتھولک) کے موجودہ پیشوائے اعظم یا پاپائے روم جان پال نے جو اس وقت میکسیکو (وسطی امریکہ) کی سیاحت پر گئے ہوئے ہیں ایک تقریر کرتے ہوئے بائبل کے ان شارحین پر سخت نکتہ چینی کی ہے جو (حضرت) عیسیٰ مسیح کو ایک سیاسی شخصیت اور ایک انقلابی لیڈر کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے اس قسم کی ساری تشریحوں کو قطعاً غلط و خلاف واقعہ ٹھہرایا ہے۔"

مادیت کے پرستار خواہ وہ سرمایہ دار ملکوں امریکہ اور یورپ کے ہوں خواہ کمیونسٹ ممالک کے، دونوں کے یہاں ایسی متجددانہ جہالت کے نمونے برابر ملتے ہیں جن میں اللہ کے مقدس پیغمبروں کو عام دنیادار اور سیاسی لیڈر یا انقلابی رہنما کی حیثیت دے کر ان کی روحانی و مذہبی اہمیت کو بھلانے اور نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اور خود مسلمانوں کے نام نہاد روشن خیالوں میں بھی ایسوں کی کمی نہیں، بعض نے تو جسارت کر کے انبیاء کرام کا یہی قطعی غیر اسلامی تخیل بڑے دعووں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حالانکہ اسلام میں مسیحیت وغیرہ سے بھی کہیں زیادہ انبیاء خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی مذہبی و روحانی عظمت کا قدم قدم پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ ان مقدس ہستیوں کو سیاسی لیڈر یا انقلابی رہنما قرار دینا ان کی تعظیم ذرا بھی نہیں بلکہ سرتاسر تنقیص و توہین ہے۔ (صدق جدید ۹ فروری ۱۹۷۹ء)

چندہ سالانہ	
ہندوستان سے	۱۵/-
پاکستان سے	۳۰/-
بنگلہ دیش سے	۲۰/-
فی شمارہ	۱/۵۰

الفرقان

ممالک غیر سے چندہ سالانہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ کے بعد
اب نئی شرح یہ ہے
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

جلد (۴۷) | بابت اپریل سنہ ۱۹۷۹ء مطابق جمادی الاوّل سنہ ۱۳۹۹ھ | شمارہ (۴)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری۔ براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت۔ الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۵ تاریخ تک آجانا چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ پچیس روپے ہندوستانی سکہ میں بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں تیس روپے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ اسٹریلین بلڈنگس لاہور کو بھیجدیں۔

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

اللہ کی ایک بندی :-

اس عاجز کے مخلص دوستوں میں ایک صاحب ہیں، پیشہ تجارت ہے، امیر کبیر تو نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے خوشحالی اور اس کے ساتھ ایک درجہ کی دینداری بھی نصیب فرمائی ہے —— ان کی اہلیہ (جو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ، سے بیعت ہیں) سالہا سال سے مریض اور صاحبِ فراش ہیں —— وہ کبھی دعا کی فرمائش کے ساتھ راقم سطور کو کبھی خط لکھا کرتی ہیں۔ حال میں اُن کا ایک خط ملا، وہ راقم سطور کے لیے بھی سبق آموز ہوا۔ امید ہے اُس کا مطالعہ اللہ کے دوسرے بندوں کے لیے بھی مفید و نفع مند ہوگا —— اسی لیے نذرِ ناظرینِ الفرقان کیا جا رہا ہے —— [یہ واضح رہے کہ یہ دینی بہن، اپنی اور میری عمر کے فرق کے لحاظ سے مجھے ابا جی کے لفظ سے مخاطب کیا کرتی ہیں۔]

باسمہ سبحانہ

محترم ابا جی! دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، الحمد للہ کریم آقا نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کا میں شکر ادا نہیں کر سکتی ...... ابا جی میرے اللہ نے جو تکلیفیں مجھے عطا فرمائی ہیں بیشک وہ بھی نعمت ہیں مگر اب یہ نعمت میں برداشت نہیں کر پا رہی ہوں، اب میں بالکل پلنگ

پر لیٹ چکی ہوں، کمزوری بہت ہو گئی ہے، کھانسی بہت شدت سے ہے۔ بات نہیں کر پاتی، اور مختلف عوارض ہو چکے ہیں، تلاوت ذکر وغیرہ بالکل چھوٹ چکے ہیں، دنیا میں اپنا حال دیکھ رہی ہوں، آخرت کا حال معلوم نہیں، میں کریم آقا سے اپنے ایک ایک گناہ کی معافی مانگتی ہوں، کریم آقا سے پوری امید کرتی ہوں کہ میرے پر فضل فرمائیں گے اور مجھکو اپنے فضل وکرم سے معاف فرمائیں گے اور میرا خاتمہ بخیر فرمائیں گے۔

ابا جی! میرے پاس تو کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جو بارگاہ الٰہی میں پیش کر سکوں۔۔۔۔۔۔۔

میرے لیے خدا کے واسطے دعا فرمائیے کہ میرا خاتمہ بخیر ہو اور جبتک زندہ رہوں دنیا میں بھی عافیت نصیب ہو۔ آخرت میں بھی عافیت نصیب ہو۔۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ماہ گزر جاتے ہیں میں غسل نہیں کر پاتی، آخرت میں میرا کیا حشر ہوگا، میں ہر وقت اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں، بعض وقت دل بہت گھبرا جاتا ہے اور بہت رونا آتا ہے کہ میری بد اعمالیوں کا کیا ہوگا ــــــ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کرم کا معاملہ فرمائے خاتمہ بخیر فرمادے بڑی تمنا ہے خاتمہ بخیر ہونے کی ــــــ

میرے اللہ! مجھے معاف فرما دیجیے، معاف فرما دیجیے! ــــــ ابا جی! پھر عرض کرتی ہوں میرے لیے دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرماوے۔ والسلام

ناظرین سے بھی درخواست ہے کہ وہ خط لکھنے والی اس بہن کے لیے دعا فرمائیں ــــــ الفرقان میں یہ خط اس لیے بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

افسوسناک اور ناقابل توجیہ :-

رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی میاں کی ایک کتاب ــــــ عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح ــــــ ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، اس میں انھوں نے جماعت اسلامی کے بانی ورہنما مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی قابل قدر علمی و دینی خدمات کے اعتراف کے ساتھ اور اُن کی شخصیت کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اُن کی دینی فکر کی بعض ایسی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو بہت سے لوگوں کے لیے گمراہی کا باعث بن سکتی ہیں، اور اظہار مقصد یا معذرت کے طور پر کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھا ہے کہ :-

"یہ پیش نظر کتاب..... نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، نہ فقہ و فتوے کی زبان میں، وہ ایک اندیشہ کا اظہار ہے، اور "الدین النصیحۃ" (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے حکم پر عمل کرنے کی مخلصانہ کوشش، اس کی نہ کوئی سیاسی غرض ہے نہ جماعتی مقصد، اس کتاب کی تالیف میں مختلف قوی محرکات و دواعی کے باوجود بہت تاخیر سے کام لیا گیا اور اس موضوع پر اپنی افتاد طبع اور طرز عمل کے خلاف اُسی وقت قلم اٹھایا گیا جب اس کا پوری طرح مشاہدہ اور تجربہ ہو گیا کہ اس دعوت و لٹریچر سے جو جماعت تیار ہو رہی ہے اُس کا ایک نیا دینی مزاج بنتا جا رہا ہے..... اور اس کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ دین کا ایک نیا فہم، نئی تعبیر اور نئے اقدار و معیار پیدا کرلے، اور ملت کے ایک تعلیم یافتہ، فہیم مخلص اور باعمل و صاحبِ عزم طبقہ کی فکر و سعی کا کارواں کتاب و سنت، سیرت و اسوۂ رسول ؐ، فکر آخرت اور "ایمان و احتساب" کی شاہراہ سے ہٹکر محض جماعتی تنظیم، اور مسلمانوں کے لیے حصولِ حکومت و اقتدار کے راستہ پر پڑ جائے، اور پھر اس کی واپسی مشکل ہو جائے، اس ناخوشگوار کام کو (خدا علیم و خبیر ہے کہ) عند اللہ مسؤلیت اور شہادتِ حق کے خیال سے انجام دیا گیا۔" ص۱۵-۱۶

"امید ہے کہ خود جماعت اسلامی کے حلقہ کے لوگ اس کتاب کو غور و سنجیدگی کے ساتھ پڑھیں گے اور اس کو کسی جماعتی تعصب یا ذاتی اغراض پر محمول نہ کریں گے۔" ص۱۷

مولانا علی میاں کی یہ کتاب پڑھ کے راقم سطور کو بھی پوری امید تھی کہ جس خلاص و دلسوزی کے ساتھ اور جس انداز میں کتاب لکھی گئی ہے، جماعت اسلامی اور مولانا مودودی سے تعلق رکھنے والے حضرات جو بالعموم تعلیم یافتہ اور خواص ہی ہیں اور ان میں بہت بڑی تعداد اُن کی ہے جو مولانا علی میاں سے اچھی طرح واقف ہیں، کتاب کو اسی نظر سے دیکھیں گے جس کی وہ مستحق ہے۔ لیکن ——— "غلط بود آنچہ ما پنداشتیم" ——— اس سلسلہ میں خود راقم سطور کے نام اس حلقہ کے کچھ حضرات کے جو خطوط آئے افسوس ہے کہ وہ سب ہی اس توقع کے خلاف رہے ہیں، اور بعض تو

لے راقم سطور کے نام خطوط اس سلسلہ میں غالباً اس لیے آئے کہ لکھنے والے حضرات کو مولانا علی میاں کے ساتھ اس عاجز کے تعلق اور رفاقت کا علم ہوگا ——— واللہ اعلم

بہت ہی غیظ وغضب کی حالت میں لکھے گئے ہیں ـــــ ان میں سے کم از کم ایک اس لائق ہے کہ عبرت کے لیے اُس کا ذکر کیا جائے ـــــ اس کے لکھنے والے علاقہ کشمیر کے ایک صاحب ہیں، یہ پورے چار صفحہ کا خط ہے تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صاحب اچھے پڑھے لکھے اور صاحبِ علم وقلم ہیں۔ اور اپنے علم وقلم پر ان کو اعتماد بھی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"کیا علی میاں کی کتابیں غلطیوں سے پاک ہیں، مجھ جیسے لوگ بھی اگر چاہیں تو نہ جانے کتنی غلطیاں نکال سکتے ہیں۔"

کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کی تصنیف پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"یہ کتاب لکھ کر مولانا علی میاں جیسی غیر متنازعہ شخصیت اُن لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں جنھوں نے مولانا مودودی کی مخالفت کرنا اپنا جزو ایمان سمجھا ہے۔"

آگے تحریر فرمایا ہے:۔

"یہ نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی ایسا ہوا ہے جب کوئی عالم آیا اور اس نے ایک عالم کو متاثر کرنا شروع کیا تو صاحب جبہ و دستار اس کے خلاف ہو گئے۔

آج اگر ...... مولانا علی میاں جیسے اصحاب مولانا مودودی کے خلاف لکھ رہے ہیں یا کہہ رہے ہیں تو وہ وہی فریضہ انجام دے رہے ہیں جو اس سے پہلے بھی کسی مقتدر عالم کے خلاف اُس وقت کے صاحب جبہ و دستار دیتے رہے ہیں۔"

اس سب کے بعد ارشاد ہوا ہے:۔

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب لوگ سید مودودی کے مقابلہ میں احساس کمتری کے شکار ہیں، انھیں اس بات نے پریشان کیا ہے کہ آخر یہ شخص عالم اسلام کے لیے اتنا اہم کیوں بن گیا ہے۔"

ناظرین میں سے جن حضرات نے مولانا علی میاں کی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کا مطالعہ کیا ہو گا اُن کے لیے ان کشمیری مکتوب نگار صاحب کے خط کے یہ اقتباسات یقیناً موجب تکدر اور افسوسناک ہوں گے، تاہم وہ اس لب ولہجہ اور اندازِ گفتگو کی یہ توجیہ

کرسکیں گے کہ مولانا مودودی کی دینی فکر کی کسی غلطی کی نشاندہی اور اس پر تنقید و احتساب نے ان صاحب کو مشتعل اور غیر متوازن کر دیا ـــــــ لیکن اس مکتوب میں اس لب و لہجہ کے علاوہ بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن کی کوئی توجیہ نہ راقم سطور کر سکا نہ غالباً کوئی اور صاحب کر سکیں گے۔

ملاحظہ فرمایا جائے۔

محترم مکتوب نگار نے خط کے شروع ہی میں تحریر فرمایا ہے کہ انھوں نے مولانا علی میاں کی کتاب ایک دفعہ پڑھنے کے بعد دوبارہ غور سے پڑھی ـــــــ اس کے دو ہی چار سطر بعد تحریر فرماتے ہیں :-

"مولانا مودودی کی دینی فکر پر اعتراض سے پہلے ذرا حضرت مولانا علی میاں اُن حضرات کی دینی فکر پر کچھ تحریر فرماتے اور اُسے امت کے لیے فتنۂ عظیم قرار دیتے جنکی دینی فکر مولانا مودودی سے ملتی ہے، میری مراد اخوان المسلمون کے بانی حسن البناءؒ اور سید قطب شہیدؒ سے ہے"..... کیا یہ باتیں سید قطب کی کتابوں میں نہیں پائی جاتی ہیں "

ہمارے لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان صاحب کے اس بیان کو کہ ـــــــ انھوں نے مولانا علی میاں کی کتاب دو بار اور غور سے پڑھی ہے ـــــــ غلط اور خلاف واقعہ سمجھیں، انھوں نے یہ کتاب دو بار اور اپنے نزدیک غور ہی سے پڑھی ہوگی، لیکن اللہ ہی جانتا ہے کہ اس مطالعہ کے وقت وہ کس عالم یا کس حال میں تھے کہ دو دفعہ کے بغور مطالعہ میں بھی اُن کو یہ نظر نہیں آیا کہ کتاب کے صفحہ ۸۵ سے صفحہ ۱۵۰ تک (پورے ۶۰-۷۰ صفحوں میں) سید قطب مرحوم کی دو کتابوں "معالم فی الطریق" اور "فی ظلال القرآن" سے اُن کی وہ عبارتیں نقل کر کے جن میں انھوں نے مولانا مودودی کی "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات" والا دینی فکر اپنایا ہے وہی تنقید کی ہے جو مولانا مودودی پر کی گئی ہے۔

نیز دوبارہ کے اس بغور مطالعہ میں انھیں یہ بھی نظر نہیں پڑا کہ صفحہ ۱۳۱ سے صفحہ ۱۳۵ تک مولانا علی میاں نے "اخوان المسلمین" کے دوسرے مرشد عام استاذ حسن اسمٰعیل ہضیبی علیہ الرحمہ کی کتاب "دعاۃ لا قضاۃ" سے وہ طویل کلام نقل کیا ہے جس میں انھوں نے مولانا مودودی

کے چار بنیادی اصطلاحات والے اُسی دینی فکر کو دلائل سے رد کیا ہے جس پر مولانا علی میاں نے اپنی اس کتاب میں تنقید کی ہے ۔۔۔۔ "اخوان" کے اس مرشد عام کو یہ کتاب (دعاۃ لا قضاۃ) اس لیے لکھنی پڑی تھی کہ الامام حسن البنا علیہ الرحمہ کی شہادت کے بعد اخوان المسلمون کے حلقہ کے بہت سے نوجوانوں نے جن کو علم دین میں رسوخ حاصل نہیں تھا مولانا مودودی کی کتابوں سے متاثر ہو کر اُن کے دینی فکر کو اپنا لیا تھا جو استاذ ہضیبی کے نزدیک غلط تھا اور بہت سی گمراہیوں کی بنیاد بن سکتا تھا، اس لیے انھوں نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ عام مسلمانوں کو اور خاص کر اخوان کو حقیقت سے آگاہ کریں اور غلط روی اور گمراہی سے بچائیں۔ اُن کی تنقید کا نشانہ مولانا مودودی بھی ہیں اور مرحوم سید قطب بھی۔

سید قطب راہِ حق میں بڑے ظالمانہ طریقہ سے شہید کیے گئے (اُن پر اللہ کی بے حساب رحمتیں) اس لیے راقم سطور کے دل میں اُن کی خاص عظمت اور محبت ہے لیکن علم دین پر اُن کا کوئی خاص مقام نہیں تھا، اور حسن البنا شہیدؒ کے بعد اخوان کے علمی و دینی رہنما وہ نہیں تھے بلکہ استاذ حسن ہضیبی علیہ الرحمہ تھے جو الامام الشہید حسن البنا، کی شہادت کے بعد اُن کی جگہ بالاتفاق مرشد عام منتخب ہوئے تھے وہ بھی اُس دور کی اخوان دشمن حکومت مصر کے ظلم کا نشانہ بنے

ع ۔۔۔۔ "خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

سید قطب شہیدؒ اور استاذ حسن ہضیبیؒ کے تعلق سے بات طویل ہو گئی، ورنہ یہاں عرض صرف یہ کرنا تھا کہ راقم سطور اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکا کہ مولانا مودودی صاحب کے ایک اچھے پڑھے لکھے فدائی نے مولانا علی میاں کی کتاب دو بار غور سے پڑھی لیکن کتاب کے صفحہ ۵۴ سے ۱۵ تک مسلسل سید قطب کی کتابوں سے جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں اور ان کے بارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کا انھیں مطلق شعور نہیں ہوا۔ اسی طرح صفحہ ۱۲۱ سے ۲۵ تک "اخوان المسلمین" کے دوسرے مرشد عام استاذ ہضیبی کی کتاب "دعاۃ لا قضاۃ" سے جو طویل کلام نقل کیا گیا ہے وہ بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے نہیں آسکا ۔۔۔۔ زندگی میں پہلی دفعہ یہ تجربہ سامنے آیا کہ بعض اچھے پڑھے لکھے آدمیوں کا یہ حال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کتاب کا

مطالعہ فرمائیں اور بغور دو دفعہ مطالعہ فرمائیں لیکن انھیں خبر نہ ہو کہ اس میں کیا لکھا ہے ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے؟

ان صاحب نے اپنے اس خط میں "روزنامہ دعوت دہلی کے یوم جمہوریہ نمبر" کا حوالہ دیکر، مولانا مودودی کے اُس مکتوب کا بھی ذکر فرمایا ہے جو مولانا علی میاں کی کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد جماعت اسلامی ہند و پاکستان کے قریباً سب ہی اخبارات و رسائل میں ایک خاص انداز سے شائع کیا گیا ——— (حالانکہ وہ خط اس سے قریباً ایک سال پہلے کا لکھا ہوا تھا۔)

راقم سطور کا اندازہ ہے کہ غالباً ہر اُس شخص نے جس میں سوچنے سمجھنے کی کچھ بھی صلاحیت ہے یہ محسوس کیا ہو گا کہ اس موقع پر اس خاص انداز سے اس خط کی اشاعت کے ذریعہ صرف یہ تاثر دینے اور پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا علی میاں تو مولانا مودودی کے خلاف برابر کہتے اور لکھتے ہی رہتے ہیں، گویا ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور مولانا مودودی نے دین اور امت مسلمہ کی عظیم مصلحت کے پیش نظر یہ طے فرما رکھا ہے کہ وہ اُن کے خلاف نہ کچھ کہیں گے نہ لکھیں گے، اگرچہ ان کی کتابوں میں بھی قابل اعتراض مواد موجود ہے ——— ظاہر ہے کہ ذہن میں یہ بات بیٹھ جانے کے بعد، مولانا مودودی اور جماعت سے تعلق رکھنے والے کم از کم دوم اور سوم درجہ کے حضرات تو مولانا علی میاں کی اس کتاب کے مطالعہ کا ارادہ ہی نہ کریں گے اور اگر مطالعہ کریں گے بھی تو وہ مطالعہ کم و بیش اُسی طرح کا ہو گا جیسا کہ ان کشمیری مہربان نے دو بار اور غور سے مطالعہ فرمایا ہے۔

افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ جس حکمت عملی کے تحت اور جس طرح جماعت اسلامی ہند و پاکستان کے اردو و عربی اخبارات و رسائل میں اس خط کی اشاعت کی گئی ہے اُس کو مولانا مودودی کے خاص الفاظ میں "وسوسہ اندازی" کی کوشش ہی کہا جا سکتا ہے۔ اور عامیانہ زبان میں "کرتب"۔ ——— خالی اللہ المشتکیٰ

درسِ قرآن ۔ محمد منظور نعمانی

● آل فرعون کے مردِ مومن کی اپنی قوم کو دردمندانہ نصیحت

● یہ دنیا چند روزہ ہے اور ہمیشہ رہنے کی جگہ آخرت ہے اسکی فکر کر لو

● عنقریب وقت آئے گا کہ تم یاد کرو گے میں تم سے کیا کہتا تھا

● فرعون و آل فرعون اور اس مردِ مومن کا آخری انجام

حمد و صلوٰۃ　　اعوذ　　اور بسم اللہ کے بعد

وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ۝ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ز وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا ج وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ وَیٰقَوْمِ مَا لِیْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَی النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَی النَّارِ ۝ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ز وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَی الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَلَا فِی الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَی اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ط وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ

يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۚ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (سورۃ المومن آیات ۳۸–۴۶)

اور اس مرد مومن نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو میری پیروی کرو میں صحیح راستہ کی طرف تمہاری رہنمائی کروں گا۔ اے میری قوم والو یہ اس دنیا کی زندگی تو بس چند روزہ متاع ہے اور اصل دار القرار (یعنی ہمیشہ رہنے کی جگہ) تو دار آخرت ہے (اور اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون یہ ہے کہ) جو کوئی برائی کا ارتکاب کرے گا تو وہ اسی کے مطابق بدلہ پائے گا۔ .... اور جو کوئی مرد یا عورت نیک عمل کرے گا اور وہ صاحب ایمان بھی ہو تو وہ سب جنت میں جائیں گے اور وہاں وہ (اپنے خداوند کریم کی طرف سے) بے حساب رزق و فضل پائیں گے۔

اور اے میری قوم کے لوگو یہ کیا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو اور مجھے اس کی دعوت دے رہے ہو کہ میں خدا کا کافر ہو جاؤں اور اس کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کروں جن کا مجھے علم ہی نہیں اور میں تمہیں خدائے عزیز و غفار کی (بندگی اور عبادت کی) دعوت دے رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تم مجھے جس کی طرف بلاتے ہو اُن کی کوئی دعوت اور پکار نہیں ہے نہ دنیا میں نہ آخرت میں اور ہم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کے جانا ہے، اور بلاشبہ جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں وہ دوزخی ہیں، اور (سن لو) عنقریب یاد کرو گے تم میری وہ باتیں جو میں تم سے کہہ رہا ہوں، اور میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں، بے شک وہ اللہ سب بندوں کو پوری طرح دیکھ رہا ہے ——— تو اللہ نے اس بندہ کو اُن کی بری سازشوں سے محفوظ رکھا اور فرعون والوں کو بدترین عذاب نے گرفت میں لے لیا — ان کو صبح شام دوزخ پر پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہو گی تو حکم ہو گا کہ فرعون اور اس کے آل و اتباع کو شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔ (سورۂ مومن آیات ۳۸ تا ۴۶)

(تفسیر و تشریح) یہ سورۂ مومن کے پانچویں رکوع کی آیتیں ہیں، اس سے پہلے رکوع میں بیان فرمایا گیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی اور انھوں نے

اس کے حکم سے مصر آکر فرعون اور مصر کے دوسرے اکابر و اعیان کو دین حق کی اور خدا کی بندگی اور نیک عملی کی دعوت دی، تو وہ لوگ بہت گستاخی کے ساتھ پیش آئے اور فرعون نے حضرت موسیٰ کو قتل کرا دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو اُسی کے گھرانے کے ایک مرد خدا نے جو موسیٰ علیہ السلام کی حقانی دعوت اور اُن کے روشن معجزات سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا تھا لیکن اس نے اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ پوشیدہ رکھا تھا —— قوم کے ایک خیر اندیش اور درد مند و خیر خواہ کی حیثیت سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے بڑی دانشمندانہ اور موثر تقریر کی —— اس تقریر کا بڑا حصہ پچھلے ہفتے چوتھے رکوع میں گزر چکا ہے —— اور فرعون نے اس تقریر کے اثر کو زائل کرنے کے لیے تقریر کے درمیان ہی میں بار بار جو مداخلت کی تھی اس کا بھی ذکر آچکا ہے۔ اس وقت پانچویں رکوع کی جن آیتوں کی تلاوت کی گئی یہ اُسی تقریر کا آخری حصہ ہے۔

اس تقریر کی اہمیت اور معنویت جب اچھی طرح سمجھ میں آئیگی جب اس فضا اور ماحول کو ذہن کے سامنے رکھ لیا جائے جس میں اس مرد مومن نے یہ تقریر کی تھی —— صورت حال یہ بن گئی ہو گی کہ حضرت موسیٰ کی دعوت حق اور اُن کے روشن معجزات نے اور پھر اس مرد مومن کی دلسوزی سے بھری ہوئی مدلل تقریر نے قوم کے بہت سے لوگوں کو متاثر کر دیا ہے اور انھوں نے اس دعوت کو حق سمجھ لیا ہے لیکن اُس کے قبول کر لینے میں بڑے خطرات ہیں، فرعون جیسے سرپھرے ظالم و جلاد سے کچھ بعید نہیں کہ وہ یہ حکم دیدے کہ جو کوئی موسیٰ کے دین کو قبول کرے اس کو سولی پر لٹکا دیا جائے، اس کا گھر لوٹ لیا جائے اور آگ لگا دی جائے —— اور وہ اس مرد مومن کی تقریر کے درمیان میں مداخلت کر کے لوگوں کو یہ بھی جتا چکا ہے کہ قوم کے لیے صحیح راستہ وہی ہے جس کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں یعنی یہ کہ وہ موسیٰ کی بات نہ مانیں اور اپنے باپ دادا کے دین اور طریقہ ہی پر جمے رہیں (وَمَا اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ) بہر حال یہ فضا اور یہ ماحول ہے جس میں وہ مرد مومن پوری دلسوزی کے ساتھ قوم سے یہ خطاب کر رہا ہے —— اس نے کہا

"ٰیقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ...... يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ؀"

مطلب یہ ہے کہ " اے میری قوم والو، میرے بھائیو عزیزو، میری بات مانو، میرے بتائے راستہ پر چلو وہی ہدایت اور تمھارے لیے فلاح و کامیابی کا راستہ ہے، (فرعون جس راستہ کی طرف تم کو بلا رہا ہے وہ ہلاکت اور بربادی کا راستہ ہے)

حق کے قبول کرنے اور حضرت موسیٰ پر ایمان لانے میں اُس وقت لوگوں کے سامنے جو خطرات تھے، جو ایمان لانے کے راستہ میں بڑی رکاوٹ تھے، اُن کے سلسلہ میں اس مرد مومن نے فرمایا " یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی یہ زندگی تو بس چند روزہ ہے، اگر بالفرض دعوتِ حق قبول کرنے کے نتیجہ میں یہاں کچھ تکلیف بھی اٹھانی پڑی تو وہ بس چند روزہ ہوگی، مرنے کے ساتھ یہاں کی تکلیفیں اور راحتیں سب ختم ہو جائیں گی۔ ہاں مرنے کے بعد جس عالمِ آخرت میں پہنچنا ہوگا وہ " دار القرار " ہے وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہوگا۔ اس لیے عقل اور خودغرضی کا بھی تقاضا ہے کہ وہاں کے بے پناہ عذاب اور تکلیفوں سے بچنے کی اور وہاں کی دائمی اور بے حساب راحتیں، لذتیں اور نعمتیں حاصل کرنے کی فکر کی جائے اور اُس کے لیے اگر اس چند روزہ اور فانی زندگی کی کچھ راحتیں لذتیں یا جان بھی قربان کرنی پڑے تو اُس سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ یہ سودا بہر حال نفع بخش ہے ——— اس کے آگے اُس مرد مومن نے کہا کہ اُس دار آخرت کے بارہ میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ " مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰی اِلَّا مِثْلَهَا ...... بِغَیْرِ حِسَابٍ ہ یعنی جو کوئی یہاں اس زندگی میں برے عمل کرے گا (کفر، شرک یا اللہ کے بندوں پر ظلم وغیرہ) تو وہ اُسی کے مطابق سزا پائے گا۔ کوئی وہاں اس کو اللہ کی پکڑ اور عذاب سے بچا نہ سکے گا۔ خواہ وہ دنیا میں بادشاہ یا وزیر یا بڑا سردار یا سرمایہ دار رہا ہو، اور جو کوئی ایمان لا کر یہاں نیک اعمال کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، اُن سب کا مقام جنت میں ہوگا، جہاں اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے حساب نعمتوں سے نوازا جائیگا (یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ہ)

آگے جو تقریر کا حصہ ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ دنیا پرست لوگوں نے خیر خواہ بنکر اس مرد مومن سے کہا ہوگا کہ تم باپ دادا کا دین اور طریقہ چھوڑ کے اور موسیٰ کی دعوت

قبول کر کے بادشاہِ وقت فرعون کو اور پوری قوم کو اپنا دشمن بنا رہے ہو اور بڑے خطروں کو دعوت دے رہے ہو، اس سے باز آجاؤ، اپنی جان پر رحم کرو —— غالباً ان دنیا پرستوں کے اسی "ناصحانہ" مشورہ کا جواب دیتے ہوئے اس مردِ مومن نے اپنی تقریر میں کہا ہے

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ...... وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ" اے میری قوم کے لوگو! یہ کیا ہو رہا ہے (اور اس کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے) کہ میں آپ لوگوں کو نجات اور فلاح کے راستہ کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو، تم مجھکو دعوت دیتے ہو کہ میں خدا کا کافر بن جاؤں اور اس کے ساتھ خدائی میں ایسی چیزوں کو شریک کروں جن کا مجھے کچھ علم نہیں، وہ محض تمھارے وہم و خیال کی ایجاد ہیں؛ حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں، —— اور میں تمھیں اس خداوند عزیز و کریم پر ایمان لانے اور اسکی عبادت اور بندگی کی دعوت دیتا ہوں جو "العزیز" ہے یعنی کائنات کی ہر چیز پر اس کا قابو ہے اور "الغفار" یعنی بہت بخشنے والا بھی ہے۔ تو سوچو کہ کس کی دعوت قابل قبول ہے، تمھاری یا میری؟

"لَاجَرَمَ" یعنی حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے جن معبودوں کی عبادت و بندگی کی طرف مجھے بلاتے ہو اُن کا حال یہ ہے کہ ان کو پکارنے اُن سے دعا کرنے کا نہ دنیا میں کوئی حاصل اور فائدہ ہے نہ آخرت میں، اور ہم سب کو بالآخر اللہ کی طرف لوٹنا اور اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے، اور جو لوگ اس دنیوی زندگی میں حد سے تجاوز کرنے والے ہوں گے یعنی کفر و شرک کے اس راستہ پر چلیں گے جس کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو اُن کے لیے قطعی فیصلہ ہے کہ وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے اور اس کا ایندھن بنیں گے (وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ)

اس مردِ مومن نے اپنا خطاب ختم کرتے ہوئے آخر میں کہا

"فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ"

مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اور تمھاری خیر خواہی میں جو کچھ کہنا تھا وہ میں کہہ چکا۔ اگر تم آج میری بات قبول نہ کروگے تو عنقریب یعنی مرنے کے بعد وہ وقت آجائے گا کہ تم یاد کروگے کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا اور کس طرح کہا تھا، میں حجت تمام کر چکا

اور اب میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ "بصیر بالعباد" ہے سب بندے اور اُن کے اعمال و احوال اور اُن کا ظاہر و باطن سب اس کی نگاہ کے سامنے ہے، میں نے جس طرح تم کو راہ ہدایت دکھانے کی کوشش کی اور تمہارا جو رویہ رہا وہ سب اس کے سامنے ہے، اب وہی میرا اور تمہارا فیصلہ فرمائے گا۔

اس آیت پر آل فرعون کے اُس مرد مومن کی تقریر ختم ہو گئی ــــــ اس کے بعد کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں فریقوں کا انجام بیان فرمایا گیا ہے ــــــ ارشاد ہوا ہے "فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۞ ...... اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۞"

"سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آل فرعون کے اس مرد مومن نے فرعون اور اس کے حواریوں کو اور پوری قوم کو موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کر لینے اور ایمان لے آنے کی ایسے واضح اور موثر انداز پر دعوت دی۔ اور فرعون اور اس کے حواریوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ہمارے ہی گھر کے اس شخص کی اس مخلصانہ نصیحت سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ مرد مومن کی دعوت قبول کر کے اُس کے ساتھ ہو جائیں گے تو اُن ظالموں نے اُس مرد خدا کو شہید کرا دینے کا منصوبہ بنایا، یا اسی طرح کے کسی اور خطرناک اقدام کی سازش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندہ کی حفاظت فرمائی اور ان کے منصوبے اور ان کی سازش کو ناکام کر دیا۔ اور فرعون اور اس کے حواریوں اور سارے لاؤ لشکر کو عذاب الٰہی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسی کو فرمایا گیا ہے۔ "فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۞" ظاہر یہی ہے کہ اس عذاب سے مراد فرعون اور اس کے سارے لاؤ لشکر کی غرقابی ہے ــــــ آگے فرمایا گیا ہے۔ "اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۞" یعنی ان ظالموں کو ہر روز صبح و شام دوزخ پر پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت قائم ہوگی تو حکم دیا جائے گا کہ فرعون اور اس کے تمام آل و اتباع کو دوزخ کے سخت ترین عذاب میں جھونک دیا جائے!

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں اور تمام لاؤلشکر کو ڈبو کر ختم کر دیا اور قیامت تک کے لیے اُن پر یہ عذاب مسلط کر دیا گیا ہے کہ ہر صبح اور ہر شام دوزخ کا وہ مقام اُن کے سامنے کر دیا جاتا ہے جو عالم آخرت میں اُن کا اصل ٹھکانا بننے والا ہے، اُس کا صرف نظر کے سامنے آجانا ہی سخت ترین عذاب ہے ـــــ اللہ کی پناہ! ـــــ گویا مرنے سے لیکر قیامت تک جو ہزارہا ہزار سال کا زمانہ ہے جس کو عالم برزخ کہا جاتا ہے اس میں تو وہاں کے مستقل عذاب کے علاوہ ایک یہ عذاب اُن کو دیا جارہا ہے کہ روزانہ صبح شام ان کو دوزخ کا اپنا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے، جس کو صرف دیکھ کر اُن کا جو حال ہوتا ہوگا اور اُن کی روح پر جو گزرتی ہوگی اس کو وہی جانتے ہوں گے، یہاں کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا ـــــ آگے فرمایا گیا ہے کہ "وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ٥" یعنی جب دنیا کی عمر پوری ہو جانے پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے قیامت قائم ہوگی تو فرعون اور اس کے تمام آل و اتباع اور اعوان و انصار کے بارہ میں حکم ہوگا کہ ان کو دوزخ کے بدترین اور شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو ان آیات کے مضامین سے سبق لینے اور عبرت حاصل کرنے کی توفیق دے۔

(فائدہ) اس آخری آیت کے الفاظ "اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا" سے صراحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوئی کہ قیامت سے پہلے عالم برزخ میں بھی مجرمین کو عذاب ہوتا ہے ـــــ قبر کے عذاب کے بارہ میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں اُن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجرمین کے اسی برزخی عذاب کی تفصیل بیان فرمائی ہے ـــــ لیکن عذاب قبر اور عذاب آخرت، ان سب کی حقیقی اور واقعی نوعیت جب ہی معلوم ہوگی جب اُن سے واسطہ پڑے گا ـــــ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ ٥

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مدظلہ

سیّد ابراہیم بن ادہم اور ان کے مدفن کی تحقیق

حضرت ابراہیم بن ادہم تعارف سے مستغنی ہیں، وہ باتفاق امت سر حلقہ اصفیائے کرام و سرخیل مشائخ طریقت، زہد و تقویٰ میں منفرد، اور تورع و عبادت میں یگانۂ روزگار تھے متقدمین میں یعقوب بن سفیان فسوی[1]، ابن حبان[2]، ابو نعیم اصبہانی[3]، اور پیر ہرات شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری[4] وغیرہ نے بہت بلند الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ فسوی کہتے ہیں "ھو من خیار الأفاضل"[5] اور ابن حبان کہتے ہیں "کان صابرا علی الجہاد والفقہ والورع الدائم والسخاء الوافرۃ"[6] اور ابو نعیم نے پچاسی صفحہ میں ان کا ذکر خیر کیا ہے، حافظ ذہبی نے ابراہیم کو صرف زاہد کہہ کر ذکر کیا تو امام یافعی نے سخت برہمی کا اظہار فرمایا، اور لکھا کہ یہ ان کی توہین اور ان کے مرتبہ کو گھٹانا، اور ان کی عظمت و رفعت کو کم کر کے دکھانا ہے[7]۔

ابراہیم بن ادہم قدس سرہ بلخ میں پیدا ہوئے تھے، اور وہیں رہتے سہتے تھے، لیکن جب امیری چھوڑ کر فقیری اختیار کی اور رزق حلال کی فکر دامن گیر ہوئی، تو انھوں نے شام کے

---

[1] المتوفی ۲۷۷ھ، [2] المتوفی ۳۵۴ھ، [3] المتوفی ۴۳۰ھ، [4] المتوفی ۴۸۱ھ

[5] تہذیب التہذیب ص ۱۰۲ ج ۱، [6] تہذیب، [7] مرآۃ الجنان ص ۳۲۹

علاقہ میں بود و باش کو ترجیح دی، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے بعض مشائخ سے رزق حلال کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اذا اردت الحلال فعلیک ببلاد الشام (تم کو حلال کی تلاش ہو تو ملک شام جاؤ)۔[1]

اور فرماتے تھے کہ مجھے سکون کی زندگی اور اطمینان تو شام کے شہروں ہی میں نصیب ہوا، اس پہاڑ سے اس پہاڑ پر اور اس چوٹی سے اس چوٹی پر منتقل ہوتا رہتا.... ہوں، مجھکو دیکھکر کوئی کہتا ہے کہ نیم پاگل ہے، اور کوئی کہتا ہے کہ حمال (قلی) ہے،ــــــــــ پھر (شقیق بلخی سے) فرماتے کہ شقیق! ہماری نگاہ میں کوئی شخص حج اور جہاد کے ذریعہ باعظمت نہیں ہوا، ہمارے نزدیک تو جس نے اس پر دھیان رکھا کہ اس کے پیٹ میں جو دو روٹیاں جارہی ہیں، وہ حلال کمائی کی ہیں، بس وہی باعظمت ہوا ہے۔[2]

کسی نے پوچھا کہ آپ شام میں کب سے ہیں؟ فرمایا چوبیس سال سے۔ میں جہاد کے لیے آیا، نہ رباط کے لیے! پوچھا پھر کس لیے آئے؟ فرمایا حلال روٹی سے شکم سیر ہونے کے لیے۔[3]

حضرت ابراہیم نے جس حلال روزی کی تلاش میں شام کا رخ کیا تھا اس کے ذرائع کیا تھے؟ شیخ الاسلام انصاری فرماتے ہیں:۔ "بشام رفت و آنجا کسب می کرد و در طلب قوت حلال ناطورباني می کرد،" یعنی شام میں باغوں کی رکھوالی کرکے روزی کماتے تھے،ــــــــــ باغبانی کے علاوہ صور، غزہ اور عسقلان میں کھیت کاٹنے کا کام بھی کرتے رہے، اور فلسطین میں ڈول سے آب پاشی بھی کی ہے۔

ایک بار ابراہیم اور ان کے ایک رفیق روزے سے تھے، اس دن افطار کا کوئی سامان نہ تھا، رفیق نے مشورہ دیا کہ چلیے باب الرستن میں کھیت کاٹنے والوں کے ساتھ ہم بھی کھیت کاٹ کر افطار کے لیے کچھ حاصل کریں، انھوں نے اس مشورہ کو قبول کیا، اور باب الرستن گئے، ان کے رفیق کو تو کھیت والوں نے ایک درہم پر رکھ لیا، مگر ابراہیم کو نہیں لیا، یہ کہا کہ وہ

ملک اس دور کے خاص حالات میں علاقہ شام کو اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہوگا۔ الفرقان

[1] حلیۃ الاولیا ص ۳۶۹ [2] حلیہ ص ۳۷۳

بہت کمزور ہیں، پھر بہت کہنے سننے کے بعد ان کو صرف چار دانق پر رکھ لیا، شام کو مزدوری وصول کر کے ان کے رفیق نے بازار سے بقدر ضرورت کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، جو باقی بچا اس کو خیرات کر دیا، جب سامان لیکر ابراہیم کے پاس آئے تو ابراہیم نے کہا کہ ہم نے مزدوری تو پوری وصول کر لی، لیکن معلوم نہیں کام بھی پورا کیا یا نہیں، یہ سنکر رفیق کو بہت غصہ آیا۔ جب ابراہیم نے ان کا غصہ دیکھا تو فرمایا کہ اچھا کوئی مضائقہ نہیں چلو تم ضامن بن جاؤ کہ ہم نے پورا پورا کام مکمل کر دیا ہے، ان کے رفیق کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا تو کھانا اٹھایا اور لیجا کر اس کو بھی خیرات کر دیا۔

میں نے ابراہیم کے کسب معاش کے ان حالات کا ذکر اس لیے کیا کہ اس میں ہمارے لیے بہت بڑا درس عبرت ہے، آج ہم جن بزرگوں کے سلسلہ میں داخل ہو کر اور جن کی روحانیت سے مستفید ہو کر اپنی بزرگی کا سکہ جمائے ہوئے ہیں، ان کی زندگی کا نقشہ یہ تھا، ان کے یہاں کسب حلال کا یہ اہتمام تھا، اور ہمارے یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے، ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہم کسب معاش کے لیے بہت معقول ماہانہ پر کسی کام کی ذمہ داری لے لیتے ہیں، مگر پورے طور پر کام کر کے اس کسب کو حلال طیب بنانے کا بالکل اہتمام نہیں کرتے بلکہ میں تو یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بہت سے مشائخ کسب معاش کا کوئی ذریعہ اختیار نہیں کرتے، ان کی گذر اوقات صرف مریدوں کے عطایا اور نذرانوں پر موقوف ہے، جس کے لیے سال میں ایک دو بار دورہ کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی بزرگ متوکلانہ زندگی بسر کرنے کے خیال سے ترک اسباب کا ارادہ کر لیں تو یہ قابل اعتراض بات نہیں ہے، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ کسی شرعی ضرورت کے سوا گھر سے نہ نکلیں، مریدوں کے یہاں دورہ نہ کریں، بلکہ ہر اس صورت حال سے کنارہ کشی اختیار کریں جس سے تعرض للسوال یا حسن طلب کی صورت پیدا ہو،

بعض حضرات کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ مسترشدین کی درخواست پر بھی، کسی مقام پر رمضان گزارنے کے لیے چلے جاتے ہیں، اس صورت میں ہر چند کہ ان کی اور مریدین کی نیت صالح ہو، پھر بھی حضرت ابراہیم بن ادھم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ضروری ہے۔ اس لیے کہ صحیح معنوں میں جو حضرات رتبۂ مشیخت کو پہونچے ہوئے ہیں ان کی دیکھا دیکھی دوسرے نااہل، اور غیر عالم پیرزادے

رمضان کے علاوہ بھی مہینہ دو مہینہ بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک مریدوں کی بستیوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے لیے تو سرے سے مرید کرنا اور مسند ارشاد پر بیٹھنا ہی جائز نہیں ہے نہ بیعت ہونے والوں کو ایسے پیروں سے بیعت ہونا جائز ہے۔

جون پور کے ربانی عالم، اور سید احمد شہیدؒ کے خلیفۂ برحق مولانا کرامت علی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "القول الثابت" میں فرماتے ہیں۔

"جس کو دونوں علم نہیں ہے (یعنی احکام شرعیہ اور علم اسرار یعنی تصوف) وہ عالم نہیں ہے اور جب عالم نہیں ہے تو مرشدی کا رتبہ بھی اس کو نہیں ہے۔"

یہ بات مولانا جونپوری نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (سر حلقہ سہروردیہ) کی کتاب عوارف المعارف کے حوالہ سے لکھی ہے۔ پھر حضرت نظام الدین اولیا کے علم حاصل کرنے پھر مرید ہونے اور خلافت پانے کا واقعہ اخبار الاخیار شیخ عبدالحق دہلوی سے نقل کر کے فرماتے ہیں کہ:-

> "اس سب مضمون سے ثابت ہوا کہ جو شخص دونوں علم کا عالم نہیں، اس سے بیعت کرنا اور اس کو خلافت نا سہو دینا درست نہیں ہے .... بلکہ جس شخص نے ایسے جاہل سے بیعت کیا ہے اس پر واجب ہے کہ اس کی بیعت سے توبہ کرے، اور اس شخص سے کنارہ کرے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں واعرض عن الجاھلین (اور کنارہ کر جاہلوں سے)
>
> الغرض مسلمانوں پر واجب ہے کہ جو شخص کہ مرشدی کا دعویٰ کرتا ہو یا کسی مرشد کی گدی پر بیٹھا ہو اس کے عقیدے اور علم اور مذہب کو خوب تحقیق کر لیں، اور یہ بات بھی دریافت کر لیں کہ رتبہ مشیخت کا اس کو حاصل ہے یا نہیں، یہ بات دریافت کر کے مرید ہونے سے بڑی بڑی خرابی ہوتی ہے، اور اگر کسی مرشد سے وعدہ کر چکا ہے کہ ہم آپ سے بیعت کریں گے اور اس شخص میں علم احکام اور علم اسرار اور رتبہ مشیخت نہ پایا تو اس سے بیعت نہ کرے، کیونکہ خلاف شرع کام کا وعدہ کیا، تو اس کا وفا کرنا درست نہیں۔[1]"

---

[1] القول الثابت صفحہ ۳۱-۳۲ مطبوعہ مطبع محمدی پیا لدہ (کلکتہ) ۱۲۹۶ھ

اور مولانا کرامت علی کے پردادا پیر اور تمام دیوبندی وغیر دیوبندی اکابر علماء کے شیخ الکل اور بالخصوص سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کے تمام مشائخ کے شیخ المشائخ اور استاذ الکل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی القول الجمیل میں فرماتے ہیں (ہم القول الجمیل کی عربی عبارت کے بجائے اس کا ترجمہ شفاء العلیل (جو مولانا خرم علی کی تالیف ہے) سے نقل کرتے ہیں، اصل عبارت القول الجمیل مترجم صـ۱۳، صـ۱۵ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔)

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"بیعت لینے والے میں یعنی پیر اور مرشد میں چند اور شرط ہیں، شرط اول۔ علم قرآن اور حدیث کا۔ اور پیری یہ مراد نہیں کہ پہلے سرے کا مرتبہ علم کا مشروط ہے بلکہ قرآن میں اتنا علم ہونا کافی ہے کہ تفسیر مدارک یا جلالین کو یا سوا اون کے مانند تفسیر وسیط یا وجیز واحدی کے محفوظ کر چکا ہو اور کسی عالم سے اوس کو تحقیق کر لیا ہو اور اس کے معانی اور ترجمۂ لغات مشکلہ کو اور شان نزول اور اعراب قرآنی اور قصص اور جو اس کے قریب ہے اس کو جان چکا ہو۔ اور حدیث کا علم اتنا کافی ہے کہ ضبط اور تحقیق کر چکا ہو مانند کتاب مصابیح اور مشارق کے اور اس کے معانی دریافت کر چکا ہو، اور اس کی شرح غریب یعنی لغات مشکلہ کا ترجمہ اور اعراب مشکل اور تاویل معضل کی بنا پر رائے فقہائے دین کی معلوم کر چکا ہو۔ (صـ۱۳)

اور عالم ہونا مرشد کا تو ہم نے اتنے واسطے شرط کیا ہے کہ غرض بیعت سے مرید کو امر کرنا ہے مشروعات کا اور روکنا اس کو خلاف شرع سے اور اس کی رہنمائی طرف تسکین باطنی کے اور دور کرنا بدخوؤں کا اور حاصل کرنا صفات حمیدہ کا پھر مرید کا عمل میں لانا اس کو جمیع امور مذکور میں سو جو شخص عالم اور واقف ان امور سے نہ ہوگا اوس سے یہ کیونکر متصور ہوگا۔

ف مترجم کہتا ہے، سبحان اللہ کیا معاملہ بالعکس ہو گیا ہے، فقرائے جہاں کو اس وقت میں یہ خبط سمایا ہے کہ پیری مریدی میں علم کا ہونا کچھ ضرور نہیں، بلکہ علم درویشی کو مضر ہے، اس واسطے کہ شریعت کچھ اور ہے اور طریقت کچھ اور، حالانکہ صوفیائے قدیم

کے کتب اور ملفوظات میں شل قوۃ القلوب اور عوارف المعارف اور احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت اور فتوح الغیب اور غنیۃ الطالبین تصنیف حضرت عبدالقادر جیلانی میں صاف مصرح ہے کہ علم شریعت شرط ہے طریقت اور تصوف کی، یہ بھی جہالت کی شامت ہے کہ جن مرشدوں کا نام صبح شام مثل قرآن اور درود کے ذکر کیا کرتے ہیں ان کے کلام سے بھی غافل ہیں کہ وہ کیا فرما گئے۔ (ص۱۵) اور تیسری شرط بیعت لینے والے کی یہ ہے کہ دنیا کا تارک ہو۔ (ص۱۶)

(یعنی نذرانے اور ہدایا وصول کرنے کے لیے دورے نہ کرتا ہو۔ ہدیے اس قدر نہ لے کہ لوگوں کو حیرانی ہو کہ اتنا سامان کس طرح جائے گا۔)

اور پانچویں شرط یہ ہے کہ بیعت لینے والا مرشدوں کامل کی صحبت میں رہا ہو، اور ان سے ادب سیکھا ہو زمانۂ دراز تک، اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو۔ (ص۱۶)

اس ضروری تنبیہ کے بعد اب ہم پھر ابراہیم ادہم کے کسب معاش کا ذکر کرتے ہیں:۔

ابو یوسف غسولی کا بیان ہے کہ ایک بار ہم ابراہیم کے ساتھ رمضان مبارک میں کھیتوں کے کاٹنے کا کام کر رہے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ کیا اچھا ہوتا اگر ہم اس وقت شہر میں منتقل ہو جاتے، اور وہاں رمضان کا آخری عشرہ گذارتے، ممکن تھا کہ لیلۃ القدر نصیب ہو جاتی، یہ سنکر ابراہیم نے فرمایا کہ بس یہیں (دیہات میں) پڑے رہو، اور خوب جم کر کام کرتے رہو، یہاں کی ہر رات تمھارے لیے لیلۃ القدر ہے۔ اس بارے میں حضرت ابراہیم بن ادہم اتنے متشدد تھے کہ ایک دفعہ وہ صور میں گھر کے اندر تشریف فرما تھے، اور ان کے رفیق سلیمان ابو الیاس اونی جبہ پہنے ہوئے دروازہ پر بیٹھے تھے، ابراہیم نے ان کو ڈانٹ کر کہا کہ اندر آؤ، اندر آؤ، ایسا نہ ہو کہ کوئی ادھر سے گذرے اور تم کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ سائل ہے اور یہ سمجھ کر تم کو کچھ دیدے![1]

وہ فرماتے تھے کہ بھیک مانگنا دو طرح پر ہوتا ہے، ایک دروازوں پر جا کر مانگنا ہے

---

[1] حلیہ ص۳۸

دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی کہے، میں مسجد سے نہ نکلوں گا، روزے رکھوں گا، نماز پڑھوں گا اور عبادت میں مشغول رہوں گا، کوئی اللہ کا بندہ کچھ لا کر دیدے گا تو قبول کرلوں گا ——— فرمایا کہ یہ سوال کی بدترین صورت ہے، اور یہ چمٹ کر بھیک مانگنا ہے، وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ صائم النہار قائم اللیل، نمازی، حاجی، عمرے کرنے والا اور مجاہد غازی تو بس وہ ہے جو خود کو لوگوں سے بے نیاز بنا دے۔[۱]

ابراہیم بن ادہم نے باغوں کی رکھوالی، مزدوری پر کھیت کاٹنے اور ڈول سے کھیت یا باغ کی سینچائی کا کام کرنے کے سوا، چکی پیس کر بھی گذر بسر کیا ہے، چکی پیسنے کے کئی واقعات حلیہ میں مذکور ہیں۔

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ ابونعیم اصفہانی نے بہت شرح وبسط کے ساتھ ان کے حالات و واقعات لکھے ہیں، اور ابن الجوزی کا بیان ہے کہ ان کے حالات کے بیان میں میری ایک مستقل تصنیف ہے۔

ابراہیم بن ادہم چوبیس سال سے زیادہ شام کے مختلف شہروں میں رہے، زندگی کے آخری ایام میں جیسا کہ فرج (ان کے رفیق) کا بیان ہے، وہ شہر صور میں مقیم ہوئے اور وہاں سے غزوات میں شرکت کرتے رہے، غزوہ سے واپس آتے تو صور میں مسجد کی داہنی جانب قیام پذیر ہوتے، آخر میں ایک غزوہ میں شرکت کے لیے گئے اور بحر ابیض متوسط (یا بحر شام کہیئے) کے کسی جزیرہ میں ان کی وفات ہوئی، وہاں سے لاکر ان کو صور کے ایک مقام مدفلہ میں دفن کیا گیا، صور والے جب کسی مرنے والے کا مرثیہ کہتے ہیں تو پہلے ابراہیم کا مرثیہ کہتے ہیں۔ قاسم بن عبد السلام نامی ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے یہ بات فرج کی زبانی ۶۰۰ھ میں سنی ہے، اور حضرت ابراہیم بن ادہم کے مزار کو صور میں دیکھا ہے۔[۲]

جزیرہ میں وفات پانے اور نعش کو وہاں سے لاکر صور میں دفن کرنے کا ذکر ابن الجوزی نے بھی کیا ہے۔[۳]

مناوی نے بھی کواکب دریہ ص۲۴ میں پہلے یہی لکھا ہے، اور اس پر اتنا اضافہ بھی

---

[۱] حلیہ ص۱۳/۸ [۲] حلیہ ص۸/۸ [۳] صفۃ الصفوۃ ص۳۲/۴

کیا ہے کہ ان کی قبر صور میں مشہور ہے، اس کے بعد ابن عساکر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ بحری جنگ میں شریک ہوئے تھے، اسی لڑائی میں بلاد روم کے کسی جزیرہ میں اُن کی وفات ہوئی اور اسی جزیرہ میں مدفون ہوئے۔ ابن حبان نے بھی بلاد روم ہی میں اُن کے انتقال کرنیکا ذکر کیا ہے۔[۱]

لیکن ان سب کے برخلاف شیخ الاسلام ہروی نے فرمایا ہے کہ "بشام برفت از دنیا"[۲]

اور دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ ان کی وفات جبلۂ شام میں ہوئی، اور ایک روایت میں بغداد لکھا ہے،[۳]

اور انوار العارفین ص۱۰۳ میں ہے کہ ابراہیم بن ادہم وفات کے وقت ناپید ہو گئے، بعضے کہتے ہیں کہ امام احمد کے پہلو میں دفن ہیں، یعنی بغداد میں، اور بعضے کہتے ہیں جلبہ (جبلہ صحیح ہے) شام میں مدفون ہیں، جہاں حضرت لوط علیہ السلام کا مزار انور ہے۔

خواجہ ابراہیم بن ادہم کے مدفن کے بارے میں تذکرہ نویسوں کا اختلافِ بیان آپ کے سامنے ہے، دارا شکوہ نے جبلۂ شام میں ان کے مدفون ہونے کو اصح (زیادہ صحیح) قرار دیا ہے۔ مجھکو بھی یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ میں فدائیوں کے قلعہ سے روانہ ہو کر جبلہ پہونچا، جبلہ شہر سمندر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ جبلہ میں ولی صالح حضرت ابراہیم بن ادہم کا مزار ہے، مزار کے احاطہ میں زاویہ بھی ہے، وہاں پانی کا حوض اور وارد و صادر کے لیے کھانے کا انتظام بھی ہے، شام کے مختلف شہروں اور اطراف و اکناف سے شعبان کی پندرھویں شب میں لوگ آتے ہیں اور تین دن قیام کرتے ہیں، ان دنوں میں شہر کے باہر بہت بڑا بازار لگتا ہے جس میں ہر قسم کی چیزیں بکتی ہیں۔

ابن بطوطہ ہی کے بیان کی تصدیق خطط الشام سے بھی ہوتی ہے، جو دورِ حاضر کے مشہور محقق محمد کرد علی کی تصنیف ہے۔ وہ لکھتے ہیں وبجبلة علی ساحل البحر قبر ابراهیم بن ادهم

---

[۱] تہذیب ص۱۲۳ [۲] طبقات الصوفیہ ص۳۵ [۳] سفینۃ الاولیا ص۸۹

الزاهد، ومعظم هذه المزارات مازالت معروفة يختلف اليها الناس وقام عليها زوايا او تكايا۔

اور اس کی تصدیق منجد سے بھی ہوتی ہے، صاحب منجد لکھتا ہے:" جبلہ لاذقیہ کے جنوب میں شام کی ایک بندرگاہ ہے۔ ۶۳۶ء میں اس کو عربوں نے فتح کیا، ۱۱۰۹ء میں اس پر صلیبیوں کا قبضہ ہوا، پھر ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاوون نے اس کو واپس لیا۔ اسمیں رومانی مسرح کے آثار کے علاوہ ابراہیم بن ادہم امیر بلخ اور عابد و صوفی کی قبر ہے" صوریہ کے نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جبلہ، شام کے ضلع لاذقیہ کا ایک شہر ہے، اس کے شمال میں لاذقیہ، جنوب میں بانیاس اور طرطوس، مشرق میں جبال نصیریہ یا حصون فداویہ، اور مغرب میں بحر ابیض متوسط ——(میڈیٹرینین سی) (MEDITERRANEAN SEA) ہے۔

شہر صور اس سے بہت فاصلہ پر جانب جنوب میں ہے، اور وہ اب جمہوریۂ لبنان میں ہے، کسی غلط فہمی کی بنا پر بہت سے بزرگوں کے مزارات کے باب میں اختلاف بیان پایا جاتا ہے مثلاً حضرت خضر، حضرت یحییٰ، حضرت لوط علیہم السلام، اس کے لیے خطط الشام کا مطالعہ کیا جائے۔

ابن بطوطہ نے جو شہر جبلہ کو سمندر سے ایک میل دور بتایا ہے، وہ ان کے زمانے کی بات ہوگی اب تو شہر جبلہ اس شاہراہ کے کنارہ تک آباد ہو گیا ہے جو صور، صیدا، بیروت اور طرابلس سے سمندر کے کنارے کنارے جبلہ سے آگے تک چلی گئی ہے، اور سلطان ابراہیم ادہم کا مزار جس سے متصل ایک عظیم الشان مسجد بھی ہے سمندر سے دو یا تین فرلانگ کے فاصلہ پر پورب جانب ہے۔ میں نے ذی القعدہ ۱۳۹۶ھ میں زیارت کی سعادت حاصل کی ہے۔

عرفانِ امداد

حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کے چند غیر مطبوعہ خطوط!

مرتبہ ——— مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مکتوبات کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اور اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی غیر مطبوعہ خطوط بہت بڑی تعداد میں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ منتشر خطوط کے علاوہ مکتوبات امداد کے ایک سے زائد قلمی مجموعے ہمارے علم میں ہیں، کاش ان سے استفادہ عام ہو اور ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیں۔

اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ کے چھ غیر مطبوعہ مکتوبات پیش ہیں۔ ان میں سے پہلا خط حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی کے نام ہے۔ یہ گرامی نامہ مخدومی ماموں ناظر حسن صاحب جھنجھانوی نے عنایت فرمایا اور اس وقت ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

بقیہ خطوط مولانا سید ابو القاسم ہنسوی کے نام ہیں، یہ خطوط سیدی و مخدومی حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہم کے خاندانی "مرقع نوادر" میں محفوظ ہیں، حضرت مولانا نے از راہ شفقت ناچیز کو ان کے نقل کی اجازت عطا فرمائی۔ یہی وہ خطوط ہیں جن کا حیات عبد الحئی صنہ۹ میں ذکر آیا ہے۔

اس موقع پر یہ وضاحت مناسب ہو گی کہ یہ خطوط املاء کرائے گئے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب کی تحریر نہیں ہیں جس دور میں یہ خط لکھے گئے، اس وقت حاجی صاحب بینائی کی کمزوری کی

وجہ سے لکھنے پڑھنے سے بڑی حد تک معذور ہو گئے تھے۔ مولانا عبد الحیٔ کے نام اس معذوری کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"بسبب کبر سنی کے ضعف جسمانی و ضعف بصارت بہت ہو گیا ہے اس لیے اپنے ہاتھ سے لکھنے پڑھنے میں مجبوری ہے، اگر ضرورتاً کبھی لکھتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے۔"[۵]

لیکن اس سے ان خطوط کی اہمیت و افادیت کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوتی۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ خطوط اپنی اصلی کیفیت میں قارئین تک پہنچیں۔ اس لیے ان کا املاء بھی جوں کا توں باقی رکھا گیا ہے، اس میں کسی قسم کی ترمیم و تصحیح نہیں کی، فارسی خطوط کا ترجمہ اور حواشی میں متعلقہ اشخاص کا تعارف کرا دیا گیا ہے (حواشی آخر میں یکجا ملاحظہ ہوں)

(۱)

مکتوب بنام حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ

بخدمت بابرکت عزیز القدر گرامی مرتبت مولانا مولوی فتح محمد صاحبؒ زید عرفانہ

بعد سلام مسنون و دعائے ازدیاد ذوق و شوق معلوم فرماویں، خط آپ کا پہونچا، تمام کیفیت معلوم ہوئی، اللہ تعالیٰ مدرسہ کی ترقی فرماوے، اور توفیق دین کی عطا فرماوے، مثنوی شریف ضرور شروع کرا دیجئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ رحمۃ اللہ علیہ کی روح کی امداد پہونچے گی، اور فقیر کی بھی دعا ہے کہ وہ سبحانہ تعالیٰ تم کو اس کے مطالب کماہی القا فرماوے۔

باقی رہا توجہ اور ہمت کے معاملہ میں یہ ہے کہ فقیر دل سے متوجہ ہے، فیاض حقیقی امہاتِ مقاصد سے بہرہ ور فرماوے۔ فقیر کو اپنی حالت سے غافل تصور نہ فرمائیں، بلکہ تمام اعزہ کی ترقی حالات کی دعا روزمرہ کرتا رہتا ہے۔ اپنا کام بندگی بجا لانے کا ہے، اور صاحب اور خداوندی اوس ذات مطلق کے ہاتھ ہے، بہر کیف ارادہ کامل، اور عزم بالجزم کے ساتھ اس راہ میں چلتے رہیں، انشاء اللہ تعالیٰ فضل ایزدی ضرور دستگیری فرمائے گا۔

برخوردار لخت جگر مولوی عبد اللہ ساکن قصبہ انبہٹہ اس سال فقیر کے پاس آئے،

---

[۵] مورخہ ۲۵ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ (۱۴ اگست ۱۸۸۸ء) حیات عبد الحیٔ ص ۹۲

بسبیل تذکرہ جو آپ کا ذکر آیا، تو انھوں نے بیان کیا کہ میرے گمان میں تو بعد مولوی محمد قاسم صاحبؒ مرحوم و مولوی محمد یعقوب صاحبؒ مغفور و مولوی رشید احمد صاحبؒ مدظلہ العالی کے، مولوی فتح محمد صاحب و مولوی سخاوت علی صاحبؒ باعتبار اخلاص و تکمیت وغیرہا کے ہیں۔ اور فقیر بھی اونکے گمان کی تصدیق کرتا ہے۔

باقی حج بیت اللہ شریف کو جو آپ کی والدہ شریفہ فرماتی ہیں، آپ خوب واقف ہیں کہ بدون زاد راہ ممانعت شرعی ہے، علاوہ ممانعت شرعی تکالیف گوناگوں پیش آتی ہیں۔ لہذا فقیر دعا کرتا ہے کہ حضرت حق بقدر زاد وراہ قدرت کاملہ فرماوے۔ آمین ثم آمین

جملہ واقفین و پرسان (؟ احوال سے) سلام مسنون۔

الراقم فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ

از مکہ معظمہ زادھا اللہ شرفا

پتہ!

بمقام کونچ ضلع جالون قسمت جہاں سے (کذا؟)

بخدمت فیضدرجت و بابرکت عزیز القدر گرامی شان مولوی فتح محمد صاحب زید عرفانہ

موصول باد

خط کی پشت پر تحریر ہے، جو غالباً مولانا فتح محمد صاحب کے قلم کی ہے:۔

"بتاریخ یکم ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ (۱۷ دسمبر ۱۸۸۷ء) روز شنبہ کو پہونچا"

(۲)

بنام مولانا سید ابوالقاسم صاحب ہنسوی

از طرف فقیر امداد اللہ عفی عنہ بعد السلام علیکم کے، بخدمت مولوی ابوالقاسمؒ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ واضح ہو کہ خط آپ کا تحریرہ ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ کا پہونچا تھا، حال معلوم ہوا تھا، لیکن بوجہ ضعف جسمانی و بصارت کے کہ کاہلی از حد مستولی ہو گئی ہے۔ روانگی جواب میں تاخیر ہوئی۔

حسب الطلب آپ کے شجرہ بھیجا جاتا ہے، اور بیعت غائبانہ کہ اس بیعت کو بیعت عثمانی

رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کی گئی، ــــــ تعبیر کے (کذا ؟) بظاہر اس طرح اس احقر کی رائے میں آتی ہے کہ آپ جن سے بیعت ہیں، وہ نہایت عظیم القدر، رفیع الشان شخص ہیں۔ کہ ادنیٰ جس کا یہ ہے کہ اون کا نور عرفان مثل مہر نیمروز کے ہے، اور فیض بھی اونکا مستمر معلوم ہوتا ہے، ایسے شخص سے بیعت ہوکر دوسرے شخص کی طرف بیعت کے لیے خیال کرنا ممنوع ہے۔ واللہ اعلم!

خداوند ہمیں آپ کو اپنی محبت عطا فرماوے، اور اپنے فضل وکرم اور رحمت میں ڈھانپ لے۔ والسلام ۱۴ محرم ۱۳۰۳ھ (۲۳ اکتوبر ۱۸۸۵ء)

جو کوئی ملنے والا ہو سب کو سلام پہونچے، اور وصایا میں کتب معمور ہیں، اور انشاء اللہ تعالیٰ اگر تم نے پھر یاد دہانی کی تو جواب باصواب بھیجا جاوے گا۔

از مکہ مکرمہ

(۳)

از فقیر امداد اللہ عفی عنہ، بخدمت بابرکت عزیز القدر مولوی ابوالقاسم زاد اللہ علمہ ومعرفتہ باللہ!

بعد سلام مسنون ودعائے خیر مشہود رائے عزیز باد مکتوب عقیدت اسلوب معہ رسالہ مناجاتیہ منتخبہ از مناجات فقیر، برائے صحت، ودلائل الخیرات، ورسالہ ارشاد مرشد، برائے صحت وطلب سند جناب سید مولوی عبد الرب صاحب رسانید مسرور گردانید۔

عزیز من! رسالہ مناجاتیہ را چونکہ فقیر ملاحظہ کردہ شد چیزے غلط وغیر مربوط یافتہ شد، ودر درستی وصحت آں چیزے فراغت وصحت ضروریست، وفقیر در یں ولا بسیار ضعیف است، خصوصاً ضعف بصارت کہ از نوشتن وخواند معزور (؟ کذا) است، لہذا واپس کردہ شد، خود درست باید نمود۔ آنکہ در طلب سند دلائل الخیرات نوشتہ بود؟ عزیز من! در مدینہ منورہ شیخ الدلائل دو بزرگوار بودند کہ بدرجہ نہم از حضرت مصنف علیہ الرحمۃ روایت میدارند۔ یکے سید محمد بن احمد بن عبد الرحمان مغربی حافظ دلائل، دوم علی بن یوسف حریری حافظ دلائل، اگرچہ ہر دو بزرگواران شاگرد یک استاد اند، مگر چند جا در روایت باہمدگر اختلاف است، چوں اجتماع ہر دو روایت در تحریر دشوار بود، لہذا اندراج یک روایت در متن، وثبت دیگر بر حاشیہ واقع شد، ونیز در آخر جداگانہ ہم ثبت کردہ بود نگاہ دارند، فقط! فقیر را سند از ہر دو جانب است وآں اینست (؟؟)!

دیگر آنکہ بموجب درخواست آنعزیز را، عزیز جان مولوی عبدالحق را غائبانہ بعیت گرفتہ در سلسلہ احمدیہ وچشتیہ صابریہ داخل کردہ، اجازت اذکار واشغال ہر دو طریقہ مذکورہ کہ در رسالہ ارشاد مرشد مرقوم اند، باجازتیکہ دادمرا بزرگان طریقہ، واللہ الموفق وبہ نستعین!

دو پرچہ چشتیہ صابریہ، و پرچہ شجرہ احمدیہ محررہ آنعزیز می رسد، نقل گیر و داشتہ بعزیز جان مولوی عبدالحق حوالہ کردہ شد، ورسالہ ارشاد مرشد ہم میسر شد گرفتہ بعمل آرند۔

بخدمت عزیزم مولوی سید عبدالحق صاحب، وحاجی شاہ قدرت علی صاحب نقشبندی وشیخ وجیہ الدین صاحب وغیرہ محبان سلام دعا برسد۔!

مہر (محمد امداد اللہ فاروقی)
۱۲۷۹ھ

ترجمہ:-

فقیر امداد اللہ کی طرف سے، بخدمت بابرکت عزیز مولوی ابوالقاسم، اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعرفان میں اضافہ فرمائے!

بعد سلام مسنون اور دعائے خیر کے آں عزیز کو معلوم ہو کہ آپ کا عقیدت بھرا خط معہ رسالہ مناجاتیہ جو آپ نے فقیر کی مناجات سے منتخب کیا ہے، تصحیح کے لیے، اور دلائل الخیرات اور رسالہ ارشاد مرشد صحت وسند حاصل کرنے کے لیے جناب سید مولوی عبدالرب نے بھیجا یا بیحد مسرور کیا۔

میرے عزیز! رسالہ مناجاتیہ کو فقیر نے دیکھا، اسے غلط اور غیر مربوط پایا اس کی درستی اور تصحیح کے لیے فرصت اور صحت ضروری ہے، اور فقیر اس وقت بہت کمزور ہو گیا ہے۔ خصوصاً بینائی کی کمزوری کی وجہ سے پڑھنے لکھنے سے بھی معذور ہے، لہذا (وہ مناجات) واپس کر رہا ہوں خود ہی تصحیح کر لیں۔

اور آپ نے جو دلائل الخیرات کی سند کے لیے لکھا ہے، عزیزم! مدینہ منورہ میں دو بزرگ شیخ الدلائل ہیں، جو نو واسطوں سے حضرت مصنف سے روایت کرتے ہیں، ایک سید محمد بن احمد بن عبدالرحمان مغربی حافظ دلائل، دوسرے علی بن یوسف حریری حافظ دلائل، اگرچہ دونوں بزرگ ایک استاد کے شاگرد ہیں مگر چند مقامات پر روایت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

چوں کہ دونوں روایتوں کا اجتماع (متن میں) دشوار ہے۔ اس لیے ایک روایت متن میں، دوسری حاشیہ پر درج کی گئی، اور آخر میں سلا اختلاف روایات، علیحدہ بھی لکھ دیا گیا ہے خیال رکھیں۔ فقط!
فقیر کو دونوں (حضرات) سے سند اور اجازت حاصل ہے، اور وہ یہ ہے (سند خط میں مذکور نہیں ہے)
دوسری بات یہ ہے کہ تمھاری درخواست کے مطابق آں عزیز اور عزیز از جان مولوی عبد الحق کی غائبانہ بیعت لیکر سلسلہ احمدیہ اور چشتیہ صابریہ میں داخل کر لیا ہے۔ دونوں سلسلوں کے اوراد و اشغال رسالہ "ارشاد مرشد" میں لکھے ہوئے ہیں جس طرح کہ مجھ کو بزرگان طریقت سے ان کی اجازت ملی ہے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور ہم اس ہی سے مدد چاہتے ہیں!
دو پرچے شجرہ چشتیہ صابریہ اور پرچہ شجرہ احمدیہ لکھا ہوا، آنعزیز تک پہنچے گا، اس کی دوسری نقل کر کے عزیز از جان مولوی عبد الحق کے حوالہ کر دیں، اور رسالہ ارشاد مرشد بھی بھیج رہا ہوں، وصول کر کے اس کے مطابق عمل کریں۔ عزیزم مولوی سید عبد الحق اور حاجی شاہ قدرت علی صاحب نقشبندی، اور شیخ وجیہ الدین صاحب وغیرہ دوستوں کی خدمت میں سلام پہنچے۔!

(۴)

اما بعد۔ بعد الحمد والصلوۃ۔ فقیر حقیر امداد اللہ عفی عنہ، عرض می نماید کہ برادر طریقت و طالب معرفت عزیزم مولوی سید ابو القاسم صاحب نقشبندی، باخلاص تمام بردست فقیر غائبانہ توبہ و تجدید بیعت نمودہ، داخل سلاسل اربعہ بالخصوص طریقہ چشتیہ صابریہ و نقشبندیہ احمدیہ ...... طالب اجازت اذکار و اشغال و مراقبات طرق موصوفہ شدند، پس اجازت دادم باجازتیکہ دادمرا بزرگان طریقت، و نیز اجازت است کہ ہر کس را کہ اہل و طالب صادق نام حق یابند باستعداد و قابلیت او تعلیم و تلقین نام حق نمایند، و از آداب سلوک اطلاع نمایند و بہ تحصیل مسائل فقہ ضروریہ و بہ تصحیح عقاید سنت جماعت تاکید کنند و رغبت و تحریص بر اتباع شرع شریف نمایند کہ بے ایں وصول مطلوب مشکل است، وھو الموفق وبہ نستعین وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد والہ واصحابہ اجمعین۔ فقط

مہر (محمد امداد اللہ فاروقی)
۱۲۶۹ھ

ترجمہ :- امابعد حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر حقیر امداد اللہ عفی عنہ، عرض کرتا ہے کہ برادر طریقت اور معرفت الٰہی کے طالب عزیزم مولوی سید ابو القاسم صاحب نقشبندی نے نہایت اخلاص سے فقیر کے ہاتھ پر غائبانہ توبہ اور تجدید بیعت کی ہے، (اور) چاروں سلسلوں میں داخل ہوئے ہیں۔ بالخصوص طریقہ چشتیہ صابریہ اور نقشبندیہ احمدیہ میں...... (اور مجھ سے) ان طریقوں کے اذکار و اشغال کی اجازت چاہی ہے، پس میں نے (ان کو) اجازت دی جس طرح کہ بزرگان طریقت نے مجھے اجازت عطا فرمائی۔

اور (ان کو) اس کی بھی اجازت ہے کہ جس شخص کو اہل اور نام حق جل مجدہ کا سچا طلبگار پائیں۔ اس کی استعداد و صلاحیت کے مطابق اسے نام حق کی تعلیم و تلقین کریں، اور راہ سلوک کے آداب اسے بتائیں اور تمام ضروری فقہی مسائل کی تحصیل اور عقاید کی تصحیح سنت جماعت کے طریقے پر کرنے کی تاکید کریں، اور اتباع شریعت کی رغبت اور حرص دلائیں، اس لیے کہ اس کے بغیر معرفت خداوندی حاصل ہونی مشکل ہے، اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور ہم اس سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ اور درود ہو خیر خلائق جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تمام آل و اصحاب پر! فقط!

(۵)

از فقیر امداد اللہ عفی عنہ۔　بخدمت محبان و مخلصان عزیزان من مولوی ابو القاسم و منشی ابو سعید صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ

بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، و دعاء ترقی درجات دارینی مشہود رائے عزیزان باد ـــــ اخلاص نامہ تمہارا معہ درخواست بیعت والدہ اس عزیز کی اور والدہ میاں سید عبدالحئی کی وارد ہوا، اور اس کے مضامین سے فقیر مسرور ہوا۔

بموجب تحریر کے دونوں مستورات موصوفہا سے بیعت غائبانہ لی گئی، اور شجرہ خاندانی سید احمد رحمۃ اللہ کے ملفوف خط کی (؟) روانہ کیے جاتے ہیں انشاء اللہ تمہارے پاس پہونچیں گے دونو مسماۃ کو دیدینا، اور کہدینا کہ جب شجرہ ان کے پاس پہونچیں، بعد غسل دو رکعت نفل توبہ کی نیت سے پڑھ کر کہے الٰہ العالمین! ہم نے توبہ کی شرک اور کفر اور صغیرہ کبیرہ گناہوں

سے اوپر ہات امداد اللہ کے، سو تو قبول کر اور توفیق اعمال نیک کی عطا فرما! بعد ازاں ہر روز سو بار استغفار صبح، اور سو بار شام، اور ہزار بار کلمہ طیبہ، اور ہزار بار درود شریف ہمیشہ پڑھا کریں، ترک نہ کریں۔ اور تبرکات تسبیح وغیرہ بھی اگر کوئی ادھر کا بندہ میسر ہوا تو روانہ کی جائیگی ڈاک میں بند و بست نہیں ہو سکتا۔ اور اگر رسالہ ارشاد مرشد دست یاب ہو تو اوس میں اوراد اذکار، اور اشغال اور وظائف لکھے ہیں۔ اوسکی تم کو اجازت ہے، جس قدر ہو سکے عمل میں لاویں، فقط!

عزیزم منشی ابو سعید صاحب کے حق میں دعا کرتا ہوں اِنَّہٗ قریبٌ مجیب۔ فقط!

(۶)

از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ، بخدمت سراپا خیر و برکت عزیزانم میاں ابو القاسم، و مولوی عبد الحئی صاحبان سلمہا اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! مکتوب بہجت اسلوب بہ سبیل ڈاک ورود و سرور لایا ممنون و مسرور ہوا، اللہ تعالیٰ بدیں یاد فرمائی و محبت و عنایت، مکروہات زمانہ سے محفوظ رکھکر جمعیت صوری و معنوی اور اپنی محبت و رضا عنایت کرے۔

حاجی مولوی سید عبد العزیز صاحب مرحوم و مغفور کے انتقال کا حال سنکر رنج و افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما کر اپنے جوار رحمت میں مقام اعلیٰ علیین عنایت (؟ فرمائے) آمین! اور اون کے پسماندگان کو صبر و استقلال مرحمت کرے، اور ان کا نعم البدل عطا کرے۔

اب فقیر کو ضعف و نقاہت بہت برسر ترقی ہے۔ صبح و شام معلوم ہوتا ہے، فقیر (؟ کے) حسن خاتمہ کی دعا کرو، —— اور چونکہ باعث ضعف اب اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتا، اس لیے اگر جواب کے جانے میں تقصیر ہو تو درگزر کرو، کیونکہ صدہا خطوط آتے ہیں، ہر چند جواب لکھوانے میں کوشش کرتا ہوں، تاہم بشریت سے سہو ممکن ہے!

آپ کے اشعار یعنی قصیدہ مصنفہ عزیز پہونچا، اگرچہ من آنم کہ من دانم لیکن اللہ تعالیٰ تمھاری عقیدت و ارادت و محبت کے مطابق تمھارے دلوں کو انوار و فیوض و برکات سے منور کرے اور اپنے ماسوا سے دل کو پاک و صاف کرے، بہر کیف اللہ تعالیٰ خود ہادی و

متصل ہے۔ شیخ و مرشد درمیان میں ایک واسطہ اسباب کا قرار دیا گیا ہے، اس لیے جتنی محبت
و عقیدت اپنے شیخ سے ہوگی اسی قدر فیوض و برکات اسے ہونگیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا اور تمہارا
خاتمہ بالخیر فرماکر اپنے صدیقین کے سلسلہ میں داخل فرمادیں، اور تم کو دارین میں درجات عالیات
قرب مراتب عنایت کریں۔ والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم!

۱۴ ربحرم ۱۳۰۸ھ (۱۳ راگست ۱۸۹۰ء) از مکہ معظمہ محلہ حارۃ الباب

سب عزیزان و احباب کی خدمت میں سلام مسنون باد۔

حواشی

لہ مولانا فتح محمد صاحب تھانوی، وطن، نسب اور ابتدائی تعلیم کی نسبت معلومات نہیں ملتیں۔ تھانہ بھون وطن ثانی تھا، ابتدائی تعلیم بظاہر دہلی اور جھنجھانہ میں پائی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، مولانا نواب قطب الدین دہلویؒ، مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتیؒ جیسے فخر روزگار علما سے تعلیم حاصل کی، اور جب دیوبند میں مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) کی ابتدا ہوئی تو دیوبند آ گئے وہاں شریک درس رہے، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور مولانا ملا محمود دیوبندی (جن کا انجاح الحاجہ حاشیہ ابن ماجہ منسوب بہ شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی کی تصنیف میں غالب حصہ رہا ہے۔ "میرے والد ماجد" از مولانا مفتی محمد شفیع کراچی ۱۹۶۵ء صفحہ ۵۵) وغیرہ سے استفادہ کیا، دارالعلوم کی طرف سے پہلی بار ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۰ء) میں جن طلبا کی دستار بندی ہوئی ان میں مولانا فتح محمد صاحب بھی تھے۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۵۵)

مثنوی مولانا روم سے بےحد شغف تھا، مثنوی کے مشہور استاذ مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی سے مثنوی شریف کا درس لیا تھا، اور بہت ذوق و شوق سے اس کا درس دیتے تھے۔

نواب قطب الدین دہلوی سے بیعت ہوئے اور نواب صاحب کے انتقال کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے رجوع ہو گئے تھے، حضرت حاجی صاحب نے اجازت و خلافت عطا فرمائی، حضرت حاجی صاحب کی نظر میں مولانا کا کیا مرتبہ و مقام تھا اس کا اس خط سے اندازہ ہو رہا ہے۔ "نہایت متقی کریم النفس اور بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بہت ہی بابرکت اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔"

اشرف السوانح ص ۲۱/۱

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے عربی فارسی کی ابتدائی کتابوں اور مثنوی شریف کا سبق مولانا فتح محمد صاحب سے لیا تھا۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دین کا شوق مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت سے پیدا ہوا تھا۔ اشرف السوانح ج ۱ ص ۲۱

مولانا عبدالحیٔ صاحب رائے بریلوی (مولف نزہتہ الخواطر) کو بھی مولانا فتح محمد سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔ (نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۰) —— مولانا نے ستر سال کی عمر میں ۱۳۲۳ھ میں وفات پائی۔

۵۵ مراد حضرت مولانا جلال الدین (محمد بن محمد قونوی) رومی، ولادت ۶۰۴ھ (۱۲۰۷ء) وفات ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) مشہور بہ مولانا روم۔

۵۶ مولانا عبداللہ بن انصار علی بن احمد علی بن قطب علی انصاری انبھٹوی، نہایت ذہین و ذکی عالم تھے، دیوبند میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے تعلیم پائی۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا سید عالم علی نگینوی اور مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتی سے سند حدیث حاصل کی۔

حضرت حاجی امداد اللہ سے مثنوی مولانا روم کا درس لیا، اور حاجی صاحب سے ہی بیعت ہوئے۔ اور خلافت و اجازت پائی۔

مولانا عبداللہ انصاری سر سید احمد خاں کی دعوت پر علی گڑھ چلے گئے تھے۔ اور طویل عرصہ تک ایم۔ اے۔ او کالج میں ناظم دینیات رہے —— مولانا کو علی گڑھ آنے پر آمادہ کرنے کے لیے سرسید احمد خاں نے منشی سید احمد صاحب تھانوی (نائب منیجر بورڈنگ ہاؤس ایم۔ اے۔ او کالج) کے نام ایک مفصل خط لکھا تھا۔ (مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ص ۶۱۷ تا ص ۶۲۲)

شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بیحد قریب تھے۔ ریشمی رومال تحریک میں شریک رہے، تحریک کی فوجی تنظیم "جنود ربانیہ" کے عہدہ داران کی فہرست میں میجر جنرل کے عہدہ کے لیے مولانا عبداللہ انصاری کا بھی نام ملتا ہے ——

[ریشمی خطوط سازش کیس
مرتبہ مولانا محمد میاں ص ۲۷۵ ص ۳۰۳]

ہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری اُن کے صاحبزادے تھے۔ مولانا عبداللہ انصاری نے ۱۳۴۴ھ میں بمبئی میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر ص۲۸۶)

۴ـ حضرت مولانا محمد قاسم بن اسد علی صدیقی نانوتوی ولادت شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) میں ولادت ہوئی۔ ۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (۱۵؍ اپریل ۱۸۸۰ء) میں وفات پائی۔ سوانح اور خدمات محتاج تعارف نہیں، تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے "سوانح قاسمی" مولانا مناظر احسن گیلانی۔ و "انوار قاسمی" انوار الحسن صاحب شیر کوٹی، مقدمہ "کیا مقتدی پر فاتحہ واجب" از مفتی سعید احمد پالنپوری۔ اور نزہۃ الخواطر ص۳۸۲ تا ص۳۸۴ جلد ہفتم۔

۵ـ حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی ۶؍ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ (۱۱؍ مئی ۱۸۲۹ء) میں پیدائش ہوئی۔ ۹؍ جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ (۱۱؍ اگست ۱۹۰۵ء) میں انتقال فرمایا۔ مفصل حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے تذکرۃ الرشید از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مقدمہ لامع الدراری از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ العالی ص۔ یحیوی سہارنپور، اور نزہۃ الخواطر ص۱۴۸ تا ص۱۵۲ جلد ہشتم۔

۶ـ حضرت مولانا محمد یعقوب بن مولانا مملوک العلی صدیقی نانوتوی ۱۳؍ صفر ۱۲۴۹ھ (۲؍ جولائی ۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے اور یکم ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۲۲؍ دسمبر ۱۸۸۴ء) میں وفات پائی۔ مفصل حالات کے لیے بیاض یعقوبی، نزہۃ الخواطر ص۵۲۴ اور حیات یعقوب و مملوک از انوار الحسن صاحب شیر کوٹی ملاحظہ فرمائیے۔

۷ـ مولانا سخاوت علی انبہٹوی، افسوس ان کے مفصل حالات نہیں ملتے، صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ انھوں نے سرسید احمد خاں کی تحریک سے متاثر ہو کر انبہٹہ (ضلع سہارنپور) میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اور اس وقت کے مذہبی حلقوں کے عام رجحان کے برعکس سرسید کے ہم نوا اور ان کی تحریک کے مداح تھے مولانا حالی نے بحوالہ تہذیب الاخلاق (جلد ۴ شمارہ ۷) ان کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:-

"اگرچہ پہلے بھی ہم کو اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضا کرنے والا اور بار بار جگانے والا نہ تھا، اب تہذیب الاخلاق نے یہاں تک چوکنا اور آگاہ کیا جس کے سبب اس قصبہ میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا، خدا اس پرچہ تہذیب الاخلاق کو ہمارے لیے ہمیشہ مبارک رکھے۔ (حیات جاوید ص۲۵۵)

۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں سہارنپور میں مدرسہ اسلامیہ (مظاہر علوم) قائم ہوا، تو اس میں مدرس عربی مقرر ہوئے۔ پھر مدرس فارسی ہو گئے تھے۔ ۱۲۸۹ھ میں مستعفی ہو کر وطن چلے گئے تھے۔ مستفاد از تاریخ مظاہر ص۔ مرتبہ مولوی محمد شاہد سہارنپوری۔

۸ مولانا سید ابو القاسم بن عبد العزیز بن سراج الدین حسنی ہنسوی، ۵ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ (۱۳ اکتوبر ۱۸۵۸ء) میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم مولانا عبد السلام سے پائی، انھیں سے بیعت ہوئے، اور ان کے ممتاز خلفاء سے تعلیم کی تکمیل کی، مولانا قاری عبد الرحمان پانی پتی، اور مولانا سید ضیاء النبی رائے بریلوی سے اجازت حدیث حاصل کی۔

حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت عثمانی کی، اور چاروں سلسلوں میں مجاز ہوئے۔ عمدہ علمی وتاریخی ذوق پایا تھا، نزہۃ الخواطر سے ان کی چھ تالیفات کا علم ہوتا ہے، جن میں سب سے زیادہ اہم اور بیش قیمت تالیف "مکتوب المعارف" ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ محمد عاشق پھلتی اور حضرت شاہ عبد العزیز کے مکتوبات حضرت شاہ ابو سعید رائے بریلوی اور ان کے اعزہ کے نام جمع کیے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۳۰۳ھ میں سہارنپور سے شائع ہوا، اور ان کی تلخیص و ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی زید مجدہم کے قلم سے الفرقان (لکھنؤ) میں ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ اپریل ۱۹۶۵ء تا محرم ۸۵ھ جون ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی اور ہسوہ میں دفن ہوئے۔

تفصیلات کے لیے نزہۃ الخواطر ج۸ ص۱ اور حیات عبد الحی ص۹ ملاحظہ ہو۔

۹ مراد حضرت مولانا عبد السلام بن ابو القاسم ہنسوی ولادت ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۷ء وفات ۲۸ شوال ۱۲۹۹ھ (۱۹ اگست ۱۸۸۲ء) نزہۃ الخواطر ج۷ ص۲۶۳

۱۰ حاجی میر شاہ قدرت علی ساکن بجیت فتحپور (نظام کانپور اکتوبر ۱۹۶۴ء ص۲۴) مولانا سید عبد السلام ہنسوی سے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں اجازت بیعت حاصل تھی، مولانا عبد الحی رائے بریلوی نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ حیات عبد الحی ص۲ ص۱۰۳

۱۱ شاہ وجیہ الدین۔ مولانا عبد السلام ہنسوی کے خلفاء میں ان کا بھی نام ملتا ہے ص۲۴ ماہنامہ نظام کانپور ۱۹۶۴ء

۱۲ منشی سید ابو سعید، حافظ سید عبد السلام صاحب کے صاحبزادہ اور مولانا عبد الجلیل صاحب کے پوتے تھے۔ ان کا نام اپنے جد امجد حضرت سید شاہ ابو سعید صاحب کے نام پر رکھا گیا جو حضرت سید احمد شہید

کے حقیقی نانا تھے، اور ان کا شمار حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خواص اصحاب میں تھا، صاحب علم ہوشمند، اور نہایت کریم النفس اور ہمدرد و ذی مروت انسان تھے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ حیات عبدالحئی ص۱۲۵

۱۳ یہ بی بی محترمہ سیدہ عزیز النساء، مولانا سراج الدین ہسوی متوفی ۱۲۷۷ھ ۱۸۶۰ء کی صاحبزادی تھیں۔ ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں وفات پائی، حیات عبدالحئی ص۲۶-۵۶

۱۴ مولانا سید عبدالحئی، مولانا فخر الدین خیالی کے نامور فرزند، نزہۃ الخواطر، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، جنۃ المشرق، اور گل رعنا کے مصنف کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ ابتدا ہی سے تحریک ندوۃ العلماء کے سرگرم رکن رہے۔ رمضان ۱۳۳۳ھ (جولائی ۱۹۱۵ء) میں ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے اور آخر عمر تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت عثمانی کی درخواست کی، حضرت نے بیعت قبول فرمائی اور سلسلہ کے معمولات و اشغال کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ اس موقعہ پر حاجی صاحب نے جو مفصل گرامی نامہ تحریر فرمایا تھا وہ حیات عبدالحئی ص۹۱ ص۹۳ میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

۱۳۱۳ھ میں حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کے دامن فیض سے وابستہ ہو گئے تھے، اور مولانا سے بڑا ہی والہانہ تعلق رکھتے تھے۔

۱۸ رمضان ۱۲۸۶ھ (۲۳ دسمبر ۱۸۶۹ء) میں پیدائش ہوئی، اور ۵ رجمادی الآخر ۱۳۴۱ھ (۲ فروری ۱۹۲۳ء) میں وفات پائی، مفصل سوانح کے لیے دیکھیے حیات عبدالحئی از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم۔

۱۵ مکتوب الیہ، مولانا سید ابوالقاسم کے والد اور مولانا سید سراج الدین ہنسوی کے فرزند تھے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ۱۳۰۷ھ کے اواخر میں وفات پائی۔

ترتیب مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی
جامعۃ الرشاد (اعظم گڑھ)

مجلس بقیۃ السلف

حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی مدظلہٗ

(۲)

فرمایا کہ گناہ کا ہو جانا اور بات ہے اور گناہ اس قصد سے کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوگی دونوں میں بڑا فرق ہے گناہ سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے اگر ہو جائے تو توبہ کرنے سے پھر اللہ کی رحمت لوٹ آتی ہے۔ اس پر متعدد آیات اور احادیث سے استدلال فرمایا اس سے پہلے کے ملفوظات میں تفصیل آچکی ہے۔

فرمایا کہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ مانکپور میں رہتے تھے ان کو لوگ بہت ستاتے تھے عاجز آکر انھوں نے حضرت مجدد صاحب کو لکھا کہ یہاں کے لوگوں نے اظہار حق کے جرم میں بہت پریشان کر رکھا ہے، اگر اجازت ہو تو الہ آباد منتقل ہو جاؤں! حضرت مجدد صاحب نے ان کو لکھا کہ عزیمت تو یہی ہے کہ آپ مانکپور ہی میں رہیں اور لوگوں کی تکلیفیں برداشت کرتے رہیں۔ وہ رک گئے مگر کچھ دنوں بعد مجدد صاحب نے خواب میں دیکھا کہ ان کا سامان الہ آباد منتقل ہو رہا ہے اس کے بعد ان کو الہ آباد جانے کی اجازت دیدی۔

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ ربر کی گیند کو جتنا ٹپکا جاتا ہے وہ اتنا ہی بلندی پر جاتی ہے اسی طرح اللہ والوں کو جو لوگ جتنا ہی پٹکنے اور ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اتنا ہی خدا کے یہاں اونچے ہوتے ہیں۔ بس آدمی کو شریعت کا دامن نہ چھوڑنا

چاہیے ۔

فرمایا کہ لوگ دعا کراتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ کرے، یہ بات اچھی ہے مگر میں نے اس میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ یہ دعا کرنی اور کرانی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ایمان نصیب کرے اور ایمان پر خاتمہ کرے، ایمان پر خاتمہ کی دعا کرانے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایمان موجود ہے، ایمان ضرور موجود ہے مگر ایمان جیسا ہونا چاہیئے کہاں نصیب ہے، اسی لیے دعا کرانی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی ایمان نصیب کرے اور اسی پر خاتمہ کرے۔

دو بزرگوں میں سے کسی کے انتقال کے بعد دوسرے بزرگ نے ان کو خواب میں دیکھا کہ وہ جنت میں ٹہل رہے ہیں، پوچھا کیا حال ہے ....

.... فرمایا کہ جنت کا مزہ لے رہا ہوں، پوچھا کہ دل میں کوئی تمنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ایک تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ دنیا میں بھیج دیتا اور گھر گھر جاکر لوگوں کو اللہ کا کلام سناتا۔

یہ خواب بیان کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ اللہ والوں کو اللہ کا پیغام سنانے میں جو لطف آتا ہے وہ کسی چیز میں نہیں، میری صحت خراب ہے صحت کی اگر خواہش ہے تو صرف اس لیے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی بات سنا سکوں، اس دنیا میں ایک بار اخلاص سے سبحان اللہ کہنے کا موقع مل جائے تو یہ ہفت اقلیم سے زیادہ بہتر ہے۔

فرمایا کہ حضرت مولانا تھانویؒ بچوں کو پیار کرتے اور چھیڑتے رہتے تھے ایک دن ایک ناسمجھ بچہ کو چھیڑا تو اس نے کہا کہ "اللہ میاں بڑے ابا مر جائیں" حضرت تھانوی نے فرمایا کہ اگر کسی کو موت کی بد دعا دی جائے تو فطری طور پر اس سے اس کو تکلیف ہوگی مگر میں نے اس جملہ پر غور کیا تو بچہ کا جملہ بد دعا نہیں بلکہ دعا ہے اس دنیا میں جب تک آدمی رہے گا علائق دنیا اور مرض و تکلیف وغیرہ سے دوچار رہے گا مگر مرنے کے بعد جب جنت میں پہنچ جائے گا تو آرام ہی آرام ہوگا اس لیے میں نے اس جملہ کو دعا پر محمول کیا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ حضرت تھانوی کی اس توجیہ پر میں پھڑک اٹھا، اللہ والے اسی طرح تکلیف دہ باتوں میں بھی بھلائی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک عالم دشمنی رکھتے تھے وہ کہتے تھے کہ مولوی اسحاق صاحب جس چیز کو حرام کہیں گے میں اس کو حلال اور جائز ثابت کروں گا، شاہ صاحب نے ان کے یہاں کہلایا کہ میں ماں اور بہن سے نکاح کو حرام کہتا ہوں اب وہ اس بارے میں اپنی رائے دیں۔ بس وہ خاموش ہو گئے"

ایک صاحب۔ جو دونوں حضرات سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے دونوں صاحبان کو اپنے یہاں مدعو کیا، حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق اور وہ عالم صاحب۔ اپنے چند دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ تشریف لائے، جب کھانا چن دیا گیا تو داعی نے کہا کہ حضرت آپ لوگ یہ بات سن لیں کہ میں نے یہ بکرا غازی میاں کے نام پر ذبح کیا ہے آپ حضرات پسند کریں تو کھائیں، کھانا نہ چاہیں تو نہ کھائیں! شاہ اسحاق صاحب اور ان کے ساتھیوں نے کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ان حضرات کو دیکھ کر ان عالم صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھانا نہیں کھایا، داعی نے عالم صاحب سے سوال کیا کہ یہ بتائیے کہ شاہ صاحب تو پہلے ہی سے اسے حرام کہتے ہیں مگر آپ تو اسے حلال کہتے ہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں کھاتے؟ وہ بولے کہ بات تو شاہ صاحب کی صحیح ہے مگر ان کی ضد میں اسے حلال کہتا ہوں۔ اس واقعہ کو مولانا گنگوہی نے ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں میں یہ خوبی تھی کہ انھوں نے صفائی سے کہہ دیا کہ صحیح بات تو یہ ہے مگر میں ضد سے ایسا کہتا ہوں، اس زمانہ میں تو یہ بھی کہنے والے موجود نہیں۔ اس زمانہ میں لوگ اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں نفسانیت اور ضد بڑی بری چیز ہے۔

فرمایا کہ تذکرۃ الرشید میں پڑھا ہے کہ ڈاکوؤں کا ایک سردار تھا جو قافلہ ادھر سے گزرتا تھا اسے لوٹ لیتا تھا، جب بوڑھا ہو گیا اور اس کے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تو وہ پریشان ہوا کہ اب کیا کروں، اس کی سمجھ میں آیا کہ چلو درویشی اختیار کر لوں، چنانچہ وہ جنگل میں ایک گزرگاہ پر حجرہ بنا کر عبادت اور ذکر کرنے لگا، آہستہ آہستہ اس کی بزرگی کا چرچا ہوا اور کچھ لوگ مرید ہو گئے یہ مریدین چونکہ مخلص تھے اس لیے خلوص کی برکت سے وہ اللہ کے مقرب ہو گئے، ان میں کچھ لوگوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے

شیخ کس مقام پر ہیں۔ بہت مراقبہ کیا مگر ان کے مقام کا پتہ نہ چل سکا، انھوں نے اپنے حسن ظن کی بنا پر یہ سمجھا کہ ہمارے شیخ کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ہم اس کا پتہ نہ لگا سکے اور پھر شیخ سے اگر اس کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ سچی بات یہ ہے کہ میں تو کچھ نہیں ہوں میں تو ڈاکو تھا۔ جب ڈاکہ ڈالنے کے لائق نہیں رہا تو یہ کاروبار شروع کر دیا۔ تب ان مریدوں نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں دعا کی کہ اے اللہ جن کی بدولت تو نے ہم کو اپنا لیا ہے ان کو بھی اپنا بنائے۔ حضرت گنگوہی نے قصہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اصل چیز صدق و اخلاص ہے مریدین اپنے خلوص کی بنا پر مقرب ہو گئے پھر ڈاکو کی سچائی اور مخلص مریدوں کی دعاؤں نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اس کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ واصل الحق ہو گیا۔

تیسری بات فرمائی کہ اصل یہ ہے کہ شیخ مرید کو لیجاتا ہے اور فضل یہ ہے کہ مرید شیخ کو لیجاتا ہے مطلب یہ ہے کہ کبھی کسی مرید کے اخلاص اور للہیت کی وجہ سے شیخ کے درجات بھی بلند کر دیے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ شیخ شعرانی نے لکھا ہے کہ جس کو حسن سیاست سے حصہ نہ ملا ہو اس کی تبلیغ سے فائدہ کم ہوتا ہے اور نقصان زیادہ ہوتا ہے اور مولانا تھانوی نے لکھا ہے کہ تبلیغ کے لیے اہل بھی ہونا چاہیے اور محل بھی۔

فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ پہلے میں شیخ محمد تھانوی سے مسئلہ پوچھتا تھا اب جب سے مولوی رشید احمد صاحب سے تعلق ہوا ہے اُن سے مسئلہ پوچھتا ہوں۔

فرمایا کہ دین پر پورے طور پر عمل کرنا چاہیے اخلاق معاملات بھی دین کا اہم جز ہیں ان کے بغیر دین کامل نہیں ہوتا مگر ہم اس سلسلہ میں بہت کوتاہ ہیں اور ہم بھی اس آیت کے مصداق بن گئے ہیں۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ	کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب الٰہی کے بعض
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ	احکام پر اور بعض کو چھوڑ دیتے ہو۔

صفائی معاملات بھی دین کا اہم جز ہے مگر اس میں لوگ بڑی کوتاہی کرتے ہیں، حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ اگر کسی نے چھ رتی مال کسی کا ناجائز طریقہ سے لے لیا ہو تو

اس کی سات سو مقبول نمازیں لیکر جس کا مال لیا ہے اس کو دے دی جائیں گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ مفلس کون ہے صحابہ نے جواب دیا مفلس ہم لوگ اس کو سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ اور سامان معیشت نہ ہو آپ نے فرمایا کہ:۔

اِنَّ المفلس من اُمتی من یاتی یوم القیامۃ بصلوٰۃ وصیام وزکوٰۃ ویاتی قد شتم ھذا وقذف ھذا واکل مال ھذا وسفک دم ھذا وضرب ھذا فیعطی ھذا من حسناتہ وھذا من حسناتہ فان فنیت حسناتہ قبل ان یقضی ما علیہ اخذ من خطایاھم فطرحت علیہ ثم طرح فی النار (صحیح مسلم)

میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ سب ادا کر کے آیا ہوگا مگر اسی کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی کسی پر تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال ناجائز طریقہ سے کھا لیا ہوگا کسی کا خون بہایا ہوگا یا بلا وجہ مارا پیٹا ہوگا تو اسکی نیکیاں بقدر ظلم صاحب حق کو دے دی جائیں گی اگر صاحب حق کا حق ادا ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو اُن اہل حقوق کے گناہ لیکر اس کے اوپر لاد دیے جائیں گے اور پھر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

حضرت مولانا کے ایک خویش عبد الحسیب صاحب رہبر ہیں جو ریلوے گارڈ ہیں دینداری کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں، مولانا کی مجلس کا ایک تاثر انھوں نے "نذرانۂ عقیدت" کے عنوان سے پیش کیا ہے ناظرین الفرقان ان شاء اللہ محظوظ ہوں گے۔

غزل

ساقی تیری نظروں نے وہ جام پلائے ہیں
بہکے ہوئے دیوانے پھر ہوش میں آئے ہیں

قربت میں تیری ہم نے جو لطف اٹھائے ہیں
ابتک انھیں یادوں کو سینے سے لگائے ہیں

پاکیزہ تبسم کے موتی جو لٹائے ہیں
ہم نے وہ عقیدت سے دامن میں اٹھائے ہیں

کردار کی عظمت سے گفتار کے جادو سے
دشمن کو بھی وہ اپنا گرویدہ بنائے ہیں

جو دل پہ گزرتی ہے دنیا اسے کیا جانے
غم اپنا تبسم کے پردے میں چھپائے ہیں

ظلماتِ شبِ غم کا شکوہ وہ نہیں کرتے
جو دل میں محبت کے فانوس جلائے ہیں

ہم ان کی توجہ کے قابل تو نہیں رہبرؔ
نذرانۂ دل لیکن ہم شوق سے لائے ہیں

محمد منظور نعمانی

یادِ رفتگاں

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

سید محبوب رضوی (دیوبند)

مقامی روزنامہ "عزائم لکھنؤ" کے ۳۰ مارچ کے شمارہ میں شائع ہونے والے عبداللہ جاوید صاحب (دیوبند) کے مراسلہ سے یہ اطلاع پاکر کہ ہمارے "دارالعلوم دیوبند" کی ہر دلعزیز اور بڑی محبوب و باصلاحیت شخصیت سید محبوب رضوی کا اچانک انتقال ہوگیا طبعی طور پر بڑا رنج اور صدمہ ہوا۔

گزشتہ ۳۵۔۴۰ سال کی مدت میں جن ہزارہا ہزار افراد کا دارالعلوم دیوبند سے کسی طرح کا تعلق رہا ہے کم و بیش اُن سب ہی کا یہ تجربہ ہوگا کہ مرحوم سید محبوب رضوی، ذاتی شرافت، طبعی لطافت و نفاست، امتیازی صلاحیت، دیانت و امانت، دارالعلوم کی مفوضہ خدمت کی پوری ذمہ داری کے ساتھ ادائیگی اور حسن کارکردگی کے لحاظ سے حلقۂ دارالعلوم کی ممتاز و منفرد شخصیت تھے۔ اِن صفات کے ساتھ وہ خوب رو اور خوش پوش بھی تھے اور اللہ تعالیٰ نے وجاہت و دلکشی بھی بھرپور عطا فرمائی تھی ـــــ مرحوم کسی وجہ سے درسیات کی تکمیل نہیں کرسکے تھے اس لیے درس و تعلیم کے شعبہ سے ان کا تعلق نہیں رہا دارالعلوم کے بیسیوں دفاتر میں ایک بہت اہم دفتر ہے جس کو وہاں "محافظ خانہ" کہا جاتا ہے، دارالعلوم کی تاسیس و قیام سے لیکر (جس پر سو سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے) اس وقت تک کے سارے اہم قابل حفاظت کاغذات، ریکارڈ، فائلیں مسلیں وغیرہ سب اسی دفتر میں محفوظ رہتے ہیں ـــــ سید محبوب رضوی مرحوم اس دفتر خاص کے انچارج اور ذمہ دار تھے۔

راقم سطور کا قریباً ۳۵ سال سے بادر علمی دارالعلوم کے ساتھ اس کی مجلس شوریٰ و عاملہ کی

رکنیت کا بھی تعلق رہا ہے ـــــ بارہا ایسا ہوا کہ مجلس شوریٰ یا عاملہ کا جلسہ ہو رہا ہے، کسی معاملہ کو سمجھنے کے لیے ۱۰۔۲۰ سال یا ۴۰۔۵۰ سال پہلے کے کسی کاغذ کے دیکھنے کی ضرورت پڑی، میں اچانک اُن کے دفتر پہنچا (جو اتفاق سے دارالاہتمام اور دارالمشورہ کے بالکل متصل ہے) اور میں نے مطلوبہ کاغذ کے بارہ میں اُن کو بتلایا، مجھے یاد نہیں کہ وہ کاغذ نکال کر مجھے دینے میں اُن کو کبھی ۱۰ منٹ سے زیادہ کا وقت لگا ہو، معلوم ہوتا تھا کہ "محافظ خانہ" میں محفوظ ہزاروں فائلوں، مسلوں، اور اہم کاغذات میں سے ہر ایک کی جگہ اُن کے حافظہ میں ہے۔

سید محبوب رضوی بہت اچھے صاحب قلم اور مصنف بھی تھے۔ تاریخ نگاری ان کا خاص موضوع تھا، اس سلسلہ کی غالباً ان کی پہلی تصنیف "تاریخ دیوبند" تھی ـــــ دوسری قابل ذکر تصنیف "مکتوبات نبوی" ہے جو ان کی تاریخی تحقیق و کاوش کا اچھا نمونہ ہے۔ اور آخری سب سے اہم تالیف "تاریخ دارالعلوم" ہے، جو دو جلدوں میں دارالعلوم ہی کی طرف سے کچھ ہی پہلے شائع ہوئی ہے ـــــ اس کی تصنیف و تالیف کا کام دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے اُن کے سپرد کیا تھا ـــــ

مرحوم کی عمر ساٹھ کے قریب ہی رہی ہوگی، عمر کے لحاظ سے اُن کی عام صحت بظاہر بہت اچھی رہتی تھی، کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی دارالعلوم اور اس دنیا ہی کو خیرباد کہدیں گے۔

دفتر دارالعلوم کی طرف سے اُن کے سانحۂ انتقال کے بارہ میں جو خبرنامہ جاری کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ مرحوم انتقال کے دن (۲۵ مارچ) ہشاش بشاش تھے، صبح کا وقت حسب معمول دارالعلوم میں گزارا۔ ظہر کے وقت اپنے مکان سے دارالعلوم آتے ہوئے چھتہ کی مسجد کے قریب شدید قلبی دورہ پڑا اور بس چند ہی منٹ میں روح نے جسم سے مفارقت اختیار کر لی۔

معلوم ہوا ہے کہ مرحوم لاولد تھے، قریبی پسماندگان میں عمزدہ اور سوگوار بیوہ ہے، اللہ تعالیٰ جو سب کا والی وارث ہے اُن کو صبر و سکون عطا فرمائے اور مرحوم کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔

شاہ مسعود احمد (بہٹ۔ سہارنپور)

ناظرین میں سے جو حضرات مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ سے

کچھ تعلق و واقفیت رکھتے ہوں گے، غالباً وہ شاہ مسعود صاحب سے ناواقف نہ ہوں گے۔ اُن کے والد ماجد شاہ زاہد حسن مرحوم (جو ضلع سہارنپور کے گویا ایک رئیس اعظم تھے) حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے شیخ و مرشد حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کے خاص الخاص نیازمند اور گویا عاشق صادق تھے۔ پھر اسی نسبت سے ان کے جانشین حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ساتھ اُن کا تعلق محبانہ و نیازمندانہ رہا ——— شاہ زاہد حسن صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے صاحبزادے شاہ مسعود احمد صاحب نے جو اُس وقت نوعمر تھے حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو صرف شیخ و مرشد ہی نہیں بلکہ اپنے مرحوم والد ماجد کی جگہ اپنا مربی و سرپرست بھی بنالیا اور حضرت نے بھی اُن کے ساتھ وہی رویہ رکھا جو اولاد کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔

بہٹ اور رائے پور کے درمیان قریباً ۴-۵ میل کا فاصلہ ہے، حضرت کا مستقل مستقر تو رائے پور کی خانقاہ تھی، لیکن بہٹ میں شاہ مسعود صاحب کے مکان کو حضرت کا گویا دوسرا مستقر ہونے کا شرف حاصل تھا، بسا اوقات کئی کئی دن حضرت بہٹ میں شاہ مسعود صاحب کے مکان پر قیام فرماتے اور ان دنوں میں وہ مکان ہی "رائے پور کی خانقاہ" ہوتا۔ بار بار اس عاجز نے بھی ایسے دنوں میں حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ وہاں قیام کیا ہے۔

اور حضرت کے آخری دور علالت میں تو طویل مدت تک حضرت کا قیام شاہ مسعود صاحب کی سہارنپور والی کوٹھی (بہٹ ہاؤس) میں رہا اور اس پوری مدت میں یہ کوٹھی رائے پور کی خانقاہ بنی رہی ——— شاہ مسعود صاحب پر حضرت کی خاص نظر عنایت تھی بظاہر اسی کی برکت تھی کہ موصوف رئیس ابن رئیس ہونے کے باوجود ہمیشہ بظاہر "مولانا" اور خانقاہی درویشوں ہی کی طرح رہے ——— وہ حافظ قرآن بھی تھے اور بہت ہی اچھا پڑھتے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ کے آخری دور علالت میں جب قیام سہارنپور بہٹ ہاؤس میں تھا اور ایک سال وہیں رمضان مبارک آیا تو تراویح میں قرآن مجید شاہ مسعود صاحب ہی نے سنایا۔ راقم سطور نے اتنا اچھا قرآن مجید ساری عمر میں غالباً ۳-۴ دفعہ ہی سنا ہوگا۔ بڑا رشک آتا تھا تراویح میں اُن کے قرآن مجید پڑھنے پر۔

غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، ہم بندے جو کچھ دیکھتے ہیں اسی کی بنا پر کہا

جاسکتا ہے کہ وہ اُن خوش نصیب بندوں میں سے تھے جنکو دولتِ دین بھی نصیب فرمائی جاتی ہے اور دنیا بھی ——— ما احسن الدین والدنیا لو اجتمعا ——— صحت بھی بظاہر بڑی اچھی تھی۔ لیکن قضاء و قدر کا فیصلہ وہ ہو چکا تھا جو سامنے آیا۔ ۲۶ فروری کو شاہ صاحب پر قلب کا دورہ پڑا اور ایک ہی دن میں یکے بعد دیگرے مرض کے تین حملے ہوئے اور اسی دن جاں بحق ہو گئے ——— رہے نام اللہ کا ——— رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین

شاہ مسعود صاحب کے پسماندگان میں صاحبزادے اور صاحبزادیاں بھی ہیں اور غمزدہ اہلیہ بھی جو لکھنؤ کے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے عطر کے کارخانہ" اصغر علی محمد علی" کے سابق مالک و مورث الحاج اصطفیٰ خاں صاحب مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر و سکون عطا فرمائے اور مرحوم شاہ صاحب کی حسنات کا وارث بنائے۔

عبدالکریم عرف بچو بھائی (بمبئی)

بمبئی میں ہمارے اکابر سے تلمی تعلق رکھنے والے اور اس عاجز سے بھی لوجہ اللہ محبت کرنے والے جو مخلص احباب ہیں اُن میں ایک یہ بچو بھائی بھی تھے۔ مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت کا تعلق تھا۔ حضرت کی حیات میں رائے پور کی خانقاہ میں کبھی کبھی حاضر ہوتے تھے۔ بندگان خدا کی خدمت و راحت رسانی کا بڑا جذبہ اور خاص سلیقہ تھا، اسی مقصد کے لیے محکمۂ ریلوے کے افسروں اور جہاز کے عملہ والوں سے تعلقات رکھتے تھے اور انھیں خوش رکھنے کے لیے اپنی جیب سے خوب خرچ کرتے تھے" تاکہ ان تعلقات کے ذریعہ اللہ کے بندوں کو کچھ آرام دلوا سکیں اور ان کی مشکلات رفع کرا سکیں ——— یہی اُن کا خاص وظیفہ اور مشن تھا ——— راقم سطور کو بارہا اس کا ذاتی تجربہ ہوا ہے۔

اُن کے بڑے بھائی حاجی محمد نور صاحب مرحوم تھے جن کا ابھی سال دو سال پہلے انتقال ہوا ہے، اب سے قریباً صرف ۵۰-۶۰ سال پہلے جب بمبئی کا حال یہ تھا کہ قبر پرستی اور لیا پرستی اور بدعات و خرافات کی مخالفت کرنے والا ہر شخص گردن زدنی "وہابی" سمجھا

جاتا تھا تو اس وقت گنتی کے جو چند حضرات صحیح العقیدہ تھے اُن میں ایک بھائی حاجی محمد نور بھی تھے، بجو بھائی انہی کے تربیت یافتہ تھے — اگرچہ عمر بچاس سے اوپر ہی رہی ہوگی لیکن دیکھنے میں جوان رعنا معلوم ہوتے تھے۔ جامع مسجد کے بالکل قریب کٹیلری کی دوکان تھی اور ہے جو "پروین" کے نام سے معروف ہے۔ اب سے صرف ۲-۳ ہفتے پہلے بھائی حاجی محمد یعقوب صاحب نے دعا کی فرمائش کے ساتھ اطلاع دی کہ بجو بھائی کچھ علیل ہیں اور ڈاکٹروں نے کینسر کا شبہ ظاہر کیا ہے — پھر چند ہی روز کے بعد، حاجی محمد یعقوب صاحب ہی کا خط ملا کہ آج بجو بھائی کا انتقال ہو گیا — اللہ تعالیٰ مرحوم کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے — پسماندگان میں بیٹے بیٹیاں بھی ہیں اور بیوہ اہلیہ بھی — اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر و سکون عطا فرمائے اور ان پر فضل و کرم کا سایہ رکھے۔

ان صفحات میں جن مرحومین کے حادثہ انتقال کا ذکر کیا گیا یہ تینوں حضرات راقم سطور کے عزیز دوست اور مختلف پہلوؤں سے میرے محسن بھی تھے اللہ تعالیٰ ان کے حق کے مطابق ان کے واسطے مغفرت و رحمت کی دعا کا اہتمام اس عاجز کو نصیب فرمائے — ناظرین کرام سے بھی استدعا ہے کسی بھی مومن بندہ کے لیے دعائے خیر اللہ کی عبادت اور اس بندہ کے ساتھ سب سے بڑی نیکی ہے۔ واللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھیے قاعدہ ۸)

مقام اشاعت ... ... لکھنؤ	پروپرائٹر کا نام ... ... محمد منظور نعمانی
وقفہ اشاعت ... ... ماہانہ	قومیت ... ... ہندوستانی
ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر کا نام ... محمد منظور نعمانی	پتہ ... ... ۳۱ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ ۱

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح و درست ہیں۔

(دستخط) محمد منظور نعمانی

چندہ سالانہ
ہندوستان سے ۱۵/-
پاکستان سے ۳۰/-
بنگلادیش سے ۱۶/-
فی شمارہ ۱/۵۰

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے چندہ سالانہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح یہ ہے
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

جلد (۴۷) بابت مئی ۱۹۷۹ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ شمارہ (۵)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۵ تاریخ تک آجانا چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان کے خریدار حضرات
مبلغ پچیس روپے ہندوستانی سکہ میں بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں تیس ۳۰ روپے: ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ اسٹریلین بلڈنگس لاہور کو بھیج دیں۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

ذبیحہ گاؤ کے مسئلہ پر ونوبا بھاوے جی کا برت اور وزیر اعظم مرارجی بھائی ڈیسائی :-

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو جانے کے بعد ہم ہندوستانی مسلمانوں کے حصے میں آزادی کے جو خاص تحفے آئے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اکثر ریاستی حکومتوں نے (بعض نے بہت جلدی اور بعض نے چند برسوں کے بعد) دستور میں دیے ہوئے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے گائے کے ذبیحہ پر مطلق پابندی عاید کر دی جو مسلمانوں کے اوسط طبقہ کی خاص مرغوب اور قوت بخش غذا تھی۔ مسلمانوں نے اپنے کو بے بس محسوس کرتے ہوئے اور فتنہ و فساد اور اس کے اثرات سے بچنے کے لیے صبر کے ساتھ خاموشی کا فیصلہ کر لیا ـــــ لیکن کیرالا اور مغربی بنگال کی حکومتوں نے ابھی تک یہ پابندی نہیں لگائی تھی ـــــ پچھلے دنوں اچاریہ ونوبا بھاوے جی نے مطالبہ کیا کہ ان دونوں ریاستوں میں بھی یہ پابندی اسی طرح لگائی جائے جس طرح دوسری ریاستوں میں لگائی گئی ہے، اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو میں مرن برت رکھوں گا ـــــ یہ دونوں ریاستیں اپنے خاص حالات کی وجہ سے فوری طور پر یہ پابندی عائد کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکیں، انہوں نے جو دلائل اس کے خلاف دیے وہ ہر معقول آدمی کو مطمئن کرنے کے لیے بالکل کافی تھے ـــــ

لیکن ونوبا جی نے نہیں مانا اور اپنے اعلان کے مطابق ۲۲ر اپریل سے مرن برت شروع کر دیا جو اُن کی ضعیف العمری اور شخصیت کے لحاظ سے ملک کے نظم ونسق اور امن وامان کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار تھی۔

آخر کار وزیر اعظم مرارجی بھائی ڈیسائی نے ایک حد تک ذمہ داری اور اطمینان دلایا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ آئین میں ترمیم کر کے گائے کے ذبیحہ پر پورے ملک میں مکمل پابندی عائد کر دی جائے گی تو پانچویں دن ۲۶ر اپریل کو ونوبا جی نے اپنا برت توڑا ـــــــ اب بظاہر یہی ہوگا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ آئین میں ترمیم کر کے ونوبا جی کی ضد پوری کر دی جائے گی۔

اس معاملہ کا ایک نہایت افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ارباب حکومت اور پیشہ ور سیاستکار ہی نہیں، آچاریہ ونوبا بھاوے جیسے روحانیت و درویشی کے مدعیوں میں بھی اتنی سچائی اور اخلاقی جرأت نہیں ہے کہ صفائی سے کہیں کہ چونکہ یہ ملک ہندو اکثریت کا ہے اور ہندوؤں کے نزدیک گائے ایک مقدس مخلوق یا دیوتا ہے اس لیے اس کے ذبیحہ پر پابندی لگائی جا رہی ہے، بلکہ اس کے لیے دوسرے عنوانات اور حیلے بہانے استعمال کرتے ہیں جن سے غالباً وہ خود اپنے کو بھی فریب نہیں دے سکتے ـــــــ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ میں اکثریت کی ذہنیت سے قطعی مایوس ہو کر پہلے ہی صبر وخاموشی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اور اس وقت کے مسئلہ سے غیر متعلق ہیں۔

اسی مسئلہ (ذبیحہ گاؤ) سے متعلق مرارجی بھائی ڈیسائی کا ایک واقعہ اُس زمانہ کا راقم سطور کے علم میں ہے جب وہ اب سے قریباً ۲۷ سال پہلے "عظیم صوبہ بمبئی" کے وزیر اعلیٰ تھے (اُس وقت گجرات بھی صوبہ بمبئی میں شامل تھا اور وہ تقسیم نہیں ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں گجرات اور مہاراشٹر دو ریاستیں بنگئیں)، اُس وقت اس مسئلہ میں ان کا موقف وہی تھا جو آج مغربی بنگال اور کیرالہ کے وزرائے اعلیٰ کا ہے، بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔

راقم سطور کا اس زمانہ میں بار بار بمبئی جانا ہوتا تھا، وہاں کے دوستوں سے سنتا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ خاصکر تعلیمی مسئلہ میں مرارجی کی حکومت کا رویہ بڑا فرا خدلانہ ہے، مسلمانوں کے جن مکتبوں

مدرسوں میں صرف اردو زبان پڑھائی جاتی ہے اُن کی بھی حکومت پوری سرپرستی کرتی ہے۔ اس کے برعکس چونکہ ہماری ریاست یوپی میں انتہائی بے دردی کے ساتھ اُردو کا گلا گھونٹا جا رہا تھا اور ایک خاص نظام تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسل کو ایک طرح سے ہندوانے کی کوشش کی جا رہی تھی اس لیے بمبئی کی حکومت کا یہ حال معلوم کر کے بڑی خوشی ہوتی تھی، یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ فرقہ پرست ہندوؤں کے مطالبہ اور دباؤ کے باوجود وہاں کی حکومت نے گائے کی نسل کے ذبیحہ پر وہ پابندی عائد نہیں کی ہے جو یوپی وغیرہ دوسری بہت سی ریاستوں میں لگ چکی تھی ——— میں نے دوستوں کی ایک نجی مجلس میں اس صورت حال پر اپنی قلبی مسرت اور تشکر و احسان مندی کے جذبات کا اظہار کیا اور بمبئی کے دوستوں سے کہا کہ ہماری ریاست کی حکومت کے مقابلہ میں آپ کے ہاں کی حکومت آپ کے حق میں خدا کی بڑی رحمت ہے۔ اس کی قدر کیجیے اور خدا کا شکر ادا کیجیے!

میرے دوست اور میزبان سیٹھ احمد غریب مرحوم نے (جن کا مرارجی سے بہت اچھا تعلق تھا) بعد میں مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ مرارجی سے ملاقات کریں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اُن سے وقت لے لوں؟ ——— اگرچہ میں اپنی خاص افتاد طبع کی وجہ سے ارباب حکومت کی ملاقاتوں سے اکثر گریز کرتا ہوں لیکن اُس دن میں نے اپنے کو آمادہ کر لیا۔ ———

احمد غریب صاحب نے ٹیلی فون ہی پر مرارجی سے بات کی اور انھوں نے اگلی صبح ہی ملاقات کے لیے وقت دیدیا۔ ——— غالباً نماز فجر کے متصلاً بعد ہی بھائی احمد غریب مرحوم مجھے اپنی کار سے لیکر مرارجی کی قیام گاہ پر پہنچے۔ دیکھا کہ وہ اپنی میز پر فائلیں کھولے کام کر رہے ہیں ——— بہت اخلاق سے پیش آئے، احمد غریب صاحب نے میرا مختصر تعارف کرایا ——— میں نے مختصر تمہید کے بعد ان کی حکومت کے بارہ میں اپنے احساسات و تاثرات کا اظہار کیا اور جو کچھ اللہ نے کہنے کی توفیق دی کہا ———

اس صحبت میں خود مرارجی نے یہ واقعہ سنایا کہ یہاں کے فرقہ پرست عنصر نے گائے کی نسل کے ذبیحہ پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا اور دوسری ریاستوں میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کا حوالہ دیا، ——— میں نے کہہ دیا کہ جب تک میں حکومت کا ذمہ دار ہوں ایسا نہیں ہوگا ——— وہ لوگ دہلی جواہرلال جی کے پاس پہنچ گئے، انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو ریاستوں کا مسئلہ ہے تم مرارجی بھائی سے

بات کرو۔ — وہ پھر میرے پاس آئے اور کہا کہ پنڈت جی تو راضی ہیں اور پھر وہی مطالبہ کیا، میں نے کہا کہ جب تک میں ہوں اس وقت تک تو ایسا نہیں ہوگا — پھر جب میں دہلی گیا تو میں نے پنڈت جی سے کہا کہ ان مسئلوں میں اگر آپ ڈھیلے پڑیں گے تو ہم لوگوں کو بہت مشکل پیش آئے گی — (مجھے مرارجی کی یہ گفتگو اچھی طرح یاد ہے) اب وہی مرارجی بھائی ہیں اور ان کو پورے ملک میں گائے کے ذبیحہ پر مکمل پابندی لگانے کے لیے پارلیمنٹ کے ذریعہ آئین میں ترمیم کرانے کی فکر اور کوشش کرنی ہے — ع بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

مسٹر بھٹو کا حادثہ اور ہم مسلمانوں کی مزاجی کیفیت :-

یہ شمارہ جس وقت ناظرین کرام تک پہنچے گا، اس وقت تک پاکستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کے واقعہ پر پورا ایک مہینہ گزر چکا ہوگا — جن لوگوں کو اس مقدمہ کے بارے میں جس کے نتیجہ میں اُن کو سزائے موت دی گئی، کچھ بھی معلوم ہے وہ اتنا ضرور جانتے ہوں گے کہ یہ ایک قتل کا مقدمہ تھا — اب سے کئی سال پہلے جب مسٹر بھٹو پاکستان کے حکمراں اور فرمانروا تھے، اُن کے ایک قدیم رفیق سیاست و حکومت مسٹر محمد علی قصوری سے اُن کو سخت اختلاف ہوگیا — ایک دن یہ محمد علی قصوری اپنے والد (محمد احمد قصوری) کے ساتھ کار میں جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک جگہ اچانک اُن پر مشین گن سے گولیاں چلیں، تقدیر الٰہی سے وہ خود بچ گئے لیکن اُن کے والد صاحب گولیوں کا نشانہ بن گئے اور ختم ہوگئے — مسٹر محمد علی قصوری نے پولیس اسٹیشن پر اس واردات کی جو رپورٹ درج کرائی اُس میں چند آدمیوں کو ملزم نامزد کیا اور قتل کا اصل ذمہ دار مسٹر بھٹو کو قرار دیا — جبتک وہ برسر اقتدار رہے یہ کیس آگے نہیں بڑھ سکا لیکن جب ۷۷ء میں الکشن میں دھاندلیوں کی بنیاد پر مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی کے علاوہ ملک کی تقریباً سب ہی پارٹیوں نے متحدہ محاذ بنا کر اُن کے خلاف سخت ہنگامہ خیز تحریک چلائی اور ملک زیرو زبر ہونے لگا اور صورت حال انتہائی خطرناک ہوگئی تو پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی، مسٹر بھٹو کی حکومت ختم ہوگئی اور مارشل لا نافذ ہوگیا — اس کے بعد مسٹر محمد علی قصوری کے والد کے قتل کا کیس جو اب تک گویا دبا پڑا تھا، ابھرنے لگا اور عدالت کی سطح پر آگیا،

پہلے لاہور ہائی کورٹ میں کئی مہینے تک اس کی سماعت ہوئی۔ بالآخر ہائی کورٹ کے ججوں نے بالاتفاق مسٹر بھٹو اور اُن کے علاوہ اُن چار ملزموں کو بھی جنھوں نے عدالت میں قتل کا اقرار کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم نے مسٹر بھٹو کے حکم اور ان کے دباؤ کی وجہ سے ایسا کیا تھا (الغرض پانچوں کو) قتل کا مجرم قرار دے کر اُن کے لیے سزائے موت کا فیصلہ کر دیا۔

ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف پاکستان سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی جس کی کارروائی طویل مدت تک چلی آخر میں سپریم کورٹ نے بھی ہائی کورٹ کے فیصلہ کی توثیق کر دی ـــــ اس مرحلہ پر مختلف ملکوں کے سربراہوں اور بڑے بڑے لوگوں نے جنرل ضیاء الحق سے اپیل کی کہ مسٹر بھٹو کو سزائے موت نہ دی جائے اور وہ اپنے خصوصی اختیار کو استعمال کر کے اُن کو معافی دیدیں ـــــ جنرل موصوف نے یہ موقف اختیار کیا کہ عدلیہ کے اس قسم کے کسی فیصلہ میں نہ ابتک میں نے مداخلت کی ہے نہ اب کروں گا ـــــ بالآخر ۴ / ۵ اپریل کی درمیانی رات میں عدالت عالیہ کے فیصلہ کے مطابق اُن کو سزائے موت دیدی گئی۔

بلاشبہ اس مسئلہ میں اس کی پوری گنجائش ہے کہ ایک شخص اپنی اطلاعات و معلومات اور اپنی فہم و فکر کے مطابق مسٹر بھٹو کے بارہ میں عدالت کے فیصلے اور جنرل ضیاء الحق کے موقف کو غلط سمجھے اور اس کی مذمت کرے اور دوسرا آدمی اسی طرح اس کو صحیح سمجھے اور اس کی تائید و حمایت کرے راقم سطور حقائق و واقعات سے اتنا واقف نہیں ہے کہ اس بارہ میں قطعیت کے ساتھ کوئی رائے قائم کر سکے ـــــ البتہ الفرقان کے دفتر میں پاکستان کے مختلف مکاتیب فکر اور مختلف جماعتوں کے جو رسائل و اخبارات آتے ہیں اُن کے مطالعہ سے اور حال ہی میں آنے والے وہاں کے بعض قابل اعتماد اشخاص سے وہاں کا جو حال معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جو جماعتیں اور جو حلقے اور عناصر وہاں دین کے علمبردار اور دین کے نام پر وہاں ملکی سیاست میں حصہ لیتے ہیں ـــــ جن میں سب سے نمایاں مولانا مودودی کی جماعت اسلامی، اور مولانا مفتی محمود صاحب کی قیادت والی جمعیۃ العلماء ہیں ـــــ ان سب ہی کا یہ موقف ہے کہ بھٹو اسی انجام کے مستحق تھے۔ اور دوسرے مختلف حلقے اور عناصر خاص کر وہ جن کو آجکل کی سیاسی زبان میں "بائیں بازو والے" کہا جاتا ہے اُن کا

موقف اس کے برعکس ہے، اور اُن کی طرف سے پاکستان کے متعدد بڑے شہروں میں احتجاجی مظاہرے اور ہنگامے بھی ہوئے، جن میں توڑ پھوڑ بھی ہوئی ـــــ جو قطعاً غیر متوقع نہیں تھی۔

لیکن ہمارے ملک ہندوستان میں بعض مقامات پر خاصکر کشمیر میں مسٹر بھٹو کی سزائے موت ہی کو بنیاد بنا کر (یا بہانہ بنا کر) جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ اُن سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں ہی کے کسی عنصر نے جو کچھ کیا جس کی لرزہ خیز اور شرمناک تفصیلات اخبارات میں آچکی ہیں (اور جہاں تک معلوم ہے ابھی تک حکومت کشمیر کی طرف سے بھی اُن کی تردید نہیں کی گئی ہے۔) وہ اس بات کی علامت ہیں کہ ہم خود ہی اپنے سب سے بڑے دشمن ہیں اور انسانیت کے مقام سے گر کر درندوں کی سطح پر آگئے ہیں۔

اس واقعہ نے ۱۹۴۶ء کا وہ دور یاد دلایا جب تحریکِ پاکستان اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور دین سے آزاد مسلمانوں کے بعض پیشہ ور لیڈروں اور ناخدا ترس اخبار نویسوں نے مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ کو ایسا پاگل بنا دیا تھا کہ وہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے رفقا جیسے دین وملت کے لیے مرمٹنے والوں کو گردن زدنی سمجھتے تھے اور اُن کو مغلظ گالیاں دینے اور اُن پر پتھر اور جوتے پھینکنے کو "جہاد" سمجھتے تھے اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگا کر یہ جہاد کرتے تھے (اور یہ بالعموم وہ لوگ تھے جن کا عملی زندگی میں اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا) راقم سطور نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، اور روح وقلب پر جو کچھ گزرتی تھی اس کا تذکرہ "الفرقان" کے صفحات میں بھی کیا جاتا تھا، جو اس کی فائلوں میں محفوظ ہے۔

الفرقان پڑھنے والوں میں غالباً کوئی صاحب بھی ایسے نہ ہوں گے جو اس بات سے واقف نہ ہوں کہ راقم سطور کو "جماعت اسلامی" کی بعض باتوں سے سخت اختلاف ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسٹر بھٹو کی سزائے موت کو بہانہ بنا کر، خاصکر کشمیر میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک امتی اور ایک انسان ہونے کی حیثیت سے میں اس کے بارے میں اپنے اس احساس وتاثر کا اظہار واعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ شقاوت وناخدا ترسی کا بدترین مظاہرہ تھا ـــــ خدا کرے کہ اس کے بعد زندگی میں کبھی کوئی اور ایسا واقعہ سننے میں نہ آئے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے بعض مسلم اخبارات نے مسٹر بھٹو کے حادثہ کو ایسا رنگ دیا اور اس طرح

ماتم و نوحہ کیا کہ گویا کسی ابن زیاد اور کسی شمر ذی الجوشن نے اس دور کے کسی حسین ابن علی کو شہید کر دیا ہے، اور ایک بڑے اور مشہور غیر مسلم صحافی نے تو صراحت کے ساتھ یہی لکھا ہے ـــــ پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بعض وہ لوگ جن کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مسٹر بھٹو کے بارہ میں سخت مخالفانہ رائے ظاہر کیا کرتے تھے، اُن کے حادثہ کی اطلاع کے بعد وہ بھی اُن کی شان میں قصیدہ خوانی فرمانے لگے ـــــ اس پر اب سے قریباً ۴۰-۴۵ سال پہلے کا ایک لطیفہ یاد آگیا ـــــ کسی ریلوے اسٹیشن پر (غالباً مراد آباد یا بریلی کے اسٹیشن پر) مشہور خطیب ملت سید عطاء اللہ شاہ بخاری (علیہ الرحمہ) سے اچانک ملاقات ہوگئی، سلام و مصافحہ اور مزاج پرسی کے بعد بڑی سنجیدگی سے فرمایا ـــــ "بھئی مولوی منظور صاحب! میں چار بزرگوں کا عرس کر رہا ہوں اس میں آپ کی شرکت ضروری ہے، ایک حضرت ابن زیاد، دوسرے حضرت یزید، تیسرے حضرت شمر ذی الجوشن اور چوتھے حضرت حجاج بن یوسف (اور مسلمانوں کی ایک دینی سیاسی جماعت کا نام لیکر کہا کہ) یہ عرس فلاں جماعت کے دفتر میں ہوگا ـــــ

میرا ذہن فوراً منتقل ہو گیا کہ شاہ صاحب کیا فرمانا چاہتے ہیں ـــــ واقعہ یہ تھا کہ چند ہی روز پہلے ملک کے ایک بہت بڑے شخص کا انتقال ہوا تھا جو حکومت برطانیہ کے بڑے وفادار اور بڑے معتمد تھے بہت اعلیٰ عہدہ پر تھے اُن کو "سر" کا خطاب بھی ملا ہوا تھا، وہ ان لوگوں میں تھے جنکی یہ رائے تھی (اور غالباً پورے خلوص کے ساتھ رہی ہو گی) کہ ہندوستان پر انگریزوں ہی کی حکومت رہنی چاہیے، مسلمانوں کے حق میں وہ اس کو بہتر سمجھتے تھے، بالفاظ دیگر ہندو اکثریت کے اقتدار کے مقابلہ میں وہ مسلمانوں کے حق میں انگریزوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے ـــــ ایسے لوگوں کے بارہ میں "جمعیۃ العلماء" اور "مجلس احرار" جیسے برطانیہ دشمن حلقوں کی اُس زمانہ میں جو رائے ہونی چاہیے تھی وہی رائے اُن مرحوم سر کے بارہ میں تھی ـــــ لیکن اُن کے انتقال کے بعد مسلمانوں کی ایک آزادی کی علمبردار جماعت کے اخبار میں جو تعزیتی نوٹ لکھا گیا تھا اُس میں مرحوم کی بڑی تعریفیں کی گئی تھیں اور بڑی خدمات گنائی گئیں ـــــ بہرحال میرا ذہن منتقل ہو گیا کہ شاہ صاحب کو اس نوٹ پر ناگواری ہے ـــــ چنانچہ فرمایا کہ "تم نے فلاں تاریخ کا فلاں اخبار دیکھا تھا؟" میں نے عرض کیا جی ہاں دیکھا تھا ـــــ فرمایا ہم مسلمانوں کا عجیب حال ہے۔ زندگی میں جس کو بے ایمان سمجھتے اور کہتے رہیں مرنے کے بعد وہ اگر "علیہ السلام" نہیں تو "رضی اللہ عنہ" تو ہو ہی جاتا ہے ـــــ

یہ تھا تو شاہ صاحب کا ایک لطیفہ، مگر بعض اوقات یہی دیکھنے میں آتا ہے۔

درس قرآن مجید

محمد منظور نعمانی

- دوزخ میں مجرمین کی عبرتناک کسمپرسی
- فرشتے بھی اُن کے حق میں کسی دعا و سفارش کے لیے آمادہ نہ ہوں گے
- اللہ اپنے رسولوں اور مومنین صادقین کی اس دنیا میں بھی مدد فرماتا ہے اور آخرت میں بھی، یہ اُس کا ازلی قانون اور محکم وعدہ ہے ——

(اس پر شبہہ اور اُس کا جواب)

حمد و صلوٰۃ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد

وَإِذْ يَتَحَاجُّونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِنَ النَّارِ ۝ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُلٌّ فِيهَا إِنَّ اللَّهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِنَ الْعَذَابِ ۝ قَالُوا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۚ قَالُوا فَادْعُوا ۗ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝ إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ

مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ۝ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (سورۃ المومن آیات ۴۷-۵۵)

اور جب وہ دوزخ میں آپس میں جھگڑیں گے تو کمزور اور زبردست لوگ اُن لوگوں سے جو بڑے بنے تھے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع اور پیرو تھے تو کیا تم دوزخ کے عذاب کا کوئی حصہ ہم سے ہٹا سکو گے؟ وہ کہیں گے آج ہم سب اسی دوزخ میں ہیں (جب ہم اپنے ہی کو اس آگ سے نہیں بچا سکتے تو تم کو کیا بچا سکیں گے) اللہ نے سب بندوں کے درمیان (جزا سزا کا) فیصلہ کر دیا ہے (اور اس کا فیصلہ اٹل ہے)

اور جو (مجرمین) دوزخ میں پڑے ہوں گے وہ خزنۂ جہنم (یعنی دوزخ کے محافظ اور منتظم فرشتوں) سے کہیں گے کہ آپ ہی اپنے رب سے دعا کریں کہ کسی دن ہمارا عذاب ہلکا کر دیا جائے۔ وہ (فرشتے جواب میں) کہیں گے کیا تمہارے رسول تمہارے پاس کھلی نشانیاں لیکر نہیں آئے تھے؟ ——— وہ کہیں گے کہ ہاں! (آئے تھے!) وہ (فرشتے) کہیں گے تو اب تم ہی دعا کرو۔ اور نہ ماننے والوں کی دعا تو بس بے کار ہی جائے گی۔ ———

اور ہم بے شک مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی اس زندگی میں بھی اور اُس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ پیش ہوں گے۔ جس دن مجرموں کو ان کی معذرت خواہی کچھ بھی نفع نہ دے گی، اور ان کے لیے خدا کی لعنت ہو گی اور ان کے واسطے بدترین گھر ہو گا (دوزخ)

اور ہم نے موسیٰ کو عطا کی (کتاب) ہدایت اور وارث بنایا بنی اسرائیل کو اس کتاب کا۔ اہل دانش کی رہنمائی اور نصیحت کے لیے ——— بس (اے پیغمبر) آپ صبر و ثابت قدمی کا رویہ اختیار کیجیے، اللہ کا وعدہ قطعاً برحق ہے، اور اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے رہیے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح شام و صبح کرتے رہیے۔

(سورۂ مومن۔ آیت ۴۷ تا ۵۵)

(تفسیر و تشریح) آپ حضرات کو یاد ہوگا، اوپر کی آیتوں میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ فرعون کے گھرانے کے ایک مرد مومن نے اپنی قوم کو اور خاصکر قوم کے بڑوں کو بڑی دلسوزی سے نصیحت کی اور حضرت موسیٰ کی دعوتِ حق کو قبول کرنے اور اس کی مخالفت نہ کرنے کا بڑے موثر اور خیر خواہانہ انداز میں مشورہ دیا، اور جب اُس مرد مومن نے محسوس کیا کہ یہ لوگ حضرت موسیٰ کی دعوت حق کو قبول نہ کرنے اور اس کی مخالفت پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور گویا ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے تو اتمام حجت کے بعد اُس مرد مومن نے یہ کہا تھا "فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ" ——— جس کا مطلب یہ تھا کہ آج تم میری بات ماننے کو تیار نہیں ہو لیکن ایک وقت آئے گا جب تمہارے اس کفر و انکار کا نتیجہ تمہارے سامنے آئے گا اس وقت تم حسرت و افسوس سے یاد کرو گے کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا ——— اور میں اب اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں ——— سب بندے اور اُن کے اعمال و کردار اسی کی نگاہ کے سامنے ہیں۔

اس کے بعد والی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ فرعون اور فرعونیوں نے غالباً یہ محسوس کر کے کہ اس شخص کی اس طرح کی باتوں سے قوم متاثر ہو کر موسیٰ کی دعوت کو قبول کرنے لگی، اُس مرد مومن کے خلاف کوئی خطرناک سازش کی، ظاہر یہی ہے کہ اُن کا خاتمہ کر دینے کا کوئی منصوبہ بنایا ——— لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مومن و مخلص بندے کی حفاظت فرمائی اور اُن کے منصوبہ کو فیل کر دیا، اور فرعون اور اس کے سارے لاؤ لشکر پر خداوندی عذاب نازل ہو گیا اور وہ سب غرقاب کر دیے گئے۔

اس کے بعد فرمایا گیا تھا کہ قیامت تک کے لیے اُن پر ایک خاص عذاب یہ مسلط کر دیا گیا ہے کہ دوزخ کا وہ خاص عذاب گھر جہاں اپنے کفر و سرکشی کی اصل سزا بھگتنے کے لیے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے ڈالے جائیں گے، وہ ہر صبح شام اُن کے سامنے کیا جاتا ہے اور قیامت قائم ہونے پر وہ اسی میں جھونک دیے جائیں گے ———

اس کے بعد یہ آیتیں ہیں جن کی میں نے اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کی ارشاد فرمایا گیا ہے "وَإِذْ يَتَحَاجُّونَ فِي النَّارِ ...... إِنَّ اللَّهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ" ———

مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی اور حساب کتاب کے بعد وہ کفار و مشرکین جنھوں نے اللہ کے پیغمبروں کی نہیں مانی اور اُن کی دعوتِ حق کی مخالفت ہی پر جمے رہے، خداوندی قانون اور فیصلہ کے مطابق دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے، ان میں وہ بھی ہوں گے جو قوم کے لیڈر اور چودھری تھے اور وہ بھی ہوں گے جو ان کے جھنڈے کے نیچے تھے اور بس پیروکار تھے، تو یہ دوسرے تیسرے درجہ والے متبعین اپنے بڑوں اور چودھریوں سے کہیں گے کہ ہم تو آپ کے پیروکار تھے تو کیا آپ لوگ ہماری یہ مدد کر سکتے ہیں کہ ہمارا عذاب کچھ کم کر دیں؟ —— وہ بڑے اور چودھری لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی دوزخ کے اس عذاب میں مبتلا ہیں، اللہ نے سب بندوں کا اُن کے اعمال و احوال اور کردار کے مطابق فیصلہ کر دیا ہے، ہم نے تم نے جو بویا تھا وہی ہم سب کو کاٹنا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے ہی اوپر سے عذاب نہیں ہٹا سکتے تو تم سے کیا ہٹا سکیں گے —— آگے فرمایا گیا ہے

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ ...... وَمَا دُعَاءُ الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝

مطلب یہ ہے کہ جو مجرمین کفر و شرک اور ظلم جیسے جرائم کی وجہ سے جہنم میں پڑے ہوں گے وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر دوزخ کے منتظم فرشتوں سے کہیں گے کہ آپ اپنے خداوند سے ہمارے واسطے استدعا کیجیے کہ کسی دن ہمارا عذاب ہلکا ہی کر دیا جائے (يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ) وہ فرشتے جواب میں کہیں گے کیا تمہاری ہدایت کے لیے خدا کے پیغمبر تمہارے پاس اُس کے واضح احکام اور روشن نشانیاں لیکر نہیں پہنچے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں پہنچے تھے! تو فرشتے کہیں گے پھر ہم تمہارے لیے خدا کے حضور میں کچھ عرض نہیں کر سکتے، تم خود ہی اس سے عرض کرو —— آگے فرمایا گیا ہے —— وَمَا دُعَاءُ الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝ —— مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خداوندی فیصلے کے مطابق دوزخ میں جھونکے جانے والے کفار و مشرکین کی دُعا اور عرض و معروض وہاں لاحاصل اور بے فائدہ ہی رہے گی۔

یہاں تک پیغمبروں کی بات نہ ماننے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے کفار و مشرکین کے انجام کا بیان ہوا —— آگے اللہ کے پیغمبروں اور ان کی دعوتِ ایمان قبول کرنے والے

اور اُن کا ساتھ دینے والے اہل ایمان کا انجام بیان فرمایا گیا ہے۔

ارشاد ہے —— "اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝" ——

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرماتا ہے کہ ہمارا یہ دستور و معمول ہے کہ ہم اپنے پیغمبروں اور اُن کی دعوتِ ایمان کو قبول کر کے اُن کا ساتھ دینے والوں کی ضرور مدد کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں بھی، اور قیامت کے اُس دن بھی یقیناً اُن کی مدد کریں گے جب کہ گواہ پیش ہوں گے اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے ہر شخص کے عمل و کردار اور ظاہر و باطن کا اس کو پورا علم ہے، (کسی کی کوئی بات بلکہ دل کا کوئی ارادہ بھی اس سے چھپا ہوا نہیں ہے، یہ بات قرآن مجید ہی میں بیسیوں جگہ بیان فرمائی گئی ہے۔) اس کے باوجود اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ آخرت میں کسی کے عذاب و ثواب کا فیصلہ وہ صرف اپنے ذاتی علم سے ہی نہ فرمائے گا، بلکہ گواہوں کے بیانات ہوں گے، اللہ کے فرشتے گواہی دیں گے، اور خود انسانوں کے اعضا ہاتھ پاؤں وغیرہ بھی اُس دن اللہ کے حکم سے گواہی دیں گے، اس لیے اس آیت میں قیامت اور حساب کتاب کے اس دن کو "یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ" فرمایا گیا ہے۔ (یعنی گواہوں کی پیشی کا دن) ——

آگے ارشاد ہے کہ اُس دن مجرموں کا کوئی حیلہ بہانہ اور کوئی معذرت اُن کو نفع نہیں پہنچائے گی اور ان کے لیے خدا کی رحمت سے محرومی کا اور دوزخ کے عذاب کا فیصلہ ہوگا (یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ)

میں ذکر کر چکا ہوں کہ یہ سورۂ مومن مکی ہے اور بظاہر اس دور میں نازل ہوئی ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کی مخالفت کرنے والے کفار و مشرکین کو ہر طرح کا غلبہ حاصل تھا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے اور آپ پر ایمان لانے والوں کو بڑے ظالمانہ طریقوں سے ستاتے تھے۔ ظاہری حالات میں اُس وقت اس کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ ان دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو غلبہ حاصل ہو سکے گا —— لیکن اسی حالت اور اسی فضا میں بہت سی دوسری آیتوں میں بھی اور سورۂ مومن کی اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس منشور ازلی کا اعلان فرمایا کہ ہمارا

دستور و معمول ہے کہ ہم اپنے پیغمبروں اور اُن پر ایمان لانے والوں کی اس دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں (جس کے نتیجہ میں اُن کی دعوتِ حق دیر سویر کامیاب ہوتی ہے) اور آخرت میں بھی اُن کو رحمت اور جنت سے نوازتے ہیں جو حقیقی کامیابی ہے — اور اس کے برعکس کفر و شرک جیسے جرائم کے مجرمین کے ساتھ آخرت میں ہمارا معاملہ یہ ہوگا کہ اُن کا کوئی عذر کوئی حیلہ بہانہ نہ سنا جائے گا اور ان کے لیے لعنت کا (یعنی رحمت سے قطعی محرومی کا) اور دوزخ کے بدترین عذاب کا فیصلہ ہوگا۔ (وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ)

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ایمان لا کر آپ کا ساتھ دینے والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ (اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے انتظار کرو وہ اس دنیا میں بھی تمہاری مدد فرمائے گا اور آخرت میں بھی تم پر اُس کی خاص رحمت و عنایت ہوگی، اور جو کفار و مشرکین آپ کو اور صحابہ کرام کو ستاتے تھے ان کو آگاہی دی گئی ہے کہ بالآخر وہ اس دنیا میں بھی مغلوب و مقہور ہوں گے اور آخرت میں وہ خدا کی رحمت سے قطعی محروم رہیں گے اور دوزخ کے بدترین عذاب میں جھونکے جائیں گے۔

اس آیت کے مضمون سے متعلق ایک عامیانہ شبہہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں بڑی تاکید اور قطعیت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ "ہم اپنے پیغمبروں کی اور اُن پر ایمان لانے والوں کی اس دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں اور کریں گے"— حالانکہ ہم خود دیکھ رہے ہیں اور تاریخ میں بھی اس کی بے شمار مثالیں ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے کافر دشمنوں کے مقابلہ میں شکستیں کھائیں اور ان کے مغلوب ہو کر رہے، خود ہمارا حال اور ہماری تاریخ بھی کچھ ایسی ہی ہے — اس کا جواب یہ ہے اور میں بار بار اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ قرآن پاک میں کہیں بھی "مسلمان قوم" یا "مسلمان کہلانے والوں کی مدد کا وعدہ نہیں فرمایا گیا ہے جہاں کہیں اس طرح کا وعدہ کیا گیا ہے "مومنین" یا "الَّذِينَ آمَنُوا" جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اور ان سب آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس امت کی مدد فرمائے گا جو صاحبِ ایمان ہوگی اور جس کی زندگی ایمان والی زندگی ہوگی، جس کا صحیح نمونہ صحابہ کرام تھے —

اور آج کی مسلمان قوم کا حال یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کی زندگی میں ایمانی صفات اور ایمان والے اعمال و افعال کے مقابلے میں کفار و منافقین اور فاسقوں فاجروں کی صفات اور

اُن کے اعمال افعال زیادہ ہیں، اُن کا حال قرآن پاک کے الفاظ میں اس وقت یہ ہے کہ "هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ" ـــــ الغرض ایسی کسی قوم کے لیے ہرگز اللہ کی طرف سے مدد کا وعدہ نہیں ہے، بلکہ ایسی قوم اور ایسے لوگوں کے لیے تو خدا کی مدد سے محرومی اور دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی کے عذاب کی آگاہی دی گئی ہے ـــــ آج مسلمانوں کی اکثریت کا حال تھوڑے فرق کے ساتھ وہی ہے جو بگڑے ہوئے بنی اسرائیل کا تھا جنکو قرآن پاک میں جا بجا خدا کی لعنت اور اس کے غضب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

ایک دوسرا شبہہ اس آیت کے مضمون پر یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغمبروں کی مدد فرمانے کا وعدہ فرمایا گیا ہے (إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا) اور قرآن پاک ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے بعض پیغمبر شہید بھی کیے گئے اور بعض کو جلا وطن ہونا پڑا ـــــ جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی مدد نہیں ہوئی، اگر اللہ کی مدد ہوئی ہوتی تو ایسا نہ ہوتا ـــــ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کی مختلف صورتیں ہیں ـــــ ایک صورت یہ ہے کہ زندگی ہی میں ان کا مشن کامیاب ہو جائے، اُن کا لایا ہوا دین قبول کر لیا جائے اور ان کے دشمن مغلوب و مقہور ہو جائیں ـــــ ایسی مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی۔ اور اسی طرح کی مدد ایک درجہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بھی حاصل ہوئی تھی۔

ایک دوسری صورت مدد کی یہ ہے کہ پیغمبر کو اور ان کے متبعین کو اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں لے لے اور دشمن قوم آسمانی عذاب سے نیست و نابود کر دی جائے ـــــ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم السلام کی مدد اسی صورت میں ہوئی۔

ایک تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبر کی دینی دعوت اگرچہ اُن کی زندگی میں دنیا میں نہ پھیلے لیکن اس کی نسل کے لیے نصرت و برکت اور دینی امامت مقدر فرما دی جائے اور دنیا ہمیشہ عزت و احترام سے اس کا نام لے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسی طرح کی مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیب ہوئی ـــــ آج ابراہیم علیہ السلام کا نام پوری دنیا میں جیسے احترام سے لیا جاتا ہے غالباً دنیا کی کسی ہستی کا بھی نہیں لیا جاتا، مسلمانوں کی طرح یہود و نصاریٰ بھی اُن کو "امام" مانتے ہیں، تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مدد ہی کا ظہور ہے ـــــ ایک صورت مدد کی یہ بھی کہ

دشمن کسی پیغمبر کو شہید کرنا چاہتے ہوں اور عالم اسباب میں اس کا پورا انتظام کر چکے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ معجزانہ طور پر اُن کو بچالے اور بعد میں اُن کے ماننے والوں کو دشمنوں پر غالب کر دے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی کیا گیا —— اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ پیغمبر دشمنوں کے ہاتھ سے شہید ہو جائیں —— پھر اس کی سزا میں قوم پر عذاب آئے اور یہ بات سب کے سامنے آجائے کہ یہ اللہ کے صادق پیغمبر تھے، پھر بہت سوں کو ایمان نصیب ہو جائے اور ایمان والے بندے ہمیشہ اُن پر سلام بھیجیں اور ان کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مدد ہی کی صورت ہے —— الغرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ہر رسول کو اس کی مدد حاصل رہی ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بلاشک وشبہ برحق ہے کہ "اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝۔

یہ چند آیتیں درمیان میں ایک ضمنی مضمون کے طور پر آگئیں، ورنہ آپ کو یاد ہوگا کہ اوپر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان ہو رہا تھا، پھر اسی سلسلہ میں فرعون کے گھرانے کے ایک مردِ مومن کی تقریر ذکر کی گئی تھی جو بڑی موثر تقریر تھی —— پھر بیان فرمایا گیا تھا کہ فرعون اور اُس کے لوگوں نے اُس مردِ مومن کے خلاف کوئی خطرناک منصوبہ بنایا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے ناکام کر دیا، اس مردِ مومن کی حفاظت فرمائی، اور فرعون مع اپنے لاؤ لشکر کے غرقاب ہو کر جہنم رسید ہو گیا، اور قیامت سے پہلے عالم برزخ میں وہ برابر مبتلائے عذاب رہیں گے اور قیامت آجانے پر جہنم کے بدترین عذاب میں جھونک دیے جائیں گے ——

اس سب کے بعد فرمایا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی دعوت کو قبول کر کے اُن کے ساتھ ہو جانے والے مردِ مومن کے ساتھ اللہ کی مدد کا جو معاملہ ہوا یہ کوئی استثنائی معاملہ نہیں تھا بلکہ اپنے رسولوں اور اُن پر ایمان لانے والوں کے ساتھ یہ معاملہ کرنا ہمارا دستور و معمول ہے —— اس ضمنی اور درمیانی مضمون کے بعد پھر موسیٰ علیہ السلام کا اور اُن پر اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے

"وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ ۝ هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۝

مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبر موسیٰ کو اور اُن پر ایمان لانے والوں کو فرعون کے ظلم و ستم سے نجات دینے کے بعد اور فرعون اور اس کے سارے لاؤ لشکر کو غرقاب کر کے نیست و نابود کر دینے کے بعد موسیٰ کو کتابِ ہدایت تورات عطا فرمائی اور اُن کے بعد ان کی قوم بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث و امین بنایا، تا کہ اہل عقل و دانش اُس سے رہنمائی اور نصیحت حاصل کرتے رہیں۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو اشارہ ہے کہ آپ کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہوگا، دشمنوں کے ظلم و ستم سے اللہ تعالیٰ آپ کو نجات عطا فرمائیگا، آپ کے دشمن (ابوجہل ابولہب وغیرہ جو گویا آپ کے زمانہ کے فرعون و ہامان تھے) اگر باز نہ آئے تو نیست و نابود کیے جائیں گے یا مغلوب و مقہور ہوں گے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ غلبہ عطا فرمائے گا، اور کتابِ ہدایت بھی عطا فرمائے گا اور آپ کے بعد آپ کے وفادار اور پیرو کار امتی اس کے وارث و امین ہوں گے۔ اور دنیا بھر کے اصحابِ عقل و خرد اس سے ہدایت و نصیحت حاصل کر سکیں گے ——— اس کے آگے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرما کے آپ کے اور بالواسطہ آپ کے امتیوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ۔ "فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۝"

مطلب یہ ہے کہ آپ صبر و استقامت کے ساتھ دین حق کی دعوت کا کام کرتے رہیں اور یقین رکھیں کہ اللہ کا وعدہ (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) برحق ہے پورا ہو کر رہے گا۔ اور اپنی تقصیرات اور غلطیوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں اور خاص کر صبح و شام کے اوقات میں اس استغفار اور اللہ کی حمد و تسبیح میں مشغول رہا کریں ———

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس آخری آیت کے مخاطب بظاہر اور براہ راست تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن بالواسطہ آپ پر سارے ایمان لانے والے اور ہم آپ بھی

مخاطب ہیں ـــــ یہ آیت ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کا خاص منشور ہے، اس کا پیغام یہ ہے کہ مضبوطی سے دین پر جمے رہو اور صبر و ثابت قدمی کے ساتھ اس کی دعوت دیتے رہو اور اپنے قصوروں گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی و مغفرت مانگتے رہو۔ اور خاص کر صبح شام (جو دن رات کی ابتدا اور انتہا کے اوقات ہیں) اُن میں توبہ و استغفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کو اپنا معمول و وظیفہ بنا لو ـــــ اگر ایسا کرو گے تو "اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ" کا یقیناً ظہور ہو گا ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اور اس کے بعد صحابہ کرام کے دور میں جو کچھ ہوا وہ دراصل اس آیت کی اور اس مضمون کی دوسری آیتوں کی عملی تفسیر تھی ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو یقین اور اس کے مطابق عمل نصیب فرمائے۔
ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد و تسبیح اور استغفار کا بڑا ہی جامع کلمہ تعلیم فرمایا ہے اور خود آپ کی زبان مبارک پر اکثر یہ کلمہ رہتا تھا ـــــ "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ"۔

مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل
(رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کے اصول اور طریقے

[پاکستان کی موجودہ حکومت نے جب ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کا فیصلہ کیا تو اسلامی قانون کی جدید تدوین کی ضرورت محسوس کر کے اس کے لیے ایک ادارہ "اسلامی نظریاتی کونسل" کے نام سے قائم کیا، اور مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے بالغ نظر علماء کرام اور دینی ذہن رکھنے والے ممتاز ماہرین قانون کو اس کا رکن منتخب کیا ___ اس کے ایک محترم رکن ہمارے فاضل دوست مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل نے ایک مقالہ اسی کونسل کے مقصد و موضوع پر لکھا تھا۔ ہم نے اس کا حق سمجھا کہ ہندوستان کے اہل علم و دانش تک بھی وہ پہنچا دیا جائے۔ اس لیے ان صفحات میں اس کو پیش کیا جا رہا ہے۔]

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وخاتم النبیین وعلیٰ آلہ واصحابہ وذریاتہ اجمعین

اسلامی قانون کی تدوینِ جدید اور اس کے اصول اور طریقوں کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار سے قبل میں یہ ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ ایک غلط فہمی کا ازالہ کردوں جو اس عنوان کے سنتے ہی پیدا ہو جاتی ہے، ہمارے ملک میں کچھ حضرات جو واقعی دین دار اور اسلام کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھنے والے ہیں، جب "اسلامی قانون کی تدوین جدید" کا عنوان

سن لیتے ہیں تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور ان پر ایک وحشت سی طاری ہوتی اور پریشان ہو جاتے ہیں اور ان کی اس گھبراہٹ، توحش اور پریشانی کے لیے ایک منشا موجود ہے اور وہ یہ کہ کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا اُبھر آیا ہے جس کا دین اسلام کے ساتھ نہ تو اس درجہ میں اعتقادی رابطہ ہوتا ہے جو ایک مومن کے لیے ضروری ہے اور نہ عملی طور پر وہ لوگ اسلامی احکام و قوانین کے پابند ہوتے ہیں مگر دن رات مضامین و مقالات اور تقاریر و خطابات میں بڑے زور و شور کے ساتھ نئے "اجتہاد" اور نئے سرے سے قوانین اسلامی کی تدوین کی بات کرتے رہتے ہیں اور یہ یا تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو صرف قرآن مجید کے ماخذ قانون اسلامی ہونے کا تو اقرار کرتے ہیں لیکن سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل حجت شرعی یا ماخذ قانون اسلامی ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔ اور قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کے لیے بھی وہ اپنے آپ کو کسی حدیث یا تعامل صحابۂ کرام یا اجماع امت یا تفسیر و توضیح ائمہ ہدیٰ اور سلف صالحین کے پابند نہیں سمجھتے وہ صرف اپنی فہم و بصیرت، یا اپنی "لغات القرآن" ہی کو قرآن فہمی کا واحد ذریعہ یقین کرتے ہیں اور یا وہ لوگ ہوتے ہیں جو زبان سے تو یہ اقرار کر لیتے ہیں کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہ بھی حجت شرعی اور ماخذ قانون ہے لیکن قرآن مجید کی طرح احادیث رسول اللہ کی تشریح و توضیح وہ اپنی آزاد رائے سے کرتے ہیں، استنباط و استخراج کے لیے بھی ان کے ہاں مقررہ اصول و ضوابط نہیں، بلکہ مغربی تعلیم، مغربی سیاست اور مغرب کے فلاسفہ و حکماء، اور مستشرقین سے متاثر ہونے کی وجہ سے ان کا اجتہاد و استنباط درحقیقت، مغربی افکار اور مغربی قوانین کا آئینہ دار ہوتا ہے یعنی وہی صورت حال ہوتی ہے جس کا ذکر اکبر مرحوم نے یوں کیا تھا۔ ؎

کھل گیا مصحف رخسار بتانِ مغرب
شیخ حاضر بھی ہوئے ہیں نئی تفسیر کے ساتھ

ان حضرات کی علمی تحقیق عموماً یوں ہوتی ہے کہ احادیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول و فعل منقول ہوتا ہے اس کو صرف وقتی اور عرب کے مخصوص حالات اور مخصوص زمانہ کے ساتھ مختص ثابت کر کے عملاً اس کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد کر دیا جائے اور پیش آمدہ

واقعہ میں خود اپنا اجتہاد کر کے کوئی حکم مستنبط کر دیا جائے اور اس کو اسلامی قانون قرار دیا جائے اور لازماً اس قسم کے اجتہاد میں مغرب سے مرعوبیت اور مغرب کی نقالی کی جھلک نظر آتی ہے اور جب ان حضرات کا معاملہ خود حدیث کے بارے میں اس قسم کا ہے تو ظاہر ہے کہ خلفائے راشدین کے دور کے مسائل اور فیصلہ شدہ قوانین یا آئمہ مجتہدین اور بعد کے حضرات فقہاء کرام کے بارے میں تو اور بھی جرأت اور بڑی آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک خاص دور کا اجتہاد تھا جو دور گزر گیا وہ اجتہاد بھی ختم ہوا۔ اب نئے دور میں نئے تقاضے ہیں، نئے حالات ہیں لہٰذا ہم اُن حضرات کے اجتہادات یا اُن کی تعبیر و توضیح کی پابندی کیوں کریں۔ اور اس طرح بہ قول علامہ اقبال مرحوم ؏

برلیے راز دارِ دیں شدہ

الغرض جب چاروں طرف ایسی فضا موجود ہو اور اس فضا میں جب یہ دین دار اور مخلص حضرات یہ سنتے ہیں کہ کسی مجلس میں "اسلامی قانون کی تدوین جدید" پر مقالہ پڑھا جارہا ہے تو بجا طور پر وہ گھبراتے ہیں کہ شاید مندرجہ بالا طبقے کا کوئی خود ساختہ مجتہد' اجتہاد کا دروازہ چوپٹ کھولنے کے لیے اور پوری امت کے ذخیرہ تفاسیر و شروحِ احادیث اور ذخیرہ فقہ و اصول پر اور آئمہ مجتہدین اور سلف صالحین کی اجتہادی کوششوں پر پانی پھیرنے کے لیے، کچھ ادھر اُدھر کا مواد اکٹھا کر کے کچھ سنانے کھڑا ہوا ہے، اس لیے میں ان حضرات کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے مقالہ کے شروع ہی میں اس غلط فہمی کا ازالہ کرتا ہوں اُن کو ہرگز متوحش نہیں ہونا چاہیے۔

میرا نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے جو نصوص قطعی الدلالۃ ہیں، یا احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جو احادیث قطعی الدلالۃ ہیں یا آیات قرآنی اگرچہ ظنی الدلالۃ ہوں یا اخبار آحاد ظنی الثبوت ہوں مگر قرون ثلاثہ کے ارباب حل و عقد نے کسی معنی پر اجماع کیا ہو تو ایسے احکام و قوانین بالکل ابدی ہیں ان میں کسی تغیر و تبدل، کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں اسی طرح اگر نصوص کی کسی تعبیر پر مفسرین و شارحین اور آئمہ مجتہدین کا اتفاق ہو چکا ہو تو اس تعبیر و تشریح کے سوا محض اپنی فہم و بصیرت یا کسی خود ساختہ لغات القرآن اور لغات الحدیث کا سہارا لے کر اور کوئی تعبیر کرنا یا اور کوئی تشریح و تفسیر اختیار کرنا ضلال مبین اور موجب ہلاکت

وخسران دارین ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

اب جو اسلامی قوانین واحکام اس نوعیت کے ہیں ان کی تدوین جدید سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ موجودہ دور میں جس طرح قوانین کی دفعہ وار ترتیب ہوتی ہے اس طرح ان قوانین کو خاص سلیس انداز کے ساتھ اور نمبر دے کر لکھا جائے تاکہ کسی کو کتب فقہ میں اِدھر اُدھر تلاش کرنے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ بلکہ ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ متعلقہ دفعہ نکال کر اپنا مطلوب قانون اور مسئلہ معلوم کر سکے ہر مسئلہ کسی دشواری اور زیادہ وقت ضائع کیے بغیر نکالا جا سکے اور اس قسم کی تدوین جدید کی افادیت میں کسی کو شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

اسلامی قوانین کا بہت بڑا حصہ وہ ہے کہ کسی ظنی الدلالۃ آیت کی تفسیر میں، یا کسی خبر واحد کے مفہوم و مراد کی تعیین میں حضرات آئمہ مجتہدین کا آپس میں علمی اختلاف رہا۔ مثلاً چار دل آئمہ مجتہدین یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمدؒ کا آپس میں اتفاق نہیں رہا بلکہ ایک نے تو اپنے علم و تفقہ اور قوت اجتہاد کی بنیاد پر یا دوسرے نظائر کو سامنے رکھ کر کوئی ایک تفسیر کی ہے یا ایک مفہوم متعین کر دیا ہے اور دوسرے نے دوسری تفسیر کی ہے اور دوسرا مفہوم بتایا ہے یہ ان کا اجتہادی اختلاف تھا، جو فطری ہے ایسے مسائل و قوانین کو ہم اجتہادی قوانین کہیں گے۔ چونکہ ہمارے ملک میں غالب اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جو حنفی کہلاتے ہیں یعنی وہ مسلمان جو قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح اور ان سے اسلامی قوانین و احکام کے استنباط و استخراج کے سلسلے میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ جو صحابہ و اہل بیت کا احترام سب کا کرتے ہیں سب سے عقیدت و ارادت ہے ان سب کو ائمہ ہدیٰ دین کے بغیر خواہ متقی اور اولیاء اللہ سمجھتے ہیں۔ مگر وہ عام طور پر عملی زندگی میں ان قوانین و احکام پر عمل کرنا زیادہ بہتر اور راجح سمجھتے ہیں جو امام ابو حنیفہؒ نے اپنے اجتہاد سے نصوص شرعیہ کو سامنے رکھ کر مستنبط کیے ہیں اور قانون سازی کے دائرہ میں جس کی ایک شاندار اور بے نظیر تاریخ ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ وقت نہیں۔ بہر حال جب یہاں اکثریت حنفیوں کی ہے اور دین و دانش کا بھی تقاضا یہ ہے اور موجودہ دور جمہوریت میں بھی ملکی قوانین کے سلسلے میں اکثریت کے معتقدات و رجحانات کو اصل قرار دے کر ان قوانین کو

پبلک لاء، قوانین عامہ کے طور پر نافذ کیا جاتا ہے جو اکثر آبادی کے قوانین ہوں۔ بلکہ ہماری سابقہ تاریخ بھی اس کی گواہی دیتی ہے جن ممالک میں شافعی حضرات کی اکثریت تھی وہاں امام شافعیؒ کی فقہ کے قوانین جاری رہے، جہاں مالکیہ کی تعداد زیادہ تھی مثلاً اندلس اور مغربی افریقہ وہاں امام مالکؒ اور اُن کے تلامذہ کی مدون کتابوں کے قوانین نافذ تھے اور ان کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور جہاں حنابلہ کی اکثریت اور حکومت تھی وہاں فقہ حنبلی کے قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے زیر نگین ممالک میں احناف کی اکثریت تھی، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان میں حنفی حضرات کی تعداد زیادہ تھی اس لیے صدیوں تک ان ممالک میں فقہ حنفی سرکاری فقہ کے طور پر نافذ رہی۔ اور حنفی اجتہاد کے مطابق سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ضخیم کتابیں فتاویٰ کی اور متون اور شروح اور حواشی منہیات کی اسی فقہ حنفی میں تصنیف ہوتی رہیں۔

الغرض پاکستان میں بھی بنیادی طور پر حنفی فقہ کے مطابق اسلامی قوانین و احکام پبلک لاء قوانین عامہ کے طور پر نافذ ہونا بالکل عقلی، دینی، فطری اور تاریخی تقاضا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلامی قوانین لاکھوں کی تعداد میں ان کتب فقہ حنفی میں منتشر موجود ہیں۔ گذشتہ ادوار کے حضرات علماء کرام اور فقہائے عظام تو اپنی قوت حافظہ، ذہانت، ادراک اور تجربہ کاری و مہارت کی بنا پر عند الضرورۃ اپنا مطلوبہ مسئلہ اور قانون اور شرعی حکم آسانی کے ساتھ ڈھونڈ کر نکال سکتے ہوں گے اُن کو ہر ہر مسئلے کے مظان کا اندازہ تھا، کسی دشواری کے بغیر اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے اب یہ واقعہ ہے کہ اس دور میں جو کہ کہا جاتا ہے کہ زیادہ ترقی کا دور ہے نہ وہ قوتیں رہے نہ اہل علم اور قانون دانوں میں وہ ادراک و انصار رہا اور نہ وقت زیادہ خرچ کر سکتے ہیں۔ اس لیے اب یہ انتہائی ضروری ہے کہ نئے دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق ان اسلامی قوانین کو نئی ترتیب دی جائے ان کو دفعہ وار لکھا جائے اور آج کل تمام مہذب و متمدن ممالک میں ملکی قوانین کو جس طرح ایک بل کی صورت میں خاص انداز کے ساتھ مرتب و مدون کر کے کتاب قانون کا ایک حصہ بنایا جاتا ہے اس طرح ان اسلامی قوانین کو بھی مدون و مرتب کر دیا جائے تو تدوین جدید سے مراد یہ بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی افادیت اور نفع بخشی سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا اور نہ اس سے کسی توحش کی عقلاً اور شرعاً گنجائش ہے۔

اب اس سے آگے ایک اور مرحلہ آتا ہے چونکہ وہ قدرے نازک سا مسئلہ ہے میں چاہتا ہوں کہ اہل علم ذرا غور سے سن کر پھر اس کے بارے میں فیصلہ فرمائیں۔ حنفی فقہ کے قوانین و احکام میں سے بعض قوانین ایسے ہیں کہ وہ محض اجتہادی ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قطعی ہیں اور دوسرے ائمہ مجتہدین نے اگر اس سے مخالف یا تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دوسرا قانون بیان کیا ہے تو وہ بالکل غلط اور قطعی ناجائز ہے اس قسم کے مسائل کے بارے میں خود ہمارے ائمہ احناف کا یہ مقولہ مشہور ہے۔

ھذا صواب یحتمل الخطأ والقول الآخر خطاء یحتمل الصواب

موجودہ دور میں اس قسم کے بعض قوانین کی تنفیذ و اجراء میں کچھ عملی مشکلات نظر آتی ہیں میری مراد مشکلات سے محض وہمی اور فرضی مشکلات نہیں بلکہ وہ حقیقی مشکلات و موانع ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جس دور میں وہ اجتہاد کیا گیا تھا اُس دور کا عُرف کچھ اور تھا۔ تجارتی روابط کچھ اور نوعیت کے تھے قوی کا فرق تھا۔ اس دور کا عُرف جب بدل گیا۔ تجارتی کاروبار کے طریقے کچھ مختلف ہو گئے، نئی تہذیب نئے تمدن نے ماحول کو بالکل بدل دیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی عالمگیر اور بے نظیر ترقی کی وجہ سے نئی نئی ایجادات نے ایک نئی دنیا بسا دی۔ اگر سابقہ ادوار کے قیاسی اور اجتہادی قوانین کسی قسم کے غور و فکر اور نظر ثانی کے بغیر جوں کے توں نافذ کیے جائیں تو بعض دفعہ یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ تو نافذ نہ ہو سکیں عملی دشواریاں اور طرح طرح کی واقعی رکاوٹیں ان کو چلنے نہ دیں اور کچھ قطعی اور غیر متبدل قوانین بھی اُن کی لپیٹ میں آکر نافذ ہونے سے رہ جائیں گے تو اس وقت اجتہاد مطلق کی ضرورت تو نہیں قطعیات اور اجماعی مسائل اور ممکن العمل اجتہادی مسائل کے بارے میں کسی نئی تحقیق یا اجتہاد کی نہ ضرورت ہے نہ شرعی گنجائش،

———— البتہ ان بعض خالص اجتہادی مسائل کے بارے میں نئی تحقیق یا نئے اجتہاد کی ضرورت بھی ہے اور گنجائش بھی۔ اس وقت اسلامی نظام کے مکمل اور حقیقی اجراء و تنفیذ کے لیے ان امور پر از سر نو غور کر کے قابل عمل راستہ نکالنے کی واقعی ضرورت ہے اور اس سے اغماض یا غفلت کا نتیجہ ہرگز اچھا نہیں نکلے گا۔ اسی طرح بہت سی نئی نئی صورتیں پیدا

ہو رہی ہیں اور نئے نئے واقعات سامنے آ رہے ہیں جن کا صاف و صریح حکم تلاش و جستجو کے باوجود قدیم فقہی کتابوں میں نہیں مل سکتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعینہٖ اسی قسم کی صورت ان فقہاء کرام کے زمانوں میں پیدا نہیں ہوئی تھی تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے بارے میں کوئی خاص قانون کس طرح بنا سکتے تھے۔ یہ تو امر واقعہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے نئے واقعات پیش آتے ہیں کہ ان کا تصور تک ان حضرات کے ذہن میں نہیں تھا۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے وقت کے جید علماء اور فضلاء کو بلا کر اور عظیم الشان کتب خانہ مہیا کر کے ان کو فتاویٰ عالمگیری کی تدوین پر لگایا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ باوجودیکہ قدیم فقہاء کی بے نظیر علمی کتابیں اور ضخیم فتاویٰ اور مسائل و واقعات کا ذخیرہ موجود تھا مگر اپنے دور میں ایک منظم اور قانونی حکومت چلانے کے لیے انھوں نے نئی تدوین کی ضرورت محسوس کی تھی اور انھوں نے اس دور کے اعتبار سے ایک معیاری کام کیا (اسلامی قوانین کا مجموعہ مرتب کیا) جو قابل قدر کارنامہ ہے اور اس کی قدر و قیمت اور عظمت و اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے جزاھم اللہ احسن الجزاء لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے اور اس میں ان کے کارنامہ کی تنقیص کا شائبہ بھی نہیں کہ بہت سی نئی صورتوں اور نئے واقعات کا قانونی حکم معلوم کرنے کے لیے ہمیں عالمگیری میں بھی صاف و صریح فقہی جزئیے مل نہیں سکتے۔ اس لیے بعینہٖ فتاویٰ عالمگیری کو نافذ کرنے کا مطالبہ محض ایک جذباتی نعرہ ہے جس کی پشت پر سیاسی داعیہ ہو تو ہو کوئی علمی دلیل نہیں۔ ہاں اس وقت زیر تجویز تدوین جدید میں عالمگیری سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور اس کی روشنی میں ہم جادہ پیما ہو کر اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتے ہیں۔

ایسے نئے واقعات کے لیے شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے یہ محدود و مشروط اجتہاد اس دور کی ایک واقعی ضرورت ہے علامہ عبدالکریم شہرستانی نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے کہ معاملات میں اور انسانی تصرفات کے ذریعہ جو حوادث اور نئے نئے واقعات پیش آتے رہتے ہیں انکی تعیین و تحدید ناممکن ہے اور یہ بات قطعی طور پر ہم جانتے ہیں کہ ہر نئے حادثہ کے لیے شریعت کا صریح حکم موجود نہیں ہے اور نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے اور جب واقعات اور حوادث غیر متناہی اور کتاب و سنت کے احکام محدود ہیں۔ تو جو خود محدود ہو وہ غیر محدود کو اپنے قابو

میں کیسے لاسکتا ہے اس لیے قطعاً یہ بات معلوم ہوگئی کہ اجتہاد اور قیاس اس وقت تک قابل لحاظ چیز ہے۔ جب تک کہ ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے اس لیے ہر حادثہ کے لیے اجتہاد کرنا پڑے گا۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو عراق کا والی مقرر کرکے بھیجا تھا تو ان کو ایک خط لکھا تھا یہ خط قضا رکی انتظامی اور فقہی رہنمائی کے لیے ایک زبردست دستور ہے اس کا ہر ہر جملہ نہایت قیمتی ہے اور اس سے اسلامی قانون کی دفعات کا استنباط کیا جاسکتا ہے اور کیا گیا ہے اس خط میں ایک حصہ یہ بھی ہے:۔

الفهم الفهم فی ما تلجلج فی صدرك مما لیس فی کتاب الله ولا سنة النبی صلی الله علیه وسلم ثم اعرف الاشباه والامثال وقس الامور عند ذالك بنظائرها واعمد الی اقربها الی الله واشبهها بالحق۔ اعلام الموقعین ج۱ ص ۹۹ (جمهرة رسائل العرب رسالہ ۲۱۴)

الغرض اس وقت ہمارے سامنے فقہ حنفی کے کچھ وہ قیاسی اور اجتہادی قوانین واحکام ہیں کہ موجودہ دور میں عملاً ان کی تنفیذ و اجراء میں واقعی مشکلات ہیں اور ان پر اصرار زمانہ اور معاشرہ بدلنے کی وجہ سے بہت سی عملی پیچیدگیاں، دشواریاں، اور نظم مملکت میں اختلال اور موجودہ معاشرے میں انتشار پیدا کر سکتا ہے۔ تو ضرورت ہے کہ ان اجتہادی مسائل پر از سر نو غور کرلیا جائے۔ اور اگر حضرات ائمہ اربعہ میں سے باقی تین حضرات کے ہاں اس معاملے میں اُن کا کوئی اجتہادی قانون ایسا ہے کہ اس کی تنفیذ بہ آسانی ہوسکتی ہے اور وہ "ارفق بالناس" ہے عرف عام یا عرف خاص کے ساتھ زیادہ موافقت رکھتا ہے، مصالحِ مرسلہ کا تقاضا اس سے پورا ہوتا ہے۔ یا قیاس کے مقابلہ میں وہ اجتہاد استحسان کی بنا پر ہے تو اس قانون کو لیا جائے اور ترجیح دی جائے اور اسلامی قانون کے نئے مدون مجموعہ میں بہ حیثیت قانون کے اس کو درج کردیا جائے اور ایسا کرنا نہ تو حنفیت سے انحراف ہے اور نہ فقہاء کرام کے ہاں ناجائز۔ خود ہمارے فقہاء حنفیہ نے اس کی اجازت دی ہے مثالیں تو بہت ہیں میں صرف اجمالی اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں، مسئلہ مفقود الخبر میں فقہاء حنفیہ نے بالاتفاق امام مالکؒ کے مسلک کو ترجیح دے کر اس پر فتویٰ دیا ہے۔ بہت سے مسائل میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے اقوال کو چھوڑ کر امام زفرؒ کے اجتہادی

قول پر فتویٰ انہی وجوہات کی بنا پر دیا ہے اگر کوئی بالغہ عورت اپنی مرضی سے غیر کفو میں نکاح کرلے اور اس کے والدین اور دوسرے اولیاء اس کو عرفاً عار سمجھتے ہوں تو ظاہر الروایۃ تو یہ ہے کہ نکاح تو ہو چکا ہے البتہ اولیاء کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قاضی کے ہاں دعویٰ دائر کریں۔ اور اپنی ناراضگی اور عرفاً خاندان کے لیے اس کا موجب عار ہونا ثابت کریں تو قاضی نکاح فسخ کردیگا ظاہر الروایۃ تو یہی ہے لیکن حسن بن زیاد کا اجتہاد یہ ہے۔

"لا نکاح الا بولی اور ایما امراۃ نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل" کے مطابق درحقیقت ایسی صورت میں نکاح ہوتا ہی نہیں، فسخ قاضی کے بغیر بھی وہ نکاح اصلاً نہیں ہوا، فقہاء متاخرین نے اس صورت میں حسن بن زیادؒ کی اس روایت کو قبول کرکے اس پر فتویٰ دیا، در مختار میں ہے ویفتی فی غیر الکفوٴ بعدم جوازہ اصلاً وھو المختار للفتویٰ لفساد الزمان اور شامی نے یفتی بعدم الجواز پر لکھا ہے ھذہ روایۃ الحسن عن ابی حنیفۃ ووجہ عدم الصحۃ علیٰ ھذہ الروایۃ دفع الضرر عن الاولیاء اور وھو المختار للفتویٰ پر لکھا ہے قال شمس الائمہ وھذا اقرب الی الاحتیاط کذا فی تصحیح العلامہ قاسم لانہ لیس کل ولی یحسن المرافعۃ والخصومۃ ولا کل قاضٍ یعدل ولو احسن الولی وعدل القاضی فقد یترک انفۃ للتردد علیٰ ابواب الحکام واستثقالاً لنفس الخصومات فیتقرر الضرر فکان منعہ دفعاً لہٗ فتح (شامی ص۳۰۵)

اسی طرح علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ایک پورا رسالہ اسی موضوع پر لکھا ہے جس کا نام ہے "نشر العرف فی بناء الاحکام علی العرف" اور اس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ یہ مسئلہ کہ احکام تبدل زمانہ سے بدلتے ہیں بادلائل تحریر فرمایا ہے اس لیے ہمارے حنفی حضرات کو اس معاملے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے البتہ اس کام کے لیے ضروری ہے کہ یہ کچھ اصول وقواعد کے مطابق ہو اور یہ اجتہاد کرنے والے واقعتہً اس کے اہل ہوں اور اجتہاد بھی انفرادی نہ ہو بلکہ اجتماعی ہو کسی نفسانی خواہش یا کسی ذہنی مرعوبیت کی بناء پر نہ ہو واقعی ضرورت درپیش ہوئی ہو لہٰذا اس سلسلہ میں اجمالاً اجتہاد کے بارے میں بھی چند باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اجتہاد کی تعریف علماء اصول فقہ نے یوں کی ہے:۔

"بذل الجهد فی استخراج الاحکام من شواهدها الدالة علیها بالنظر المؤدی الیها" یا "استفراغ الفقیه الوسع لتحصیل ظن بحکم شرعی"

اجتہاد کے لغوی معنی کسی امر کی تحقیق میں اپنی امکانی کوشش صرف کرنے کے ہیں، اور فقہاء کے نزدیک اُس امکانی کوشش صرف کرنے کو اجتہاد کہتے ہیں جو دلائل شرعیہ کے ذریعے استنباط احکام و مسائل میں صرف کی جائے ——— بعض فقہاء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ اتنی کوشش ہو کہ وہ محسوس کرے کہ اب اس سے زیادہ اور کوشش نہیں کی جا سکتی ——— بعض فقہاء نے طلب الظن کی قید بھی لگائی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ کو شریعت کے منشاء کے مطابق کرنے یا کسی حکم شرعی کے تحت لانے میں اتنی کوشش کی جائے کہ یہ گمان غالب حاصل ہو جائے کہ شریعت کا یہی مقصد و منشاء ہے، اس قید لگانے کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے کتاب و سنت سے ثابت شدہ احکام اور اجتہادی مسائل میں فرق ہو جائے گا کیونکہ پہلے قسم کے احکام میں قطعیت ہوتی ہے اور دوسرے قسم کے احکام میں غلبۂ ظن ہوتا ہے۔

(علامہ عبدالعزیز بخاری نے "کشف الاسرار شرح اصول فخر الاسلام بزدوی" میں جو تقریر کی ہے وہی میں نے اردو میں لکھی ہے) اور مجتہدین کی تعریف امام فخر الاسلام بزدویؒ نے یوں کی ہے

هو ان یحوی علم الکتاب بمعانیه ووجوهه التی قلنا وعلم السنة بطرقها ومتونها ووجوه معانیها وان یعرف وجوه القیاس علی ما تضمنه کتابنا هذا۔ اور امام غزالیؒ نے "مستصفی الاصول" میں مجتہد کے لیے دو شرطیں لازمی لکھی ہیں۔

احدهما ان یکون محیطاً بمدارك الشرع متمکناً من استثمار الظن بالنظر فیها وتقدیم ما یجب تقدیمه وتاخیر ما یجب تاخیره، والثانی ان یکون عدلاً مجتنباً عن المعاصی القادحة فی العدالة، اسی طرح امام شاطبیؒ نے بھی دو شرطوں کا ذکر کیا ہے،

احدهما فهم مقاصد الشرع علی کمالها والثانی التمکن من الاستنباط بناءً علی فهمه فیها اور پھر اس تمکن فی الاستنباط کی تشریح یوں کی ہے هو بواسطة معارف محتاج الیها فی فهم الشریعة اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجتہاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مقاصد شریعت

اور اس مسئلہ کے بارے میں اُن علوم و معارف سے واقف ہو جو اس کو پیش آمدہ صورت کا حکم مستنبط کرنے کے قابل بنا سکیں، یعنی وہ اس مسئلہ کے بارے میں قرآن پر، حدیث پر، اجماع صحابہ پر نظر رکھتا ہو اور اسی کے ساتھ قیاس کے شرعی طریقہ اور اصول سے واقف ہو اور پھر اسی کے ساتھ شریعت کی پوری روح اور اس کے مقاصد پر اس کی پوری نظر ہو اور پھر وہ مسئلہ جس شعبہ زندگی سے متعلق ہو اس سے بھی اس کو واقفیت حاصل ہو۔ اگر ان میں سے کسی بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو پھر وہ اجتہاد قابل قبول نہیں ہو گا۔ مجتہد میں ان صفات کی موجودگی کے بارے میں تمام فقہا متفق الرائے ہیں، نیز مجتہد کے لیے نہ صرف شریعت کے علم و فہم ہی کی ضرورت ہے بلکہ کتاب و سنت کی روشنی میں علماء نے اس کے لیے ایک مخصوص کردار کی بھی شرط لگائی ہے جیسا کہ امام غزالیؒ کا قول ذکر ہو چکا، یعنی ثقہ ہو عادل ہو۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ اسلامی قوانین کے چار ماخذ ہیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع، اجتہاد جو قیاس یا استحسان، یا مصالح مرسلہ یا عرف کی بناء پر کیا جائے اس وقت زیر بحث یہ آخری ماخذ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اجتہاد پر شورائی رنگ غالب تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ اہم مسائل میں چاہے وہ حقوق سے متعلق ہوتے یا سیاست سے صحابہ کرام کو جمع کرتے اور ان کے صلاح و مشورے سے پیش آنے والے مسئلہ کا شرعی حل تلاش فرماتے، اس سلسلہ میں ان کا یہ طرز عمل اس نص قرآنی کے عین مطابق تھا۔ جو انہیں بلا تخصیص ہر معاملہ میں مشورہ کرنے کی ہدایت کرتی تھی "وامرهم شوری بینهم" اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے بھی مطابقت رکھتا تھا جو حضور نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا، ایک موقع پر حضرت علیؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر کسی مسئلہ میں مسلمانوں کو کتاب و سنت میں کوئی نص نہ ملے تو وہ کیا کریں۔ آپ نے فرمایا؟ اصحاب علم کو جمع کر کے مشورہ کرو اور فیصلہ کرو کسی انفرادی رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

اس کے بعد جو دور آیا اس میں عام طور پر اجتہاد میں انفرادی رنگ پایا جاتا ہے اور ہر مجتہد اجتہادی مسائل میں اپنی رائے سے فیصلہ کرنے لگا اور اس کے بھی کچھ اسباب تھے البتہ حضرت

امام ابو حنیفہؒ کے اجتہادی مسائل میں شورائی انداز ضرور رہا ہے ان کے تلامذہ جو فقہاء و مجتہدین تھے جمع ہو کر مسائل کی تحقیق کرتے اور امام ابو حنیفہؒ کی سرکردگی میں ان کی یہ شورائی مجلس ہوا کرتی تھی تفصیلات "سیرت النعمان" اور "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" میں دیکھی جائیں، چوتھی صدی تک یہ اجتہاد بھرپور انداز میں ثقہ اور قابل اعتماد مجتہدین کے ذریعہ ہوتا رہا اور اسلامی قوانین کا ایک عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آیا جنہیں اصول و نظریات، کلیات و قواعد عامہ بھی ہیں اور بے شمار فروعی احکام بھی، اس کے بعد دور کچھ بدل گیا، نہ علم و تفقہ کا وہ معیار رہا نہ تقوی و پرہیزگاری اور سیرت و کردار کا، بعض ممالک میں سیاسی انحطاط بھی رونما ہوا اور اہواء نفسانی کا غلبہ و استیلاء بھی، اس لیے دینی مصلحت کو ملحوظ رکھ کر مذاہب اربعہ کے متبعین میں سے محتاط علماء کرام نے یہ فتویٰ دیا کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہے درحقیقت ان کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ پرفتن دور میں مبادا کوئی اجتہاد کا نااہل مدعی دعویٰ اجتہاد لے کر اٹھے اور اجتہاد کے نام سے بدعتوں کی اشاعت، زہریلے خیالات و نظریات کی ترویج اور شریعت کے مسلمہ اصول و قواعد میں بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بن جائے، یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے توجہ دلائی ہے اور "رموز بیخودی" میں ایک عنوان ہے "در معنی ایں کہ در زمانہ انحطاط تقلید از اجتہاد اولیٰ تر است" اور اس سلسلے میں فرمایا ہے:-

مضمحل گردد چو تقویم حیات
ملت از تقلید می گیرد ثبات

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است
معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار
از شجر مگسل بہ امید بہار

نقش بر دل معنیٔ توحید کن
چارہ کارِ خود از تقلید کن

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

ذوقِ جعفر کاوشِ رازی نماند
آبروئے ملتِ تازی نماند

الغرض اس وقت یہ دانشمندی اور احتیاط کی بات تھی کہ چوتھی صدی کے بعد ان خطرات کے پیش نظر جو اس دروازہ کو کھلا رکھنے کی صورت میں نظر آرہے تھے، اجتہاد کے دروازے کو

بند کر دیا جائے تاکہ بات بگڑنے نہ پائے ان حضرات کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اجتہاد بھی منصب نبوت کی طرح بالکل ختم ہو گیا ہے اور آگے آنے والے ادوار میں اجتہاد بہر صورت ممنوع ہے،

علامہ عز الدین بن عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ فقہاء شافعیہ میں بہت بلند مقام فقیہ ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر آج کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس میں کوئی نص نہ ملے یا اس کے بارے میں سلف صالحین کے درمیان اختلاف ہو تو لازمی طور پر اسے کتاب و سنت کی روشنی میں اجتہاد ہی سے حل کیا جائے گا اس کے سوا کوئی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ہذیان کا مریض ہو۔

جن علماء کرام نے اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا حکم دیا تھا ان کی مراد بھی یہ تھی کہ ائمہ مجتہدین نے نصوص کتاب و سنت سے جتنے مسائل کا استنباط کیا ہے اور وہ استنباط کسی عرف اور وقتی مصلحت پر بھی مبنی نہیں تھا تو بلا وجہ پھر ان مسائل کو زیر بحث لا کر نئے سرے سے استنباط و اجتہاد کی ضرورت تو ہے نہیں اور خطرات موجود ہیں اس لیے اجتہادِ مطلق کا دروازہ بند ہونے کا فتویٰ دینی مصالح کی بنا پر دیا تھا ورنہ تخریج و ترجیح کا سلسلہ تو انھوں نے بھی جاری رکھا تھا یہ بھی تو ایک جزئی اجتہاد ہی ہوتا ہے" اگر پہلے دور میں امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ تھا اور صدیوں اس پر عمل ہوتا رہا بعد میں حالات کا تقاضا ہوا کہ صاحبین کا قول ارفق بالناس ہے یا بعد کے عرف کے مطابق ہے تو متاخرین فقہاء نے اس کو ترجیح دی تو یہ بھی تو یک گونہ اجتہاد ہے یا حنفی فقہ کے متفقہ مسئلہ کو چھوڑ کر امام شافعیؒ کے مسلک کو کسی خاص مسئلے میں لے لیا تو یہ بھی اجتہاد ہے اور اس قسم کا اجتہاد چوتھی صدی سے لے کر آج تک ہر دور میں خود فقہائے حنفیہ کے ہاں جاری رہا ہے خود عالمگیری، رد المختار، بدائع الصنائع البحر الرائق، معین الحکام، جامع الفصولین وغیرہ تمام کتب فقہ سے سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور آج ہم صرف اسی اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ ہم کو بھی واقعۃً اسی کی ضرورت پیش آئی ہے لیکن انفرادی اجتہاد آج بہت زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ جو خطرات کل تک واہمہ کی حیثیت رکھتے تھے جن کے پیش آنے کا خوف چوتھی صدی ہجری کے بعد دامن گیر تھا اور جن کی وجہ سے فقہائے مذاہب نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تھا وہ آج کے دور میں ایک امر واقعہ بن گئے ہیں، آج دین کے سوداگروں کی ریل پیل ہے اور حقیقۃً نیکو کار اور خدا ترس علماء فقہا کی نسبت یہ متجددین زیادہ چرب زبان بھی ہیں تو اسلامی قوانین ایسے ہی محرفین کا تختۂ مشق بن جائیں گے

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

عرفانِ امداد

(حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا ایک غیر مطبوعہ خط)

(۲)

"عرفانِ امداد" کی گزشتہ قسط ترتیب دینے کے بعد حضرت حاجی صاحب کا ایک اور گرامی نامہ حاصل ہوا، یہ گرامی نامہ اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس وقت تک حضرت حاجی صاحب کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں وہ سب حضرت کے مریدین و خلفاء اور وابستگان فیض کے نام ہیں؛ یہ پہلا خط شائع ہو رہا ہے جو حضرت نے اس دور کی ایک معروف شخصیت، اور اپنے بزرگ زادہ[۱] کو تحریر فرمایا ہے۔

مکتوب گرامی!

از فقیر نیاز مند امداد اللہ عفی اللہ عنہ، بعالی خدمت فیضدرجت

مکرم معظم حضرت سید شاہ میر عبد اللہ صاحب مد فیوضہ۔

بعد سلام مسنون و نیاز مشحون، مشہود ضمیر منیر باد والا نامہ کرمت شمامہ ورود آوردہ۔ معزز و ممتاز فرمود، واز حال مندرجہ اش مفتخر گردانید، اللہ تعالیٰ ذات بابرکات را معہ

---

[۱] حضرت حاجی صاحب، المکتوب الیہ شاہ میر عبد اللہ کے جد امجد، حضرت شاہ نصیر الدین سے بیعت تھے ان کے وصال کے بعد حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی سے رجوع فرمایا تھا۔

صحت و عافیت بر سر نیازمنداں سلامت با کرامت دارد۔

در مقدمہ عزیز جان عطا، اللہ صاحب ارشاد بود کہ عزیز از جان موصوف جگر گوشہ فقیر است، و از صلاحیت او بسیار خوشنود شدم، اللہ تعالیٰ در عمرش برکت داد و داد او را بر طریقہ بزرگان خود مستقیم دارد،

و نیز ذات شریف آنجناب را از امراض جسمانی و روحانی صحت کامل عطا فرماید، و از زیارت حرمین شریفین مشرف سازد، بذریعہ ایں نعمت فقیر ہم مشرف بملازمت جناب شود۔
ایں نیازمند نیز مستدعی دعا، خاتمہ خیر است۔

بخدمت جمیع عزیزان سلام و نیاز قبول باد۔ فقط

ترجمہ:۔

از نیازمند فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ

بعالی خدمت فیض درجت کرم معظم حضرت سید شاہ عبد اللہ صاحب[۱] مد فیوضہ

بعد سلام مسنون با و نیاز مشحون، خدمت والا میں عرض ہے کہ گرامی نامہ نے ورود فرما کر

---

[۱] حضرت شاہ میر عبد اللہ بن شاہ صابر بخش بن سید شاہ نصیر الدین بن غلام سادات حسینی۔ تعلیم کی نسبت معلومات نہیں ملتی، غالباً حضرت شاہ صابر بخش سے تعلیم پائی۔ شاہ صابر بخش کی وفات (۱۳؍ ربیع الاول ۱۲۳۷ھ ۱۱؍ دسمبر ۱۸۲۱ء) کے بعد سجادہ نشین ہوئے، اس کا ذکر سر سید احمد خاں نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"ان حضرت (شاہ صابر بخش) کے بعد فرزند و خلیفہ رشید آپ کے سید عبد اللہ سلمہ اللہ مسند خلافت پر متمکن ہو کر پوری طرح خدمت فقرا میں معروف ہیں"۔ (آثار الصنادید ص ۲۴۴ نولکشور)

شاہ عبد اللہ صاحب نے ۲۹ر شعبان ۱۲۹۵ھ (۱۱؍ مئی ۱۸۷۸ء) کو وفات پائی۔ (سیر دہلی شاہ محمد اکبر دانا پوری ص ۶۸)

"واقعات دار الحکومت" میں شاہ صابر بخش اور شاہ عبد اللہ کی تواریخ وفات میں دلچسپ غلطی ہوگئی ہے۔ مولوی بشیر الدین، شاہ عبد اللہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"انھوں نے ۲۹ر شعبان ۱۲۳۷ھ ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۱ء کو بہادر شاہ کے زمانے میں انتقال کیا"

(واقعات دار الحکومت ص ۱۳۲/۲۶۶۔ آگرہ) بہادر شاہ ثانی کے عہد میں شاہ صابر بخش نے وفات پائی ہے۔ لیکن ان کی صحیح تاریخ وفات ۱۱ر دسمبر ۱۸۲۱ء ہے۔

اعزاز و امتیاز سے نوازا، اور اس کے مندرجہ حالات نے انتہائی بخشا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ذات با برکات کو صحت و عافیت سے ہم نیازمندوں کے سر پر ـــ قائم ـــ رکھے۔

عزیز میاں عطاء اللہ کے مقدمہ میں آپ کے فرمانے کی ضرورت نہیں تھی، عزیز از جان موصوف فقیر کا جگر گوشہ ہے، اور ـــ میں ـــ ان کی صلاحیت سے بے حد خوش ہوا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے، اور اپنے بزرگوں کے طریقہ پر قائم رکھے، اور آپ کی ذات شریف کو امراض جسمانی و روحانی سے صحت کامل عطا فرمائے، اور حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف فرمائے، اس نعمت ـــ آپ کی زیارت حرمین ـــ کے ذریعہ سے یہ فقیر بھی آپ کی ملاقات سے مشرف ہو سکے گا۔ نیازمند بھی خاتمہ بخیر کی دعا کی درخواست کرتا ہے۔

تمام عزیزوں کی خدمت میں سلام نیاز قبول ہو۔

پتہ!

انشاء اللہ تعالیٰ۔   در دہلی در امام باڑہ حضرت شاہ صابر بخش قدس سرہ
بعالی خدمت فیض درجت جناب مکرم و معظم حضرت شاہ میر عبد اللہ صاحب دامت برکاتہم۔
مشرف باد

از مکہ معظمہ۔ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ ہجری نبوی صلعم
(۱۹ فروری ۱۸۸۴ء)

؎ اس گرامی نامہ کی فوٹو کاپی جناب سید ناصر حسین صاحب سجادہ نشین درگاہ صابریہ دریا گنج، دہلی نے عنایت فرمائی جس کے لیے ہم بیحد ممنون ہیں۔

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

خاندان نبوی پر زکوٰۃ کی حرمت — اور بعض مغربیت زدہ لوگوں کا اس پر اعتراض

اسلامی شریعت کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس کے احکامات صرف خیالی تصورات و تخیلات پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ شریعت اسلامیہ نے حقائق و واقعات، فطرت و نفسیات کو پیش نظر رکھ کر احکام جاری کیے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلامی شریعت کے زیر سایہ جو مثالی معاشرہ وجود میں آیا تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مغربی نظام و فلسفہ کا کھوٹ انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ نے اپنی مادی ترقیات کے ذریعہ اپنے ایجاد کردہ فلسفہ کو خوب فروغ دیا۔ یورپ کی چند مسحور کن اصطلاحات مساوات، جمہوریت، سوشلزم وغیرہ نے جادو کا کام کیا۔ یورپ کے پروپیگنڈے سے مسلمانوں کا بھی بہت بڑا طبقہ متاثر ہو گیا۔ انھوں نے اسلام کے احکام کو اہل یورپ کی دی ہوئی کسوٹی پر جانچنا شروع کر دیا۔ اسلامی احکام کے ایک بڑے حصے کو محض اس بنا پر رد کرنے کے قابل سمجھا کہ وہ نام نہاد یورپی مساوات یا سوشلزم کے نظریہ کے خلاف ہے۔ کافی دنوں یہ صورت حال رہی۔ لیکن یورپ کے سیاسی دباؤ کی کمی کے ساتھ یہ مرعوبیت بھی کم ہوتی گئی۔

ایک طویل عرصہ تک دنیا نے یورپ کے فلسفہ و نظام کو آزمایا۔ تجربہ کی کسوٹی نے

اس تہذیب و فلسفہ کا کھوٹ ظاہر کر دیا۔ تجربات نے بتا دیا کہ یہ خود ساختہ قانون و فلسفہ انسانی فطرت کے خلاف ہے، اس تہذیب کی مسحور کن اصطلاحات محض ڈھونگ ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ——— یہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود مسلمانوں کا ایک طبقہ اب تک ذہنی مرعوبیت میں گرفتار ہے۔ چنانچہ بعض مغرب زدہ "محققین" یورپ کے نظریہ مساوات کے پیش نظر باب زکوٰۃ کے ایک مسئلہ کو بدلنے کی فکر میں ہیں۔

ایک متفق علیہ مسئلہ

فقہ اسلامی کا مشہور مسئلہ ہے کہ خاندان نبوت کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے اور اس مسئلہ پر امت کے فقہا کا اجماع رہا ہے۔ ہاں اس مسئلہ کے چند متعلقات میں ضرور اختلاف رائے ہے، مثلاً خاندان نبوی کا مصداق کون لوگ ہیں؟ حرمت زکوٰۃ کی علت محض قرابت نبوی ہے یا قرابت مع النصرۃ وغیرہ، لیکن اصل مسئلہ میں کسی قابل ذکر امام و مجتہد کا اختلاف نہیں ہے۔ مشہور حنبلی فقیہ ابن قدامہ اپنی کتاب مغنی میں لکھتے ہیں :-

لا نعلم خلافا فی ان بنی ھاشم لا تحل لھم الصدقۃ المفروضۃ [۱]	ہمیں بنو ہاشم کے لیے زکوٰۃ حرام ہونے میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہے۔

متعدد احادیث میں اس حرمت کو صریح طور پر بیان کیا گیا ہے صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرۃ سے روایت ہے کہ "حضرت علیؓ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ نے صدقہ کی ایک کھجور لے کر اپنے منھ میں رکھ لی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تھو تھو۔ کھجور پھینک دو کیا تمھیں یہ بات نہیں معلوم کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے [۲]"

صحیح مسلم کی روایت ہے۔ "حضرت عبد المطلب بن ربیعہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ صدقات لوگوں کا میل کچیل ہیں۔ صدقات محمدؐ اور آل محمدؐ کے لیے حلال نہیں [۳]"

---

[۱] المغنی ص۵۱۹/۲ج [۲] صحیح بخاری جلد اول باب ما یذکر فی صدقۃ النبی و آلہ۔
[۳] مسلم جلد اول باب تحریم الزکوٰۃ علی رسول اللہ۔

مغربیت زدہ طبقہ کے اعتراضات

بعض "مساوات زدہ" افراد نے اس حکم شرعی پر دو طرح سے اعتراض کیے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ صدقات کو میل کچیل قرار دے کر خاندان نبوی کے لیے اس کی حرمت اور دوسرے خاندانوں کے لیے اسکی حلت مساوات کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلام نے ایک خاندان کو معزز قرار دے کر ان کے لیے اوساخ الناس (لوگوں کے اموال کے میل کچیل) کو حرام قرار دیا اور دوسرے خاندانوں کو ذلیل و کمتر درجہ کا مان کر ان صدقات کو ان کے لیے حلال ٹھہرا دیا۔

ایک دوسرا "مساوات زدہ" طبقہ اس طرح لب کشا ہوا، کہ یہ تو خاندان نبوی کے اوپر بہت بڑا ظلم اور ان کے ساتھ بے انصافی ہے کہ فقر و احتیاج کی حالت میں بھی ان کے لیے زکوٰۃ کو حرام قرار دے دیا گیا، کیا ان کی قربانیوں کا صلہ یہی ہے کہ انھیں دوسرے خاندانوں سے بھی کم حق دیا جائے اور رزق کا ایک دروازہ ان پر بند کر دیا جائے۔

زکوٰۃ کی شرعی حیثیت

اس مسئلہ کی وضاحت کرنے اور اعتراضات کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی شرعی حیثیت اور اس کے بارے میں شریعت کے منشا کی مختصر طور پر وضاحت کر دی جائے تاکہ جواب بات سمجھنے میں آسانی ہو۔

مال کے بارے میں اسلام مسلمانوں کے دلوں میں یہ تصور قائم کرنا چاہتا ہے کہ یہ انکی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ مال و دولت کے سلسلے میں ان کی حیثیت صرف اللہ کے خلیفہ و نائب کی ہے۔ لہٰذا مال میں اپنی حکومت اور خودمختاری جتانے کے بجائے خدا تعالیٰ کے احکام کے مطابق تصرف کرنا چاہیے۔ قرآن مجید کی مختلف آیات اور متعدد احادیث میں اس نقطہ نظر کو مختلف پیرایوں سے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

خلافت و نیابت کا یہ تصور قائم کرنے کے بعد اسلام نے مالداروں پر زکوٰۃ فرض کی۔ زکوٰۃ فرض کرنے میں دو بنیادی مصلحتیں ہیں (۱) مال کی محبت کی وجہ سے انسان کے دل میں بخل کا جو مرض پیدا ہوتا ہے زکوٰۃ کے ذریعہ اس مرض کا ازالہ کر کے انسانی ہمدردی، غربا، نوازی، مسکین پروری کی صفات پیدا کرنا (۲) سماج میں جو معذور اور لاچار افراد ہیں، یا جن افراد کو ہاتھ پیر مارنے کے باوجود بھی روزی میسر نہ آسکی ان کے گذر بسر کا آسانی سے انتظام کرنا۔

صدقات کھانا اسلام کی نگاہ میں

اس سلسلے میں ایک بات اور ذہن نشین کرنے کے قابل ہے۔ اسلام نے کبھی بھی زکوٰۃ وصدقات کھانے اور اس پر گذر بسر کرنے کی ہمت افزائی نہیں کی ہے۔ اسلام نے ہمیشہ ان لوگوں کی ہمت افزائی اور تعریف کی ہے جو اپنے خون پسینے اور قوت بازو سے حاصل کی ہوئی روزی پر گذارا کرتے ہیں —— دوسروں کی امداد کی امید پر ہاتھ پر ہاتھ سمیٹ کر، اپاہج بن کر بیٹھ جانا اسلام کی نگاہ میں قابل تعریف اور مستحسن ہونے کے بجائے ایک مذموم حرکت ہے۔ ایسے افراد معاشرے کے لیے ایک بوجھ بن جانے کے علاوہ بلند ہمتی، خودداری، اولوالعزمی، غیرت وحیا کے جوہروں سے خالی ہو جاتے ہیں۔

حضرت زبیر بن عوامؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ بات کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنی رسی لے اور جنگل سے لکڑیوں کا گٹھر اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور اس کو بیچ لے ...... اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے مانگتا پھرے۔ پھر لوگ اس کو دیں یا نہ دیں[1]۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر فرمایا: کہ تو لوگوں سے کچھ نہ مانگ۔ میں نے عرض کیا، ہاں میں کسی سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تیرا کوڑا زمین پر گر جائے تو وہ بھی کسی سے نہ مانگ بلکہ سواری سے اتر کر خود اسے لے[2]۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے مملکت کا نظام بگڑنے کا ایک اہم سبب اس بات کو قرار دیا ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد بیت المال پر بوجھ بن جائے اور وظیفہ خواری کو ذریعہ معاش بنائے، شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"اور اس زمانہ میں شہروں کی ویرانی کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ بیت المال پر بوجھ ہیں، اس طرح کہ غازیوں اور علماء کے جن کا بیت المال میں حق ہے، شعراء اور زہاد وغیرہ نے جن کے ساتھ سلاطین سلوک کرتے ہیں بیت المال سے حاصل کرنا پیشہ بنا لیا ہے۔ یہ لوگ کوئی خدمت نہیں کرتے اور ان کا گذارا بیت المال سے ہوتا ہے[3]۔"

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۱۶۳ ج ۱، بخاری صفحہ ۱۹۹ ج ۱ [2] مشکوٰۃ صفحہ ۱۶۴ ج ۱ [3] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۴۵ ج ۱ رشیدیہ دہلی

بہر حال اسلام مفت خوری اور زکوٰۃ و صدقات کو ذریعہ معاش بنانے کی ذرہ برابر ہمت افزائی نہیں کرتا بلکہ شدید مذمت کرتا ہے۔

زکوٰۃ کے بارے میں شریعت کے اس نقطہ نظر کی وضاحت کے بعد ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کن حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر زکوٰۃ کو خاندان نبوی کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔

خاندان نبوی پر زکوٰۃ کی حرمت کی پہلی مصلحت

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان اپنی قوت بازو سے کما کر روزی حاصل کریں۔ لیکن مجبوری کی حالت میں عام مسلمانوں پر تنگی نہیں کی گئی بلکہ آسانی کے خیال سے صدقات کا استعمال ان کے لیے جائز قرار دیا مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے لیے راہ عزیمت کو پسند کیا، احتیاج و فقر کی حالت میں بھی ان کو "اوساخ الناس" سے منع کیا۔ اور زکوٰۃ کو میل کچیل سے تعبیر کرنا صرف لوگوں کو متنفر کرنے کی غرض سے نہیں ہے۔ بلکہ اہل بصیرت و روحانیت نے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ اوساخ الناس کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"میں کہتا ہوں صدقات کے میل ہونے کی یہ وجہ ہے کہ صدقات گناہوں کو دور کرتے ہیں اور بلا کو دفع کرتے ہیں۔ اور بندہ کی طرف سے وہ فدیہ بن جاتے ہیں۔ پس ملاءِ اعلیٰ کی نظر میں یہ صدقات بالکل میل ہی دکھائی دیتے ہیں جس طرح صورت ذہنیہ و نقطیہ و خطیہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورتیں اسی شئی خارجی کا وجود ہیں۔ اور اس کو ہم وجود تشبیہی کہتے ہیں۔ پس بعض نفوس عالیہ کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ان صدقات میں ایک قسم کی تاریکی ہے اور بعض امکنہ سافلہ کی طرف اس امر کا نزول ہوتا ہے اور کبھی بعض اہل مکاشفہ کو بھی اس تاریکی کا ادراک ہوتا ہے —— اور میرے والد صاحب قدس سرہ بھی اس امر میں اپنا مکاشفہ بیان فرماتے تھے۔

اور نیز جس مال کو انسان بغیر کسی چیز کے عوض یا محنت کے لیتا ہے اور اس کے دینے میں اس انسان کا اعزاز و اکرام مقصود نہیں ہوتا تو اس مال کے لینے میں لینے والے کی ذلت و اہانت ہوتی ہے اور دینے والے کو اس پر فضیلت و فوقیت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) نیچے کے ہاتھ سے (یعنی لینے والے ہاتھ سے)

بہتر ہے" بس زکوٰۃ و صدقات حاصل کرنے کا پیشہ بدترین پیشہ ہے، اور جو لوگ دینی حیثیت سے بزرگ اور محترم ہیں اُن کی شان کے بالکل لائق نہیں ہے۔

دوسری مصلحت خاندان نبوی کے لیے صدقات حرام ہونے کی دوسری بنیادی مصلحت یہ ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کے لیے صدقات جائز کر دیتے تو مخالفین کو اعتراض کا موقع مل جاتا۔ وہ کہتے کہ اس شخص نے صدقات وصول کر کے اپنے لوگوں کا پیٹ پالنے کے لیے یہ مذہبی ڈھونگ رچایا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ رقمطراز ہیں:۔

"خاندان نبوی کے لیے زکوٰۃ ممنوع ہونے کے دلائل بالکل واضح ہیں۔ یہ آیت بھی اس کی تائید کرتی ہے قل ما اسئلکم علیہ اجرا (آپ فرما دیجیے کہ میں اس تبلیغ و دعوت پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں) کیونکہ اگر نبی اکرم علیہ السلام اپنے خاندان کے لیے زکوٰۃ کو حلال کرتے تو آپ کے مخالفین اس کو بنیاد بنا کر آپ کے خلاف پروپیگنڈہ کر سکتے تھے"۔[۲]

حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے انداز میں اس حکمت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"اور اس حکم میں ایک حکمت اور راز یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر خود صدقہ لیتے اور اپنے خاص لوگوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جن کا نفع آپ ہی کا نفع ہے، اس کے لینے کو جائز فرماتے تو لوگ آپ سے بدگمانی کرتے اور آپ کے حق میں نامناسب باتیں کرتے۔ اس واسطے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دروازہ کو بالکل بند کر دیا"۔[۳]

تیسری مصلحت تیسری حکمت یہ ہے کہ اگر خاندان نبویؐ کے لیے زکوٰۃ کا لینا درست ہوتا تو امت مسلمہ کے مالدار لوگ خاندان نبوی سے محبت کی بنا پر تلاش کر کے زکوٰۃ انھیں کے حوالہ کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بعض دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی نسلی اجارہ داری قائم ہو جاتی، دوسرے خاندانوں کے فقراء و مساکین زکوٰۃ و صدقات سے محروم ہو جاتے۔

زکوٰۃ و صدقات کے نظام میں اسلام نے جو اصلاحات کی ہیں اُن کو بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:۔

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۴۵-۴۶ [۲] فتح الباری ج ۳ ص ۲۸۰ [۳] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۴۶

"دوسری طرف ان سے ان فقرا، ومساکین و مستحقین زکوٰۃ کو بھی سخت نقصان پہنچ رہا تھا جن کے حقوق پامال ہو رہے تھے۔ اس لیے کہ صدقہ کرنے والا قدرتی طور پر یہ چاہتا تھا کہ اس کا صدقہ اس شخص کو پہنچے جو کسی دینی منصب پر فائز ہو، اپنی رگوں میں انبیاء کا خون رکھتا ہو، اور کسی شریف و اعلیٰ خاندان سے متعلق ہو۔ ہندوستان میں یہ بات سب سے زیادہ نمایاں تھی، یہاں برہمن مندروں کے پروہت و پنڈت، ان صدقات پر پوری طرح قابض تھے اور ان محتاج اور مستحق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا جو مقدس برہمنی خون نہ رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کو اتنا بھی میسر نہ تھا جس سے ان کی زندگی قائم رہتی۔ وہ دولت مندوں کی بے پرواہی، برہمنوں اور پنڈتوں کی تعیش پسندی اور اس مخصوص مذہبی قانون کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے تھے جس کی ذمہ داری آرین نسل پر سب سے زیادہ ہے۔

اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ نے اس مذہبی خاندانی اجارہ داری اور اجتماعی ناانصافی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ آپ نے بنو ہاشم پر جو خود آپ ہی کا خاندان ہے اور اسلامی تاریخ اور دینی جدوجہد کے میدان میں بھی بڑی فضیلت رکھتا ہے زکوٰۃ حرام کر دی اور بڑی قوت و صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ صدقہ ہمارے لیے حلال نہیں یہ خاندانِ نبوی پر صدقات کی حرمت کی یہ تین مصلحتیں ہیں۔ ان کے علاوہ حکمائے اسلام نے چند اور مصلحتیں بھی بیان کی ہیں لیکن بحث طویل ہونے کے خوف سے انھی تین مصلحتوں کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں ــــــ اس کے بعد ہم معترضین کے اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔

(باقی)

ارکان اربعہ ص ۱۸۵-۱۸۶

مرحوم مغفور شاہ مسعود صاحب

الفرقان کے گزشتہ ہی شمارہ میں "یادِ رفتگاں" کے ذیل میں قصبہ بہٹ ضلع سہارنپور والے شاہ مسعود صاحب کے حادثۂ رحلت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جس وقت وہ لکھا گیا تھا حادثہ کی تفصیل اور واقعی نوعیت بھی معلوم نہیں ہو سکی تھی ــــــ جس کے معلوم کرنے کا راقم سطور کی طرح الفرقان کے اُن تمام ناظرین کو انتظار و اشتیاق ہو گا جو مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے کوئی نسبت رکھتے ہیں اور مرحوم شاہ صاحب کے ساتھ حضرتؒ کے خصوصی تعلق سے واقف ہیں ــــــ بعد میں مولانا محمد عابد صاحب (مدرس مدرسہ زاہدیہ۔ بہٹ) کے ایک خط سے حادثہ کی تفصیل معلوم ہوئی ــــــ نیز مرحوم کے خاص دوست و خواجہ تاش اور مرشدنا حضرت رائے پوریؒ کے (غالباً سب سے زیادہ) بے تکلف خادم اور حضرت کی مجلس کی رونق، بھائی راؤ عطاء الرحمان خاں رائے پوری نے بھی اپنے ایک مکتوب میں مرحوم شاہ صاحب کے چند واقعات و روایات لکھے۔ جی چاہا کہ یہ واقعات اور حادثہ کی تفصیلات بھی ناظرین تک پہنچا دی جائیں اور اس طرح الفرقان کے صفحات میں بھی محفوظ ہو جائیں۔

گزشتہ شمارہ کے تعزیتی نوٹ کے شروع میں راقم سطور نے مرحوم شاہ صاحب کے تعارف کے سلسلہ میں جو چند سطریں لکھی تھیں ــــــ ناظرین یہاں ان کو پھر پڑھ لیں۔ لکھا گیا تھا کہ

> جو حضرات مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ سے کچھ تعلق اور واقفیت رکھتے ہوں گے، غالباً وہ شاہ مسعود صاحب سے ناواقف نہ ہوں گے۔ اُن کے والد ماجد شاہ زاہد حسن مرحوم، جو ضلع سہارنپور کے گویا ایک رئیس اعظم تھے، حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے شیخ

ومرشد حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے خاص الخاص نیازمند اور گویا عاشق صادق تھے پھر اسی نسبت سے اُن کے جانشین حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ساتھ ان کا تعلق عباذ و نیازمندانہ رہا، شاہ زاہد حسن صاحبؒ کے انتقال کے بعد اُن کے صاحبزادے شاہ مسعود صاحب نے جو اس وقت نوعمر تھے، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کو صرف شیخ و مرشد ہی نہیں بلکہ اپنے مرحوم والد ماجد کی جگہ اپنا مربی و سرپرست بھی بنا لیا اور حضرت نے بھی اُن کے ساتھ وہی رویہ رکھا جو اولاد کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔"

حضرت رائپوریؒ کی عنایت و شفقت کے بعض واقعات

بھائی راؤ عطاء الرحمان خاں صاحب نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ میں شاہ صاحب سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کچھ باتیں کر رہا تھا تو شاہ صاحب بولے۔ بھائی! میں خود حضرت کی زندہ کرامت ہوں ــــ والد صاحب کے وصال کے بعد مجھے ٹی بی ہو گئی، ماموں جان (شاہ محمد حسن) نے مجھے دہلی لیجا کر سینی ٹوریم میں داخل کر دیا، ــــ میں چار پانچ ہی روز کے بعد بھاگ آیا، وہاں جی نہیں لگا ــــ ماموں جان نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ اس کا مرض مہلک ہے اور یہ چلا آیا ہے، حضرت ہی اس کو سمجھا دیں کہ یہ دہلی جائے اور جبتک وہاں رہنا ضروری ہو وہیں رہے ــــ حضرت نے مجھے بلایا اور فرمایا ــــ "برخوردار علاج ضرور کراؤ"، ــــ میں نے عرض کیا کہ کیا علاج آنے والی موت کو روک دے گا؟ ــــ حضرتؒ نے فرمایا کہ حکم یہی ہے کہ علاج کرایا جائے ــــ اور فرمایا کہ میں خود دہلی تیرے ساتھ چلوں گا اور جب تک آرام ہوگا وہیں رہوں گا ــــ میں نے کہا وہاں عورتیں (یعنی نرسیں) آتی ہیں اور طرح طرح کی باتیں بناتی ہیں ــــ حضرت نے فرمایا تم اپنی نظر نیچی کر لیا کرو، اور میں روزانہ کچھ وقت تیرے پاس رہا کروں گا ــــ حضرت کے فرمانے سے میں نے ارادہ کر لیا، خود حضرت بھی دہلی تشریف لے گئے اور قصاب پورہ کی نواب والی مسجد میں قیام فرمایا، اور روزانہ میرے پاس تشریف لاتے رہے، الحمد للہ بس دن نہیں ہوئے تھے کہ میں بالکل ٹھیک ہو گیا اور حضرت کے ہمراہ ہی آگیا ــــ شاہ صاحب نے کہا وہ دن ہے اور آج کا دن

مجھے کبھی کھانسی، بخار نے چھوا بھی نہیں۔ کیا مجھے دیکھ کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کو کبھی ٹی بی ہوئی ہوگی [1]

بھائی عطاء الرحمان خاں صاحب ہی نے شاہ صاحب ہی کی روایت سے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ۔ گرمی کا موسم آیا اور گرمی شدید تھی، میں نے خود بھی کچھ عرصہ کے لیے مسوری پہاڑ پہ قیام کرنے کا ارادہ کیا اور چاہا کہ کسی طرح حضرت بھی تشریف لے چلیں اور وہیں قیام فرمائیں۔ (واضح رہے کہ مسوری پر خود شاہ صاحب کی عالیشان ذاتی کوٹھی تھی) میں نے حضرت سے عرض کیا کہ معالج ڈاکٹروں نے گرمی میں مسوری پہ قیام کے لیے کہا تھا، —— فرمایا ہاں ضرور جاؤ! میں نے عرض کیا کہ میں تو حضرت کے بغیر نہیں جاؤں گا اگر حضرت تشریف لے چلیں تب تو میں جاؤں گا ورنہ نہیں جاؤں گا —— فرمایا کہ بھائی تجھے تو صحت کے لیے جانا ضروری ہے میرا کیا کام ہے، فضول خرچ مت کرو! میں نے عرض کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو میں تو حضرت کے بغیر نہیں جاؤں گا، میں نے اس کے لیے ضد کی، ۔ آخر میں حضرت نے فرمایا کہ رمضان مبارک قریب ہے شرط یہ ہے کہ تراویح میں کلام پاک تو خود سنائے گا۔ (شاہ صاحب کا بیان ہے کہ، حضرت کو معلوم تھا کہ میں بہت کچھ بھول گیا ہوں اس لائق نہیں ہوں کہ تراویح میں سنا سکوں، —— لیکن حضرت نے یہ شرط لگا دی، مجبوراً میں نے اقرار کرلیا، الغرض حضرت بھی مسوری تشریف لے گئے، چند ہی روز بعد رمضان مبارک بھی آگیا —— پھر الحمد للہ حضرت کی برکت سے میں نے تراویح میں قرآن پاک سنایا —— جب ختم ہوا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ اب یہاں آنا وصول ہوا —— شاہ صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد سے ایسا یاد ہوا کہ بھولنا الحمد للہ بالکل ہی ختم ہوگیا۔

حضرتؒ کے آخری دور علالت میں جب ایک سال حضرت کا قیام شاہ مسعود حسن صاحب کی سہارنپور والی کوٹھی (بہٹ ہاؤس) میں طویل مدت تک رہا۔ رمضان مبارک بھی وہیں آیا، نماز تراویح بھی وہیں ہوتی تھی، بہت بڑا مجمع ہوتا تھا، بہٹ ہاؤس بہت وسیع ہونے کے باوجود تنگ ہو جاتا تھا۔ حضرت کے حکم سے قرآن مجید شاہ صاحب ہی نے سنایا، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ بھی وہیں نماز عشا اور تراویح پڑھتے تھے، یاد نہیں پڑتا کہ اللہ

[1] شاہ صاحب جسمانی حیثیت سے ماشاء اللہ بہت تندرست تھے، پہلوانوں کا سا جسم تھا، کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ کبھی ٹی بی کے مریض رہے ہوں گے۔

کے بندہ کو کسی دن کہیں تشابہ بھی لگا ہو، سب ہی سننے والوں کا یہ احساس تھا اور شیخ الحدیث بھی فرماتے تھے کہ ایسے لطف و لذت کے ساتھ غالباً کبھی قرآن پاک نہیں سنا، ان کی قرات و تلاوت میں بڑی دلکشی تھی اور بقول مولانا محمد عابد صاحب یاد ایسا تھا جیسے ہم لوگوں کو الحمد شریف یاد ہوتی ہے ــــــ بلاشبہ یہ حضرت اقدس رائے پوریؒ کی برکت و کرامت تھی۔

حضرت کے مہمانوں اور حضرت کے سلسلہ سے آنے جانے والوں کی خاطر مدارات پر مرحوم بہت خوش دلی اور کشادہ دستی سے خرچ کرتے تھے اور بے حساب خرچ کرتے تھے ــــــ ایک دفعہ حضرت نے تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میرے اوپر اتنا خرچ نہ کیا کرو، شاہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت جو کچھ میرے پاس ہے اگر سب حضرت ہی پر خرچ ہو جائے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔

بھائی عطاء الرحمان خاں صاحب نے لکھا ہے کہ مرحوم شاہ مسعود صاحب کا مستقل معمول تھا کہ سردی کا موسم آنے پر بہت سے لحاف بنواتے اور چوری چھپے غربا کے گھروں پر پہنچواتے، کسی کی ضرورت علم میں آتی تو اکثر خفیہ طور پر اس کی اعانت کرتے ــــــ دولت جمع کرنے کی فکر سے دل بالکل ہی خالی تھا۔ کھانا پہننا بھی بالکل سادہ تھا۔ ۲۵، ۲۶ فروری کی درمیانی شب میں جب اس دنیا سے سفر کیا تو جیب میں صرف ایک سو دس روپئے تھے اس کے علاوہ نہ گھر میں کوئی قابل ذکر سرمایہ تھا نہ بینک بیلنس ــــــ حالانکہ جائداد و باغات کی آمدنی اتنی تھی کہ بینک میں لاکھوں کا سرمایہ ہونا چاہیے تھا ــــــ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو اپنی شان کریمی کے مطابق قبول فرمائے اور بہتر سے بہتر صلہ آخرت میں عطا فرمائے۔

مولانا محمد عابد صاحب مدرس مدرسہ زاہدیہ بہٹ نے اپنے گرامی نامہ میں حادثۂ رحلت کی جو تفصیل لکھی ہے، ناظرین کرام وہ انہی کے الفاظ میں پڑھیں ــــــ راقم سطور (محمد منظور نعمانی) کے نام گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

حضرت شاہ مسعود حسن صاحب کا انتقال صرف ۱۰ گھنٹہ کی مختصر علالت کے بعد حرکت قلب بند ہو جانے سے ۲۶ فروری ۷۹ء منگل کی شب میں سوا بارہ بجے رات کو ہوا۔

۲۵ فروری ۸۰ء کو حسب عادت صبح بہٹ تشریف لائے ظہر کی نماز با جماعت اپنی مسجد میں ادا کی نماز سے فراغت کے بعد راؤ عطاء الرحمٰن خاں اور راؤ رافع خاں سے مکان پر کافی دیر گفتگو فرماتے رہے۔ پھر ان حضرات کے ساتھ ہی باغ تشریف لے گئے اور باغ ہی میں با جماعت نماز عصر سے فراغت فرما کر سہارنپور تشریف لے گئے۔ رات کو طبیعت ٹھیک رہی ۲۶ فروری ۸۰ء بروز پیر صبح کی نماز میں دورہ کا اچانک حملہ ہوا۔ جلدی سے نماز سے فارغ ہونے کے بعد اوپر کی منزل میں اپنے کمرے پر تشریف لے گئے علاج معالجہ شروع کردیا گیا مگر طبیعت سکون پر نہیں آسکی ڈاکٹر آتے جاتے رہے ظہر کے بعد جب خطرہ محسوس ہوا تو سول سرجن کو بلایا گیا اس نے دیکھ کر کہا کہ آپ نے کیس کو دس گھنٹے لیٹ کردیا۔ کئی انجکشن لگائے مکمل آرام کو کہا مگر شاہ صاحب اپنی بے چینی کی بنا پر ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل نہ کرسکے طبیعت بگڑتی چلی گئی، نیند کے انجکشن بھی لگائے دن میں سکون کچھ دیر کے لیے ہوا بھی مگر اس کے بعد حالت بگڑتی رہی، رات کو جب نیند کا اثر معلوم ہوا تو ٹائم معلوم کیا، بتلایا گیا کہ پونے بارہ بج رہے ہیں فرمانے لگے کہ اب تو ذرا سو جاؤں چار بجے اٹھا دینا نماز ادا کرلوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد کروٹیں لینی شروع کردیں یہ دورہ کا آخری سخت حملہ تھا ــــ سورۂ یٰسین شریف شاہ صاحب نے خود پڑھنی شروع کردی، ایک جگہ جا کر رکے تو بیگم صاحبہ فوراً ہی آگے پڑھنا شروع کردیا۔ یہ رکنا روح کی پرواز تھی، یہ پیر اور منگل کی درمیانی شب تھی رات کے سوا بارہ بجے تھے۔ مرحوم نے ظہر، عصر، مغرب با قاعدہ ادا کیں جبکہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ حرکت مت کرنا، مگر یہ کہکر کہ میں تو ٹھیک ہوں، صحیح حالت کی طرح نماز ادا کرتے رہے۔ مرحوم کی عمر ۵۵ برس کی ہوئی۔

مکتوب نگار مولانا محمد عابد صاحب نے اس مکتوب میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ کہ "شاہ صاحب کا روزانہ ظہر کے بعد قرآن پاک تین پارے ترتیل کے ساتھ تلاوت کا معمول تھا ــــ اس کے علاوہ روزانہ سہارنپور سے بس کے ذریعہ بہٹ آمد و رفت میں بھی تین چار پارے پڑھ لیتے تھے، یہ بھی مستقل معمول تھا، ماشاء اللہ یاد ایسا پختہ تھا جیسا کہ ہم لوگوں کو الحمد شریف یاد ہے"

اللہ تعالیٰ مرحوم کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور درجات عالیہ عطا فرمائے۔ آمین۔

چندہ سالانہ

ہندوستان سے	۱۵/-
پاکستان سے	۳۰/-
بنگلادیش سے	۱۶/-
فی شمارہ	۱/۵۰

جلد ۴۷	بابت جون ۱۹۷۹ء مطابق رجب ۱۳۹۹ھ ہجری	شمارہ ۶

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیئے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع اگلے مہینے کی ۵ر تاریخ تک آجانا چاہیئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ ۲۵ روپے ہندوستانی سکہ میں، بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں ۳۰ روپے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ اسٹریلین بلڈنگس لاہور کو بھیج دیں

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

اپنے مختلف النوع مشاغل و مصروفیات کی وجہ سے قریباً ۱۲-۱۴ سال سے اس عاجز کا حال یہ ہے کہ صرف اُن کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں جن کا مطالعہ اپنے لئے کسی وجہ سے ضروری و ناگزیر یا خاص طور سے مفید سمجھتا ہوں ۔۔۔ اس لئے بہت سی اہم جدید مطبوعات کے مطالعہ کی نوبت نہیں آتی ۔۔۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" اب سے بہت پہلے جب شائع ہوئی تھی تو یاد ہے کہ اس کا خوب چرچا ہوا تھا۔ اسی طرح اس کی تنقید و تردید یا اس کے جواب میں مختلف حضرات نے جو کتابیں لکھیں ان کا بھی چرچا رہا تھا۔ اور رسائل و اخبارات میں ان میں سے بعض پر تبصرے بھی نظر سے گزرے تھے لیکن اس عاجز کو "خلافت و ملوکیت" کے مطالعہ کی نوبت نہ آئی نہ اس کے جواب میں لکھی جانے والی کسی کتاب کے مطالعہ کی[1]

چند روز ہوئے مولوی محمد عارف صاحب ندوی سنبھلی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) مودودی صاحب سے متعلق ایک مضمون لکھ کر لائے اور مجھ سے اس کے دیکھنے کی فرمائش کی ۔۔۔ میں نے اس کو پڑھا ۔۔ اس میں "خلافت و ملوکیت" کے حوالہ سے مولانا مودودی صاحب کی بعض عبارتیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے متعلق نقل کی گئی تھیں۔ اس عاجز کے نزدیک وہ ایسی شنیع و سخیف اور اتنی مکروہ تھیں کہ مجھے اطمینان نہیں ہوا کہ یہ عبارتیں مودودی صاحب کی ہوں گی ۔۔۔ ان کے بعض خیالات و نظریات سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود میں یہ امید نہیں رکھتا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کے بارے میں ایسی زبان استعمال کریں گے اور ایسا جارحانہ و معاندانہ رویہ اختیار کریں گے ۔۔۔ میں نے مولوی محمد عارف سے دریافت کیا کہ آپ نے یہ عبارتیں "خلافت و ملوکیت" میں خود دیکھی ہیں ۔۔ اور براہ راست اسی سے نقل کی ہیں؟ ۔۔ انھوں نے کہا میں نے "خلافت و ملوکیت" ہی سے نقل کی ہیں۔ اس کے بعد بھی میں نے ضروری سمجھا کہ میں خود اصل کتاب دیکھوں ۔ چنانچہ میں نے

[1] اب سے چند ہی مہینے پہلے پاکستان کے ایک فاضل صاحب قلم یوسف صلاح الدین صاحب کی کتاب پہنچی تھی، جو مولانا مودودی صاحب کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہے اس کا نام بھی فاضل مصنف نے "خلافت و ملوکیت" ہی رکھا ہے، اسکی کچھ ورق گردانی کی تھی اور ارادہ تھا کہ موقع ملنے پر انشاء اللہ اس کا مطالعہ کروں گا لیکن اسکی نوبت ابھی تک نہیں آسکی۔

"خلافت و ملوکیت" انہی سے منگوائی۔ اور وہ عبارتیں اس میں خود دیکھیں ——— یہ بھی دیکھ لیا کہ سیاق سباق میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے مودودی صاحب کے حق میں کوئی اچھی توجیہہ کی جاسکے ——— بہرحال مولوی محمد عارف صاحب کا وہ مضمون اسی شمارہ میں شائع کیا جارہا ہے، اگرچہ اس میں بعض الفاظ سخت ہیں لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارہ میں مولانا مودودی صاحب کی عبارتوں نے اس کا پورا جواز پیدا کردیا ہے۔

پہلے بھی بارہا تجربہ ہوا تھا اور حال میں مولانا علی میاں کی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کی اشاعت پر بھی دیکھا کہ جہاں کسی نے مولانا مودودی کی کسی سنگین سے سنگین اور سخت گمراہ کن غلطی پر بھی ٹوکا تو ان کے حلقہ کی طرف سے مخصوص ماہرانہ انداز میں یہ شور برپا کیا گیا کہ ——— اس وقت اس سے اسلام اور اسلامی جدوجہد کو نقصان اور اسلام دشمن طاقتوں کو فائدہ پہنچے گا اور ان کے ہاتھ مضبوط ہوں گے لہٰذا اس سے باز آجائیے، ورنہ آخرت میں آپ خدا کو کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی تحریروں نے اپنے لوگوں کا یہ ذہن بنادیا ہے کہ خود، وہ اور ان کی جماعت، اسلام کے واحد امین اور اجارہ دار ہیں، اور ان کے خلاف کچھ بھی کہنا اور لکھنا گویا براہ راست اسلام کو نقصان پہنچانا اور دشمنان اسلام کی مدد کرنا ہے۔

راقم سطور کے علم میں ہے کہ مولانا علی میاں کی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" بڑی تعداد میں انگلستان میں بھی منگوائی گئی تھی، اور وہاں بھی بہت پڑھی گئی ——— انگلستان کے شہر برمنگھم سے جماعت اسلامی کے حلقہ کا ایک اردو ماہنامہ "پیغام اسلام" نکلتا ہے، وہ میرے ہاں نہیں آتا ——— لیکن اسی مہینے مئی کا شمارہ خاص طور سے مجھے بھیجا گیا ہے، اس کے ٹائیٹل پیج پر خود مولانا مودودی کی ایک طویل تحریر ۱۹۵۱ء کی شائع کی گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے ——— **علمائے کرام کی خدمت میں** ——— اس کا حاصل اسی کے چند جملوں میں یہ ہے کہ:

> "ہم اس وقت فسق و ضلالت کی عالمگیر حکمرانی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ آپ کو (علمائے کرام کو) خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ کا وزن کس پلڑے کی طرف جارہا ہے۔ آپ اپنا انجام سوچ لیں اگر خدا کے ہاں آپ سے باز پرس ہوئی اور پوچھ گیا کہ جب طاعت و فسق اور ہدایت و ضلالت

کے درمیان معرکہ برپا تھا تو تم نے کس کو ترجیح دی تھی۔ اس وقت آپ کا کیا جواب ہوگا۔"

راقم سطور کا احساس یہی ہے کہ اس وقت اس کے خاص مخاطب مولانا علی میاں ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے ساتھ یہ عاجز بھی مخاطب ہو، اور اسی لئے یہ شمارہ مجھے بھیجا گیا ہو۔

مولانا مودودی کی اس تحریر کی اس وقت اس طرح اشاعت نے وہ زمانہ یاد دلا دیا جب مرزا غلام احمد قادیانی "براہین احمدیہ" کی جلدیں لکھ رہے تھے، اس وقت انھوں نے یہ عام تاثر دے رکھا تھا کہ اسلام کے اس وقت کے خاص دشمنوں، عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کا مقابلہ اور ان کے حملوں سے اسلام کا دفاع ہم ہی کر رہے ہیں۔ اور ہم ہی اس معرکہ میں اسلام کے وکیل ہیں ___ پھر جب انھوں نے وہ باتیں بھی لکھنی شروع کر دیں جنہوں نے علما کو ان کے خلاف بولنے اور لکھنے پر مجبور کر دیا۔ تو اس وقت انھوں نے یہی نعرہ بلند کیا تھا کہ ___ یہ علما جو میرے خلاف لکھ اور بول رہے ہیں، وہ اسلام کے دشمن آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کی مدد اور ان کا ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔

راقم سطور کا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ مولانا مودودی یا ان کے رفقا اور متبعین کا وہی مقام ہے جو مرزا صاحب اور ان کے حواریین کا تھا لیکن ناقدین و معترضین کا منہ بند کرنے اور ان کی صحیح اور مخلصانہ تنقید کو بھی بے اثر بنا دینے کی تکنیک وہی ہے جو انھوں نے اختیار کی تھی

ایک غلطی کی تصحیح

گزشتہ شمارہ میں مسٹر بھٹو کے حادثہ سے متعلق جو نوٹ لکھا گیا تھا اس میں محمد احمد قصوری (جن کے قتل پر مقدمہ چلا تھا) کے بیٹے کا نام غلطی سے محمد علی قصوری لکھا گیا تھا اسکی جگہ احمد رضا قصوری سمجھنا چاہیئے۔ معلوم ہوا ہے کہ محمد علی قصوری، ان کے دوسرے بھائی ہیں اور صاحب واقعہ احمد رضا قصوری تھے۔

درس قرآن ۔ محمد منظور نعمانی

قرآن کے منکرین و مخالفین کا اصل مرض کبر اور بڑائی کا گھمنڈ۔

جزا سزا کے لیے عالم آخرت کا برپا ہونا عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔

اپنی حاجتیں اللہ ہی سے مانگو، دعا عین عبادت ہے اور اللہ ہی کا حق ہے

حمد و صلوٰۃ اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ٥ لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ٥ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ٥ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ قَلِيلًا مَا تَتَذَكَّرُونَ ٥ إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ٥ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ٥

(سورۃ المومن آیات ۵۶ - ۶۰)

جو لوگ کٹ حجتی کرتے ہیں اللہ کی آیات میں بغیر کسی دلیل اور سند کے جو (خدا کی طرف سے)

اُن کے پاس آئی ہو، اُن کے دلوں میں بس کبر ہے (بالاتری کا احساس اور غرور ہے) جس کو وہ کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ بس تم اللہ کی پناہ مانگو وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کو پیدا کرنے سے بڑی (اور بہت مشکل) بات ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ـــــ اور اندھے اور سہانکے برابر نہیں، اور (اسی طرح) ایمان اور نیک اعمال والے، اور بدکردار لوگ یکساں نہیں ہو سکتے) تم لوگ بہت کم سبق حاصل کرتے ہو ـــــ بالیقین قیامت آنے والی ہے، اس میں کچھ شبہ نہیں، مگر بہت سے لوگ یقین نہیں لا رہے ہیں ـــــ نہیں مان رہے ہیں ـــــ اور تمھارے رب کا فرمان ہے کہ مجھے پکارو مجھ سے دعا کرو میں تمھاری استدعا قبول کروں گا، جو لوگ میری بندگی سے سرتابی کر رہے ہیں وہ سخت ذلت و خواری کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔ (سورۂ مومن آیات ۵۶ تا ۶۰)

(تفسیر و تشریح) جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ سورۂ مومن کا سلسلہ چل رہا ہے ـــــ میں نے ذکر کیا تھا کہ قرآن پاک میں سات سورتیں ہیں جو "حٰمٓ" کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں، یہ سب مسلسل ہیں، ان میں پہلی یہ سورۂ "مومن" ہے، یہ سب مکی سورتیں ہیں اور ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اُس دور کی ہیں جب مکہ کے کفار و مشرکین کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ ایمان اور دعوتِ توحید کی سخت مخالفت اور مزاحمت ہو رہی تھی، ان سب سورتوں کا بنیادی مضمون اکثر مکی سورتوں کی طرح توحید اور عقیدۂ آخرت پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔ قرآن مجید کے خاص انداز و اسلوب میں ان دونوں بنیادی عقیدوں کے دلائل بھی ان سورتوں میں پیش کیے گئے ہیں اور ان کو قبول کرنے اور ان کا انکار کرنے کے نتائج بھی بیان فرمائے گئے ہیں ـــــ اس کے علاوہ اُس وقت کے اہل کفر و شرک کے متکبرانہ اور ظالمانہ رویہ سے اہل ایمان کے دلوں پر جو اثرات پڑتے تھے یا پڑ سکتے تھے اور جو مایوسی پیدا ہو سکتی تھی اُس کے بارے میں بھی ہدایات دی گئی ہیں ـــــ جو آیتیں اس وقت تلاوت کی گئی ہیں ان سے پہلی آیت جس پر گزشتہ ہفتے درس ختم ہوا تھا یہ تھی ـــــ "فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝"

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے براہ راست آپ کو اور بالواسطہ آپ پر ایمان لانے والے آپ کے اصحاب و رفقاء کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ دعوت کی راہ میں آپ کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، آپ اُن کا مقابلہ اللہ کے وعدۂ نصرت پر یقین کرتے ہوئے صبر و ثابت قدمی سے کریں، اللہ کا جو وعدہ ہے (کہ دین حق غالب ہو کے رہے گا) وہ یقیناً پورا ہوگا، آپ کا معمول اور دستور العمل یہ رہنا چاہیے کہ برابر بالخصوص صبح و شام کے اوقات میں اپنے قصوروں اور گناہوں کی اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتے رہیں اور اس کی تسبیح و حمد میں مشغول رہیں ـــــــ

میں یہ بات اس درس کے سلسلے میں بار بار بیان کر چکا ہوں کہ حضور اور تمام انبیاءؑ معصوم ہیں، ان سے ایسا کوئی عمل نہیں ہوتا جو "گناہ" کے خانہ میں آتا ہو لیکن کبھی کبھی اُن سے کوئی ایسی لغزش ہو جاتی ہے جو اُن کے بلند مقام کے مناسب نہیں ہوتی وہ اس کو اپنا قصور و گناہ سمجھتے ہیں اور اُس سے وہ اتنا رنجیدہ ہوتے ہیں جتنے ہم گنہگار اپنے گناہوں سے بھی رنجیدہ اور متاثر نہیں ہوتے۔ اور اس پر وہ اللہ کے حضور میں ایسا روتے ہیں اور اس طرح معافی اور مغفرت کے طالب ہوتے ہیں کہ ہم اپنے بدترین گناہوں پر بھی ایسا استغفار نہیں کرتے، یہی ان کی عظمت اور بڑائی ہے "قربا نرا بیش بود حیرانی" ع

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

آج جو آیتیں تلاوت کی گئی ہیں اُن کا مطلب اور پیغام سمجھنے کے لیے اُس صورت حال کو پیش نظر رکھ لینا چاہیے جس سے ان آیتوں کا خاص تعلق ہے ـــــــ

قرآن پاک میں توحید اور عقیدہ آخرت کا جس طرح بیان ہوتا تھا اور اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کیے جاتے تھے اُن سے بہت سے سادہ دل عوام متاثر ہوتے تھے، ان کے اس تاثر کو مٹانے کے لیے اور راہ ہدایت سے اُن کو روکنے کے لیے اُن کے لیڈر طرح طرح کے اعتراضات اور سوالات اُٹھاتے تھے اور کٹ حجتی کرتے تھے، کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ عقیدے ٹھیک ہوتے تو ہمارے باپ دادے انہی عقیدوں پر ہوتے، کبھی کہتے تھے کہ سارے معبودوں کو ختم کرکے بس ایک خدا کو ماننا عجیب اور ناقابل فہم ہے (أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا

لَشَيْءٌ عُجَابٌ (۵) کبھی کہتے کہ ہم نے آج تک نہیں سنا کہ کوئی مردہ زندہ ہوا ہو، اس لیے مرنے کے بعد پھر زندہ کیے جانے کی بات ماننے کے لائق نہیں ہے ــــــ کبھی کہتے کہ ہمارے باپ دادوں کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے ــــــ ظاہر ہے کہ اُن میں سے کسی بات میں بھی کوئی معقولیت نہیں، یہ اُن کی صرف کٹ حجتی تھی،

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ .... اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" ــــــ مطلب یہ ہے کہ جو منکرین اللہ کی آیات، اُس کے ارشادات اور اس کے بیان فرمائے ہوئے دلائل و براہین کے بارہ میں کٹ حجتی کرتے ہیں اُن کے انکار واختلافات کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس انکار واختلاف کے لیے اُن کے پاس کوئی دلیل یا اللہ کی نازل فرمائی ہوئی کوئی سند ہے، بلکہ اُن کی بیماری یہ ہے کہ ان کے دلوں میں کبر ہے یعنی اپنی سرداری و بالاتری کا گھمنڈ اور اپنا جھنڈا اونچا رکھنے کا شوق و جذبہ ہے، حالانکہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ بات اُن کو نصیب نہیں ہوگی (مَا هُمْ بِبَالِغِيْهِ) ــــــ آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے " فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" یعنی آپ ان منکرین شیاطین کی شرارتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ سے حفاظت اور پناہ کی استدعا کرتے رہیں، وہ سمیع و بصیر ہے، سب کچھ دیکھ رہا ہے سن رہا ہے۔

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوتِ حق کے اولین مخالفین مکہ کے کفار و مشرکین کے کفر و انکار اور مخالفت کا اصل سبب ان کے دلوں کا کبر یعنی اپنی بالاتری کا احساس اور گھمنڈ تھا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایسے حالات میں حق کے داعیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر اس یقین کو تازہ کرتے رہیں کہ اللہ سمیع و بصیر ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا اور سن رہا ہے اور متکبر مخالفین کے شر سے حفاظت و پناہ کی اُس سے استدعا کرتے رہیں۔

اس کے آگے پھر قیامت اور آخرت کے مسئلہ کو سمجھایا گیا ہے ــــــ ارشاد فرمایا گیا ہے " لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ" مطلب یہ ہے کہ تم خود اُس بات کو مانتے ہو کہ آسمان و زمین یعنی سارا عالم علوی و سفلی اللہ

نے پیدا کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سب کا پیدا کرنا انسان کے پیدا کرنے کے مقابلہ میں زیادہ مشکل کام ہے اور انسان کا پیدا کرنا اس کے مقابلہ میں آسان ہے، تو جس اللہ نے یہ سارا عالم علوی و سفلی بنایا اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، اتنی موٹی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ——— آگے فرمایا گیا ہے ——— "وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ" ——— پہلی آیت سے قیامت اور بعث بعد الموت کا امکان ثابت کیا گیا تھا، اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ جزا سزا کے لیے انسانوں کا دوبارہ زندہ کیا جانا اور عالم آخرت کا برپا ہونا انسان کی عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بدیہی بات ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ایک اندھا جس کی آنکھ میں روشنی اور بینائی بالکل نہ ہو اور وہ کچھ نہ دیکھ سکتا ہو اور ایک سہانکھا جس کی آنکھ بالکل صحیح سالم اور بینا ہو اور اس کو سب کچھ نظر آتا ہو ——— ان دونوں کا حال اور مآل ایک نہیں ہوسکتا ——— اسی طرح ایک ایسا آدمی جس کو ایمان و یقین کا نور اور حسنِ عمل نصیب ہے ——— اور ایک بدکردار بدفعل آدمی ان دونوں کا حال و انجام بھی ایک نہیں ہونا چاہیے، پہلے آدمی کو ایمان اور عمل صالح کا صلہ اور پھل ملنا چاہیے اور دوسرے کو اس کی بدکرداری اور بدفعلی کی سزا ملنی چاہیے، اور اس دنیوی زندگی میں ایسا نہیں ہو رہا، تو ہماری عقل کہتی ہے کہ پھر کسی دوسرے عالم اور کسی دوسری زندگی میں یہ جزا سزا ملنی چاہیے۔ اور وہ وہی عالم آخرت ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے سب پیغمبروں نے دی ہے، اس لیے عالم آخرت ہماری عقل و فطرت کا بھی تقاضا ہے ——— لیکن تم لوگ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور سمجھنا نہیں چاہتے۔ (قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ)

آگے فرمایا گیا ہے "إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ۝"

مطلب یہ ہے کہ قیامت جس کی خبر دی جا رہی ہے اس میں شک، شبہہ کی گنجائش نہیں ہے وہ یقیناً اور قطعاً آنے والی ہے، اور عقل و فطرت کا تقاضا اور تمام انبیاء علیہم السلام کی اطلاع بھی یہی ہے کہ وہ وقت پر برپا ہوگی اور کسی صحیح العقل اور سلیم الفطرت انسان کے لیے اس کے

نہ ماننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن بہت سے آدمی ہیں جو اس کو نہیں مان رہے ہیں —— ظاہر ہے کہ اُن کا نہ ماننا قیامت کو آنے سے تو روک نہیں سکتا البتہ وہ اس نہ ماننے کا انجام دیکھ لیں گے

آگے ارشاد ہوا ہے "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝"

قیامت اور آخرت کے ذکر کے بعد یہ اُس توحید کی دعوت دی گئی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اولین اور سب سے اہم سبق ہے، بلکہ اُسی کے لیے اس عالم کی تخلیق کی گئی ہے (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝) مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قیامت کا آنا اور آخرت میں جزا سزا کا ہونا برحق ہے۔ تو تمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ پھر نجات کا راستہ کیا ہے؟ —— سنو! نجات کا راستہ یہ ہے کہ اللہ ہی کو وحدہ لاشریک پروردگار کارساز یقین کرتے ہوئے، اُسی سے اپنی حاجتیں مانگی جائیں اُسی سے دعائیں کی جائیں، وہی دعا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے، اُس سے اپنی حاجتیں مانگنا اور دعا کرنا عین عبادت ہے —— حدیث شریف میں ہے۔ "الدُّعَاءُ هُوَ العبادة یعنی دعا ہی اصل عبادت ہے۔ ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں۔ الدعاءُ مُخُّ العبادة" یعنی دعا عبادت کا جوہر اور اس کی روح ہے —— بہرحال قیامت اور آخرت کے ذکر کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" سنو! تمہارے رب کا فرمان ہے کہ اپنی حاجتوں کے لیے مجھ سے دعا کرو، مجھ سے مانگو میں سنوں گا اور تمہاری دعا قبول کروں گا۔

دنیا کی اکثر قوموں کا شرک یہی رہا ہے کہ وہ اپنے دیوتاؤں یا بزرگوں کی روحوں کو کارساز اور حاجت روا سمجھ کر اپنی حاجتیں اُن سے طلب کرتے تھے اور انھیں راضی کرنے کے لیے چڑھاوے چڑھاتے اور اپنے طریقوں سے ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے —— جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا یہ دعا اور حاجت طلبی عین عبادت ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ اپنی حاجتوں کے لیے مجھ سے ہی دعا کرو مجھ سے ہی مانگو میں ہی تمہاری دعا قبول کرسکتا ہوں اور تمہاری مراد پوری کرسکتا ہوں ——

قرآن مجید ہی میں دوسرے مقامات پر جا بجا فرمایا گیا ہے کہ میرے سوا جن سے تم مانگتے ہو ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے (مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ)

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دَاخِرِیْنَ"

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس فرمان کے بعد اور توحید کی دعوت پہنچ جانے کے بعد جو سرپھرے اس کی بندگی سے سرتابی کریں گے اور شرک سے توبہ کر کے خدائے وحدہٗ لاشریک لہ کے حضور میں نہیں جھکیں گے ان کے لیے قطعی فیصلہ ہے کہ وہ نہایت ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں پڑیں گے (سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دَاخِرِیْنَ)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو براہ راست مخاطب کر کے فرمایا ہے "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" (مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا) اس پر شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بندوں کی بہت سی دعائیں قبول نہیں ہوتیں حتیٰ کہ جنکو اولیاء اللہ سمجھا جاتا ہے ان کی بھی سب دعائیں قبول نہیں ہوتیں، اور قرآن شریف ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام کی بھی بعض دعائیں قبول نہیں ہوئیں، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا اُن کے بیٹے کے بارہ میں قبول نہیں ہوئی ——— اس کا جواب یہ ہے کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کی قبولیت کا وعدہ دو باتوں سے مشروط ہے ایک یہ کہ دعا کسی ناجائز بات کے لیے نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف نہ ہو ——— اور دوسری یہ کہ دعا کرنے والا کسی ایسے گناہ میں مبتلا نہ ہو جس کی وجہ سے بندہ خدا کی رحمت اور نظر عنایت کے قابل نہیں رہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں دعا قبول نہیں ہوتی وہاں انھیں میں سے کوئی بات رکاوٹ بن جاتی ہے

اس کے علاوہ حدیث شریف میں دعا کی قبولیت کے بارہ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ دعا کے قبول ہونے کی مختلف صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ بندہ جس چیز کے لیے دعا کرے وہ اُس کو عطا فرما دی جائے (ہم لوگ اپنی کم نظری سے صرف اسی کو دعا کی قبولیت سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت اُس کی صفتِ رحمت کے بھی خلاف ہے کہ بندہ جو مانگے وہ اُس کو بہر حال دیدیا جائے، بندہ تو نادان اور ظلوم وجہول ہے وہ بسا اوقات ایسی چیز مانگتا ہے جو انجام کے لحاظ

سے اس کے لیے مضر بلکہ مہلک اور تباہ کن ہو سکتی ہے، ایسی صورت میں اللہ کی حکمت اور رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اُس کو نہ دی جائے ــــ تو اللہ تعالیٰ جو حکیم و رحیم ہے وہ چیز اُس کو عطا نہیں فرماتا لیکن اُس کے بجائے اُس دعا ہی کے حساب میں دنیا یا آخرت کی کوئی اور نعمت اُس کے واسطے مقدر فرما دیتا ہے اور اُس بندہ کے حق میں یہی بہتر ہوتا ہے۔ تو یہ بھی دعا کی قبولیت کی ایک صورت ہے ــــ بس جب کوئی بندہ دیکھے کہ کوئی دُعا جو میں نے کسی جائز مقصد کے لیے کی تھی بظاہر وہ قبول نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی رحیمی کریمی پر نظر رکھتے ہوئے یقین کرے کہ میری یہ دعا رائیگاں اور لاحاصل نہیں رہے گی، جو کچھ میں نے اپنے اللہ سے مانگا تھا وہ مجھے نہیں ملا ہے تو اُس رب کریم نے اُس سے بہتر کوئی چیز ضرور میرے لیے مقدر فرما دی ہے جو مجھے اسی دنیا میں یا آخرت میں جا کر ملے گی، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا دعا کی قبولیت کا وعدہ "اَسْتَجِبْ لَكُمْ" پورا ہو گا۔

انسانی اعمال میں دعا کا مقام اور درجہ

میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ "دعا عین عبادت ہے" اور دوسری حدیث میں ہے کہ "دعا عبادت کا مغز، جوہر اور اس کی روح ہے" ــــ افسوس ہے کہ ہم لوگ دعا کی اس قدر و قیمت سے بالکل غافل ہیں ــــ ایک حدیث شریف کا مضمون ہے کہ اللہ کو بندہ کا کوئی عمل اور اس کی کوئی بات دعا سے زیادہ عزیز اور پیاری نہیں (لَيْسَ شَيْءٌ اَكْرَمَ عَلَى اللهِ مِنَ الدُّعَاءِ) ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس بندہ سے ناراض ہوتا ہے جو اُس سے نہ مانگے، دعا سوال نہ کرے (مَنْ لَمْ يَسْئَلِ اللهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ) ایک حدیث پاک کا مضمون ہے کہ جس بندہ کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا یعنی اُس کو دعا کی توفیق مل گئی اور اس کو حقیقی دعا نصیب ہو گئی تو سمجھنا چاہیے کہ اس کے واسطے خدا کی رحمت کے دروازے کھل گئے (مَنْ فُتِحَ لَهُ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَهُ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ)

بلاشبہ وہ بندے بڑے مبارک ہیں جن کو دعا کا ذوق نصیب ہو جائے اور وہ اللہ کے در کے فقیر اور بھکاری بن جائیں اللہ تعالیٰ نے یہ دولت سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیب فرمائی تھی اور جس کو یہ نعمت جس درجہ میں نصیب ہو جائے وہ اتنا ہی خوش نصیب ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ اس کا یہ ارشاد "اُدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" برابر یاد رہے اور دعا کی حقیقت ہمیں

م نصیب ہو جائے اور ہمارا حال بن جائے۔ والحمد للہ رب العٰلمین وسلامٌ علی المرسلین ٥

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
و ناظم مجلس تحقیقاتِ شرعیہ

ربِّ کریم کے

فضلِ خاص کے تین ۳ ہفتے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد رسول اللہ وآلہ ومن والاہ

بچپن سے یہ مثل سننے میں آتی رہی ہے۔ "جب خدا کسی کو دینا چاہتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیدیتا ہے"۔ بلاشبہ اس مثل کے پیچھے سینکڑوں واقعات شہادت دینے کے لئے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حقیر راقم سطور کے ساتھ گزشتہ دنوں پیش آیا، کہ اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے (بغیر کسی تواضع اور انکسار کے عرض ہے کہ بالکل بلا استحقاق) ایک ناکارہ اور مادّی وسائل و اسباب سے قطعاً محروم بندہ کو اس نعمت عظمیٰ سے نوازا جس کی تمنا میں ہزاروں بندگانِ خدا عمر میں ختم کر کے دار البقا کی طرف روانہ ہو گئے اور یہ حقیر بھی عمر عزیز کی چار دہائیاں بلکہ اس سے بھی زیادہ گزار چکا تھا اور آئندہ مزید کتنی مدت اسی حسرت و آس میں گزرتی۔؟ اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس عظیم دولت کے حصول کا ذریعہ مخدومنا حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہٗ کی سراپا

شفقت ذات گرامی ہیں، فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ ہوا یہ کہ "البنک الاسلامی للتنمیہ" جدہ (ISLAMIE DEVELOPMENT BANK JEDDAH) کے ڈائریکٹر ہز ایکسی لینسی ڈاکٹر احمد محمد علی کا تار آیا جس میں بنک کی طرف سے منعقد ہونے والی ایک نہایت اہم میٹنگ میں شرکت کی دعوت مولانا کو یا ان کے معتمد نمائندہ کو جس کی علوم شرعیہ پر گہری نظر ہو، دی گئی تھی، اور تمام مشغولیتوں پر اس کو ترجیح دینے کی پُرزور اپیل بھی تھی تار کے جواب میں مولانائے محترم نے ازراہ حسنِ ظن اس ناچیز کا نام بھیجنے کا فیصلہ فرماکر یہ خوش آئند بلکہ مبارک خبر راقم سطور کو بھی سنائی۔ اگرچہ یہ خبر ہی زندگی کی سب سے اہم اور دیرینہ تمنا پورا ہونے کا وسیلہ بننے کی بناپر نہایت مبارک خبر تھی مگر چونکہ وقت بہت کم تھا اس لئے یہ خوف بھی تھا کہ تاخیر ہو جانے یا کسی قانونی رکاوٹ کے پیش آجانے کی وجہ سے کہیں یہ امید حسرت میں نہ بدل جائے، اس وجہ سے عجب امید و بیم کی کیفیت ان دنوں رہی جس کا صحیح اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس طرح کی صورتِ حال سے کبھی دوچار ہو چکے ہوں (اللہ تعالےٰ بہت بہت جزائے خیر دے، حضرت مولانا معین اللہ صاحب ندوی دام مجدہم کو، کہ ان کی مخلصانہ مساعی اور مدبرانہ رہنمائی بہت ہی مفید اور موثر ثابت ہوئی) لیکن اس قادر مطلق (جس کے قبضہ میں سب کے قلوب ہیں) کا شکر کس طرح ادا ہو کہ اس نے ایسا کرم فرمایا۔ کہ حیرت انگیز طریقہ پر بسہولت و بعجلت، تمام رکاوٹیں دور ہوتی اور مختلف پے چیدہ اور قانونی اور فنی دشواریاں یوں حل ہوتی چلی گئیں کہ ایسا بہت کم ہوتے دیکھا گیا ہے (فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً)

بالآخر ۳ فروری ۷۹ء بروز شنبہ کو وہ ساعت سعید آہی گئی جس میں "سوئے حرم اُڑ کر جانے" کی قدیم شاعرانہ آرزو مجازی نہیں حقیقی معنی میں پورا ہوتے دیکھنے کی سعادت اس بے بال و پر کو میسّر آئی۔ چنانچہ تاریخ مذکور پر شام کی فلائٹ سے لکھنؤ سے دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ ابھی سفر اچھی طرح گویا شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پہلی منزل آگئی لکھنؤ اور دہلی کا فاصلہ جسے کبھی ۱۰۔۱۲ گھنٹے سے کم میں طے کرنے کا تجربہ ہی نہ تھا، صرف پون گھنٹہ میں طے ہوتے اس دنیا ان آنکھوں نے بھی دیکھ لیا۔

دہلی سے اگلے دن (۴ فروری کو) ہوائی جہاز سے ہی بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ (جہاز کی روانگی میں ڈھائی گھنٹہ کی تاخیر ہوجانے کی وجہ سے) عصر کے قریب بمبئی پہنچنا ہوا۔ دہلی اور بمبئی کی طویل مسافت دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں طے ہوگئی۔ اس موقعہ پر بمبئی کے مشہور، دیندار تاجر اور علم دین سے وابستگی رکھنے والوں کے مستقل میزبان جناب صوفی عبد الرحمٰن صاحب (خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم) اور ان کے سعادت مند فرزندوں کے مخلصانہ برتاؤ اور بیرونی سفر کے سلسلہ میں پیش آنے والی مختلف دشواریاں (بمبئی وجدہ دونوں جگہ) حل کرانے کے بارے میں ان کی جدّ وجہد کا ذکر نہ کیا جانا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ صوفی صاحب اور ان کے سعادتمند صاحبزادگان کی مخلصانہ مساعی، ہر طرح کی سہولت پہنچانے کا ان میں دلی جذبہ (جو بلاشک خداوند تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک اہم انعام ہے) نہ ہوتا تو مجھ جیسے ناتجربہ کار اور بیرونی سفر کی دشواریوں سے ناآشنا کے لئے یہ سفر بہت دشوار ہوجاتا (جو بلا مبالغہ ظاہری وجسمانی لحاظ سے بھی زندگی کا سب سے زیادہ آرام وراحت والا سفر تھا) اللہ تعالیٰ ان سب کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

اس کے دو روز بعد (۶ فروری ۹ء، یوم شنبہ) بمبئی سے جدّہ کی طرف پرواز تھی۔ خدا خدا کرکے وہ مبارک ساعت بھی آگئی جس کے لئے دن گنے جارہے تھے اور خدا کی توفیق سے عمر میں پہلی مرتبہ اس مقدس لباس میں ملبوس ہونے کی سعادت کا وقت (صوفی صاحب ہی کے دولت کدہ پر بعد فجر غسل مسنون کرکے) آیا۔ جسے احرام کا پاکیزہ نام پاک ذات ہی کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ خدا کی شان کبریائی اور اس کی قدرت کی کارفرمائی نظر آئی جس نے اپنے ایک نہایت ضعیف وحقیر اور گناہ گار بندہ کو یہ موقعہ عطا فرمایا کہ وہ محرم بنے اور اس در اقدس پر حاضر ہونے کی تیاری کرے جس کی تمنا میں نہ جانے کتنے قدسی صفات وبرگزیدہ انسان حسرت لئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جہاز کو اگرچہ ڈیڑھ بجے دن پرواز کرنا تھی لیکن ہمیں حکم یہ ملا کہ ۹½ بجے صبح ہی ایرپورٹ پہنچ جائیں (شاید جذبۂ دل کا امتحان مقصود تھا) چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی وہاں پہنچ کر کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد وہ مبارک وقت آیا کہ سوئے حرم اڑ کر جانا نصیب ہوا۔ اور سہ

..... چوں شود نزدیک　　آتش شوق تیز تر گردد

کے مصداق جوں جوں منزل قریب آتی گئی ویسے ہی دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار تیز تر ہوتی گئی اور شاید ہوا بازوں کو ہمارے صبر و انتظار کا مزید امتحان مقصود تھا کہ انھوں نے طویل راستہ اختیار کیا یعنی کویت میں تقریباً پون گھنٹے کے بعد جدہ کی طرف جہاز اڑایا۔ مغرب بعد (حجاز مقدس) کے تقریباً ۶½ بجے شام اور ہندوستانی وقت کے ۹ بجے رات اور سعودی کلنڈر کے مطابق ۹ ربیع الاول) جہاز اس سرزمین پر اترا۔ جسے حرم کے مسافروں کی میزبانی اور پیشوائی کا اس سے بڑھ کر "باب حرم" ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بیرونی سفروں کا جن لوگوں کو سابقہ پڑا ہے وہ جانتے ہیں کہ جہاز کا ایرپورٹ پر بخیر اتر جانا ہی مسافر کا منزل پر پہنچ جانا نہیں ہوتا بلکہ " ابھی .... امتحاں اور بھی ہیں " کا بعض مرتبہ تکلیف دہ حد تک منظر سامنے آتا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا کی چیکنگ، ہیلتھ سرٹیفکیٹ کا معائنہ اور سب سے بڑھ کر کسٹم آفیسر کی میز پر ہونے والا، امتحان (جس کا صحیح تصور دیدنی ہے، نہ کہ شنیدنی) لیکن اس قادر قیوم کا کیونکر شکر ادا ہو کہ اس نے یہ ہفت خواں (بلکہ کہنا چاہیے میدان حشر قبل از حشر کا مرحلہ) بھی گھنٹوں میں نہیں منٹوں میں طے کرا دیا۔ جس کا ظاہری سبب، اسی مسبب الاسباب نے یہ بنا دیا کہ محترم میزبان کی طرف سے مجھے لینے کے واسطے بھیجے گئے ایک عرب نمائندہ جو عربی لباس میں تھے (خلاف معمول بلکہ شاید "خلاف قاعدہ") اندر وہیں پہنچ گئے، جہاں یہ حشر بپا تھا اور پہلے سے کسی تعارف کے بغیر وہ اس تپاک اور خوش اخلاقی سے ملے بلکہ بغلگیر ہو گئے جو عربوں کا خاصہ ہے۔ پھر تو وہ ساری دہشت دور ہو گئی جو حشر کا سا سماں دیکھ کر مجھے ہو رہی تھی اور کچھ تو ان کی تجربہ کاری اور کچھ آفسروں سے ان کی شناسائی کی بنا پر گویا چشم زدن میں "ارض الحساب" سے چھٹکارا نصیب ہو گیا۔

جیسے ہی باہر پہنچے، وہاں میزبان کی طرف سے بھیجے گئے ایک معزز و محترم شخصیت استاذ بہیجہ مصری سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف بھی اسی گرمجوشی سے ملے، جس کے بعد یہ احساس ہی جاتا رہا کہ یہ کسی اجنبی جگہ ہوں۔ انھوں نے جب مجھے احرام کی حالت میں دیکھا تو سوال کیا کہ کیا اسی وقت عمرہ کرنا ہے؟ میرا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ "جی ہاں ــ یہ ارادہ اور دلی خواہش تو یہی ہے"۔

میرے ایک سوال کے جواب میں موصوف نے یہ بھی بتایا کہ جس میٹنگ میں شرکت کے لئے یہاں

آنا ہوا ہے اس کا پہلا جلسہ کل صبح ۹ بجے سے ہے۔ اس لئے بھی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رات ہی میں (یا نہ یادہ سے زیادہ علی الصباح) مکہ معظمہ حاضر ہو کر عمرہ ادا کر لیا جائے خیر اس وقت تو ایر پورٹ سے سیدھے کانٹی نینٹل سطح کے مشہور ہوٹل، قصر الکندرہ (KANDRA PLACE HOTEL) میں وہ حضرات مجھے موٹر سے لے گئے۔ راستہ میں موٹر کے اندر ہی مجھے ایک بڑا سا لفافہ دیا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ اندر کھول کر دیکھا تو اس میں بیرونی مہمانوں کے اعزاز میں دیئے جانے والے "لنچ" کا دعوت نامہ تھا۔ اس کے علاوہ سائیکلو اسٹائل کیا ہوا جلسہ کا پروگرام اور مدعوین کے نام مختصر تعارف کے ساتھ تھے (مدعوین کی فہرست میں احقر کا نام بھی مکتوب تھا) اس کے ساتھ مشہور شامی فقیہہ مصطفےٰ الزرقاء کا تیار کردہ وہ نوٹ بھی تھا جس پر بحث ہونا تھی۔ ہوٹل پہنچ کر مستقل کمرہ (جو میرے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا) میں ٹھہرایا گیا۔ استاذ بہجہ نے ہوٹل پہنچنے کے ساتھ ہی یہ بھی اطمینان دلایا کہ اسی وقت موٹر کا انتظام کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ رات ہی میں عمرہ سے فارغ ہو کر آجانا ممکن ہو۔ چنانچہ چند ہی منٹ بعد عربی لباس میں ملبوس ایک موٹر ڈرائیور کا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ یہ آدھ گھنٹہ بعد آکر مکہ مکرمہ لے جائیں گے، تم اتنے وقت میں تیاری کر لو۔

میں ہوٹل کے کمرہ میں تیاری کر ہی رہا تھا کہ ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد کمرہ میں لگے فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ لے جانے کے واسطے موٹر آگئی ہے۔۔۔ چنانچہ جلدی ہی بریف کیس میں پاسپورٹ اور مختصر سامان لے کر رات کے ۹ /۱۰ بجے کے درمیان سوئے حرم روانہ ہو گیا۔

جدہ سے مکہ مکرمہ کے درمیان ۷۵ کلو میٹر کا فاصلہ (تقریباً ۴۶ / ۴۷ میل) عمدہ موٹر اور اچھی سڑک سے عموماً ایک گھنٹہ سے کم میں طے ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارا ڈرائیور چند منٹ اپنے مکان ٹھہرتا ہوا (غالباً گھر والوں کو مطلع کرنے کی غرض سے) روانہ ہوا۔ اس لئے ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ وقت گذرنے کے بعد باب السلام کے قریب موٹر نے چھوڑا۔ اس کے بعد "بیت عتیق" کی دید سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کا وہ مبارک وقت آیا جس کے لئے نہ جانے کتنی مرتبہ دل نے بے قرار اور کتنی بار آنکھوں نے اشکبار ہو کر، رب البیت کی بارگاہ میں درخواست پیش کی تھی۔ سچ تو یہ ہے

کہ تنہا ایک اسی احسان و انعام کی خوشی میں جان بھی قبول کر لی جاتی تو کم ہوتی مگر یہ نصیب ہمارے کہاں! بس اشک ندامت کے چند قطرے ہی نذر کئے جا سکتے تھے۔ کتب فقہ و حدیث کے درس و تدریس میں ۲۰/۲۵ سالہ مشغولیت کی بنا پر گمان تھا کہ بغیر کسی راہ نما کے بآسانی عمرہ کی ادائیگی مسنون طریقہ پر کی جا سکے گی۔ مگر وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ تنہا کتابی علم نہ صرف کافی نہیں بلکہ عملی نمونہ کے بغیر علم سفینہ کیا علم سینہ بھی بے راہ ہی نہیں گمراہ بھی بنا سکتا ہے (اسی سے خداوند تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا بھی تھوڑا بہت اندازہ ہوا کہ اس نے کبھی صرف آسمانی صحیفہ بھیجنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہمیشہ کسی نہ کسی نبی کو کتاب کے ساتھ نمونۂ عمل بنا کر بھیجا۔)

مگر اس ہادیٔ مطلق کی شان کے قربان جس نے وہاں تک پہنچایا تھا، بھلا وہ عین وقت پر بھٹکتا کیونکر چھوڑ دیتا۔ اس نے نہ جانے کتنے نمونے ہم جیسے ناواقف کے لئے وہاں ہر وقت موجود رہنے کا انتظام فرما رکھا ہے۔ البتہ پہلے ہی مرحلہ میں درس و تدریس کی وجہ سے "واقفیت" کا پندار جو پیدا ہو گیا تھا وہ رخصت اور "جہول" ہونے کا ازلی وصف آشکارا ہو گیا۔ جس طرح نابینا کسی بینا کی انگلی کے ہی سہارے منزلیں طے کر سکتا ہے، میں بھی اسی کا محتاج تھا، مگر خدا کے فضل سے نہ جانے کتنے "بینا" وہاں دست گیری کے واسطے موجود تھے۔ جن کی رہنمائی میں عمرہ کے تمام افعال بحمد اللہ تعالیٰ ادا کرنے کی توفیق ملی۔ آخری مرحلہ جس پر افعال عمرہ کا اختتام ہوتا ہے حلق یا قصر (سر کے بال منڈوانے یا کتروانے) کا رہ گیا۔ اس کے لئے عملی رہنمائی بھی کافی نہیں تھی جیب تنگ مالی (اور مالی بھی وہ جسے وہاں مال سمجھ کر بآسانی قبول کیا جا سکے) سرمایہ نہ ہو اور اس وقت میرے پاس سعودی عرب کا کوئی بھی سکہ نہ تھا۔ ہاں امریکی ڈالر موجود تھے (جو بمبئی ایرپورٹ پر قانونی حد کے اندر بہت تھوڑی مقدار میں ہندوستانی سکہ کے بدلے دیئے گئے تھے) ایسی مشکل برصغیر کے جیسے کسی ملک میں پیش آتی تو نہ جانے کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا لیکن وہ جگہ جس کو "مثابۃ للناس" (تمام دنیا کے لوگوں کی پناہ گاہ) کہا گیا ہے اور جس کی طرف تمام انسانوں کے دلوں کو جھکایا گیا ہے (حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم سے یہ دعا کی تھی (فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم) بھلا اس جگہ کسی بھی ملک یا کسی بھی رنگ و نسل کا انسان ایسی معمولی دشواری میں زیادہ عرصہ کیسے پھنسا رہ سکتا تھا؟ چنانچہ ایسا فوری حل سامنے آیا کہ وجدان رقص کرنے لگا اور "بلد امین و امن" (امن و امانت کا شہر) اور اس

کے خالق کی عظمت کا یقین تازہ ہو گیا۔

اللہ اللہ امن و امانت کا یہ عالم کہ معمولی پیشہ ور ایک بالکل اجنبی اور نووارد پر ایسا اطمینان کرلے کہ وہ بے محابا کہدے "اچھا ریال پھر دے جانا" اور شاید پھر دے جانے کی بات بھی اس نے نووارد ہی کی عزت نفس کا پاس کرتے ہوئے کہی ورنہ بعید نہیں کہ اس کا ضمیر بالکل بلا اجرت لئے ہی، حلق یا قصر کرنے پر اسے آمادہ کر رہا ہو مگر اس نے اپنے ضمیر کے تقاضے پر اجنبی مسافر کے جذبہ کو ترجیح دے کر ایثار کی ایک لطیف و اعلیٰ صورت اختیار کی ہو (واللہ اعلم) مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ ضروری نہیں قرار دیا کہ مجھے ہی آکر دینا، بلکہ اس نے کہا "میرے کسی بھی ہم پیشہ کو میرا نام بتا کر دے دینا تاکہ وہ مجھے پہنچا دے"۔ سوچیئے! کیا بلدِ امین کے علاوہ کسی اور مقام پر ایسے اعتمادِ امانت کا آج کے جیسے خود غرضی کے ماحول میں تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمارے اپنے ملک کے کسی بڑے شہر میں کسی ٹیکسی ڈرائیور پر سابقہ تعارف کے بغیر یہ اطمینان کیا ہی نہیں جا سکتا کہ کوئی اجنبی مسافر تنہا رات کی تاریکی میں، سامان کے ساتھ بعافیت ٹیکسی میں اتنا لمبا سفر کرلے، مگر وہاں یہ روزمرہ کا معمول ہے کہ لوگ نہ صرف تنہا سفر کرتے ہیں بلکہ سامان کی نگرانی کا کام بھی اجنبی ڈرائیور ہی کو سونپ کر اپنے مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں چنانچہ میں نے بھی اپنا بریف کیس ڈرائیور کے ہی مشورہ پر بغیر ادنیٰ خطرہ محسوس کئے موٹر ہی کے اندر چھوڑا اور تقریباً ڈو ڈھائی گھنٹہ کے بعد عمرہ کے تمام افعال سے باطمینان فراغت کے بعد جب واپسی کا ارادہ کیا تو وہ ٹھیک اسی طرح موٹر میں رکھا ہوا پایا جس طرح چھوڑ کر گیا تھا۔

غرضیکہ حج اصغر (عمرہ) کی ادائیگی سے فارغ ہو کر رات کو ایک بجے کے قریب جدّہ کیلئے تنہا اسی ڈرائیور کے ساتھ واپسی ہوئی۔ رات کا باقی ماندہ حصہ اپنی قیام گاہ (قصر الکندرہ) میں گذرا نیند تو برائے نام ہی آئی تھی۔ صبح صادق نمودار ہوتے ہی اذان فجر سنائی دی۔ یہ غالباً پہلی اذان تھی جو ارض عرب پر میرے کانوں نے سُنی۔ مسجد تلاش کرنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ جب مسجد پہنچا تو وہاں سلام پھر چکا تھا (عالم عرب میں نماز فجر بالکل ابتدائی وقت میں ہوتی ہے، جیسے ہمارے یہاں رمضان المبارک میں اکثر مساجد کے اندر — یہ نماز ہوٹل ہی کی مسجد میں پڑھی جو وہاں کی عام مسجد وں کی طرح سائبان نما سپاٹ چھت کی تھی۔ یہ دیکھ کر قلق ہوا کہ مسجد میں بیشتر نمازی ہوٹل کے شاگرد پیشہ

ملازم (اکبر الہ آبادی مرحوم کی ظریفانہ تعبیر کے مطابق "جمن") معلوم ہو رہے تھے، حالانکہ ایسے شاندار ہوٹل میں اونچی سطح کے مقیمین کی تعداد بھی یقیناً سیکڑوں سے متجاوز ہوگی۔ (اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ پورے عالم عرب میں عموماً اور سعودی عرب میں خصوصاً نمازیوں کا تناسب غالباً ۹۵/۹۰ فیصدی ہے جب کہ ہمارے برصغیر میں مشکل سے ۱۵/۱۰ فیصد)

(۷ فروری ۷۹ء مطابق ۱۰ ربیع الاول سنہ ۹۹ھ یوم چہار شنبہ) چند گھنٹے بعد اس میٹنگ میں شرکت کے لئے جانا تھا جس کے طفیل یہ تمام سعادتیں نصیب ہوئیں نو بجے جلسہ گاہ جو اسلامی بینک کی شاندار بلڈنگ کا میٹنگ ہال تھا، پہنچنا تھا۔ جس کے لئے ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل کی زینتی منزل میں بنے ایک ہال کے اندر پہنچ گیا۔ وہاں استاذ بہجہ مصری پہلے سے خوش آمدید کہنے اور جلسہ گاہ لے چلنے کے لئے منتظر و موجود تھے۔ رفتہ رفتہ تمام مدعوئین اسی جگہ اکٹھا ہو گئے اور وہیں ہر ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا۔

جلسہ میں سعودی عرب، شام، مصر، اردن، عراق، ہندوستان، الجزائر کے علماء تھے (سعودی عرب کے علاوہ ہر ملک سے ایک ایک تھے) باہر سے آنے والوں میں مصطفیٰ زرقاء اور جامعہ ازہر کی کلیہ شرعیہ وقانون کے ذمہ دار ڈاکٹر حسن علی شاذلی سب سے ممتاز تھے۔ موخر الذکر نے ہی جلسہ کی صدارت کی۔ اور پھر اجتماعی طور پر موٹروں کے قافلہ میں، ہر موٹر میں دو نفر اسلامی بینک کی بلڈنگ کی طرف روانہ ہوئے جو ہوٹل سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تھی۔ موٹروں کا یہ قافلہ نہایت شاندار، کشادہ سڑکوں سے گزرتا ہوا ایک سر بفلک امریکی طرز کی جدید و عظیم عمارت جس پر مختلف ملکوں کے قومی جھنڈے لہرا رہے تھے کے وسیع لان میں داخل ہوا۔ اور وہاں سب لوگ موٹروں سے اتر کر بلڈنگ کے بلوریں صدر دروازے سے گذرتے ہوئے پہلی منزل پر بنے ایک ہال میں اکٹھے ہوئے۔ وہاں اپنے میزبان اور بینک کے صدر جناب ڈاکٹر احمد محمد علی کی نہایت متواضع اور خلیق و دبنگ شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ اگرچہ موصوف سے پہلی بار ملنا ہو رہا تھا مگر ان کی ذہانت اور بلند اخلاقی نے اس کا احساس ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ کسی نو وارد یا اجنبی سے مل رہے ہیں اور نہ یہ اندازہ ہوا کہ ایک معمولی پوزیشن کسی صاحب السعادۃ (ہز ایکسی لینسی) یعنی وزیر کی سطح کے قابل احترام اور مملکت کے ایک اہم شخص سے مخاطب ہے۔ اور یہ وہ امتیاز ہے جس سے

اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کے لوگوں کو خصوصی طور پر نوازا ہے ایسے اس نے اپنے آخری و ابدی پیغام کا حامل و امین بنایا۔ ظاہر ہے اس امانت کی ادائیگی بغیر تواضع اور حقیقی مساوات کے ممکن ہی نہ تھی۔ چنانچہ یہ وصف (تواضع، حقیقی مساوات اور اونچ نیچ کا فقدان) تمام عربوں میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ اسی کا یہ ثمرہ ہے کہ وہاں افسر و ماتحت، چپراسی اور سیکریٹری کے درمیان ظاہری طور پر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مثلاً ہر ایک دوسرے کو سلام کرتا اور ہر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر بے تکلف کھاتا پیتا ہے۔ دفاتر میں نشستوں کا بھی کوئی خاص امتیاز دیکھنے میں نہیں آیا۔ بس اگر فرق ہے تو کام میں، یا مشاہروں میں، ظاہر ہے کہ یہ چیز کسی ہندوستانی کے لئے ایک خوش آئند انکشاف ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور میں تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے عربوں کی اس خصوصی وصف سے قریبی آگہی بخش کر ایمان میں تازگی کا ایک مزید موقع عطا فرمایا۔

اوپر یہ بات ذکر میں آنے سے رہ گئی کہ جب اسلامی بنک جدہ کی دعوت پر میرا وہاں بھیجا جانا طے کیا گیا تو اس وقت تھوڑی سی فکر اور ذہنی الجھن اس لئے ہوئی کہ موجودہ بینکنگ سسٹم کے فنی مسائل سے تو میں نا آشنا ہوں، پھر وہاں بحث میں حصہ کس طرح لے سکوں گا؟ مگر اس منعمِ حقیقی کی کس کس نعمت کا شکر ادا ہو کہ اس فکر اور ذہنی الجھن کو چند روز (شاید ہفتہ عشرہ) ہی گزرے تھے کہ ڈاک کے ذریعہ بنک کی طرف سے بھیجے ہوئے موضوعِ بحث سے متعلق کاغذات موصول ہوئے جس کے بعد سارا تردد رفع ہو گیا۔ بلکہ بہت خوشی ہوئی (اور اسے نیک فال جانا) کیونکہ وہاں بحث کے لئے ایسا موضوع مقرر کیا گیا تھا، جو میری خاص دلچسپی کا تھا۔ یا کم سے کم یہ کہ اس سے مجھے تھوڑی بہت مناسبت تھی۔ جلسہ کی تفصیلی روداد اور اس میں کی گئی بحثوں کو تو انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں قلمبند کروں گا۔ اس وقت سر دست یہ بتا دینے ہی پر اکتفا کرتا ہوں کہ اسلامی بنک جس کا تمام کاروبار غیر سودی ہے اور ربا (سود) کے بجائے ربح (یعنی تجارتی طریقہ پر حاصل ہونے والے منافع) کے اصول پر نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے کی کامیابی کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ ۳۶ ملکوں میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں (مگر افسوس ہے کہ ہمارے ملک کی مرکزی حکومت کے ایک مسلم وزیر صاحب نے پارلیمنٹ میں یہ ارشاد فرمایا کہ غیر سودی بنکوں کا چلنا ممکن نہیں ہے) اور وہ تمام ہی خدمات انجام دے رہا ہے جو عصری

بنک انجام دیتے ہیں لیکن اس بنک کے لئے بعض مصالح کی بنا پر اپنا سرمایہ اجنبی بنکوں (سودی بنکوں) میں رکھنا بھی ناگزیر ہے، ظاہر ہے کہ سودی بنک اپنے اصول کی رُو سے جمع شدہ سرمایہ پر سود دیتے ہیں۔ اس طرح اسلامی بنک کے سرمایہ پر جمع ہونے والی سود کی رقم اتنی خطیر ہو گئی جس کا ہندوستان جیسے غریب ملک کے باشندوں کے لئے تصور بھی تعجب انگیز ہے۔ یعنی گزشتہ رجب تک اس رقم کی میزان ۶۳ ملین امریکی ڈالر تک ہو چکی تھی (تقریباً ساٹھ کروڑ ہندوستانی روپے) جس نے اسلامی بنک کے ذمہ داروں کے لئے مسئلہ پیدا کر دیا۔ اور وہ مجبور ہوئے کہ علمائے عصر سے دریافت کریں کہ اس رقم کا مصرف کیا ہو؟ بس اسی گتھی کو سلجھانے کے لئے تقریباً سارے عالم اسلام کے گنے چُنے مگر ممتاز علماء و فقہاء کو جمع کیا گیا تھا۔ اس بارے میں اسلامی بنک کے فہیم و بالغ نظر رئیس ڈاکٹر احمد محمد علی صاحب (جو اپنی دینداری میں بھی نمایاں حیثیت کے حامل معلوم ہوئے) نے یہ دانشمندانہ اقدام پہلے کیا کہ عالم اسلام کے مشہور اور نادرۂ روزگار فقیہ یعنی شامی عالم شیخ مصطفےٰ زرقا صاحب سے اس موضوع پر ایک علمی و فقہی بحث کا مسوّدہ تیار کروا کر — جو فل اسکیپ سائز کے ۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ تمام مدعوین کے پاس کافی پہلے سے بھیج دیا تھا۔ تاکہ تمام شرکاء تیاری کر کے بحث میں حصّہ لے سکیں اور کسی نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، چنانچہ اس دوراندیشی کا یہ کھلا فائدہ نظر آیا کہ ایسے اہم اور پیچیدہ مسئلہ پر مختلف فکر و خیال اور نقطۂ نظر رکھنے والے ممتاز علماء ایک ہی دن کے سنجیدہ مذاکرہ کے بعد ایک حل پر متفق ہو گئے۔ اور غیر متعلق مباحث میں الجھنے سے بچ گئے، بعض شرکاء، موضوع سے متعلق اپنے افکار و خیالات (عربی میں) قلمبند کر کے لائے تھے (ان ہی میں راقم سطور بھی تھا) ہر ایک کی تحریر کی فوٹو کاپی کروا کر تمام شرکاء کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اور بعض نے بحث و تمحیص میں صرف زبانی حصّہ لیا۔

ہم سب ہندوستانیوں کے لئے مسرت و خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے بالغ نظر علماء نصف صدی سے زائد عرصہ سے جو نقطۂ نظر اس طرح کی رقموں کے بارے میں اپنائے ہوئے ہیں اور اس کے مطابق عرصۂ دراز سے فتوے دے رہے ہیں اسی کو وہاں اختیار کیا گیا، جب احقر نے اپنے مقالہ میں ہندوستانی علماء کے اس دیرینہ فتویٰ کا ذکر کیا تو وہاں تعجب آمیز خوشی کے ساتھ اسے سُنا گیا

عہ مصطفیٰ زرقاء صاحب کی اس فاضلانہ بحث کی تفصیل، اس پر اپنی معروضات کا خلاصہ انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر شاید پیش کیا جا سکے۔

چنانچہ بعد میں بینک کے صدر صاحب نے حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ سے اس کا زبانی تذکرہ بھی کیا) اس بات سے قدرتی طور پر، ہندوستانی ہونے کے ناطے، نیز علماء کے اس گروہ کی طرف انتساب کی وجہ سے، مجھے بہت خوشی ہوئی، اس کے ساتھ اپنے اکابر کی بالغ نظری پر یقین میں اور اضافہ ہوگیا۔ یہاں یہ تذکرہ شاید بے محل نہ ہوگا کہ راقم سطور جب حجاز سے واپسی پر دہلی میں جناب محترم مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی مدظلہ سے ملا اور ان کے سامنے جلسہ کی مختصر روداد بیان کرتے ہوئے وہاں کے اس فیصلہ کا ذکر کیا تو موصوف نے بھی خوشی کا اظہار فرمایا اور اس کے ساتھ اپنے والد ماجد (عارف باللہ مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ) اور اس عصر کے بعض اکابر علماء کے اس فتوے کا پس منظر بتایا۔ گویا ان حضرات کی دور اندیشی و بالغ نظری اور اصابت رائے کا نقش تازہ کیا (فرحمھم اللہ رحمۃ واسعۃ وادخلھم النعیم المقیم)

پہلی نشست تقریباً ڈیڑھ بجے دن ختم ہوئی۔ اس کے بعد تمام شرکاء جدہ کے ایک بڑے ہوٹل "جدہ پیلیس" گئے۔ جہاں بینک کے صدر کی طرف سے، مہمانوں کے اعزاز میں پرتکلف ظہرانہ کا انتظام تھا۔ اس میں بیرونی مہمانوں کے علاوہ مقامی ممتاز اشخاص بھی مدعو تھے۔ اسی تقریب سے سرزمین عرب پر قدم رکھنے کے بیس گھنٹے کے اندر ہی عربوں کے اخلاق و تمدن، ان کی روایتی مہمان نوازی کے ساتھ وہاں عصر حاضر کی پیدا کردہ پرتکلف تہذیب کی جھلک بھی دیکھنے کا سنہرا موقعہ ہاتھ آگیا۔ کھانے کی مختلف قسم کی آٹھ دس چیزیں، تقریباً اتنی ہی پھلوں کی انواع دسترخوان پر تھیں۔ خاص ترتیب سے، ہوٹل کے خدام — ایک ایک چیز لاتے اور ہر چیز کے لئے علحدہ پلیٹ وغیرہ بھی آتی (اور پہلی پلیٹ اٹھالی جاتی) اس طرح کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹہ لذت کام و دہن کی نذر ہوا۔ مگر اس دوران علمی مذاکرہ بھی چلتا رہا۔ گویا مجلس طعام 'جسم' کے لئے ہی نہیں 'علم' کے لئے بھی برپا تھی — اس بناء پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ روح و جسم دونوں شاد کام ہو رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر موٹروں ہی میں (ہر دو نفر کو ایک موٹر پوری مدت قیام کے لئے مستقل دیدی گئی تھی) اپنی قیام گاہ پہنچے۔

مغرب بعد پھر نشست تھی جو رات کو تقریباً ۱۲ بجے تک چلی۔ اس نشست کے اختتام پر گویا کام ختم ہوچکا تھا۔ بس اب اگلے دن کے لئے صرف تجویز مرتب کر کے پاس کردینے کی رسمی کارروائی ہی باقی رہ گئی تھی (تجویز کے لئے ایک مختصر سی کمیٹی بنادی گئی تھی) بحسن اتفاق حضرت مولانا علی میاں صاحب

مدظلہ بھی جدہ پہنچ گئے۔ بنک کے صدر صاحب کو موصوف کی آمد کی اطلاع ملی تو انھوں نے باصرار آخری نشست میں شرکت کی دعوت مولانائے محترم کو دی۔ جسے مولانا محترم نے ازراہ کرم منظور فرمالیا، چنانچہ "ختامہ مسک" کا مصداق ۸ فروری ۱۹۷۹ء کو جلسہ کا اختتام (اا بجے دن) دعا پر ہوا۔ حضرت مولانا مدظلہ کے اعزاز میں اس وقت (دوپہر) کی دعوت مولانا کے جدہ کے مستقل میزبان (وہاں کے دیندار رئیس اور ملک التجار شیخ محمد نور عبدالغنی نور ولی صاحب کے یہاں تھی موصوف نے راقم سطور سے بھی کھانے میں شرکت کرنے کے لئے اصرار کیا تھا۔ چنانچہ مولانا مدظلہ کے ہمراہ اپنے معزز میزبان سے اجازت لے کر بلکہ اُن سے گویا رخصت ہو کر میں بھی (مولانا کی قیام گاہ) آگیا۔ پھر تو ایک ہفتہ شرف معیت حاصل رہا جس کا بیشتر حصہ "البلد الامین" (مکہ مکرمہ) میں گزرا۔ اس سفر میں احقر پر خداوند تعالیٰ کے جو بے شمار انعامات ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بالکل خلاف توقع حضرت مولانا مدظلہ، اور مولانا کے خواہر زادہ محترم مولانا محمد رابع صاحب زید کرمہ کی رفاقت اتنی مدت حاصل رہی جس سے دینی نفع بھی ہوا اور سہولتیں بھی پہنچیں۔ ہر نو وارد کی طرح میں بھی کسی شفیق راہنما کی دستگیری کا محتاج تھا؛ اللہ تعالیٰ کی شان کرم، اس نے ایسے ہی راہ نماؤں کا انتظام فرما دیا جس کا پہلے سے تصور بھی نہیں تھا۔ (فالحمد للہ علیٰ ذالک)

اگلے دن علی الصباح (۹ فروری مطابق ۱۲ ربیع الاول یوم جمعہ کو) حضرت مولانا مدظلہ، کے ساتھ ایک مختصر سا قافلہ کئی موٹروں میں (عمرہ کا احرام باندھے ہوئے) مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوا جس میں راقم سطور کو بھی شمولیت کا شرف حاصل رہا اور پہلی بار دن کی روشنی میں، ان مقدس و متبرک مقامات و آثار کی دید سے آنکھیں ٹھنڈا کرنے کا موقعہ ملا جن کا تصور ہی ایمان افروز اور روح پرور ہے اور جس کی تمنا ہر صاحب ایمان کے دل میں رہتی بلکہ اسی آس میں زندگی گذرتی ہے، بھلا جس نعمت کا خواب میں پالینا عظیم دولت اور خوش بختی کی علامت ہے۔ وہ بیداری میں میسر آجائے تو گناہ گار آنکھوں کی یہ جرأت کہاں کہ بغیر غسل کے تاب نظارہ لاسکیں یا تازہ بہ تازہ موتیوں کا سرمہ لگائے بغیر تابانی برداشت کرسکیں! بہرحال جوں جوں "ام القریٰ" سے قریب ہوتا گیا "فرزندوں" کے دل کی بے تابی بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ مقام آگیا، جہاں سے باادب ہو کر ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ اس سے کچھ ہی پہلے ایک ایسے تاریخی میدان سے گزرنا نصیب

ہوا، جہاں ۱۵ سو قدسی صفات جاں نثاروں نے جاں سپاری کا عہد اس دست مبارک پر کیا تھا، جس سے زیادہ پاک و مقدس ہاتھ خالق نے نہیں بنایا اور ذہن نارسا کی رسائی اور بلند پروازی دیکھیے کہ آن کی آن میں ہم اصدی پیچھے کی طرف لے جاکر چشم تصور کے سامنے ۶ھ کے وہ تمام واقعات لاکر کھڑے کرنے لگا، جو اس میدان میں پیش آچکے تھے۔ بہرحال دماغ کا سفر پیچھے کی جانب اور موٹر کا آگے کی سمت برابر جاری رہا اور اسی کے ساتھ دل برابر چٹکیاں لیتا اور ضمیر اس پر ملامت کرتا رہا کہ جو جگہ سر کے بل چلنے کی تھی وہ موٹر کے ذریعہ طے کی جارہی ہے قلب وذہن کی کشمکش سے نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک آنکھیں اسی بیت مکرم کے دیدار سے شرفیاب ہونے لگیں، جس کا وجود تمام انسانوں کی عزت وحرمت ہی کا نہیں ان کے وجود وبقاء کا بھی سبب ہے۔ اس کے ساتھ طواف کا دل آویز اور ایمان افروز منظر بھی سامنے آیا کہ مالک حقیقی کے بیت کے چاروں طرف اس کے بندے نجات کی تلاش مسلسل میں مشغول ہیں (صدیاں گزر گئیں مگر اس تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا) اور ۲۴ گھنٹوں میں کوئی لمحہ (بجز جماعت کے اوقات کے) ایسا نہیں ہوتا جس میں بندے اپنے مولا کو راضی کرنے کی فکر میں رواں دواں نظر نہ آتے ہوں اس سے بھی زیادہ روح پرور سماں "ملتزم" پر ہر دم نظر آتا ہے کہ بچوں کی طرح بلک بلک کر، اور گڑگڑا کر مانگنے والے، دینے والے سے وہ سب کچھ مانگتے اور طلب کرتے ہیں جو مانگا یا طلب کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ یقین لے کر ہی ہٹتے ہیں کہ دینے والا جس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں بس اب دینے ہی والا ہے، لاکھوں نہیں، کروڑوں انسان اپنے اپنے دامن مراد بھر چکے ہیں اور برابر بھرتے ہی چلے جارہے ہیں، مگر نہ تو دینے والا ہی اکتاتا ہے اور نہ مانگنے والے ہی وہاں تھکتے نظر آتے ہیں۔ بعض سائلوں کے نالہ و فریاد جب قریب کھڑے ہونے والوں کے دلوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتے ہیں گویا پتھر کو بھی موم بنا دیتے ہیں تو بھلا وہ الرؤف الرحیم کیوں نہ ان کی التجائیں سنے گا جس نے اپنی ایک صفت مجیب دعوۃ المضطرین بتائی ہے (بے قراروں کی فریاد سننے والا) اور حجر اسود پر انسانوں کا ٹوٹ پڑنا جس نے دیکھا ہے، پروانوں کا شمع پر نثار ہونا اس کی نظر میں مجاز بن جاتا ہے۔ ان کیف آور اور روح پرور نظاروں سے قلب و نگاہ جسم و جان کا ہٹانا اگر ناممکن

ؔ قرآن مجید میں کعبۃ اللہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس (مائدہ)

نہیں تو مشکل ضرور ہے، اگر کسی طرح اس مشکل پر قابو پالیا گیا تو وہاں سے کچھ فاصلہ پر کھڑی صفا و مروہ نامی دو چھوٹی پہاڑیوں (جنہیں دیکھ کر آج یہ باور کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ پہاڑیاں تھیں) کے درمیان ہونے والی مسلسل تگ و دو اللہ کی ایک برگزیدہ بندی کی داستان وفا سناتی دکھائی دیگی خلاصہ یہ کہ ان تمام نعمتوں سے۔ بقدر ظرف حصہ پاتے، آخر میں حلاق (حجام) کی دوکان پر جا بیٹھے اور رفتہ رفتہ تمام شرکائے میر قافلہ کے پیچھے وہیں اکٹھے ہو گئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر، حضرت مولانا مدظلہ اپنے شاگرد رشید اور مخلص قدیم مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی زاد مجدہ (استاذ ادب عربی جامعہ ملک عبدالعزیز) جنہیں مکہ مکرمہ میں مولانا کا مستقل میزبان ہونے کی سعادت حاصل ہے، کے وسیع اور آرامدہ مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ بعد میں دوسرے رفقا بھی وہیں پہنچ گئے، یہاں اس کا ذکر نہ کرنا حقیقت کو چھپانا ہوگا کہ مولانا عبداللہ عباس نے نہ صرف اپنے استاد محترم مکرم ان کے خدام و رفقا کی بھی میزبانی کا حق ادا کر دیا (فجزاہ اللہ احسن الجزاء)

جمعہ کا مبارک دن پہلی بار اس بابرکت سرزمین پر مجھے نصیب ہو رہا تھا اس لئے خواہش و کوشش تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو تیاری کر کے حرم شریف پہنچنے کی سعادت حاصل کی جائے، چنانچہ ممکنہ عجلت کے ساتھ تیاری کی، پھر موٹروں ہی میں سب لوگ (جن میں راقم سطور بھی تھا) حرم محترم حاضر ہو گئے۔ میر کارواں باب الملک عبدالعزیز کے محاذی وسطی دالان میں تشریف فرما ہوئے اور سب خدام و رفقا بھی اسی جگہ پہنچ گئے (عجب حسن اتفاق ہے کہ وہاں جمعہ کی ۱۲/ربیع الاول تھی۔ گویا جو تاریخ، بقول مشہور۔ دنیا کی قسمت جاگنے کی تھی، اس میں اس عاصی کا بخت خفتہ بھی بیدار ہو رہا تھا (وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ وصحبہ اجمعین)

پہلی بار یہ گناہ گار آنکھیں "اَیْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" کی پر کیف اور نرالی تفسیر کا مشاہدہ کر رہی تھی کہ ہر سو خدا کے بندے خدا کے حضور سر بسجود تھے، سمت کا کوئی تعین نہ تھا، البتہ سب کا قبلۂ سجود وہ بیت تھا جس کی لفظی نسبت بھی جاہلی دور تک میں صرف "اللہ" ہی کی طرف رہی اور آج بھی بیت اللہ کے علاوہ کوئی اور لقب معروف اس کا نہیں ہے، جماعت کے اختتام پر خاص انداز کا اعلان ہوتے ہی (جو ہر نو وارد کے لئے غالباً ناقابل فہم سا ہوتا ہے) پھر تمام نمازی صف بستہ ہو گئے، میری حیرانی دیکھ کر فوراً ہی حضرت مولانا مدظلہ نے متنبہ فرماتے ہوئے، نماز جنازہ ہونے کی خبر

عہ جدھر بھی اپنا رخ کر لو ادھر ہی اللہ کی ذات (کی خوشنودی اور تجلی مل سکتی) ہے۔

دی. چنانچہ ہزاروں ہزار خدا کے بندوں نے، بیت اللہ کے سامنے (ایک یا چند خوش قسمت بندگانِ خدا کی) نماز جنازہ پڑھی. میرا ملکہ شاید سب کا یقین یہی تھا کہ یہ ایسی موت تھی جس پر ہزاروں زندگیوں کو رشک آیا ہوگا. نماز کے بعد وہاں سے موٹر ہی کے ذریعہ حضرت مولانا کے ہمراہ قیام گاہ واپسی ہوئی پھر فوراً قریب ہی میں ایک صاحب وجاہت وثروت شخصیت (محترم سعدی صاحب[1]) کے یہاں حضرت مولانا کے ہمراہ پُرتکلف عربی کھانا کھایا، جس کا اہتمام مولانا کے اعزاز میں سعدی صاحب نے کیا تھا۔ اس میں بہت سی اہم شخصیتیں مدعو تھیں۔

پھر تو تقریباً ایک ہفتہ مسلسل حرم محترم کی نورانی فضاؤں میں وقت گزارنے اور نمازیں پڑھنے کی توفیق ملتی رہی۔ (فالحمد للہ علیٰ ذالک) یوں تو اس مقام کا ہر لمحہ رشکِ عید وشبِ برات ہے لیکن ہم جیسے ظاہر بینوں کو سب سے زیادہ پُرلطف اور روح پرور منظر بعد مغرب اور قبل فجر کا معلوم ہوا۔ قیام گاہ اور حرمِ شریف کے درمیان خاصا فاصلہ ہونے کی وجہ سے خطرہ تھا. کہ کہیں نماز فجر میں حضوریٔ حرم سے محرومی نہ ہو جائے، مگر اس سفر میں اللہ تعالیٰ کے جو خاص انعامات رہے ان میں یہ بھی ہے کہ روز کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جاتی جس کی وجہ سے حاضری نصیب ہو جاتی (ایسا بھی ہوا کہ قیام گاہ سے پیدل ہی چل پڑے، راستہ میں کسی موٹر نشین نے، بغیر کسی تعارف کے اپنی موٹر میں خود بٹھا کر حرم شریف پہنچا دیا۔ ہندوستان میں یہ بات چاہے جتنی تعجب خیز نظر آئے مگر وہاں رہنے والوں کے لئے اس طرح کے واقعات میں کوئی ندرت نہیں ہے) اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیز مکرم مولوی سید سلمان حسینی ندوی سلمہ اللہ کو کہ ان کی ہمت ورفاقت نے بھی اس دشواری کو بہت آسان بنا دیا تھا۔

مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران (۱۱ فروری یکشنبہ کو) منیٰ، مزدلفہ اور جنت المعلاۃ کی زیارات کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اسی کے ساتھ مسجد خیف، مسجد نمرہ اور جبل رحمت کی بھی۔ (فالحمد للہ علیٰ ذالک) اسی درمیان ہندوستانی سفیر مامور سعودی عرب (جناب عبد القادر حافظ صاحب) نے حضرت مولانا کو دیرینہ مخلصانہ تعلق کی وجہ سے ۱۲ فروری یوم دوشنبہ کو دوپہر کے کھانے پر

[1] یہ سعدی صاحب اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں جس کی یادگار مکہ معظمہ کا مدرسہ صولتیہ ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ مولانا محمد شمیم صاحب کیرانوی جو موجودہ ناظم مدرسہ صولتیہ کے حقیقی چچازاد بھائی ہیں۔ (نعمان غفرلہ)

اپنی قیام گاہ (جدہ) مدعو کیا۔ مولانا مدظلہ کے ہمراہ احقر اور مولانا رابع صاحب وغیرہ بھی مدعو اور شریک طعام تھے۔ اسی دن شام کو قبل از مغرب مکہ مکرمہ واپسی ہو گئی۔ اسی بہانے اللہ تعالیٰ نے ایک اور عمرہ کی توفیق عطا فرمادی۔ اگلے روز اپنے ویزا کی توسیع کے سلسلہ میں پھر جدہ جانا ہوا۔ سعودی عرب کے (نئی دہلی میں) سفارت خانے کی طرف سے ایک ہفتہ کا ویزا دیا گیا تھا۔ وہاں جاکر مزید دو ہفتے کی توسیع ہو سکی۔ خدا کے فضل وکرم سے (بنک کے صدر محترم کی توجہ، نیز محترم بشیر احمد صاحب انجینئر حیدر آبادی کی تگ ودو کی بدولت) چند گھنٹوں ہی میں کام ہو گیا اور بعد عصر مکہ مکرمہ واپسی ہو گئی۔ اس دن بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے عمرہ کی سعادت پھر نصیب ہو گئی۔ اسی شب میں (۱۳ر فروری ۷۹ء) جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی زاد مجدہٗ نے حضرت مولانا مدظلہ کے اعزاز میں پر تکلف عشائیہ (ڈنر) دیا جس میں تمام وجہائے مکہ، خاص طور پر ممتاز علمأ مدعو کئے گئے تھے۔ اس تقریب سے اللہ تعالیٰ نے بسہولت "بلد طیب" کے علمأ واشراف سے ملاقات کا شرف عطا فرمادیا اس سے اگلی شب میں (۱۴ر فروری ۷۹ء) مدرسہ صولتیہ کے ناظم جناب مولانا محمد شمیم صاحب زاد مجدہ (خلف الرشید حضرت مولانا محمد سلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی مدرسہ صولتیہ کے ہال میں حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ اس موقعہ پر مزید علمأ وشرفأ سے نیاز حاصل کرنے کی سعادت ملی۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی قدیم ترین تعلیم گاہ ہے۔ ایک صدی قبل جسے حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی (مصنف اظہار الحق) مہاجر مکی نے ۱۲۹۲ھ میں قائم فرمایا جس کے بقأ وقیام میں ہندوستان کے اصحاب خیر اور ذی وجاہت حضرات کی بہترین مساعی شامل رہی ہیں۔ اس لئے ہندوستانیوں، بالخصوص علمأ کو اس سے بڑا جذباتی لگاؤ ہے اور مدرسہ کے ذمہ داروں نے بھی ہمیشہ اس ربط وتعلق کی قدر فرمائی ہے۔ چنانچہ بیشتر ہندی علمأ کا قیام (زمانۂ حج میں) وہیں رہتا ہے۔ راقم سطور کے لئے اس عمومی وجہ کے علاوہ جذباتی لگاؤ کا ایک اور سبب بھی ہے۔ وہ یہ کہ احقر کے والد ماجد قاری حمید الدین سنبھلی تقریباً ۴۵، ۴۶ سال (قبل ۱۹۳۲) اس مدرسہ کے طالب علم رہ چکے ہیں، جہاں انہوں نے استاذ القرأ مولانا قاری عبداللطیف صاحب مکی سے قرأت عشرہ کی تکمیل کی تھی۔ چنانچہ محترم مولانا محمد شمیم صاحب زیدہ مجدہٗ نے جو والد صاحب سے اچھی طرح واقف ہیں، اسی رشتہ سے احقر کے ساتھ خاص شفقت اور عنایت کا معاملہ کیا۔ اور اس جگہ

کی زیارت بھی کرائی، جہاں والد صاحب قاری عبد اللطیف صاحب سے مستفید ہوتے تھے (وہ کمرہ آج کل، روحانی کے بجائے، مادی غذا کے مرکز کے طور پر استعمال ہو رہا ہے) اور مجھے مدرسہ میں ہی قیام کرنے کا حکم فرمایا (فجزاہ اللہ خیر الجزاء) اگر حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کی رفاقت کے شرف سے محرومی کا خیال نہ ہوتا تو ضرور تعمیل حکم کی جاتی بلکہ ہندوستان سے روانگی کے وقت وہیں قیام کا ارادہ تھا (اسی لئے مخدومی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے تعارفی خط بھی عنایت فرمایا تھا)

غرضیکہ اس طرح ابھی ایک ہفتہ ہی مکہ مکرمہ کے قیام پر گذرا تھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی حجاز سے واپسی کا وقت آگیا، اس لئے سب خدام اور رفقاء مولانا کے ہمراہ جدہ تودیع کی غرض سے گئے اور ۱۵ فروری یوم پنجشنبہ کو جدہ ایئرپورٹ پر مولانا کو ۱۲ بجے، دن رخصت کر کے احقر تو مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ (جاری)

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

خاندانِ نبوی پر زکوٰۃ کی حرمت اور بعض مغربیت زدہ لوگوں کا اس پر اعتراض

—(۲)—

معترضین کے اعتراضات کا جائزہ

خاندان نبوی پر زکوٰۃ کی حرمت کے بارے میں اوپر جو کچھ لکھا گیا اس کے بعد مغربیت زدہ حضرات کے وہ دونوں اعتراضات، جن کا اوپر ذکر کیا گیا خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، لیکن مزید اطمینان کے لئے ہم ان دونوں اعتراضوں کا الگ الگ جائزہ لیں گے۔

پہلا اعتراض یہ تھا کہ "اوساخ الناس" ہونے کی بنا پر بنو ہاشم کے لئے زکوٰۃ کی حرمت اور دوسرے خاندانوں کے لئے اس کی حلت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اسلام نے خاندان نبوی کو معزز سمجھا ہے اور دوسرے خاندانوں کو ذلیل تصور کر کے انہیں "اوساخ الناس" کا مصرف قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ — "اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرو" تو جب آپ نے اپنے خاندان کے لئے زکوٰۃ وصدقات کو پسند نہیں فرمایا، تو دوسروں کے لئے اسے پسند کرنا خود آپ کی تعلیم کے خلاف ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ خاندان نبوی اور دوسرے خاندانوں میں فرق کرنے کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلام کی نظر میں دوسرے خاندان ذلیل وکم حیثیت ہیں۔ بلکہ اس تفریق کی بنیاد

وہ مصالح ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ جہاں تک صدقات کے میل کچیل ہونے کی بات ہے وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ چنانچہ جو لوگ صدقات پر گزر بسر کرتے ہیں اور اسی قسم کی روزی پر قناعت کر لیتے ہیں، ان کے اندر، انسانیت کی اعلیٰ صفات، بلند قدریں دم توڑنے لگتی ہیں۔ اسی لئے اسلام نے کسی کے لئے صدقات کو پسند نہیں فرمایا۔ اسلام نے دریوزہ گری کی بے انتہا مذمت کی ہے اور سب ہی کو اس سے پرہیز کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

لیکن جو افراد کمانے سے معذور ہیں یا کوشش کر کے بھی باوجود انہیں کوئی ذریعہ معاش ہاتھ نہیں آیا، ان کے لئے مجبوری کے درجہ میں اس کی اجازت دیگئی، جس طرح اضطرار کی حالت میں مردار کھانا موجب گناہ نہیں ہوتا۔ نیز یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ اگر فقر و تنگ دستی میں بھی کسی کے لئے صدقات کا استعمال جائز نہ قرار دیا جاتا تو پھر اس کا مصرف کیا ہوتا؟ کیا اتنی بڑی رقم اور مالیت کو یوں ہی ضائع کر دیا جاتا؟

بہر حال مجبوری کی حالت میں عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ صدقات کا استعمال جائز قرار دیا جائے لیکن خاندان نبوی کے لئے فقر کی حالت میں بھی صدقات کی اجازت چند نقصانات پیدا کرتی جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، مثلاً خاندانی اجارہ داری کا خطرہ، مخالفین کی طعن و تشنیع اور تہمت کا اندیشہ ان رکاوٹوں کی وجہ سے خاندان نبوی کے لئے حرمت کا حکم فقر کی حالت میں بھی باقی رہا۔ علامہ باجی مالکی منتقی شرح موطا میں لکھتے ہیں۔ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ و صدقات کو میل کچیل اس لئے کہا کہ صدقات مال کو پاک کرتے ہیں اور گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں۔ فقراء کے لئے مال زکوات کھانے کی گنجائش اسی طرح ہے جس طرح زیادہ ضرورت اور مجبوری کی شکل میں ان کے لئے ممنوع کھانوں کی گنجائش ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ان کا خاندان اس قسم کی روزی سے بالکل الگ رہے اور انہیں صبر کرنے کی وجہ سے اوروں سے زیادہ افضل چیز یعنی اخروی ثواب ملے اور امت مسلمہ کے افراد خاندان نبوی کے فقراء کے لئے باعزت روزی مہیا کریں" [11]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ" [12] (تم میں سے کوئی حقیقی مومن نہیں ہو گا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز

[11] منتقی ا ص ۳۲۵ [12] صحیح بخاری جلد اول ص ۶

پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے) کی بنیاد پر اعتراض کرنا اس لئے غیر معقول ہے کہ حضورؐ نے صدقات کو کسی کے لئے پسند نہیں کیا۔ مجبوری کے وقت اجازت دینا دوسری چیز ہے اور پسند کرنا بالکل دوسری چیز۔

دوسرے اعتراض کا جائزہ

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ غربت و فقر کی حالت میں بھی خاندان نبوی کے لئے زکوٰۃ کی حرمت ان پر بہت بڑا ظلم ہے۔ کیا ان کی قربانیوں اور سرفروشیوں کا یہی صلہ ہے کہ ان کے اوپر رزق کے دروازے بند کر دیئے جائیں؟

یہ اعتراض بالکل ہی مہمل ہے۔ معترض نے جس بات کو ظلم قرار دیا ہے وہ ظلم نہیں بلکہ سراپا رحمت اور اکرام و اعزاز ہے۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا۔

خاندان نبوی کا اگر کوئی فرد فقر و فاقہ کی حالت میں ہے تو مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ ہدایا تحائف اور دوسرے باعزت طریقوں سے ان کی خدمت کریں۔ امت مسلمہ کے لئے بہت بے غیرتی کی بات ہوگی کہ خانوادۂ نبوت کا کوئی فرد مجبوری و لاچاری کی وجہ سے دست سوال دراز کرے یا صدقات پر گزر بسر کرے۔ خداوند تعالےٰ نے ایک ذلت آمیز ذریعۂ معاش کو بند کر کے ان کے لئے دوسرے باعزت ذرائع مہیا کر دیئے ہیں۔

اللہ تعالےٰ فقہاء کرام کو جزائے خیر دے، انھوں نے اکثر امکانی مسائل کے احکام پہلے ہی بیان کر دیئے ہیں۔ قدیم دور میں تو مسلمانوں کی خاندان نبوی سے اس بے التفاتی اور بے رخی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ازمنۂ ماضیہ میں مسلمانوں کو خاندان نبوی سے کس قدر محبت تھی؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اہل بیت کی محبت کو اہل سنت و جماعت کی علامتوں اور شرائط میں شمار کیا ہے۔ پھر بھی ہمارے فقہائے نے بیان کر دیا کہ اگر کسی وقت مسلمانوں کی غفلت و بے التفاتی سے خاندان نبوی کے بعض افراد کو غیر معمولی فقر کا سامنا کرنا پڑے تو وہ لوگ کیا کریں؟

بعض اسلامی فرقوں نے بلاشبہ تشدد سے کام لیا ہے۔ چنانچہ شیخ یوسف قرضاوی فقہ الزکوٰۃ میں لکھتے ہیں:۔ "اس سلسلہ میں زیدیہ کا مسلک سب سے زیادہ سخت ہے، انہوں نے ہاشمی کے لئے

ہاشمی کی زکوٰۃ کو بھی جائز نہیں کہا، انہوں نے یہاں تک کہا کہ بنو ہاشم کے لئے زکوٰۃ لینے کی بنسبت مردار خوری بہتر ہے۔ ہاں اگر مردار کا کھانا ان کے لئے طبی طور نقصان دہ ہو تو بطور قرض زکوٰۃ میں سے لے سکتے ہیں اور جب ہو سکے قرض واپس کر دیں۔ اور یہ تمام باتیں اس ہاشمی کے بارے میں ہیں جس کو بھوکے، پیاسے یا ننگے رہنے کی بنا پر موت یا کسی عضو کے تلف ہونے کا خطرہ ہو۔[۱۳]

لیکن بہت سے فقہا نے گنجائش نکالی ہے اس مضمون میں ہم یہ بحث نہیں چھیڑتے کہ فتویٰ کس پر ہے؟ اور نہ اس کی تعیین کرتے ہیں کہ فقر کی وہ کون سی منزل ہے جس پر پہنچنے کی صورت میں صدقات خاندان نبوی کے لئے حلال ہو جاتے ہیں۔ بلکہ صرف ان چند عبارتوں پر اکتفا کرتے ہیں جن سے علماء و فقہا کے نزدیک اس میں گنجائش نکلتی ہے۔

امام طحاوی لکھتے ہیں ــــ " اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ کی مختلف روایتیں ہیں ــــ ان کی ایک روایت یہ ہے کہ صدقات خواہ فرض ہوں یا نفل، بنی ہاشم کے لئے ان کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں خمس میں چونکہ آل نبیؐ کا حصہ مقرر تھا، اس لئے ان کے لئے صدقات حرام تھے۔ اور حضورؐ کی وفات کے بعد چونکہ ان کو وہ حصہ نہیں ملتا لہٰذا بنو ہاشم پر صدقات خرچ کرنا جائز ہو گیا۔ مجھ سے سلیمان بن شعیب نے بیان کیا، سلیمان سے ' ان کے باپ نے ' اور ان کے باپ سے محمدؒ نے " اُن سے ابو یوسف نے بیان کیا کہ امام ابو حنیفہ بھی انھیں کی طرح جواز کے قائل ہیں۔ (امام طحاوی فرماتے ہیں کہ) ہم بھی اسی قول کو اختیار کرتے ہیں [۱۴]

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحؒ کی درس صحیح بخاری کی تقریر فیض الباری میں ہے۔

امام طحاوی رحؒ نے امالی ابی یوسف سے نقل کیا ہے کہ آل نبیؐ کو زکوٰۃ دینا جائز ہے جب کہ انہیں خمس میں حصہ نہ ملتا ہو۔ کیونکہ خمس میں ان کا حصہ ہے۔ لہٰذا جب وہ حصہ نہیں مل رہا ہے تو زکوٰۃ کا ان پر خرچ کرنا جائز ہے۔ عقد الجید میں ہے کہ امام رازی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میرے خیال میں زکوٰۃ لینا سوال کرنے سے آسان ہے۔ لہٰذا میں بھی ایسی صورت میں جواز کا فتویٰ دیتا ہوں [۱۵]

---

۱۳ فقہ الزکوٰۃ جلد دوم صفحہ ۴۲۱ ۱۴ شرح معانی الآثار ص ۳۰۲/۱ ۱۵ فیض الباری ص ۵۱-۵۲/۳

—— ان دو عبارتوں پر اکتفا کرتے ہوئے عرض ہے کہ مسلمانوں کی بے رخی کے نتیجے میں خانوادۂ نبوت کے فقرا کا جن حالات سے سابقہ پڑنے کا امکان تھا ہمارے فقہاء نے ان کا حل پہلے سے بیان کر دیا ہے۔ خاندان نبویؐ کے افراد کو آج کل کے نام نہاد ہمدردوں کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔

مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

میرا مطالعہ

راقم الحروف نے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی اکثر تصانیف کا اپنے امکان کی حد تک غور سے مطالعہ کیا ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ اس مطالعہ سے میں نے علمی فائدہ بھی اٹھایا ہے جس کے لئے مجھے ممنون ہونا چاہیئے ___ اسی کے ساتھ مولانا موصوف کی تحریروں میں میں نے بعض باتیں سخت قابل اعتراض بھی محسوس کیں جو ان کے معتقدین کے لئے گمراہی کا باعث بن سکتی ہیں کیونکہ ان کے متبعین میں ان کے بارہ میں سخت غلو ہے، وہ ان کو اس دور کا مجدد بلکہ "مجدد کامل" سمجھتے ہیں اور بے تکلف اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ صدیوں کے بعد مولانا مودودی صاحب ہی نے دین کو اور قرآن کو صحیح سمجھا ہے، اور صحیح اسلام وہی ہے، جو انھوں نے اپنی کتابوں میں پیش کیا ہے، اور امت کے جن بڑے علماء نے ان پر تنقید اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے وہ بدنیت اور مرضِ حسد کے مریض ہیں ___ اس لئے میں نے ضرورت محسوس کی کہ مولانا کی تصانیف سے چند ایسی عام فہم باتیں خاص کر ان کے متبعین کی خدمت میں پیش کردوں جن کی غلطی سمجھنے کے لئے نہ بڑے علم کی ضرورت ہے نہ کسی خاص درجہ کی ذہانت اور باریک بینی کی۔

اس کاوش سے اس ناچیز کا مقصد صرف یہ ہے کہ خود مولانا مودودی صاحب (جو بفضلِ خدا

ابھی حیات ہیں اور بظاہر عمر کے آخری دور میں ہیں) میری معروضات پر غور فرمائیں اور ان کے متبعین ان کے بارے میں جس غلو میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اس سے نکل سکیں۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ،

مولانا مودودی صاحب کی تصانیف کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی ایک مزاجی خصوصیت یا کہیئے کہ اُن کا ایک مرض بے جا پندار، اعجاب بنفسہ اور کبر ہے جس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ کسی بڑی سے بڑی باعظمت ہستی حتیٰ کہ صحابۂ کرام پر بھی تنقید کرتے ہیں تو اُن کا قلم اسی بے باکی سے چلتا ہے جس بیباکی سے وہ اپنے معاصرین کی خبر لیتے ہیں۔ جس دل میں کبر کا روگ نہ ہو اس کا قلم اکابر امت خاص کر صحابۂ کرام کی شان میں اس بیباکی سے نہیں چل سکتا۔ ان کی اس سلسلہ کی عبارتوں کو پڑھ کر ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے ان کا نفس اس طرز تنقید سے لذت حاصل کرتا ہے۔

اسی پندار و کبر کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی بڑی سے بڑی غلطی ہو جائے اور ان کو وہ بتلا بھی دی جائے تو وہ اس کا اعتراف اور اس سے رجوع نہیں کرتے۔ یا تو تاویل کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اگر اس کی بھی گنجائش نہیں پاتے تو خاموشی اختیار فرما لیتے ہیں — ان دونوں باتوں کے لئے ان کی تصانیف سے اس وقت صرف ایک ہی مثال پیش کرتا ہوں — اللہ تعالیٰ نے جن دلوں کو قبول حق کی صلاحیت سے محروم نہیں کیا ہے، ان کے لئے ان شاء اللہ یہ ایک مثال ہی کافی ہوگی

مولانا مودودی کی ایک مشہور تصنیف "خلافت و ملوکیت" ہے۔ اس کتاب میں مولانا موصوف نے دیگر اسلامی بادشاہوں کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور ان کے طرز سیاست و حکومت کے بارہ میں بھی بہت کچھ لکھا ہے — اس سلسلہ کی ان کی یہ عبارت ناظرین کرام ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

"مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو بادشاہوں نے اپنے مفاد، اپنی سیاسی اغراض اور خصوصاً اپنی حکومت کے قیام و بقا کے معاملہ میں شریعت کی عائد کی ہوئی کسی پابندی کو توڑ ڈالنے، اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کیا

اگرچہ ان کے عہد میں بھی مملکت کا قانون اسلامی قانون ہی رہا۔ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کی آئینی حیثیت کا ان میں سے کسی نے کبھی انکار نہیں کیا۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔لیکن ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی، اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے پورے کرتے تھے، اور اس معاملہ میں حلال وحرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ پالیسی حضرت معاویہؓ کے عہد ہی سے شروع ہو گئی تھی۔"

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۷۳ مطبوعہ مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی)

دوسرے بادشاہوں سے اس وقت بحث نہیں دیکھنا یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مودودی صاحب پوری بے تکلفی اور بیباکی کے ساتھ کیا کیا لکھتے چلے گئے ہیں۔ حسب ذیل فقروں پر دوبارہ نظر ڈال لیجیے:

"اپنے مفاد" "اپنی سیاسی اغراض" "شریعت کی عائد کی ہوئی کسی پابندی کو توڑ ڈالنے اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کیا" (اپنی سیاست کے) "تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے پورے کرتے تھے۔ اور اس معاملہ میں حلال وحرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔"

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔

قطع نظر اس سے کہ اس عبارت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بڑی حد تک قطعاً غلط اور بے اصل ہے ـــ لیکن جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے وہ دل کے حال کا پتہ دیتا ہے ـــ پھر مودودی صاحب کا آخری جملہ کہ ـــ "اور اس معاملہ میں (سیاست کے معاملہ میں) حلال وحرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے"۔ مولانا کے اس جملہ پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ صحابیٔ رسول اور اسکو حرام وحلال تک کی تمیز روا نہ ہو؟!! اس موقعہ پر تمیز کے لفظ پر بھی غور فرما لیجئے ـــ سوچئے کہ مولانا کی اس عبارت میں بیباکی اور سوءِ ادب کی کتنی بڑی مقدار شامل ہے۔

مولانا مودودی کی جماعت (جماعت اسلامی) کے دستور میں "عقیدہ" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا گیا ہے، اور جماعت کے ہر فرد کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ ـــ "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان

کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔" (دستور جماعت اسلامی، بذیل عقیدہ)
تو کیا اس دفعہ میں تنقید سے بالاتر نہ سمجھنے کے یہ معنی ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تک کے لئے جو منہ میں آئے کہہ ڈالا جائے اور اس میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کی جائے خواہ اس ریمارک سے رسول اللہ کے صحابی قطعی بے دین ہی کیوں نہ نظر آنے لگیں — کیا ناظرین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صحابی کے متعلق یہ سوچ بھی سکتے ہیں کہ انھوں نے شریعت کی ساری پابندیوں کو توڑ ڈالا تھا، اس کی حدود کو وہ پھاند گئے تھے، حتیٰ کہ حلال و حرام کی تمیز بھی انھوں نے اٹھا دی تھی؟!

پھر اس کتاب کے اگلے ہی صفحے پر حضرت معاویہ رضی ہی کے متعلق مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ رضی کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجدِ نبوی میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ اور حضرت علی رضی کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اسے گالیاں دینا، شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا۔ اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔" (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۷۴)

مولانا کے اس بیان کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جسم کانپنے لگتا ہے کہ یا اللہ یہ حضرت معاویہ رضی کو کیا ہو گیا تھا، کہ دین، شریعت، اخلاق اور عام انسانیت، سب ہی کو وہ بھلا بیٹھے تھے؟! یعنی جس رذالت اور کمینگی کی توقع کسی شریف الطبع کافر سے بھی نہیں کی جا سکتی (معاذ اللہ) حضرت معاویہ نے اس کو اپنا مستقل مشغلہ بنا لیا تھا — یقین کیجیے کہ جب ہم نے مولانا کی اس عبارت کو پڑھا تو ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے، اور ہمارے دل پر ایسی کیفیت طاری ہوئی، جس کو لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا — کسی طرح دل یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اس میں کچھ بھی سچائی ہوگی لیکن مودودی صاحب نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں تاریخ اسلام کی مشہور و مستند کتابوں کے ایک دو نہیں پورے پانچ حوالے دیئے تھے، اور یہ حوالے بھی سرسری نہیں بلکہ کتابوں کے نام، صفحات اور جلدوں کے نمبروں کے

ساتھ، اس لئے اس بیان کو غیر واقعی سمجھنا بھی آسان نہیں تھا۔ ہم نے کتب خانے میں جا کر، جب دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ کتابوں کو کھول کر دیکھا تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ مولانا مودودی کے بتائے ہوئے مقامات پر اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں تھا جس کو انھوں نے اتنے وثوق اور شد و مد کے ساتھ تحریر فرمایا تھا۔ ہمیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ مودودی صاحب اتنی ناروا جسارت کر سکتے ہیں۔ ہم نے کتابوں کو بار بار الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن ان میں سے کسی ایک کتاب میں بھی حضرت معاویہ رضؓ کے بارے میں ان "سنگین جرائم" کا کوئی ذکر، نظر کے سامنے نہیں آیا۔

پھر غضب یہ ہے کہ مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف برسرِ منبر گالیاں دینے کی نسبت ہی کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ اس فعل کی خباثت اور شناعت میں ہزاروں گنا زیادہ اضافہ کرنے اور اس طرح اس کے مرتکب (حضرت معاویہؓ) کی طرف سے اپنے ناظرین کے دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنے کے لئے انتہائی درد انگیز الفاظ اور کسی حد تک شیعہ ذاکرین کے انداز میں صورتحال کا نقشہ بھی کھینچا — ناظرین پھر ایک بار مودودی صاحب کی عبارت کو پڑھ لیں:

مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضۂ نبوی کے سامنے

ظاہر ہے کہ مسجد نبوی میں خطبہ دینے والا منبر رسول پر ہی کھڑا ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ روضۂ نبوی بھی اس کے سامنے ہی ہوگا، جو بات بدیہی اور کھلے طور پر سب کو معلوم تھی اس کی اس طرح صراحت فعل کی شناعت کو بڑھا کر دکھانے کے لئے ہی کی جا سکتی ہے۔ یہ کام جب ہی کیا جا سکتا ہے جب بیان کرنے والے نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مسلمانوں کے دلوں میں بدظنی اور نفرت بھرنے کا تہیہ ہی کر لیا ہو۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو معاملہ چونکہ ایک صحابیٔ رسول کا تھا اس لئے بالفرض اگر یہ واقعہ مضبوط قسم کی تاریخی روایات سے بھی ثابت ہوتا تب بھی اس کو بڑے دکھ کے ساتھ اور محتاط الفاظ میں بیان کیا جاتا، شاعری اور مبالغہ آرائی کے جملوں کی بھرمار ہرگز نہ ہوتی، یہ اتنی سیدھی اور کھلی ہوئی بات ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے۔

ہم نے ابھی کہا کہ مولانا مودودی صاحب نے جو پانچ حوالے دیئے ہیں وہ بالکل غلط اور فرضی ہیں ان مقامات پر یہ واقعہ قطعاً مذکور نہیں ہے، لیکن چونکہ مولانا مودودی بہت بڑی شہرت کے مالک ہیں اس لئے اس کا پورا امکان ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہماری بات پر یقین نہ آئے اور وہ اس کو مودودی صاحب

کے خلاف پروپیگنڈا سمجھیں، اس لئے جو حضرات عربی داں ہوں اور خود عربی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہوں ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ خود ان کتابوں میں مولانا مودودی کے بتائے ہوئے مقامات پر، ان روایتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہم مولانا کے دیئے ہوئے حوالے نیچے درج کرتے ہیں

(طبری جلد ۴ صفحہ ۱۸۸ — ابن الاثیر جلد ۳ صفحہ ۲۳۴ و جلد ۴ صفحہ ۱۵۴ —
البدایہ جلد ۸ صفحہ ۲۵۹ و جلد ۹ صفحہ ۸۰) حاشیہ خلافت و ملوکیت ص ۱۷۴)

اور جو لوگ عربی نہیں جانتے یا جن کو ان کتابوں کے دستیاب ہونے کے مواقع حاصل نہیں ہیں، ان کے اطمینان کے لئے ہم خود مولانا مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" سے ایک عبارت پیش کرتے ہیں، جس میں ان حوالوں کے غلط ہونے کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اقرار خود مولانا کے قلم سے نہیں ہے، بلکہ یہ اقرار اُن کے ایک وکیل صاحب کی طرف سے ہے۔ ناظرین پہلے اس کا پس منظر جان لیں!

پاکستان کے مشہور فاضل، صاحب علم و قلم مولانا محمد تقی عثمانی (مدیر ماہنامہ "البلاغ" کراچی) نے مودودی صاحب کی اسی کتاب (خلافت و ملوکیت) پر، جس کی عبارتیں زیر بحث ہیں، تنقید کا ایک سلسلہ اپنے رسالہ "البلاغ" میں جاری کیا تھا، اس میں انھوں نے ان پانچ حوالوں کی بات بھی اٹھائی تھی، اور لکھا تھا کہ یہ حوالے غلط ہیں — عثمانی صاحب کے ان مضامین کے جواب میں مولانا مودودی صاحب کے ایک صاحب قلم رفیق اور ان کی "جماعت اسلامی پاکستان" کے رکن رکین جناب ملک غلام علی صاحب نے "ترجمان القرآن" میں مضامین کا ایک سلسلہ چلایا جس میں انھوں نے مودودی صاحب کے حوالوں کی غلطی کا اعتراف حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"مجھے عثمانی صاحب کی شکایت اس حد تک تسلیم ہے کہ جن مقامات کے حوالے مودودی صاحب نے دیئے ہیں وہاں یہ بات صراحتہً[1] مذکور نہیں کہ امیر معاویہؓ خود سب و شتم کیا کرتے تھے۔"

(بحوالہ ترجمان القرآن جولائی ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۴ و ۲۵ "حضرت معاویہؓ تاریخ کے آئینے میں" مصنفہ مولانا محمد تقی عثمانی ص ۱۲۷)

[1] ملک غلام علی صاحب نے "صراحتہً" کے لفظ سے اپنے ناظرین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مودودی صاحب نے جن مقامات کے حوالے دیئے ہیں وہاں یہ بات صراحتہً تو مذکور نہیں ہے لیکن اشارتہً کنایتہً مذکور ہے! راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اشارتہً کنایتہً بھی مذکور نہیں ہے — (عارف)

مولانا مودودی صاحب کے وکیل ملک صاحب کے اس جواب سے یہ تو یقینی طور پر معلوم ہو گیا۔ کہ مودودی صاحب کے پانچوں حوالے غلط ہیں۔ اگر ملک صاحب نے اس اعتراف پر ہی اکتفا کیا ہوتا تو ہمیں یہ جان کر خوشی ہوتی کہ مودودی صاحب کے معتقدین اور رفقاء ان کی غلطی کو بھی غلطی تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ملک صاحب نے اس بادل ناخواستہ اعتراف کے معاً بعد مولانا مودودی کی بات بنانے کی کوشش میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی افسوسناک بلکہ عبرتناک ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ــــ اگرچہ مودودی کے حوالے صحیح نہیں ہیں، مگر دوسری روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ اپنے گھر پر ایک نجی مجلس میں ایک صحابی کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے برائی کے ساتھ تذکرہ کیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ اپنے گھر میں کسی کو برا کہنا چونکہ غیبت کی حد میں آتا ہے اس لئے وہ برسر منبر گالیاں دینے سے بھی برا ہے۔

گویا جماعت اسلامی کے ان ذمہ دار رکن اور مولانا مودودی کے ان وکیل صاحب کے نزدیک کسی کو اس کی عدم موجودگی میں مجمع عام میں برسر منبر گالیاں دینا غیبت کی حد میں نہیں آتا ــــ افسوس ہے کہ مولانا مودودی کی وکالت و حمایت نے ملک غلام علی صاحب جیسے ایک پڑھے لکھے آدمی کو کس قدر لغو بات کہنے پر آمادہ کر دیا ــــ اور انھوں نے اس کی بھی بالکل پروا نہیں کی کہ اس طرح مودودی صاحب کو بچانے میں ایک صحابی رسول کی ذات مجروح ہو رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب ہی کی تحریروں نے ان حضرات کی یہ تربیت کی ہے اور ان کا یہ مزاج بنایا ہے ــــ کاش یہ حضرات، اپنے اس طرز عمل کے بارے میں خود کچھ سوچیں۔

یہ تو جماعت اسلامی کے ایک ذمہ دار رکن کی افسوسناک جانبداری اور ایک صحابی رسول کے مقابلہ میں مولانا مودودی کی حمایت میں حد سے بڑھ جانے کا تذکرہ تھا لیکن ابھی مودودی صاحب کے معاملہ پر غور کرنا باقی ہے۔

ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے علم میں یہ سب کچھ آیا لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے انھوں نے ابھی تک حوالوں کے بارے میں اپنی اس سنگین غلطی کا اعتراف اور اس سے رجوع کا اعلان نہیں کیا ہے حالانکہ یہ غلطی کسی معمولی فقہی یا علمی مسئلہ میں نہیں تھی بلکہ ایک صحابی رسول پر سنگین ترین تہمت کا مسئلہ تھا۔ ہم اس کی کوئی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکے کہ وہ اس کبر و پندار کے مستقل مریض ہیں جو اپنی غلطی

کے اعتراف سے ہمیشہ مانع ہوتا ہے ۔۔۔ قرآن مجید میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا جو واقعہ بیان فرمایا گیا ہے اس کا خاص سبق یہی ہے کہ "کبر" کی خصلت رحمت خداوندی سے محرومی کا سبب بن جاتی ہے، اور اپنی غلطی اور قصور کا اعتراف بندے کو اللہ کا مقبول و مقرب بنا دیتا ہے۔

اگر مولانا مودودی کے معتقدین میں سے کوئی صاحب ہم کو یہ بتلا دیں کہ مولانا موصوف نے اپنی اس غلطی کا اعتراف و اعلان فرمایا ہے اور اس سے رجوع فرمالیا ہے تو ہمیں بیحد خوشی ہوگی۔ اور ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔　　(باقی)

انتخاب

شیخ کے اتباع کامل میں شرک فی النبوۃ کے شبہ کا تفصیلی جواب

(از افادات حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ)

[تقریباً ۴۰ سال پہلے کی بات ہے مولانا عبدالماجد دریابادی (علیہ الرحمہ) نے ایک مکتوب کے ذریعہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ سلوک و طریق میں شیخ کے "اتباع کامل" پر جو زور دیا جاتا ہے، اس میں شرک فی النبوۃ کا شبہ ہوتا ہے ـــــ حضرتؒ نے اس کا تفصیلی جواب ارقام فرمایا تھا ـــــ جو حسب معمول خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے اصلاحی و تربیتی ماہنامہ "النور" میں اسی زمانہ میں شایع بھی ہو گیا تھا اور حضرت نے اس کا عنوان "الاعتدال فی متابعۃ الرجال" تجویز فرمایا تھا ـــــ ماہنامہ معرفت حق الہ آباد" کے جنوری کے شمارہ میں وہ نظر سے گزرا ـــــ مناسب معلوم ہوا کہ اس کو اپنے ناظرین تک بھی پہنچا دیا جائے، اس طرح وہ "الفرقان" میں بھی محفوظ ہو جائے گا!]

سوال از مولانا دریابادیؒ

شیخ کے اتباع کامل کے متعلق جناب نے اس والا نامہ میں بھی ارشاد فرمایا (اس سے پہلے کا ایک خط مراد ہے) اور اس کے علاوہ بارہا زبان مبارک سے بھی سنا اور دوسرے

بزرگوں کے ہاں کبھی اس کی تاکید دیکھی لیکن اپنے نفس کی شرارت سمجھی جائے یا جو کچھ بھی۔ پوری تشفی جیسی اور بیسیوں مسائل میں زبانِ مبارک سے سننے کے بعد ہو چکی ہے اس مسئلہ میں نہیں ہوتی۔ شبہہ اتباع میں نہیں، اتباع کامل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ دل یہی کہنے لگتا ہے کہ یہ صورت تو شرک فی النبوۃ کی سی ہو گئی، آنکھ بند کر کے اتباع کے قابل تو حضرات انبیاء کے ہی اقوال و افعال ہو سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ خلفائے راشدین کے۔ باقی اور کوئی صاحب کیسے ہی بزرگ ہوں۔ بہرحال معصوم نہیں۔ رائے میں بھی غلطی کریں گے اور عمل میں بھی۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم دن رات انھیں غلط کاریوں میں غرق رہتے ہیں اُن سے ان کا صدور کمتر ہوتا ہے۔ ہم ہزار بار غیبت کریں گے، وہ ایک بار۔ ہم سے ادائے حقوق خالق و مخلوق میں کوتاہی بیشمار بار ہوتی ہے ان سے کبھی کبھی، لیکن یہ کسی کامل سے کامل غیر معصوم کے لیے کیسے فرض کر لیا جائے گا اس کے نہ تجربہ میں غلطی ہوتی ہے نہ علم میں نہ عمل میں۔ میرے دل کو بس سب سے زیادہ حضرت سید احمد صاحب کا وہ قول لگتا ہے جو جناب ہی کی زبان سے میں نے سُنا ہے کہ مولانا شہیدؒ جب ان سے کسی مسئلہ میں گفتگو کرتے کرتے خلاف ادب سمجھ کر درمیان میں رُک گئے تو حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ تو شرک فی النبوت ہے" بس یہ تعلیم میرے دل میں اُتر گئی ہے۔ نیز مولانا گنگوہیؒ کا معاملہ "صفت مسئلہ" کے متعلق، اعتقاد کامل و اعتمادِ کامل جس شے کا نام ہے وہ زندہ بزرگوں سے کیا معنی سابق بزرگوں تک سے کبھی نہیں پیدا ہوتا یہاں تک کہ حضرت مولانا رومیؒ سے بھی، جن کی مثنوی کا باوجود اپنی نافہمی کے عاشق ہوں۔ حاشا کلا یہ مراد نہیں کہ اپنے کو اور بزرگوں کو ایک درجہ میں رکھتا ہوں۔ معاذ اللہ۔ ذرہ اور آفتاب کی نسبت کیا۔ لیکن یہ حق کہ اس کا ہر قول ہر عمل واجب الاتباع ہو صرف رسول کا سمجھتا ہوں۔ اور بہت کھینچ تان کر صدیقؓ و فاروقؓ و عثمانؓ و حیدرؓ کا بھی۔ ایک سوال متعین طور پر اور کر لینے کی اجازت چاہتا ہوں، دوسرے بزرگوں کا مرتبہ حضرات صحابہؓ سے تو بہرحال کمتر ہے۔ اب جب بعض صحابہؓ کی اجتہادی غلطیاں (مثلاً حضرت علیؓ کے مقابلہ میں قتال) نیز بعض صحابہؓ کی عملی لغزشیں (مثلاً حضرت ماعزؓ کی مشہور لغزش اور حضرت وحشیؓ کی شراب خوری) اسلم ہیں تو خود یہ حضرات صحابہؓ اتباع کامل

کے حقدار نہ ٹھہرے چہ جائے کہ جو حضرات ان سے مسلّم طور پر کمتر ہیں۔

جواب و تحقیق از حضرت حکیم الامت قدس سرہ

غالباً میرے کل معروضات اس کے متعلق آپ کے ذہن میں اس لیے جمع نہ رہے کہ شاید ایک جلسہ میں کبھی مجتمعاً بیان نہیں کیے گئے۔ اب اس کا ملخص مجموعاً عرض کرتا ہوں۔ یہ اتباع نہ عقائد میں ہے نہ کشفیات میں نہ جمیع مسائل میں نہ اُمور معاشیہ میں، صرف طرقِ تربیت و تشخیص امراض و تجویز تدابیر اور اُن مسائل میں ہے جن کا تعلق اصلاح و تربیتِ باطنی سے ہے وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ ان کا جواز مرید و شیخ کے درمیان متفق علیہ ہو اور اگر اختلاف ہو تو شیخ سے مناظرہ کرنا تو خلافِ طریق ہے اور امتثالِ امر خلافِ شریعت ہے۔ ایسی صورت میں ادب جامع بین الادبین یہ ہے کہ علماء سے استفسار کر کے یا اپنی تحقیق سے حکم متعین کر کے شیخ کو اطلاع کرے کہ میں فلاں عمل کو جائز نہیں سمجھتا اور ہمارے سلسلہ میں اس کی تعلیم ہے مجھ کو کیا کرنا چاہیئے اس پر اگر شیخ پھر بھی وہی حکم دے تو اس شیخ کو چھوڑ دینا چاہیے اور اگر وہ ترک کی اجازت دے تو یہ بھی اس کی متابعت ہے یہ معنی ہیں اتباع کامل کے یعنی جو مرض نفسانی اُس نے تجویز کیا ہو یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہو یا جو عمل مشروع جس کا مشروع ہونا شیخ و مرید میں متفق علیہ ہو تجویز کیا ہو ان چیزوں میں اتباع کامل کرے ذرا بھی اپنی رائے کو دخل نہ دے اور باقی امور میں اتباع مُراد نہیں۔ اُمید ہے کہ سب شبہات کا جواب ہو گیا ہو گا۔ اگر کوئی جزئی باقی ہو تو تعیین و تصریح کے ساتھ تحریر فرمایئے۔ خلاصہ بحث کا اس باب میں یہ ہے کہ اتباع کا محل اور قیود اور حیثیت معلوم نہ ہونے سے یہ سب شبہات پیدا ہوئے ہیں میں اس کا محل و قیود و حیثیت متعین کیے دیتا ہوں۔ سو محل تو اس کا صرف شیخ کی خاص تعلیمات تولیہ ہیں جن کا تعلق تربیت و اصلاح باطن سے ہے اور قید اس کی یہ ہے کہ وہ فعل جس کی تعلیم کی جا رہی ہے شرعاً جائز ہو جس کا جواز طالب کے اعتقاد میں بھی ہو اور حیثیت اس کی شیخ و مصلح ہونا ہے یعنی مصلح ہونے کی حیثیت سے صرف تعلیمات سلوکیہ میں اس کے

اقوال پر عمل کرنا شرطِ نفع ہے۔ اب ان قیود کے فوائدِ احترازیہ بتلاتا ہوں۔ تعلیمات قولیہ کی قید سے خود شیخ کے افعال بھی نکل گئے۔ خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز ہوں۔ جیسے شیخ پانچ سو رکعتیں روزانہ پڑھتا ہو یا صوم داؤدی ہمیشہ رکھتا ہو اس میں اتباع ضروری نہیں، اور خواہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز نہ ہوں خواہ مختلف فیہ ہونے کے سبب جیسے شیخ فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہو اور طالب اس کو مکروہ جانتا ہو اور خواہ شیخ غلطی سے کسی فعل ناجائز میں مبتلا ہو جیسے غیبت کرتا ہے اس میں اتباع جائز بھی نہیں اور اسی قید سے شیخ کے کشفیات نکل گئے خصوصاً جب کہ طالب کا کشف اس کے خلاف ہو۔ اسی طرح جمیع مسائل اصولیہ و فرعیہ جن کا تعلق تربیت سے نہیں خارج ہو گئے البتہ ان میں جو امور شرعاً بھی ضروری ہیں وہ لازم العمل ہیں گو شیخ کبھی نہ کہے اور اگر شیخ حکم دے تو یہ حکم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حیثیت سے ہو گا۔ مصلح ہونے کی حیثیت سے نہ ہو گا اور ان میں خلاف کرنا شریعت کی مخالفت ہو گی نہ شیخ کی مخالفت البتہ مخالفتِ شریعت کی بنا پر شیخ ایسے طالب سے قطع تعلق کر سکتا ہے اور یہ قطع تعلق شیخ کے ساتھ خاص نہیں ہر مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے۔ سو اس کا تعلق مسئلہ متابعتِ شیخ سے کچھ نہیں اسی طرح اس قید سے امورِ معاشیہ نکل گئے مثلاً شیخ کسی طالب سے کہے کہ تم اپنی لڑکی کا رشتہ میرے لڑکے سے یا کسی اور سے کر دو یہ بھی متابعت کا محل نہیں اور قید جواز کا فائدہ یہ ہے کہ شیخ جس چیز کی تعلیم کرتا ہے وہ اگر شرعاً ناجائز ہو اس میں اتباع جائز بھی نہیں خواہ اجماعاً ناجائز ہو جیسے کوئی معصیت خواہ اختلافاً ناجائز ہو جیسے مسائل مختلف فیہا کی کوئی خاص شق جو طالب کے اعتقاد میں جائز نہیں اور اسی تقریر میں ضمناً حیثیت کا فائدہ بھی مذکور ہو گیا۔ اب اس کے متعلق سب سوال حل ہو گئے۔ سو یہ تو طے ہو گیا کہ بعض امور محلِ متابعت نہیں۔ جن میں بعض میں تو متابعت واجب نہیں جیسے امورِ معاشیہ اور بعض میں جائز بھی نہیں خواہ ان کا عدم جواز متفق علیہ ہو جیسے معاصی خواہ مختلف فیہ ہو جیسے مسائلِ اختلافیہ جو طالب کے اعتقاد میں جائز نہیں۔ اب یہ بات باقی رہی کہ جو امور محلِ متابعت نہیں ان میں اگر شیخ حکم دے اگر وہ شرعاً جائز اور طالب کی قدرت میں ہیں تو مروت کا مقتضا یہ ہے کہ ان میں متابعت کرے۔ جیسے

کوئی اپنا ذاتی کام یا کوئی خاص خدمت کرنے کی فرمائش کرے اور اگر وہ شرعاً ناجائز ہے خواہ واقع میں بھی خواہ اس کے اعتقاد میں تو ادب سے عذر کرے۔ اگر وہ اصرار کرے تو اس سے تعلق قطع کردے مگر گستاخی وایذا کا معاملہ کبھی نہ کرے یہ تو اس وقت ہے جب وہ خلاف شرع کا حکم دے اور اگر طالب کو ایسا حکم نہ دے مگر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو۔ اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہے تو تاویل کرے اور اس سے قطع تعلق نہ کرے اور اگر تاویل کی گنجائش نہیں تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر احیاناً اس کا صدور ہو جاتا ہو تو بشریت اور احتمال توبہ پر محمول کرکے قطع تعلق نہ کرے اور اگر اصرار یعنی اعتیاد ہے نہ بمعنی مجموعہ عدم مبالاۃ تو اگر وہ صغیرہ ہے تو قطع تعلق نہ کرے اور جو کبیرہ اور فسق و فجور یا ظلم و خیانت کے درجہ میں ہے تو تعلق قطع کردے مگر ان سب حالات میں اس کے لیے دعائے صلاحیت کرتا رہے کہ حقوق احسان میں سے ہے۔ ارادہ تھا خلاصہ کو مختصراً لکھنے کا۔ مگر وہ اصل سے بھی زیادہ مبسوط ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ اس وقت بے ساختہ ذہن میں آیا کہ اس تحریر کا ایک لقب تجویز کردیا جائے۔ الاعتدال فی متابعۃ الرجال۔

(النور، شعبان، رمضان، شوال ۱۳۵۲ھ)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی ایمان افروز تالیفات

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان اور بے حد دل نشین اور پُر اثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ۔ دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کیلئے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لئے بھی اسکا مطالعہ اور اس پر عمل انشاء اللہ کافی ہے۔ مولانا موصوف کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، برمی اور ہندی وغیرہ متعدد ملکی وغیر ملکی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ قیمت ۲/۵۰

دھوکا نہ کھائیے! بعض مجرم کتب خانوں نے ہماری یہ کتاب معمولی کاغذ پر، غلط سلط چھاپ لی ہے، اور مجرمانہ طور پر اس پر کتب خانہ الفرقان کا نام چھاپا ہے۔ اسے خرید کر آپ دھوکا کھائیے۔ عمدہ کاغذ، اعلیٰ طباعت اور ۲۵۹ صفحات دیکھ کر ہی خریدئیے۔

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز روزہ، زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان، ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۳/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ ۵/-

نماز کی حقیقت

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اور اپنی نماز میں خشوع کی کیفیت پیدا کرنے کیلئے اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ ۱/۵۰

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

اسلام کے کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی ایمان افروز تشریح۔ ۱/۲۵

معارف الحدیث

احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب
اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ

مولانا نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت کیلئے ہدایت کا خاص سامان ہے۔ اس سلسلے کی چھ جلدیں الحمد للہ مکمل ہو چکی ہیں۔ مکمل سیٹ [illegible]

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے سوانح حیات، آپکے حالات اور امتیازی خصوصیات اور اس عظیم تجدیدی کارنامہ کی تفصیل جسکے نتیجہ میں اکبر اور اسکے حواریوں کا چلایا ہوا دین الٰہی [illegible] ختم ہو کر رہ گیا اور سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے پھر اسلام کی طرف مڑ گیا۔ قیمت ۱۲/-

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

جو لوگ حضرت کو نہیں پہچان سکے ان ملفوظات کے مطالعہ سے آپ کو پوری طرح سے جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اسکے لئے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ قیمت ۳/-

منتخب تقریریں

مولانا موصوف کی ایمان افروز اصلاحی و تبلیغی تقریروں کا مجموعہ۔ جو قرآن اور احادیث کے ہزاروں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ۶/-

آسان حج

یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے
پاکٹ سائز ــــــ بہترین طباعت ۱/۲۵

بوارق الغیب

اہل بدعت کے خاص [illegible] مشرکانہ یا نیم مشرکانہ عقیدہ [illegible] کی تردید میں مولانا محمد منظور نعمانی کی معرکۃ الآراء محققانہ تصنیف۔ قیمت [illegible]

ناشر کتب خانہ الفرقان، ۳۱ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ

الفرقان

لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

کتب خانہ الفرقان کی چند اہم مطبوعات

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ

اور ہندوستان کے علماء حق پر اسکے اثرات

از:- مولانا محمد منظور نعمانی

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف اُن کے مذہبی اور سیاسی دشمنوں نے افترا پردازی اور پروپیگنڈے کی جو مہم عالمی پیمانے پر چلائی تھی اُس سے ہندوستان کے بہت سے علماء حق بھی متاثر ہوئے تھے اور جماعت علمائے دیوبند نیز جماعت اہل حدیث کے بعض اکابر نے بھی انکے بارے میں سخت رائے ظاہر کی تھی لیکن جب حقیقت منکشف ہوئی تو ان حضرات نے اس رائے سے رجوع کرلیا۔ پوری تفصیل تاریخی حقائق و شواہد کی روشنی میں۔

قیمت -/5

صحبتے با اہل دل

مرتبہ:- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

عارف باللہ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے ذوق اور مزاج کے مطابق زندگیوں کی اصلاح کا پیغام، ایمان و یقین اور کیفیت احسانی پیدا کرنے کا وافر سامان اور حکایات و تمثیلات کے پیرائے میں تصوف اسلامی کا عطر آگیا ہے۔ قیمت -/9

تذکرہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

رسالہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی مختصر سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

قیمت صرف 1/50

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے سوانح حیات، آپکے عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم تجدیدی کارنامہ کی تفصیل جسکے نتیجہ میں اکبر اور اسکے حواریوں کا چلایا ہوا "دین الٰہی" تاریخی قصہ ہوکر رہ گیا اور سلطنت مغلیہ کا رُخ الحاد سے صحیح اسلام کی طرف مڑ گیا۔ قیمت -/12

تجلیات ربانی مکمل

تلخیص و ترجمہ مکتوبات مجدد الف ثانی رح

(از مولانا نسیم احمد فریدی)

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ان مکتوبات میں احسان و تصوف، تعمیر باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین و ترویج شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی عام رہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جو چار صدیوں سے امت کی رہنمائی کررہا ہے۔ جلد اول -/13/50 ، جلد دوم -/11/50

خواجہ باقی باللہؒ

اور خلفاء و صاحبزادگان

مرتبہ:- مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ ان کے دونوں صاحبزادگان خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ- اور- اکابر خلفاء تاج العارفین شیخ تاج سنبھلی، خواجہ الٰہ داد، خواجہ ابرار شیخ حسام الدین، کی سوانح حیات، صفات و امتیازات اور کارناموں کی تفصیل۔

قیمت مجلد -/6

تذکرہ حضرت جی مولینا محمد یوسفؒ

(ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کے حضرت جی نمبر کا نیا کتابی ایڈیشن)

جو سلطور پر آپ کی ایمانی کیفیات کا آئینہ، واعیانہ خصوصیات کا مرقع، ایمانی انقلاب لانے والی آپ کی دعوت و پکار کا ریکارڈ اور تبلیغی دعوت کے فکری اور عملی پہلوؤں کو سمجھنے کا مستند ذریعہ ہے ——— اس میں ——— شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، مولانا محمد اشرف ایم اے (پشاور) مولینا مفتی زین العابدین (لائلپور) مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ اکابر کے گرانقدر مضامین کے علاوہ خود مولانا مرحوم کی ایمان و یقین سے بھرپور تقریریں دعوت سے متعلق نہایت اہم مکتوبات —— اور —— ٹیپ ریکارڈ سے اخذ کی ہوئی دلوں کو ہلا دینے اور (انشاء اللہ) عرش الٰہی تک پہونچنے والی رقت اور یقین کی کیفیت سے بھرپور دعا شامل ہے۔ قیمت صرف -/8

کتب خانہ "الفرقان" ۳۱ نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ

ممالک غیر سے چندہ سالانہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ کے
بعد اب نئی شرح یہ ہے:
بحری ڈاک سے ——— ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ——— ۵ پونڈ

چندہ سالانہ
ہندوستان سے ——— ۱۵/-
پاکستان سے ——— ۳۰/-
بنگلہ دیش سے ——— ۱۶/-
فی شمارہ ——— ۱/۵۰

جلد (۴۷) بابت جولائی ۱۹۷۹ء مطابق رجب المرجب ۱۳۹۹ھ شمارہ (۷)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ براہِ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیئے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۵ تاریخ تک آجانا چاہیئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ ۲۵ روپے ہندوستانی سکہ میں بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ روانہ فرمائیں، یا پاکستانی سکہ میں ۳۰ روپے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ اسٹریلین بلڈنگس لاہور کو بھیج دیں۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

اٹھتا تھا کہ مولانا اسعد اللہ صاحب کی اس روش کو وہ کیوں اور کیسے گوارہ فرما رہے ہیں؟

لیکن چند ہی برس کے بعد مولانا مرحوم کی زندگی میں جو حیرت انگیز انقلاب آیا اسے دیکھ کر خود اپنے دل نے کہا کہ غالباً حضرت مولانا سہارنپوریؒ پر اللہ تعالیٰ نے منکشف فرما دیا تھا کہ عنقریب ان میں اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و توفیق سے غیر معمولی انقلاب آئے گا اور یہ "ولایت خاص" کے مقام پر فائز کئے جائیں گے اور مدارس کی دنیا کے لئے مثال اور نمونہ بنیں گے۔ واللہ اعلم

مولانا مرحوم ان ہی حالات میں اور اسی طریقہ پر چل رہے تھے جن کا اوپر ذکر آیا کہ اچانک ان کے دل میں انابت الی اللہ اور اپنی اصلاح کا شدید داعیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوا اسکے لئے وہ رہنمائی کے طالب بن کر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف رجوع ہوئے اور اپنے کو "کالمیت فی ید الغسال" حضرت مرشد کے حوالہ کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خاص فضل فرمایا۔ اور چند ہی روز میں ایسا قلب ماہیت ہوا کہ کم از کم راقم سطور نے تغییرِ حال اور صلاح کی ایسی کوئی مثال نہیں دیکھی۔ بلاشبہ حضرت مولانا مرحوم کی ذات حضرت حکیم الامت کی اصلاح و تربیت کا عجیب و غریب نمونہ تھی اور "اللہ یجتبی الیہ من یشاء" کا مظہر۔ راقم سطور اپنے بشری اندازہ کے مطابق کہہ سکتا ہے کہ قریباً ۳۰/ ۴۰ سال کی گزشتہ مدت میں غالباً ان سے کوئی صغیرہ گناہ بھی سرزد نہ ہوا ہوگا۔ واللہ اعلم باحوال عبادہ۔

طویل مدت سے وہ علیل اور صاحب فراش تھے۔ بار بار قلبی دورے پڑ چکے تھے جسم میں ہڈی چمڑے کے سوا گویا کچھ نہیں رہا تھا اسی حال میں کئی برس یہ معمول رہا کہ ہر نماز کیلئے جماعت کے وقت سے پہلے انکے خاص خادم اپنے دونوں ہاتھوں پہ اٹھا کے مولانا کو ان کے حجرے سے مسجد لے جاتے اور صف اول میں بٹھا دیتے۔ مولانا وقت کی گنجائش کے مطابق بیٹھے بیٹھے نوافل پڑھتے پھر جب جماعت کے لئے اقامت ہوتی تو وہی خادم مولانا کو اٹھا کے سیدھا کھڑا کر دیتے۔ اور پھر مولانا پوری نماز قیام کے ساتھ ادا فرماتے۔ سنتیں اور نوافل پھر بیٹھ کر ہی ادا فرماتے۔ فراغت کے بعد پھر وہی خادم ان کو اسی طرح اپنے ہاتھوں پہ اٹھا کے حجرے میں لے آتے۔

پھر کئی برس اس حال میں گزرے کہ مولانا اپنے حجرے میں بستر ہی پر جماعت کے ساتھ

نماز ادا فرماتے تھے۔ قریبی واقفین نے بتلایا کہ گزشتہ قریباً ۲۵/۳۰ سال میں غالباً کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا کے ہوش و حواس صحیح ہوں اور نماز جماعت کے ساتھ ادا نہ ہوئی ہو یا تکبیر اولیٰ ہی فوت ہوئی ہو۔

افسوس ہے کہ ہماری یہ دنیا ان نمونوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ فیا اسفاہ و احزناہ!

مولانا محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" رحمۃ اللہ

اکثر ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہو گا کہ رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندوی کے اکلوتے حقیقی بھتیجے اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شہرۂ آفاق عربی جریدہ "البعث الاسلامی" کے مدیر مولانا محمد الحسنی جو اپنی بعض خداداد خصوصیات اور وہبی کمالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھے اور جن کی عمر ابھی صرف ۴۴ سال کی تھی حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کی وفات کے تیسرے ہی دن صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہماری اس دنیا سے اٹھا لئے گئے ــــ ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شیئٍ عندہ باجلٍ مسمی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری، مولانا علی میاں کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں کہ "رجل موھوب" (یعنی ان کے پاس جو کچھ ہے وہ کسبی نہیں، وہبی ہے، انہوں نے محنت کر کے حاصل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانۂ کرم سے یوں ہی عطا فرما دیا ہے) ــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مولانا علی میاں سے کہیں زیادہ ان کے مرحوم بھتیجے مولانا محمد الحسنی پر صادق آتی تھی۔

اب سے ۳۳ سال پہلے ۱۹۴۶ء کی بات ہے جب راقم سطور نے مولانا علی میاں کے مشورہ بلکہ انہی کی تحریک پر "الفرقان" کو بریلی سے لکھنؤ منتقل کرنے اور خود بھی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت اپنی رہائش اور الفرقان کے دفتر کے لئے جو مکان کرایہ پر ملا تھا وہ گوئن روڈ پر مولانا علی میاں اور ان کے برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی (علیہ الرحمہ) کے مکان کے گویا بالکل برابر میں تھا۔ عزیز مرحوم مولانا محمد الحسنی ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے صاحبزادے

تھے، ان کو سب "محمد میاں" کہتے تھے اس وقت وہ ۱۰/۱۱ سال کے بچے تھے لیکن میں نے کبھی ان کو بچوں کے ساتھ یا بچوں کی طرح کھیلتے نہیں دیکھا، بولتے بھی بہت ہی کم تھے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا تھا کہ یہ پڑھنے کے لئے کسی اسکول یا مکتب، مدرسہ میں بھی نہیں جاتے ہیں، والد ماجد ڈاکٹر صاحب خود ہی ان کو قرآن پاک باترجمہ پڑھاتے ہیں اور اسی کے ذریعہ عربی تعلیم بھی ہو رہی ہے اور مصر وغیرہ سے آنے والے عربی اخبارات کا مطالعہ بھی کراتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ صرف ونحو کی کوئی کتاب ان کو نہیں پڑھائی گئی ہے اور نہ پڑھانے کا ارادہ ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد سنا کہ محمد میاں عربی میں مضمون نگاری کرنے لگے ہیں —— ہم جیسوں کو بجا طور پر حیرت ہوگی کہ جس شخص نے صرف ونحو بالکل نہیں پڑھی۔ جو ماضی، مضارع، معرب مبنی، مرفوع، منصوب، مجرور، منصرف، غیر منصرف کو نہیں جانتا وہ عربی کا کوئی جملہ بھی کیسے صحیح لکھ سکتا ہے — لیکن اللہ کی شان اور اس کی قدرت کی کارفرمائی کہ محمد میاں صرف و نحو سے بالکل ناواقف اور نابلد ہوتے کے باوجود بہت اچھی عربی لکھنے لگے اور جلد ہی وہ وقت آگیا کہ عالم عربی کے بعض بلند پایہ رسالوں میں مضامین بھیجنے لگے اور ان رسالوں میں وہ مضامین بڑے اہتمام اور بڑی قدر سے غالباً یہ سمجھ کر شائع کئے گئے کہ یہ ہندوستان کے کسی علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کا ان کا پہلا مضمون مشہور اخوانی زعیم سعید رمضان کے ماہنامہ "المسلمون" میں شائع ہوا تھا۔ جو اس زمانہ میں دمشق سے نکلتا تھا۔ اور عالم عربی کا بلند پایہ اور بہت ہی موقر مجلہ تھا۔

پھر ان کی عمر کا ۲۰واں سال تھا کہ انھوں نے خود اپنا ایک عربی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور "البعث الاسلامی" کے نام سے ایک بلند معیار عربی ماہنامہ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے جاری ہوگیا۔ اس وقت وہ ان کا ذاتی رسالہ تھا، اُن کا گھر ہی اُس کا دفتر تھا، وہ خود ہی اس کے لئے مضامین لکھتے۔ خود ہی کتابت کراتے اور چھپواتے اور خود ہی ڈاک سے اسکو روانہ کرتے کا اہتمام کرتے

"خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ"

راقم سطور کی طرح جو لوگ اس لائن سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی ذات

کے بل بوتے پر ہندوستان سے عربی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیسی ہمت مردانہ اور مالی اعتبار سے کتنے خسارے کا سودا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ۲۰ سالہ محمد میاں کو یہ ہمت بخشی ۔۔۔ جلد ہی "البعث الاسلامی" عربی ممالک میں مقبول اور ساتھ ہی خود کفیل ہونے لگا۔

پھر ۱۹۵۹ء میں جب کہ اس کی عمر کا چوتھا سال تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا عرب ممالک میں اس کو اچھی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں (جس میں راقم سطور بھی بحیثیت رکن انتظامی شریک تھا) اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ "البعث الاسلامی" کو ندوۃ العلماء کی تحویل میں لے لیا جائے اور اسکی اشاعت کا اہتمام و انتظام ندوۃ العلماء کی طرف سے ہو، اور مولانا محمد میاں اسی طرح اس کے مدیر اور ذمہ دار رہیں تو یہ ندوہ اور اس کے دار العلوم کے لئے خاص کر عرب ممالک میں ان کے تعارف کے لئے بہت مفید ہوگا۔

غور و بحث کے بعد مجلس نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ مولانا محمد میاں صاحب کی طرف سے ان کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ نے (جو خود ندوۃ العلماء کے ناظم تھے) اس کی منظوری دیدی اور "البعث الاسلامی" کی ملکیت ندوۃ العلماء کی طرف منتقل ہو گئی۔ کسی معاوضہ کا کوئی ذکر ہی نہ آیا۔ بلکہ مولانا محمد میاں کے لئے ان کی محنت اور کارکردگی کا کوئی الاؤنس بھی مقرر نہیں کیا گیا اور وہ اسی شغف۔ اور عرق ریزی کے ساتھ دن رات ایک کر کے اس کا کام کرتے رہے اور اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

تقریباً دو سال کے بعد جب ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب وفات پا گئے تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں ان کے لئے "البعث الاسلامی" کی ادارت اور تمام تر کارکردگی کے سلسلہ میں صرف سو روپے کا الاؤنس منظور کیا گیا۔ انھوں نے اس کو بھی بخوشی قبول کر لیا حالانکہ اس وقت بھی ندوۃ العلماء کے بعض محرروں کی تنخواہ اس سے زیادہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت کو ان چیزوں سے بالکل بے نیاز بنایا تھا لیکن ان کی اس قناعت اور قربانی کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی شانِ عالی کے مطابق ملا اور "البعث الاسلامی" ہی کے سلسلہ سے ان کے لئے "یرزقہ من حیث لا یحتسب" کی ایک شکل پیدا ہو گئی۔

جیساکہ اوپر عرض کیا گیا— وہ عربی زبان کی صرف ونحو سے بالکل ناواقف تھے (راقم سطور نے خود مولانا علی میاں سے سنا ہے کہ غالباً ان کو ماضی کی پوری گردان بھی یاد نہ ہوگی۔) لیکن "البعث الاسلامی" میں ان کی جو تحریریں شائع ہوتی تھیں وہ زبان کے لحاظ سے عالم عربی کے مشاہیر اہل قلم کی تحریروں کے ہم پلہ ہوتی تھیں۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "الاسلام الممتحن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کو دیکھ کر آج بھی ہر وہ شخص جس میں اس کی اہلیت ہو یہ موازنہ کر سکتا ہے۔

وہ زبان واسلوب میں (عربی میں بھی اور اردو میں بھی) مولانا علی میاں کا ایسا تتبع کرتے تھے کہ گویا ان کا "مثنیٰ" اور "دوسری کاپی" بن گئے تھے لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض وہ حضرات جن کا احساس واندازہ اس باب میں معتبر ہو سکتا ہے، محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلم میں خاص کر عربی تحریر میں مولانا سے بھی زیادہ طاقت آگئی ہے۔ خود مولانا علی میاں بھی کبھی کبھی اس کا اظہار فرماتے تھے۔

ان کا شاہکار اور آخری یادگار:

۱۱جون دوشنبہ کی شام کو اسی مہینے جون (مطابق رجب) کا "البعث الاسلامی" کا شمارہ میرے پاس آیا— مغرب وعشاء کے درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا، جو عزیز مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا تھا، اس کا عنوان تھا "سوال حائر، یحتاج الی جواب" "۷" صفحے کا مضمون تھا، اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاص کر سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں جن کا اسی طرح صاف صاف کہا جانا اُن کی خیر خواہی کا بھی تقاضا تھا اور از روئے دین اب فرض ہو گیا تھا اور اس فرض کو اب وہی مردِ خدا ادا کر سکتا تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی خاص توفیق عطا ہو— اس کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے مولانا محمد الحسنی کو یہ سعادت بخشی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر اور موثر سے موثر انداز میں انھوں نے یہ فرض

ادا کر دیا۔ میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے "ندائے غیب" سمجھا۔ اور طے کر لیا کہ اس کو اردو میں منتقل کرا کے "الفرقان" میں شائع کرنا ہے۔

اگلے دن (۱۲ جون سہ شنبہ) فجر کی نماز کے بعد ہی میں نے مولانا محمد میاں کو فون کیا۔ ان کے مضمون کے بارے میں اپنا تاثر ان کو بتلایا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کو جلدی زیادہ سے زیادہ بس ۲/۳ دن میں "الفرقان" کے لئے اردو میں منتقل کر دیں یا کسی سے کرا دیں۔ انھوں نے کہا بہت اچھا! انشاء اللہ ہو جائے گا[1]۔ اللہ کے سوا کسی کو بھی علم نہ ہوگا کہ آج ہی کا دن ان کی زندگی اور ان کے کام کا آخری دن ہے اور کل ہی ان کا سفر آخرت ہے۔

اُس کے اگلے دن (۱۳ جون چہار شنبہ کو) انھوں نے پیٹ میں کچھ تکلیف اور نفخ کی سی کیفیت محسوس کی جس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی گئی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کو بھی (جو عزیزوں سے زیادہ عزیز ہیں) بلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ بس فون پر حال کہدیا گیا۔ انھوں نے دوا بتلادی، وہ دوا استعمال کی گئی جب اس سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوا تو حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی کی طرف رجوع کیا گیا۔ جن کا مطب بالکل قریب ہی ہے اور جن سے ہم خاندانی جیسا تعلق ہے۔ انھوں نے نسخہ تجویز فرما دیا، اس کے استعمال سے بھی تکلیف میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی۔ پھر ایک ایلوپیتھ ڈاکٹر کو بلایا گیا انھوں نے دوا دی اور ایک انجکشن تجویز کیا، جو لگوایا گیا لیکن تکلیف میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔۔۔ سہ پہر کو ڈاکٹر قریشی صاحب کو پھر فون ہی سے حال بتلایا گیا، وہ عصر کے وقت خود تشریف لائے اور صورتِ حال دیکھ کر انھوں نے طے کیا کہ ان کو ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب خود اپنی کارڈی سے ان کو اسپتال لے گئے۔۔۔

یہ ۱۳ جون بعد مغرب کا وقت تھا۔۔۔ راقم سطور کو اس وقت تک بھی ان کی اس علالت کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔۔۔ جب وہ اسپتال لے جائے گئے تو ان کے خلف الصدق مولانا عبداللہ سلمہ اللہ قریباً ۸ بجے میرے پاس آئے انھوں نے اطلاع دی، اس وقت

---

[1] افسوس ہے کہ اس مضمون کا خاطر خواہ ترجمہ نہ ہوسکنے کی وجہ سے یہ شمارہ اس ترجمہ سے خالی شائع ہو رہا ہے۔

مجھے علم ہوا۔

مولانا علی میاں قریباً دو ہفتے سے سفر میں تھے اور وہ دن ان کے بمبئی میں قیام کا تھا، مولوی عبداللہ سلمہم اللہ تعالیٰ نے یہ بھی کہا کہ ہمارا فون کام نہیں کر رہا ہے آپ ہی مولانا کو بمبئی اطلاع دیدیں ـــــ حسن اتفاق کہ اس وقت صرف ۱۵ منٹ میں فون کے ذریعہ بمبئی سے رابطہ قائم ہوگیا اور مولانا کو علالت کی اطلاع دیدی گئی۔

اِدھر یہ ہوا کہ ہسپتال میں پہنچنے کے قریباً ایک گھنٹہ کے بعد عزیز مرحوم کا "وقتِ موعود" آگیا اور وہ ہم سب کو الوداع کہہ کے اپنے غفور و رحیم رب کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ـــــ اس وقت ان کی عمر کا چوالیسواں سال تھا۔

اخیر شب میں ان کو غسل دیا گیا، جنازہ کی نماز صبح طلوع آفتاب کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں پڑھی گئی اور تدفین کے لئے جنازہ اسی وقت رائے بریلی کے لئے روانہ ہوگیا، وہاں پہنچ کر دوبارہ نماز پڑھی گئی ــــ اور ۱۱/۱۲ بجے کے درمیان تکیہ شاہ علم اللہ میں اپنے والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب علیہ الرحمہ کے پہلو میں دفن کر دیئے گئے۔ اَللّٰھُمَّ اَنزِل علیہ شآبیب رحمتک و رضوانک

بمبئی میں مولانا علی میاں نے ۱۳ جون کی رات میں علالت کی خبر پاکر ہوائی جہاز سے جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ ۱۴ جون پنجشنبہ کے دن بمبئی سے دہلی پہنچ سکے اور ۱۵ جون جمعہ کی صبح دہلی سے لکھنؤ پہنچ کر رائے بریلی تشریف لے گئے ـــــ نسبی رشتہ کے لحاظ سے مولانا اگرچہ مرحوم کے چچا تھے لیکن تعلق وہ تھا جو بہت سے باپ بیٹوں میں بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے قدرتی طور پر مولانا اس حادثہ سے بیحد متاثر ہوئے، اور اس وقت اپنے موجود نہ ہونے کا صدمہ مزید برآں!

اللہ تعالیٰ ان کو اور سب پسماندگان و متعلقین کو، خاص کر غمزدہ بیوہ اور بچوں کو صبر اور تسلیم و رضا کی توفیق عطا فرمائے۔

ان فی اللہ عزاءً من کل مصیبۃ ودرکاً من کل فائت فبا للہ فثقوا

وایاہ فانا جوافنا تما المصائب من حرم الثواب

عزیز مرحوم مولانا محمد میاں کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خاص فضل سے غیر عادی طریقہ پر وہ علمی و قلمی کمال عطا فرمایا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑا فضل و انعام ان پر ان کے رب کریم نے یہ فرمایا تھا کہ جس تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کے لئے طالبین صادقین برسوں اصحاب ارشاد مشائخ کی تربیت میں رہتے اور ریاضتیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ بے بہا دولت بھی ان کو اپنے فضلِ خاص ہی سے عطا فرما دی تھی؛

معلوم ہوتا تھا کہ کبر، غصہ، حسد، کینہ، بخل جیسے رذائل ان کی فطرت سے نکال دیئے گئے ہیں اور محاسن اخلاق بھرپور عطا فرما دیئے گئے ہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء واللہ ذو الفضل العظیم ۰

درسِ قرآن — محمد منظور نعمانی

- اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے رات اور دن کا نظام قائم فرمایا
- اسی نے تمہارے لئے زمین و آسمان کو بنایا، اور تمہاری بہترین صورتگری کی
- اسی نے تمہیں کھانے پینے کی پاکیزہ اور نفیس چیزیں عطا فرمائیں
- وہی "الحی" ہے عبادت اور دعا اور حمد صرف اسی کا حق ہے

حمد و صلوٰۃ اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ○ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ○ کَذٰلِکَ یُؤْفَکُ الَّذِیْنَ کَانُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ○ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

[سورۃ المومن آیات ۶۱ - ۶۵]

اللہ ہی ہے جس نے بنائی تمہارے واسطے رات (اندھیری) تاکہ تم اس میں آرام کرو، اور

دن کو بنایا روشن (کہ تم اس میں اپنے کام کاج کر سکو) واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل و احسان فرمانے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر گذار نہیں ہوتے۔ وہی اللہ ہے تمہارا رب ہر چیز کا خالق، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو پھر تم لوگ کس طرح بہکے جاتے ہو، اسی طرح بہکتے رہے ہیں وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں۔

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مستقر اور آسمان کو (گنبد کی طرح کی) ایک عمارت بنایا۔ اور تمہاری صورت گری کی تو بہت ہی اچھی تمہاری صورتیں بنائیں۔ اور تم کو پاکیزہ اور لذیذ و نفیس چیزیں رزق کے طور پر عطا فرمائیں، وہی اللہ ہے تمہارا رب، پس بڑا ہی برکت والا ہے، وہ اللہ رب العالمین، صرف وہی ہے زندہ (ازلی ابدی) اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں، بس اسی کو پکارو، (اسی سے دعا و التجا کرو) اور اسی کی بندگی کرتے ہوئے، ساری حمد و ستائش اللہ ہی کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔

(سورۂ مومن آیات ۶۱ تا ۶۵)

تفسیر و تشریح) یہ سورۂ مومن کے چھٹے رکوع کی آیتیں ہیں، ان میں بندوں پر کئے جانے والے اللہ تعالیٰ کے بعض ہمہ گیر انعامات و احسانات کا ذکر فرما کے اس کی شکر گذاری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ساتھ ہی بتلایا گیا ہے کہ عبادت اور بندگی صرف اس اللہ کا حق ہے جس کے، بندوں پر یہ انعامات اور احسانات ہیں اور وہی اس کا مستحق ہے کہ بندے اپنی حاجتوں میں اس کو پکاریں اور اس سے دعا و التجا کریں۔ الغرض ان آیتوں کا حاصل بھی توحید کی دعوت و تعلیم ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے: اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○

مطلب یہ ہے کہ بندوں پر یہ اللہ ہی کا فضل و احسان ہے کہ اس نے رات اور دن کا یہ نظام قائم کیا ہے، رات کو اس نے ایسا تاریک اور خنک بنایا جو انسانوں بلکہ دوسرے

حیوانات کے آرام کے لئے بھی مناسب و موزوں ہے، اس کی خنکی اور تاریکی میں فطری طور پر ہر ایک آرام کرنا چاہتا ہے اور اس کو آرام ملتا ہے۔ اور دن کو آفتاب کے ذریعہ روشن بنایا تاکہ اس کی روشن فضا میں سب اپنی معاش وغیرہ کے کام کاج کر سکیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر رات نہ ہوتی، ہمیشہ دن کا اجالا رہتا تو رات میں جو آرام ہم کو اور ساری مخلوقات کو ملتا ہے وہ ہمیں حاصل نہ ہوتا، اور اس آرام چین کی نعمت سے ہم محروم رہتے۔ اسی طرح اگر دن کا اجالا نہ ہوتا ہمیشہ رات کی تاریکی رہتی تو دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ہرگز نہ ہو سکتا ——— الغرض رات اور دن کا یہ نظام اللہ تعالےٰ کی بڑی نعمت اور اس کا بڑا فضل و احسان ہے، لیکن بلاشبہ انسانوں کی غالب اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی اس کے اس فضل و احسان کا خیال بھی نہیں کرتے، اس کا شکر ادا کرنا تو بعد کی بات ہے۔ (وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝)

اس کے آگے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس اللہ نے تم پر یہ فضل و کرم فرمایا ہے وہی تمہارا رب ہے، ہر چیز کا وہی خالق ہے وہی اور صرف وہی معبود برحق ہے، عبادت اور بندگی صرف اسی کا حق ہے (ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ)

آگے مشرکین کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: (فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ ۝) کہ تمہاری کیسی عقل ماری گئی ہے کہ تم اس اللہ کو چھوڑ کر (جس کے یہ انعامات و احسانات ہیں) دوسروں کے آگے اور غیروں کے آستانوں پر جھک رہے ہو ——— آگے فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں کے اور ہماری نازل کی ہوئی ہدایت کے منکر ہوتے ہیں وہ ان سے روشنی حاصل کرنا نہیں چاہتے، اُن کی عقلیں ایسے ہی ماری جاتی ہیں اور وہ اسی طرح گمراہ ہوتے ہیں (كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِينَ كَانُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ ۝)

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۖ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ۝

اوپر اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان کا ذکر فرمایا گیا تھا کہ اس نے دن رات کا نظام قائم فرمایا، رات کو ایسا بنایا کہ اس میں ہم آرام اور چین حاصل کریں اور دن کو ایسا بنایا کہ ہم اس میں اپنی معاش وغیرہ کے لئے جد وجہد کر سکیں۔

اب اس آیت میں اسی طرح کے چار اور اہم انعامات واحسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے جن سے بندے ہمیشہ اور ہر وقت مستفید ہوتے ہیں۔ **اوّل** یہ کہ زمین کو تمہارا استقرار اور مسکن بنایا (بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا انعام واحسان ہے۔ زمین ساری نعمتوں کے، کبھی نہ ختم ہونے والے خزانے اپنے اندر لئے ہوئے ہے) **دوسرا** انعام یہ فرمایا کہ آسمان کو تمہارے لئے بطور چھت عمارت بنا دیا (چونکہ آسمان ہمارے ادراک کی دسترس سے باہر ہے اس لئے اس کی پوری حقیقت ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ہاں اتنا دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ سورج چاند ستارے جو آسمانی فضا میں ہیں اور زمینی نہیں بلکہ آسمانی چیزیں ہیں، یہ سب ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں) بہر حال آسمان بھی زمین کی طرح ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ **تیسرا** انعام یہ ذکر فرمایا کہ اسی اللہ نے تمہاری صورت گری کی اور بہت اچھی صورت گری کی (ظاہر ہے کہ اپنی شکل وصورت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے انسان اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ حسین وجمیل اور کامل وممتاز ہے۔ اسی کو دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ"

چوتھا انعام یہاں یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے تم کو پاکیزہ اور لذیذ ونفیس غذائیں عطا فرمائیں۔

یہ سب انعامات واحسانات وہ ہیں جن سے ہم انسان ہر وقت اور ہر لمحہ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کو کبھی یاد نہیں کرتے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات ہیں ظاہر ہے کہ یہ بڑی ناشکری اور ناسپاسی ہے۔ قرآن مجید کی ان آیتوں کا سبق یہ ہے کہ یہ بات ہمیشہ ہمارے ذہن میں اور ہمارے پیش نظر رہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں جن سے ہم مستفید ہوتے ہیں اور جب یہ بات ہوگی تو بندہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا رب اور معبود سمجھے گا اور شرک کی گندگی سے محفوظ رہے گا ——— چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ان انعامات و

احسانات کا ذکر فرما کر آگے فرمایا گیا ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ مطلب یہ ہے کہ ان احسانات و انعامات کا دھیان کر کے تمہیں اس نتیجہ پر پہنچ جانا چاہیئے اور تمہارے دل کی یہ آواز ہونی چاہیئے کہ یہی اللہ جس کے یہ انعامات و احسانات ہیں ہمارا رب ہے۔ بڑی برکتوں والا ہے وہ اللہ جو رب العٰلمین ہے

اللہ تعالےٰ کے ان انعامات و احسانات کا استحضار ان کا دھیان اور ان میں غور و فکر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا اور دل میں اس کی محبت اور عبادت کا داعیہ پیدا ہونے کا ذریعہ ہے ـــــ ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کے فضل سے ہمیں یہ عقیدہ تو نصیب ہے کہ دن رات کا نظام اللہ تعالیٰ ہی نے قائم فرمایا ہے اور زمین کو اسی نے ہمارا مستقر اور مسکن بنایا ہے اور آسمان بھی اسی نے ہمارے لئے بنایا ہے اور ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہماری صورتگری اسی نے فرمائی ہے۔ اور کھانے پینے کی جو پاکیزہ اور لذیذ و نفیس چیزیں ہم کو نصیب ہیں سب اس کے کرم سے نصیب ہیں لیکن ہم کو اس کا کما حقہٗ استحضار اور دھیان نصیب نہیں۔ ان انعامات و احسانات کا جتنا استحضار، دھیان اور ان میں جتنا غور و فکر کیا جائے گا اتنی ہی اللہ کی معرفت نصیب ہو گی اور دل میں اس کی محبت اور اس کی عبادت کا شوق پیدا ہو گا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ کے انعامات و احسانات کے ذکر کا خاص مقصد یہی ہے۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے " هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ـــــ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ اور جو کوئی ہے کسی کو دوامی حیات و بقا نہیں، سب فانی ہیں۔ سب کی حیات مستعار مجازی اور اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہستی ہے جس کی حیات حقیقی اور ذاتی ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔ صرف وہی معبود برحق ہے۔ اسی کی عبادت کرو اور اپنی حاجتوں کے لئے اسی سے دعا کرو، اسی سے لو لگاؤ! آخر میں ارشاد فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" ساری حمد و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے اور اسی کا حق ہے جو رب العالمین ہے، سب کا خالق و پروردگار ہے یہ" اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" بڑا ہی مبارک کلمہ ہے۔ یہ حمد و شکر کا کلمہ بھی ہے اور کلمہ توحید بھی ہے۔ اس کے مضمون پر یقین کے بعد شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ربِّ کریم کے فضلِ خاص کے تین ہفتے

(۳)

بلد اللہ الحرام سے مدینۃ الرسول کی طرف :-

جدہ سے مدینہ منورہ کا فاصلہ تقریباً ڈھائی سو میل ہے لیکن عمدہ موٹروں اور اس سے بھی عمدہ سڑک کی وجہ سے عموماً پانچ گھنٹہ میں اس طرح طے کر لیا جاتا ہے کہ راستہ میں ایک دو جگہ کافی دیر ٹھہر کر سستا لینے اور کھانے پینے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ ہماری ٹیکسی بھی دو جگہ ٹھیرتی اور رابغ میں سمندری مچھلی کھانے اور عصر کی نماز ادا کرنے کا موقعہ فراہم کرتی ہوئی قریباً ۶½ بجے یعنی غروب آفتاب کے کوئی ۲۰/۲۵ منٹ بعد مسجد نبوی کے محاذات میں پہنچ گئی۔ مغرب کی نماز باجماعت اوّل وقت میں ذوالحلیفہ سے کچھ پہلے ادا کی گئی۔

راستہ میں ٹیکسی جیسے ہی بدر کے قریب پہنچی، ذہن نے ماضی کی طرف تیزی سے پھر سفر شروع کر دیا۔ جوں جوں ٹیکسی آگے بڑھتی، قلب و دماغ کی حالت متغیر ہوتی جاتی۔ بدر اور اصحاب بدر کے تذکرے نہ جانے کتنی مدت تک کانوں کی راہ سے قلب و دماغ میں اپنا نورانی اثر چھوڑتے رہے تھے، مگر یہ گناہ گار آنکھیں اس خطۂ مہر و وفا کی جھلک ابتک دیکھنے سے محروم تھیں، سو آج خدا نے ان کی فریاد بھی سن لی تھی، تو بھلا اس پاکیزہ سرزمین کا طواف اور اس کے ایک گوشے کی زیارت سے

اپنی ٹھنڈک کا سامان فراہم کرنے میں نگاہ کیوں کوتاہی کرتی۔ مگر یہ حسرت پھر بھی باقی رہ گئی کہ مرکب (سائق کے نہیں) راکب کے اختیار میں ہوتا تو بات ہی کچھ اور ہوتی اس لئے بزبان حال یہ کہتے گزرنا پڑا۔ ع بہرے ارماں ..... پھر بھی کم نکلے۔

ارض حرم کی طرح ارض طیبہ کی حاضری بھی تنہا ہی ہو رہی تھی۔ ہر اجنبی مسافر کو نئی جگہ پہنچنے سے پہلے عموماً نادیدہ خدشات کے تصور سے دوچار ہونا پڑتا ہے، قدرتی طور پر تھوڑی دیر کے لئے مجھے بھی ہونا پڑا مگر اس ہادیٔ مطلق اور منعم حقیقی کی کس کس نعمت کا شکر ادا ہو! اس نے ایسا انتظام فرمایا کہ ہر قدم پر یوں محسوس ہوا کہ رہنما اور رہنمائی جیسے پہلے ہی سے انتظار میں ہو۔ چنانچہ جوں ہی ٹیکسی نے اپنے "مقررہ" مقام پر چھوڑا فوراً ہی ایک صاحب نظر آئے ان سے جب اپنی متوقع قیام گاہ کا پتہ پوچھا تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ وہاں تک پہنچنے کی آسان تدبیر زبانی بتائی بلکہ فوراً وہاں کے لئے ٹیکسی بلا کر کھڑی کر دی۔ سامان رکھ کر بس اس پر بیٹھا تو دیکھا ایک اور صاحب بھی (بلالی شکل و صورت کے نہایت سفید لباس میں ملبوس) اس میں بیٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں، فطرۃً ابتداءً یہ تھوڑی سی گرانی ہوئی مگر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ ٹیکسی روانہ ہوئی اور چند ہی منٹ بعد منزل کے قریب جا کر رکی جہاں سے آگے جانا قانوناً اس کے اختیار میں نہ تھا۔ ہماری منزل ابھی تھوڑی دور تھی، سامان بھی اتنا ساتھ تھا جس کا اٹھانا تنہا میرے بس کا کام نہ تھا۔ دیکھا کہ وہی بلالی صاحب سب سے زیادہ وزن والا عدد اٹھائے ہوئے ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ باصرار ایک اور چیز بھی اٹھا لینے پر آمادہ۔ ٹیکسی والے کو اجرت دینا چاہی تو معلوم ہوا کہ وہی صاحب اس میں بھی سبقت کر چکے ہیں۔ وہاں سے روانہ ہو کر مدرسہ علوم شرعیہ جا کر اسباب رکھا، ابھی عشاء کا وقت شروع ہونے میں اتنی گنجائش تھی کہ غسل کیا جا سکے چنانچہ غسل خانہ چلا گیا، وہاں جاتے ہوئے ان صاحب کو وضو کرتے ہوئے چھوڑا تھا مگر جب غسل کر کے باہر نکلا تو وہ غائب تھے، پھر اس کے بعد انھیں آنکھیں تلاش ہی کرتی رہیں مگر کامیاب نہ ہو سکیں

اسی وقت حضرت اقدس شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں باریابی نصیب ہو گئی حضرت والا طویل علالت اور بے حد ضعف کی وجہ سے بہ تکلف بہت ہی آہستہ آواز میں گفتگو فرما رہے تھے، مگر لفظ لفظ سے شفقت ٹپک رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد حضرت کے خادم خاص مولانا حبیب اللہ صاحب کے ساتھ مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں باب جبریل سے پہلی بار حاضری

نصیب ہوئی۔ اور روضۂ اطہر کے بائیں حصۂ مسجد میں عشاء کی نماز باجماعت پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ نماز سے فارغ ہو کر مواجہہ شریف میں حاضری کی بے بہا دولت ملی، جس کی آرزو میں نہ جانے کتنے اللہ کے برگزیدہ بندے تڑپ تڑپ کر جان دے چکے، مگر مراد بر نہ آسکی۔ خدا تعالیٰ کا اس ضعیف و ناتواں بندے پر کرم دیکھئے کہ اس نے بلا استحقاق و اہلیت اس آستانہ پر پہنچا دیا، جسے کسی عارف نے "عرش سے نازک تر" بتایا[عہ] اور جہاں جنید و بایزید جیسے مقبولانِ بارگاہ بھی ادباً دم بخود ہو جاتے ہیں۔ وہاں قلب و رُوح کی جو حالت ہوتی ہے اس کے اظہار کے لئے بڑی سے بڑی قدرتِ بیان بھی ناکافی ہے۔ بہر حال اژدہام کی وجہ سے دور ہی کھڑے ہو کر چند ساعتیں (جنھیں زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھنا بے جا نہ ہوگا) درود و سلام میں بسر ہوئیں۔ چونکہ حضرت شیخ مدظلہ العالی کے انتظار فرمانے کا خیال عجلت پر آمادہ کر رہا تھا، اس لئے اس وقت جلد ہی وہاں سے واپسی پر دل کو آمادہ کر لیا۔ پھر مولانا حبیب اللہ صاحب ہی کی نشاندہی پر "روضۃ الجنۃ[عہ]" (یعنی جس کے بارے میں زبانِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: "ما بین بیتی و منبری روضۃ من ریاض الجنۃ") میں حاضر ہو کر دو رکعت پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ شرعیہ آگیا (جہاں حضرت اقدس کا قیام ہے) پہنچتے ہی حضرت شیخ دامت برکاتہم کے بعض خدام نے بتایا کہ حضرت والا انتظار فرما رہے ہیں اور ایک صاحب کو مسجد شریف تمہیں دیکھنے اور بلانے بھیجا تھا۔ اس نوازش و کرم نے عرق عرق کر دیا۔ خدمت میں حاضر ہوا تو دسترخوان بچھا اور حضرت کے چند خاص احباب کے ساتھ ہم طعامی کا شرف حاصل ہوا

عہ "کسی عارف نے ہی نہیں، متعدد فقہاء نے بھی تقریباً یہی بات کہی ہے۔ مثلاً فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:- "ومکۃ افضل منہا (المدینۃ) علی الراجح الا ما ضم اعضاءہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فانہ افضل مطلقا حتی من الکعبۃ والعرش والکرسی" اس کے شارح علامہ ابن عابدین رح نے نقل کیا ہے:- الضریح افضل من المسجد الحرام وقد نقل القاضی عیاض وغیرہ الاجماع علی تفضیلہ علی الکعبۃ...... ونقل عن ابن عقیل الحنبلی ان تلک البقعۃ افضل من العرش (رد المختار ص ۲۵ / ج ۲ مطبوعہ دیوبند)۔ لیکن شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس میں کلام کیا ہے۔ اس موضوع پر سیر حاصل بحث علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم کی شرح (فتح الملہم ص ۴۲۲-۴۱۷ / ج ۳) میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

عہ ("میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کا حصہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہے")

حضرت خود تو بس روحانی غذا کے سہارے ہی جی رہے ہیں۔ مادی غذا کی مقدار تو شاید تولے سے ماشوں میں آگئی ہے۔ اور پھر جب تک احقر کا قیام وہاں رہا روزانہ بعد عشاء کا یہی معمول رہا۔ یہ رات وہیں گزری۔ اوپر یہ تذکرہ رہ گیا کہ لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت مخدومی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ العالی نے اپنی گراں مایہ تصنیف "آپ حج کیسے کریں" عنایت فرمادی تھی۔ اس کتاب سے غیر معمولی نفع پہنچا، گویا اس نے خاموش گائیڈ کا کام کیا (کتاب کے بہت سے مقامات تو آنسوؤں کے سیل رواں میں تیر کر ہی پار کئے جا سکتے ہیں) اس کتاب میں مواجہہ شریف کا سب سے پُرسکون اور کم ہجوم وقت اذان سحر (جس وقت مسجد شریف کے دروازے کھلتے ہیں) کے متصل بتایا گیا ہے۔ چنانچہ راقم سطور نے اس شب ایسا ہی کیا لیکن پروانوں کی تعداد میں اس وقت بھی کوئی غیر معمولی فرق نہ پایا (البتہ بعد عشاء کے مقابلہ میں کچھ کمی ضرور تھی) لیکن وقت چونکہ "جوف اللیل الآخر" (رات کا آخر) تھا اس لئے بہت اچھا لگا اور اللہ نے جتنی دیر توفیق بخشی حضوری کے شرف سے "روضۂ اقدس کی سنہری جالیوں کے قریب ہی کھڑے ہو کر مشرف ہونے کی سعادت نصیب رہی۔ اس وقت خود اپنی قسمت پر ناز اں تھا، لیکن ساتھ ہی یہ خطرہ بھی تھا، کہیں کوئی شعوری یا غیر شعوری۔ بے ادبی، حبط اعمال (نیکیوں کی بربادی) کا سبب نہ بن جائے۔ سنہری حروف میں جالیوں کے اوپر لکھی آیت "لا ترفعوا اصواتکم ..... ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون"؎ ہر زائر کو "باادب" رہنے کا حکم دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ مسجد شریف کے مختلف حصوں۔ بالخصوص دیوار قبلہ۔ میں مکتوب بہت سی اور آیتیں بھی "مقام محمدی" (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خبردار کر رہی تھیں۔ مزید برآں یہ کہ ادب کے جذبہ سے ہونے والی "بے ادبیوں" پر تنبیہ کرنے کے لئے کعبۃ اللہ کی طرح یہاں بھی مخصوص افراد (خاص پولیس کا عملہ) مامور ہیں، جنھیں مسلسل اپنا فرض منصبی انجام دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد جنت کی کیاری (روضۃ الجنۃ) میں بآسانی خدا کے فضل سے نماز پڑھنے کی جگہ مل گئی (بلکہ خدا کے فضل سے زمانۂ قیام کی اکثر نمازیں اسی میں پڑھنا نصیب ہوئیں) اس طرح محراب النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ایک سے زیادہ مرتبہ نماز پڑھنے کی توفیق ملی۔ حالانکہ وہاں ہر وقت ہجوم رہتا ہے اور لوگ لائن لگائے کھڑے رہتے

؎ اے ایمان والو! اپنی آواز بلند نہ کرو..... ورنہ اس کا خطرہ ہے کہ تمہاری ساری نیکیاں برباد ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔

ہیں) پھر وہیں اشراق تک مشغول رہنے کی توفیق ارزاں ہوئی (فالحمد للہ علی ذالک) روضۂ اطہر کے بھیک شمال میں چند گز کے فاصلہ پر بنا چبوترہ (صُفّہ) اُن پاکباز اور علم کوش حضرات کی یاد دلاتا ہے جنھوں نے فاقے کرکے اور مصیبتیں اٹھاکر علم کی قدر دانی اور نبی صلعم کی اطاعت شعاری کے نقوش قائم کیئے۔ (رضی اللہ عنہم) اس پر اللہ کے بندے مسلسل قرآن خوانی کرکے قرآن کے اولین طالب علموں کی گویا یاد تازہ کرتے رہتے ہیں، یہاں سے پھر مدرسہ شرعیہ آیا، رات ہی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ عصر وعشاء کے بعد کے علاوہ اور کسی وقت حضرت شیخ دامت برکاتہم سے ملاقات نہیں ہو سکتی، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس وقت احباب سے ملنے کی کوشش کی جائے جن میں سے بعض کے پتے بھی میرے پاس تھے۔ سب سے قریب قیام گاہ عزیزان مولوی علی احمد ندوی و مولوی افتخار حسین ندوی سلمہما کی تھی. چنانچہ وہیں پہنچا (یہ دونوں منتظر بھی تھے) پھر ان کی خواہش پر ان ہی کے یہاں گویا مستقل قیام رہا۔

(۱۹ ربیع الاول مطابق ۱۶ فروری) یہ جمعہ کا دن تھا. وہیں غسل اور جمعہ کی تیاری کرکے مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلاۃ والسلام) حاضر ہو گیا. نماز کے بعد پھر یہیں آنا اور کھانا ہوا اس وقت نیز عصر بعد اور بھی کئی عزیزان ندوہ سے ملاقات ہوئی، پھر تو اکثر سے بعد عصر روزانہ ملاقات ہوتی رہی (جس میں مولوی معاذ ندوی سلمہٗ بھی تھے) یہ جب تک میں وہاں رہا مستقل ساتھ رہے ان عزیزوں نے بہت ہی راحت و سہولت پہنچائی، باوجودیکہ ان لوگوں کا ششماہی امتحان قریب تھا اور اس کی تیاری کی فکر و مشغولیت تھی مگر مہمان نوازی کے ساتھ ہر اہم جگہ کی زیارت میں رفاقت کرتے رہے جس کی وجہ سے بآسانی اکثر مآثر کی زیارت نصیب ہو گئی (اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان سب کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے، اپنی مرضیات پر چلائے اور علم و عمل کی دولتیں نیز دارین میں فلاح نصیب فرمائے) اگلے دن (۱۷ فروری شنبہ) بعد نماز فجر متصلاً مسجد قُبا جانے کی سعادت حاصل ہوئی. ہفتہ کے دن صبح کے وقت وہاں پیدل جانا مسنون اور بہت ہی اجر درکت کا باعث ہے۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے ایسے ہی وقت میں پیادہ پا حاضری نصیب فرمائی۔ وہاں سے واپسی میں اسی کے قریب مسجد الجمعہ (جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا جمعہ پڑھا تھا) میں بھی حاضری کی سعادت ملی. پھر قیام گاہ واپس آکر اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد مسجد نبویؐ حاضر ہو گیا۔ آجکل بہ وقت عموماً روضۂ اطہر پر ہجوم کی کمی کا ہوتا ہے (اسی طرح عصر کے بعد کا وقت بھی) اللہ تعالیٰ جنھیں توفیق دیتا ہے وہ اس فرصت کو غنیمت جان کر مواجہہ شریف میں حاضری دیتے اور درود و سلام کے تحفے پیش کر کے شاد کام ہوتے ہیں۔

اگلی صبح کو فجر کے بعد (۸ فروری یکشنبہ) مسجد نبوی میں عزیز گرامی قدر مولوی خلیل الرحمٰن سجاد ندوی سلمہٗ (فرزند ارجمند مولانا محمد منظور نعمانی) بھی مل گئے۔ جو اسی شب میں جدہ سے واپس آئے تھے، اس کے بعد عزیز موصوف بھی پوری مدت قیام ساتھ ہی رہے اور ان کے وہاں طویل قیام نیز حلقۂ تعارف کی وسعت کے سبب بعض اہم شخصیتوں سے ملاقات کا موقعہ بھی ملا (جس سے علمی و دینی نفع پہنچا۔) اسی دن بعد فجر جبل اُحد حضرت سید الشہدا اور دیگر شہدائے اُحد کے مزارات، نیز بیر عثمان (بیر رومہ) جامعہ اسلامیہ اور مسجد غمامہ کی زیارات نصیب ہوئیں۔ اس میں اتنا وقت لگ گیا کہ مسجد نبوی میں ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ہی قیام گاہ واپسی ہو سکی۔ اس درمیان بہت سے اہم آثار دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ خاص طور پر جبل اُحد کا وہ شگاف جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمی ہونے کے بعد آرام فرمایا تھا۔ (اور یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے شگاف کو جس میں صرف ایک ہی شخص کی گنجائش ہے اسی کام کے لئے اور صرف اسی دن کے لئے وجود بخشا تھا) جب دیکھنے کی سعادت میسر آئی تو اس لحاظ سے بھی سب سے بڑی نعمت معلوم ہوئی کہ غالباً (مدینہ طیبہ) میں یہی ایسی جگہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی تغیر نہیں ہوا۔ (یا اگر ہوا بھی ہوگا تو بہت ہی معمولی) شہداء اُحد، خاص طور پر سید الشہدا حضرت حمزہ اور حضرت مصعب بن عمیر (رضی اللہ عنہم اجمعین) کی مبارک آرام گاہوں پر حاضری نے "من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ"ؑ کی عملی تفسیر دل کے اوراق سامنے کھول دیئے۔ مہر و وفا کے ایسے نمونے جب چشم سر کے سامنے آئیں (جن سے زیادہ بہتر چشم فلک کو بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوئے) تو دل کے دریا میں تلاطم برپا ہو کر آنکھوں کی

ؑ مطلب: "ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے، پھر بعض تو ان میں وہ ہیں جو زندگی کی نذر پیش کر کے اس عہد کو پورا کر چکے۔" (القرآن)

راہ سے بہہ نکلنے پر تعجب کیوں ہو؟

بیر عثمان نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس ایثار و قربانی کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دی جو انھوں نے یہ کنواں خرید کر وقف عام کر کے کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ان کی اس بے بسی (اور اعدا کی قساوت قلبی اور ظلم و جفا) کا نقشہ بھی نگاہوں کے سامنے آ گیا جب انہیں محصور کر کے اسی کنویں کے ایک قطرہ پانی تک سے محروم کر دیا گیا تھا۔

مسجد غمامہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کا دوگانہ ادا فرمایا تھا، مسجد نبوی سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہی ہے۔ جامعہ اسلامیہ (مدینہ مسلم یونیورسٹی) وادی عقیق میں گورنر کے محل کے متصل وسیع احاطہ اور شاندار عمارتوں کا مجموعہ ہونے کے علاوہ اپنی دینی خصوصیات میں پوری مملکت کے اندر ممتاز مقام رکھتی ہے مگر اندازہ ہوا کہ ابھی تعمیر و تکمیل کے مراحل ہی میں ہے، خاص طور پر لائبریری جس کے لئے اگرچہ عمارت شاندار بن چکی ہے مگر وہ تو بالکل متوسط بلکہ کتابوں کے ذخیرہ اور ان کی ترتیب کے اعتبار سے اس سے بھی کم درجہ کی نظر آئی۔ البتہ اقامت خانوں کی شان اور ان میں راحت و آرام کا سامان دیکھ کر بیساختہ ندوی عزیزوں کے سامنے اس طرح کا جملہ زبان سے نکلا — "ایسی آسائش میں کسی کو پڑھنے لکھنے اور علم کوشی کی عادت کی توفیق کامل جانا بہت ہی غیر معمولی بات ہے۔"

اس کے بعد اور ایک دن صرف اساتذہ اور ذمہ داروں سے ملاقات کرنے کی غرض سے جامعہ جانا ہوا تو نائب الرئیس (وائس چانسلر) شیخ محسن بن عباد اور الامین العام (جنرل سکریٹری) شیخ عمر محمد فلاتہ سے شرف ملاقات نصیب ہوا۔ ہر دو بزرگ بہت محبت و اخلاص اور عربوں کی روایتی گرمجوشی کے ساتھ ملے اور اظہار تعلق کی باتیں کرتے رہے۔ اس مختصر ملاقات ہی میں شیخ محسن بن عباد کے تیقظ اور قوت حفظ کا بھی اندازہ ہوا۔ ان کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور دیگر ذمہ داروں سے ملاقات اس لئے نہ ہو سکی کہ ان دنوں امتحان ششماہی کی تیاری کے لئے تعطیل چل رہی تھی۔ (اسی وجہ سے وہاں کے دروس میں شرکت کی تمنا بھی دل میں ہی رہ گئی) اس بار واپسی میں مسجد القبلتین (جہاں نماز پڑھتے ہوئے قبلہ بدلنے کا حکم نازل ہوا تھا) کی زیارت بھی کی۔ یہ بات میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ عربوں میں ایک بڑی اہم خصوصیت یہ ہے (جو سارے عالم میں اور کسی جگہ ملنا مشکل ہے) کہ بڑے سے بڑا آدمی اتنی تواضع اور بے تکلفی کے ساتھ ہر چھوٹے سے چھوٹے شخص سے بھی ملتا ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہو پاتا کہ یہ بڑا شخص ہے۔ اور ہر

شخص سے بآسانی ملاقات بھی کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اسی سے حوصلہ پاکر خیال ہوا کہ مدینہ طیبہ کی عدالت شرعیہ کے قاضی القضاۃ (مدینہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس) شیخ عبد العزیز الصالح جو مسجد نبوی کے امام اکبر بھی ہیں، سے شرف ملاقات حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ایک دن بعد مغرب (غالباً ۱۹ر فروری دوشنبہ کو) ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ موصوف توقع سے کہیں زیادہ محبت و خلوص سے ملے اور شفقت آمیز گفتگو فرمائی۔ ان کے تدین و تقویٰ نیز ذکر و شغل کے نورانی آثار نمایاں ہونے کا اعتراف سب اہل نظر کو ہے۔ مختصر سی ملاقات میں بھی موصوف کو برابر ذکر میں مشغول دیکھا۔ چنانچہ ہم جیسے بے بصیرتوں پر بھی موصوف کی ان صفات کا گہرا نقش قائم ہوا۔ اور مجلس کے بعد بھی برابر ذکر اللہ میں مشغول رہے (اطال اللہ بقاءہٗ و مدّ فیوضہٗ) موصوف سے ایک مرتبہ ایک عدالت کے کمرہ میں جب کہ وہ جج کی کرسی پر تھے ملاقات کی۔

اسی طرح ایک اور پُراثر دینی و علمی شخصیت استاذ عطیہ سالم سے نیاز حاصل کرکے طبیعت پر ان کی دقتِ نظر، وسعت مطالعہ اور اصابت فکر کے ساتھ للّٰہیت اور تواضع کا اثر پڑا۔ موصوف حرم نبوی میں بعد مغرب (موطا امام مالکؒ کا) فاضلانہ درس بھی دیتے ہیں (جس میں شرکت کی سعادت بھی راقم سطور کو ایک بار سے زیادہ حاصل ہوئی) اور عدالت عالیہ شرعیہ کے نائب القاضی (ہائیکورٹ کے جج) بھی ہیں ان کی بلند اخلاقی دیکھ کر یہ جراءت ہوئی کہ موصوف سے ہم نے عدالت میں حاضر ہونے اور اس کا طریقۂ کار دیکھنے کی فرمائش اور خواہش ظاہر کی (عزیز مکرم مولوی سجاد ندوی سلمہ اللہ کے توسط سے) جسے انھوں نے بطیبِ خاطر منظور فرمالیا اور اس کے لئے ۲۴ فروری یوم شنبہ صبح ۹½ بجے کے بعد وقت بھی طے ہوگیا۔ چنانچہ احقر اور مولوی سجاد سلمہٗ وقت مقررہ پر عدالت پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد استاذ موصوف بھی وہاں پہنچ کر جج کی کرسی پر تشریف فرما ہوگئے اور ازراہِ عنایت اس حقیر کو اپنے برابر والی کرسی پر بٹھایا (چائے سے تواضع بھی کی) اور مقدمہ کی سماعت شروع کردی۔ اس وقت دوکان کے انخلاء کا ایک مقدمہ زیر سماعت تھا اور اس کی غالباً پہلی پیشی تھی۔ مدعی اور مدعا علیہ کے بیانات سب کے سامنے ہی سنکر جج صاحب قریب ہی بیٹھے پیشکار (جسے وہاں کی اصطلاح میں "کاتب العدل" کہتے ہیں) کو املا کراتے رہے (اس کے بعد مجھے کارروائی دکھائی۔ اور وہاں کا قانون انخلاء اور طریق حکم بھی زبانی بتایا) سب سے زیادہ اہم اور قابل تقلید بات وہاں کے عدالتی نظام کی سادگی اور فریقین کے عزّت نفس کا لحاظ ہے۔ ہمارے

ملک کی طرح وہاں کے جج اپنے آپکو دوسری مخلوق نہیں سمجھتے۔ بلکہ حاضر عدالت ہونے والا جو شخص بھی چاہے جج سے (سلام مسنون کے بعد) مصافحہ بلا تکلف کر سکتا ہے کیونکہ جج کو مقدمہ کے کسی فریق کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنے اور ان کے درمیان کسی آڑ اور رکاوٹ کا کھڑا کرنا (جیسی ہمارے ملکوں میں رہتی ہیں) ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ کرسی پر آمنے سامنے بیٹھتے ہیں۔ نہ وکلائ کی لمبی چوڑی لاطائل بحثوں میں وقت ضائع کیا جاتا ہے اور نہ پیشی کے وقت آواز لگائی جاتی ہے (جو واقعتہً فریقین کی عزت نفس پر حملہ اور گویا انہیں مجرم سمجھنے کے مترادف ہے لیکن ہندوستان میں غلامی کے زمانہ کی اسی قبیح رسم کے سبب مقدمہ باز ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اس کی قباحت کا احساس بھی جاتا رہا۔) بلکہ وہاں جس کے لئے جو تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے اس پر وہ حاضر عدالت ہو جاتا ہے اگر اس وقت کسی اور کا مقدمہ زیر سماعت ہوا تو دروازہ پر کھڑے شخص سے پتہ چل جاتا ہے اور وہ اطمینان سے عدالت کے اندر پڑی کرسی پر— اگر جگہ ہو گی ورنہ— باہر بیٹھ کر انتظار کرتا ہے۔ پھر جب جج کو فارغ پاتا ہے حاضر ہوتا ہے (شاید آنیوالوں کی ترتیب سے ہی مقدمات کی سماعت ہوتی رہتی ہے)

میرے نزدیک پوری مملکت سعودیہ کی سب سے بڑی خصوصیت امن و اطمینان اور ایک کا دوسرے پر اعتماد اور عملی مساوات ہے اس وصف کی بنا پر بہت ہی راحت اور بہت ہی غیر ضروری مشغولیتوں اور زائد اخراجات سے حفاظتی انتظامات اور مقدمات کی بھر مار وغیرہ جیسے کاموں) سے وہاں کے عوام کو نجات ملی ہوئی ہے بڑی بڑی دوکان پر جس میں خواہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کا سامان موجود ہو— یوں ہی کپڑے کا پردہ ڈال کر بعض دوکاندار رات کو گھر جا کر اطمینان سے سو جاتے ہیں اور نماز کے لئے پردہ ڈال کر چلے جانا تو بیشتر دوکان داروں کا معمول ہے۔ لبس سٹینڈ یا کسی بھی عوامی جگہ پر یوں ہی فٹ پاتھ پر کسی بھی جگہ سامان چھوڑ کر چلا جانا اور گھنٹوں غائب رہنا وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے (خود راقم سطور بھی مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ واپسی کے وقت موقف (ٹیکسی اسٹینڈ) کے فٹ پاتھ پر سامان چھوڑ کر نماز کے لئے چلا گیا اور واپس آکر سامان جوں کا توں پایا) اسی اعتماد، اکرام ضیف اور احترام آدمیت کا ایسا اچھوتا نمونہ بھی راقم سطور نے دیکھا جس سے خوشی ہی نہیں روح کو

مہ یقیناً یہ راحت نتیجہ ہے اسلامی اخلاق اور شرعی قوانین کے نفاذ کا۔ جس کے اجراء کی توفیق وہاں کی حکومت کو ملی ہوئی ہے۔

تازگی بھی ملی (اس واقعہ کا ذکر پہلے کرنا چاہیئے تھا مگر افسوس ہے کہ ابتک نہ کیا جا سکا۔) وہ یہ کہ سعودی عرب کے ایک نہایت معزز و ممتاز خاندان کے مشہور ذی وجاہت اور صاحب ثروت شخص جن کا مدینہ طیبہ میں ہی زیادہ تر قیام رہتا ہے اور وہاں ایک بڑے ہوٹل کے علاوہ ان کی شاندار رہنے کے لئے بلڈنگ بھی ہے (اس کے علاوہ ریاض وغیرہ میں بھی عمارتیں ہیں) میری مراد شیخ صالح القصیبی سے ہے جو مملکت کے وزیر بھی رہ چکے ہیں اور اب بھی بہت سے بڑے اور اہم اداروں مثلاً جامعہ اسلامیہ کے رکن رکین ہیں۔ جدہ اسلامی بینک کی طرف سے منعقد کردہ اس میٹنگ کے اندر بھی شریک تھے جس کے لئے راقم سطور حاضر ہوا تھا۔ اُن کا وہاں بھی یہ طرز عمل دیکھا کہ وہ مجھ جیسے قلیل البضاعت وصغیر السن کو آتے جاتے آگے ہی رکھنے کی کوشش کرتے پھر مدینہ طیبہ کا اپنا پتہ دیکر اصرار کیا کہ میں وہاں ان سے ضرور ملوں۔ چنانچہ مدینہ شریف حاضر ہونے کے بعد اس پتہ پر گیا جو موصوف نے دیا تھا۔ مگر اس وقت ان سے ملاقات اُن کے ریاض چلے جانے کی وجہ سے نہ ہوسکی۔ میں اپنا ویزیٹنگ کارڈ چھوڑ آیا۔ اور اس کی پشت پر مدینہ طیبہ میں اپنی قیام گاہ کا پتہ بھی لکھدیا۔ ایک روز زیارات سے فارغ ہو کر میں قیام گاہ جو پہنچا تو معلوم ہوا کہ موصوف تشریف لائے تھے اور کوئی ڈیڑھ گھنٹہ انتظار فرماتے رہے۔ اور عزیز مولوی احمد علی ندوی سے اپنے دولت خانہ پر میرے قیام کے لئے اصرار کرتے رہے۔ یہ سن کر تعجب آمیز خوشی اور اسی کے ساتھ ان کے زحمت فرمانے پر ندامت ہوئی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس تکلیف کی تلافی کا ارادہ کیا۔ خوش قسمتی سے اس مرتبہ ملاقات ہو گئی تو اس قدر اکرام و اعزاز کا معاملہ کیا کہ مجھے حیرت کے ساتھ ندامت بھی ہوئی۔ اور اپنے محل نما مکان میں ٹھہرانے کے لئے بہت اصرار کیا اور اس کی ترغیب میں بہت سی وجوہ ترجیح دیر تک بیان کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ باصرار اس عظیم الشان مکان کی کنجی یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کر دی کہ تم اگر مستقل نہیں ٹھہرتے تو جب ضرورت ہو یہاں آجایا کرنا اور یہاں پر موجود سہولتوں سے فائدہ اٹھالیا کرنا۔ چنانچہ موصوف کی اس غیر معمولی عنایت کی وجہ سے ایک شب ان کے دولت خانہ پر گزارنے کی عزت حاصل کی۔ مگر میں اس وقت وہاں پہنچا جب موصوف اپنی رات کی آرامگاہ تشریف لے جا چکے تھے (اللہ تعالیٰ انہیں بہت بہت جزائے خیر دے اور ان کی عزت وکرامت میں روز افزوں ترقی فرمائے)

مدینہ طیبہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ اور ندوۃ العلماء کے

تعلق رکھنے والے ہندوستانیوں کی خاصی تعداد ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان حضرات نے تعلق خاطر کا اظہار کیا جن میں مولوی سلمان صاحب شمسی ندوی (جو وہاں سینٹر افسر ہیں) اور محترم بھائی طارق عسکری صاحب (ٹیلیفون انجینئر) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر نے تو اپنی عنایات و کرم فرمائیوں سے غیر معمولی طور پر نوازا۔

غرضیکہ مدینہ طیبہ کے ایسے پُر کیف اور ایمان افروز ماحول میں ۹، ۱۰ دن ایسے گزر گئے جیسے چند گھنٹے۔ اور روانگی کا وقت آ گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کی توفیق سے مسجد نبوی میں ۳۴ فرض نمازیں باجماعت پڑھنا نصیب ہو گئیں (اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اسے حسنِ اتفاق ہی کہا جائیگا کہ میری عمر کا بھی ۳۴ واں سال چل رہا ہے) زیارات و آرام کے اوقات چھوڑ کر معتد بہ حصہ مسجد نبویؐ اور مواجہہ شریف ہی کی نورانی فضاؤں میں بسر ہوا (فالحمد للہ حمداً کثیراً) اس سفر میں اللہ تعالےٰ کے جو بے شمار انعامات و احسانات ہوئے ان میں ایک بہت بڑا انعام یہ بھی ہے کہ اپنے مرشد و شیخ دامت برکاتہم کی غیر معمولی شفقتیں اور توجہات بلا استحقاق و اہلیت منعطف رہیں، اور بعض اوقات تو حضرت والا کی شفقتوں کا عملی و زبانی ایسا ظہور ہوتا کہ یہ حقیر ندامت سے پانی پانی ہو جاتا۔ خاص طور پر رخصت کرتے وقت جس طرح نوازا اپنے لئے یہ حقیر اسے وسیلۂ نجات اور ذخیرۂ آخرت سمجھتا ہے (حضرت اقدس نے ازراہ ذرہ نوازی اپنی تمام تصانیف بھی جو وہاں موجود تھیں مرحمت فرمائیں۔) اللہ تعالیٰ حضرت والا کا سایۂ عاطفت تادیر صحت و عافیت کے ساتھ قائم رکھے اور حضرت کے فیوض سے مستفیض ہوتے رہنے کی توفیق دے۔ حضرت کے فرزند ارجمند محترم بھائی مولانا طلحہ صاحب زاد مجدہ اور معتمد خاص جناب محترم قاضی عبد القادر صاحب و صوفی اقبال صاحب وغیرہم کے الطاف و عنایات بھی اس خادم کے حال پر بہت رہے (فجزاہم اللہ خیر الجزاء) حضرت کے معالج خاص ڈاکٹر اسماعیل صاحب کی شخصیت سے بھی بہت متاثر ہوا کہ اتنے عظیم اور ماہر فن ڈاکٹر ہونے کے باوجود مولوی ہی نہیں صوفی معلوم ہوتے ہیں (اور ارباب نظر کو یہ کہتے بھی سنا گیا کہ باطن ظاہر سے بھی اعلیٰ ہے)[1] خدا کے

---

[1] ڈاکٹر اسماعیل صاحب حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کے خواص مسترشدین میں سے ہیں اور مجاز بھی ہیں۔ (نعمانی غفرلہ)

فضل سے مدینہ طیبہ میں دو جمعے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد ۲۴ فروری ۱۹۷۹ء کو اس محبوب و دل آویز شہر سے بادل ناخواستہ بعد عصر روانہ ہونا پڑا کیونکہ ویزا کی مدت ختم ہونے میں صرف تین روز باقی رہ گئے تھے (۲۷ کی فلائٹ سے بمبئی کے لئے رزرویشن بھی ہو چکا تھا)

مدینہ طیبہ کی آمد کیطرح وہاں سے روانگی بھی تنہا ہو رہی تھی اور رات کے گیارہ بجے کے بعد بظاہر مکہ مکرمہ پہنچنا تھا۔ اس لئے ذرا فکر تھی کہ ایسے ناوقت سامان کے ساتھ قیام گاہ تک (جو کہ گلیوں میں تھی جہاں کسی سواری کا پہنچنا بھی ممکن نہ تھا) کس طرح پہنچا جائے گا۔ مگر خدا کا فضل و کرم اس موقعہ پر بھی شامل حال رہا کہ مولانا قاری سیف الدین صاحب ملتانی (شاگرد رشید مولانا قاری فتح محمد صاحب مدظلہ) جن کا مستقل قیام مکہ معظمہ میں ہے) ہم سفر ہو گئے اور مکہ مکرمہ میں میری قیام گاہ تک پہنچا کر ہی اپنے دولت خانہ تشریف لے گئے۔ راستہ میں ایک اور دیندار نادیدہ شخص سامان اٹھا کر لے جانے میں معین ہو گئے (فجزاہما اللہ خیر الجزاء) بلد امین کے مکینوں کو اللہ تعالیٰ نے وہ ظرف اور میزبانی کا وہ جذبہ عنایت فرمایا ہے جو کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ کیسے ہی ناوقت مہمان آجائے وہ گرانی تو کیا محسوس کرتے، بے حد خوش ہوتے ہیں، چنانچہ ہمارے اس وقت کے میزبان قاری محمد سلیمان صاحب زادمجدہٗ میرے ایسے ناوقت پہنچنے پر بھی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ میزبانی کے تقاضے پورے کرنے لگے (فجزاہ اللہ احسن الجزاء) اور جتنی مدت ان کے پاس قیام رہا، بہت ہی عنایت و محبت کا معاملہ کرتے رہے اور ہر قسم کی سہولت پہنچاتے رہے۔ اللہ کی توفیق نے مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ آمد کے موقعہ پر بھی ایک عمرہ نصیب فرمایا اور اس طرح اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ایک خاص شرف حاصل ہو گیا۔ قاری صاحب موصوف کا مکان حرم شریف سے قریب ہونے کی وجہ سے ہر نماز بلکہ ہر وقت کی حاضری میں بہت سہولت ہوئی۔

دوشنبہ کو (۲۶ فروری) حسب قرارداد بھائی اسمٰعیل صاحب (الپسر صوفی عبد الرحمن صاحب) مجھے جدہ لے جانے کے لئے مکہ مکرمہ موٹر لے کر آگئے۔ اور ظہر کی نماز حرم شریف میں پڑھ کر اور طواف وداع کر کے سرزمین حرم سے باحسرت و یاس روانگی ہو گئی۔ ادھر بھائی محمد صدیق صاحب نے (الپسر صوفی عبد الرحمن صاحب) رزرویشن اور سفر کے دیگر تمام مراحل طے کرانے میں بہت ہی

دلسوزی اور اخلاص سے کام کیا، سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی وہاں موجودگی۔ کم سے کم اس حقیر کے لئے، خداوند تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی، کہ ہر دشواری اور ضرورت کا حل نکالنے میں پیش پیش رہے اور میں بھی بلا تکلف ہر ضرورت کا اظہار کر دیتا (ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ بس خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ وہ انہیں شایان شان صلہ عطا فرمائے۔)

اور پھر ۲۷ فروری سنہ ۱۹۷۹ء یوم سہ شنبہ کو وہ وقت بھی آ گیا جس میں بعد مغرب جدہ سے بمبئی کے لئے ہمارے جہاز نے پرواز کی۔ اور خدا کی شان جو مسافت ہفتوں بلکہ مہینوں میں طے ہوا کرتی تھی وہ صرف چار گھنٹہ میں طے ہو گئی۔

رات کو (ہندوستانی وقت سے) ۲ ½ بجے بمبئی پہنچنا ہوا اور صبح ۶ ½ بجے والے جہاز سے (جو اس دن ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا) بمبئی سے دہلی روانگی ہوئی پونے دو گھنٹہ بعد دہلی ایرپورٹ پہنچ گئے۔

۲ راتیں دہلی میں گزار کر تیسری شب ٹرین سے روانہ ہو کر اگلی صبح (۳ مارچ یوم شنبہ) بخیر و عافیت لکھنؤ پہنچنا ہو گیا۔

اس طرح ٹھیک ایک مہینہ بعد پھر وہی لیل و نہار شروع ہو گئے، جس میں برسوں سے زندگی گزر رہی ہے۔

آخر میں اُن دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے میرے آنے جانے کے وقت مختلف جگہ کے ہوائی اڈوں پر آ کر، یا سفر کے کسی بھی مرحلہ میں میری خاطر تکلیف اٹھائی۔ ان سب کے واسطے بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ سب کو

حضرت مولانا شمس الحق صاحب
استاذ حدیث دار العلوم کراچی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے ثمرات و برکات

اللہ تعالےٰ سے جس طرح اپنی ذات کے لئے دعا مانگنا نیکی اور عبادت ہے اسی طرح اپنے متعلقین اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں دعا کرنا بھی بڑے ثواب کا کام ہے۔ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر بہت سے حقوق ہیں ان میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کے لئے دعا کیا کریں اور اگر کسی سے روحانی، جسمانی، دینی، دنیوی کسی قسم کا کوئی خصوصی تعلق ہے تو اس کا اور بھی زیادہ حق ہے۔ کہ اس کو دعاءِ خیر میں ہرگز فراموش نہ کرے وہ دعا جو کسی مسلمان کے لئے غائبانہ طور پر کی جائے اس کی قبولیت کا حدیث شریف میں خصوصیت سے وعدہ فرمایا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں جا بجا ایسی دعائیں تلقین فرمائی گئی ہیں جن میں دعا کرنے والے کے ساتھ دوسرے اہل ایمان کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اور اسی لئے اکثر دعاؤں میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے تاکہ ان کا یہ حق کسی وقت آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ اور جب اپنے لئے دعا کرے تو خواہی نخواہی یہ حق بھی ادا ہوتا رہے جیسے: رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ

الکافرین٥

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جو سراپا رحمت وشفقت تھی، آپ راتوں کو سجدہ میں گر کر اپنے رب کے حضور اپنی امت کے لئے دعائیں کرتے اور اس کی مغفرت طلب فرماتے یہ تو آپ کی وہ عمومی دعائیں تھیں جن میں ہر امتی شریک ہے، خواہ آپ کے زمانہ کا ہو یا بعد میں آنے والا، لیکن چند ایسے خوش بخت اور صاحب نصیب حضرات بھی ہیں جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ اپنی دعاؤں سے نوازا ہے اور انھوں نے اور دوسرے لوگوں نے ان دعاؤں کی قبولیت ان کے ثمرات اور برکات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا۔ اور زبان مبارک سے نکلے ہوئے دعائیہ کلمات کو حرف بہ حرف پورا ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہاں پر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ہی چند صحابہ کرام کا تذکرہ کر رہے ہیں جن کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ زبان نبوت سے کلمات دعا صادر ہوئے اور در حق سے ان کی قبولیت روز روشن کی طرح سامنے آئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

یہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں۔ اُن کی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ اور ام المومنین ہیں۔ عبداللہ بن عباس کا اپنی خالہ کے یہاں آنا جانا رہتا تھا اور اس طرح اندرون خانہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی خدمت کا انہیں موقعہ ملتا رہتا۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے، پیچھے ابن عباس رضؓ نے آپ کے لئے وضو کا پانی لاکر رکھدیا، آپ واپس تشریف لائے تو دریافت کیا کہ یہ پانی کس نے رکھا ہے، آپ کو بتایا گیا کہ ابن عباس نے رکھا۔ آپ نے خوش ہو کر ان کو دعا دی۔

اللھم فقھہ فی الدین۔ اے اللہ اس کو دین کا فقیہ بنادے۔

ابن سعد کی روایت میں ہے، ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مجھے بلایا اور میری پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی: اللھم علمہ الحکمۃ

وعلمہ التاویل الکتاب ، اے اللہ اس کو حکمت کی باتیں اور قرآن کی تفسیر سکھلا۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کی برکت یہ تھی کہ بچپن ہی سے ابن عباسؓ کی فقاہت اور قرآن فہمی صحابہ میں مسلّم تھی۔ آپ حبرِ الامّت اور ترجمان القرآن کے نام سے مشہور تھے۔ اکابر صحابہ جو ابن عباسؓ سے عمر میں بھی بڑے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی مدّتِ رفاقت و محبت بھی طویل تھی۔ اہم مسائل میں ابنِ عباسؓ کی طرف رجوع کرتے اور ان کی حکیمانہ رائے اور فہم دین پر اعتماد فرماتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کو اپنے قریب بھٹاتے اور بڑے بڑے صحابہ کی موجودگی میں ان سے مشورہ لیتے۔ حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف تیرہ یا پندرہ سال کی تھی۔ صحابہ اور تابعینؒ کی بڑی تعداد نے ان سے قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کثیر احادیث ان سے روایت کیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب کوئی شخص مسئلہ دریافت کرتا تو وہ اس کو مشورہ دیتے کہ :

سَلْ اِبْنَ عَبَّاس فَاِنَّہٗ اَعْلَمُ مَنْ بَقِیَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍؐ۔ ابن عباسؓ سے دریافت کرو اس لئے کہ وہ باقی رہنے والوں میں سب سے زیادہ دین محمدیؐ کو جاننے والے ہیں

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ اپنے کثرت علم کی وجہ سے بحر (سمندر) کہلاتے تھے۔ حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ستّر صحابہ کو دیکھا کہ جب وہ کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے تو ابن عباسؓ کے قول کو اختیار کرتے۔ حضرت اعمشؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے ایک بار حج کے موقعہ پر خطبہ دیا۔ وہ قرآن حکیم پڑھ پڑھ کر اس کی تفسیر بیان فرما رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اگر ان کا یہ بیان اور یہ علوم" فارس و روم کے لوگ سن لیں تو بلاشبہ اسلام لے آئیں۔ ایسے ہی حضرت ابو وائلؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت ابن عباسؓ سورۂ نور کی تفسیر بیان فرما رہے تھے تو ایک شخص کہنے لگا کہ اگر یہ بیان" دیلم" کے لوگ سن لیں تو مسلمان ہو جائیں۔

یہ تمام فضل و کمال، دینی فقاہت اور قرآن فہمی کا امتیاز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ان ہی دعاؤں کا صدقہ ہے: "اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ" ۔۔ اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْحِکْمَۃَ

وتنا دیل الکتاب۔"

ترمذی شریف میں ابن عباس کی روایت ہے کہ انھوں نے دو بار جبرئیل امینؑ کو دیکھا ہے شاید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی برکت سے علوم وحی، معارف نبوت اور عالم ملکوت سے خاص قسم کی مناسبت پیدا ہوجانے کی وجہ سے وحی لانے والے فرشتے سے بھی مناسبت پیدا ہوگئی ہو، جس کی بنا پر دو مرتبہ ان کو یہ سعادت رویت نصیب ہوئی۔ ابن سعد کی روایت میں ہے کہ ابن عباس رضؓ کے انتقال کے بعد جب ان کی نعش مبارک باہر لائی گئی تو اچانک ایک بڑا سفید پرندہ آیا اور ان کے کفن کے اندر گھس گیا۔ لوگوں نے اس کو نکالنا چاہا مگر وہ تلاش کے باوجود دوبارہ نظر نہیں آیا اور پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کدھر غائب ہوگیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ابن عباس رضؓ کا علم ہے جو سفید پرندہ کی شکل میں متمثل ہوکر سامنے آیا اور دوبارہ ان کے قلب میں داخل ہوگیا۔

ممکن ہے کہ انتقال کے وقت خروجِ روح کے ساتھ یہ علم بھی باہر آیا ہو اور اس کے بعد دوبارہ اس کو ان کے جسم میں لوٹا دیا گیا ہو اور عالم مثال میں ان کے علم کی صورت سفید پرندہ کی ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دین طویل قمیص کی شکل میں، اور علم دودھ کی صورت میں دکھلایا گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خادم ہیں، انصار کے مشہور قبیلہ خزرج سے آپ کا تعلق ہے۔ دس سال کی عمر میں آپ کی والدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا آپ کو لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ آپ کا چھوٹا سا خادم ہے اسے خدمت کے لئے قبول فرمالیں اور اس کے لئے دعا فرمائیں۔ آپؐ نے ان کو اپنی خدمت کے لئے قبول فرمالیا اور یہ دعا دی: اَللّٰھُمَّ بَارِکْ فِی مَالِہٖ وَوَلَدِہٖ وَاَطِلْ عُمْرَہٗ وَاغْفِرْ ذَنْبَہٗ (اے اللہ اس کے مال اور اولاد میں برکت عطا فرما اور اس کو عمر دراز عطا کر اور اس کے گناہ معاف فرما)

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین و دنیا دونوں کے لئے اس قدر جامع دعا ہے کہ نبی ؐ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ایسی جامع اور مختصر دعا نہیں دے سکتا۔

حضرت انس رضؓ خود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کی برکت یہ ہے کہ میرے باغ میں سال میں دو مرتبہ پھل آتا ہے جب کہ دوسروں کے باغات میں سال میں صرف ایک بار پھل لگتا ہے۔ اور ترمذی بیہقی وغیرہ کی روایات میں ہے کہ ان کے باغ میں ایک پودہ ایسا تھا جس کے پھولوں سے مشک کی خوشبو آتی تھی اور فرماتے ہیں کہ اولاد میں برکت کا حال یہ ہے کہ اپنے صلبی اولاد میں سے ۹۸ افراد کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر چکا ہوں اور صحیحین کی روایت میں ۱۲۹ کا ذکر ہے اور طبرانی کی روایت میں ۱۲۵ کا ذکر ہے اور جو زندہ ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ بعض روایات میں ان کی تعداد سو سے زیادہ مذکور ہے۔

اور درازیٔ عمر کا یہ عالم ہے کہ زندگی سے اکتا گیا ہوں، باقی رہ گئی مغفرت کی دعا (وَاغْفِرْ ذَنْبَہٗ) سو اللہ کی رحمت سے اس کی قبولیت کی بھی پوری امید رکھتا ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے طویل العمر اور کثیر الروایتہ صحابی ہیں۔ دس سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں رہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ایک قول کے مطابق ۹۹ سال کی اور دوسرے قول کے مطابق ۱۰۳ سال کی تھی۔ امام نووی رحؒ نے اسی دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بصرہ تشریف لے گئے تھے اور ۹۳ھ میں وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحؒ جن کا قیام کوفہ میں تھا بکثرت بصرہ جاتے رہتے تھے آپ نے بعض دوسرے صحابہ کے علاوہ حضرت انس رضؓ کو بھی دیکھا ہے اس لئے امام اعظم رحؒ تابعی کہلاتے ہیں۔

حضرت طفیل بن عمر الدوسی رضی اللہ عنہ

ان کا تعلق یمن کے قبیلہ دوس سے ہے اس لئے دوسی کہلاتے ہیں۔ انھوں نے مکہ

مکرمہ میں اسلام قبول کیا اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اپنی قوم کو تبلیغ ایمان کے لئے یمن واپس چلے گئے۔ اور وہیں پر اسلام کی دعوت دیتے رہے شروع میں ان کی دعوت پر صرف ان کے والد اور ان کی بیوی نے اسلام قبول کیا۔ دوسرے لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ انکی قوم میں زنا اور بدکاری عام تھی انھوں نے مایوس ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ دوس کے لوگ ایمان نہیں لاتے آپ ان کے لئے ہلاکت کی بددعا کردیجئے۔ آپ کی ذات تمام عالم کے لئے سراپا رحمت بن کر آئی تھی آپ ان کے لئے بددعا کیسے فرماتے۔ آپ نے بددعا کے بجائے یہ دعا فرمائی: "اللھم اھدِ دوسًا وَأتِ بھم" اے اللہ دوس کو ہدایت عطا فرما۔ اور ان کو یہاں لے آ۔

چنانچہ آپ کی اس دعا کی برکت سے قبیلۂ دوس کے ستر اسی گھرانے پورے مسلمان ہو گئے۔ اور یہ لوگ فتح خیبر کے موقعہ پر ۷ھ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی اسی سال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے بھی حضرت طفیل رض بن عمرو دوسی کی دعوت پر ایمان قبول کیا۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ جب پہلی بار مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوئے تو آپ نے ان کو دوس قبیلہ کو دعوت اسلام دینے کا حکم دیا تو انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی نشانی عطا فرمادیں جسے دیکھ کر دوس کے لوگ میری بات مان لیں اور ایمان لے آئیں۔ آپ نے ان کے لئے اللہ تعالےٰ سے دعا فرمائی۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے لئے دعا "اللھم نوّر لہ" (اے اللہ اس کے لئے روشنی پیدا فرمادے)

چنانچہ آپ کی دعا کی برکت سے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک تیز روشنی چمکنے لگی ان کو اندیشہ ہوا کہ لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگیں کہ اپنے آبا کی دین کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کی صورت ہی بدل گئی ہے اور مُثلہ ہو گیا ہے، اس لئے انھوں نے دعا کی کہ اے اللہ یہ روشنی چہرہ کے بجائے کسی اور چیز میں منتقل فرمادے۔ چنانچہ پھر وہ روشنی ان کے کوڑے کے سرے پر چمکتی تھی اور اتنی تیز تھی کہ اندھیری رات میں قندیل کی طرح نظر آتی تھی، اسی لئے ان کو

ذو النور (نور والا) کہا جاتا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کثیر الروایۃ صحابی اور اصحاب صفہ میں سے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی یمن کے قبیلۂ دوس سے ہے۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ کی دعوت اسلام پر ایمان قبول کیا اور ۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایسے آئے کہ مدینہ ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ہمہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر رہتے۔ سفر، حضر میں آپ کے ساتھ رہتے اور آپ کے ارشادات کو سنتے اور محفوظ کرتے رہتے کبھی کبھی وقت کا فاقہ گذر جاتا، سب کچھ برداشت تھا مگر دربار نبوت سے غیر حاضری گوارا نہ تھی۔ اسی لئے دوسرے صحابہ کی بہ نسبت انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث زیادہ یاد تھیں۔

ملا علی قاریؒ نے ان کی روایات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چونسٹھ بیان کی ہے۔ مستدرک حاکم میں روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت زید بن ثابتؓ سے (جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی اور سب سے پہلے جامع قرآن ہیں) کوئی بات دریافت کی انھوں نے فرمایا کہ ابوہریرہؓ سے دریافت کرو، اس لئے کہ ایک روز میں اور ابوہریرہ اور فلاں شخص (جن کا انھوں نے تو نام لیا مگر راوی نے اس کو ذکر نہیں کیا) ہم تینوں مسجد نبویؐ میں بیٹھے دعا مانگ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ادھر تشریف لے آئے اور آپ نے ہماری دعا پر آمین فرمایا اس کے بعد ابوہریرہؓ تنہا دعا مانگنے لگے اور انھوں نے یہ دعا مانگی: اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ مِثْلَ مَا سَئَلَکَ صَاحِبَایَ وَاَسْئَلُکَ عِلْمًا لَا یُنْسٰی (اے اللہ میں آپ سے وہ چیز مانگتا ہوں جو میرے دونوں ساتھیوں نے مانگی ہے اور ایسا علم مانگتا ہوں جو فراموش نہ ہو)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دعا پر بھی آمین فرمائی۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم بھی اللہ سے ایسے علم کی دعا کرتے ہیں جو فراموش نہ ہو (جیسا کہ ابوہریرہؓ نے کی تھی) تو آپ نے فرمایا: سبقکما بھا الدوسی (اس دعا میں دوسی (ابوہریرہؓ) تم سے سبقت لے گیا۔

چنانچہ ابوہریرہ رضؓ جو کچھ حضورؐ سے سنتے وہ سب ان کو محفوظ رہتا صحابہ میں یہ قوی الحفظ
شمار ہوتے تھے۔ روایات حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ ان ہی کے ذریعہ امت کو ملا ہے۔ امام بخاری
کے قول کے مطابق آٹھ سو سے زیادہ صحابہ اور تابعین نے ان سے روایت حدیث نقل کی ہے
ایک دوسری روایت میں ہے کہ شروع میں حضرت ابوہریرہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے
حافظ کی کمزوری کی شکایت کی آپنے فرمایا کہ اپنی چادر بچھاؤ۔ انھوں نے اپنی چادر پھیلا دی۔
حضور ص نے کچھ کلمات پڑھے اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ایک چلّو پانی لے کر اس چادر پر
چھینٹے مارے اور فرمایا کہ اس چادر کو اپنے سینے سے لگا لو۔ ابوہریرہ نے اس کو سمیٹ کر اپنے
سینے سے لگالیا۔ یہ فرماتے ہیں کہ اس روز کے بعد سے میرا حافظہ اتنا قوی اور مضبوط
ہو گیا کہ میں جو کچھ سنتا یاد رہتا۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی کوئی بات
مجھے نہیں بھولی۔

حضرت ابوھریرہؓ کی والدہ کے لئے دعا حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں خود اسلام
لانے کے بعد اپنی والدہ کو بھی اسلام کی ترغیب دیتا رہا مگر وہ ہمیشہ انکار کرتی رہیں میں نے
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کے اسلام کے لئے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے ان کے لئے
دعا فرمائی۔ اَللّٰھُمَّ اِھْدِ اُمَّ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (اے اللہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت فرما)
میں جب گھر واپس گیا تو میری والدہ مجھے دیکھتے ہی بلند آواز سے کلمہ پڑھنے لگیں اَشْھَدُ
اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضر ہوا اور خوشی کی وجہ سے اسی طرح رو رہا تھا جیسے پہلے غم کی وجہ سے رویا کرتا تھا
میں نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالےٰ نے آپکی دعا قبول فرمالی اور میری ماں اسلام
لے آئی۔ اب آپ یہ بھی دعا فرما دیجئے کہ میری اور میری ماں کی محبت اللہ تعالےٰ اپنے مومن
بندوں کے دلوں میں پیدا فرما دیں اور مومنین کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا کردیں۔ آپنے
ان کو یہ دعا دی: اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ عُبَیْدَکَ ھٰذَا وَاُمَّہٗ اِلٰی عِبَادِکَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَحَبِّبْھُمْ اِلَیْھِمَا (مسلم)
اے اللہ اپنے اس ناتواں بندہ کو اور اس کی ماں کو اپنے مومن بندوں کا محبوب بنانے اور ان کو ان دونوں
کا محبوب بنا دے۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ آپکی اس دعا کی برکت یہ ہے کہ روئے زمین کے تمام مومن مرد
اور عورت مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ (بشکریہ "البلاغ" کراچی)

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانویؒ کی محفلِ ارشاد

اب سے چند سال پہلے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ارشادات و ملفوظات کی تلخیص کا کام الفرقان کی چند اقساط میں پیش کر چکا ہوں۔ شروع میں اس کام کا باعث مولانا ظہور الحسن صاحب مرحوم ناظم ادارہ "تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ہوئے تھے جنھوں نے مجھے اور میرے رفیقِ سفر کو "افاضات یومیہ" کی چار جلدیں ہدیۃً عنایت فرمائی تھیں۔ کام شروع ہونے کے بعد انھوں نے ملفوظات کے چند اور مجموعے بھی ڈاک سے روانہ فرمائے تھے۔ اب دوبارہ اس کام کو شروع کر رہا ہوں تو اس کا سبب بھی مولانا موصوف کی ذات بابرکات ہوئی ہے۔ میں رمضان ۱۳۹۷ھ میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون حاضر ہو کر ایک رات قیام پذیر ہوا تو مولانا مرحوم نے ازراہ کرم چلتے وقت "حسن العزیز" کی چار جلدیں مرحمت فرمائیں۔ ان میں سے تین جلدوں کو میں نے سن لیا ہے[1] اور قابل یادداشت ملفوظات پر نشانات بھی لگوائے ہیں —— بعد کو قلب میں داعیہ پیدا ہوا کہ ان علم و حکمت کے موتیوں کو صفحات الفرقان کے سپرد کر دینا چاہئے۔ ایک جلد سننے سے رہ گئی ہے اس کا انتخاب بھی کر لیا جائے گا۔ حضرت مولانا تھانویؒ کے ملفوظات میں جو روح پروری اور دل نشینی ہے وہ طالبانِ حق اور اربابِ ذوق سے پوشیدہ نہیں ہے، مگر ضرورت

---

[1] ہمارے مولانا فریدی کئی سال سے آنکھوں سے بالکل معذور عدیم البصر ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے —— دوسروں سے پڑھوا کر سنتے ہیں یہ ان کا مطالعہ ہے اور خود بول کر اور بتلا کر دوسروں سے لکھواتے ہیں یہ ان کی تصنیف و تالیف ہے۔ والحمد للہ علی کل حال (نعمانی)

تھی کہ ان حکمت آمیز اور معنی خیز ارشادات کو خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ اس کا افادہ عام ہو ۔۔۔ میں نے تلخیص میں ایسی معمولی حذف و ترمیم کو روا رکھا ہے کہ جس سے مطلب و مقصد پر کوئی اثر نہ پڑنے پائے ۔ بعض جگہ کاتب کی غلطی کو محسوس کر کے اس کا ازالہ کیا گیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس تلخیص و انتخاب کو بھی اصل کی طرح مقبول و مفید فرمائے آمین !

حضرت مولانا نعمانی دامت برکاتہم کے مکتوب گرامی کے اس جملے نے بھی میری ہمت افزائی کی کہ "حسن العزیز" کی تلخیص انشاء اللہ ناظرین کے لئے اور خود مجھ جیسوں کے لئے مفید رہے گی ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ نسیم احمد فریدی عفی عنہ

حضرت گنگوہیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ، اللہ اکبر ! بڑا وقار تھا اور بہت کم گو تھے ۔ اگرچہ عام طور سے جو لوگ کم گو ہوتے ہیں ، ان کا کلام بہت مختصر اور مبہم ہوتا ہے ، لیکن مولانا باوجود اس قدر کم گو ہونے کے جس وقت گفتگو فرماتے تھے تو نہایت صاف اور بلند آواز سے اور نہایت کافی شافی تقریر ہوتی تھی ۔ حضرت مولانا کو حق تعالیٰ نے ہر پہلو سے کامل پیدا فرمایا تھا ۔ میں نے کوئی شخص ایسے عادات و صفات کا نہیں دیکھا ۔

ایک صاحب کسی کا دستی استفتار لائے ۔ فرمایا کہ دو پیسے کا ٹکٹ خرید کر اور پتہ لکھ کر رکھ جائیں میں بعد کو اطمینان سے لکھ کر ڈاک سے بھیج دوں گا ۔ اس وقت جلدی میں نہ معلوم کیا سے کیا لکھ جاؤں ۔ پھر فرمایا کہ لوگ بھی غضب کرتے ہیں ، کبھی ایسا نہ کیا کہ کسی جانے والے کے ہاتھ لکھ کر کسی حاکم کے نام درخواست دے دی ہو کہ بھائی اس کا جواب لیتے آئیو ! کیوں کہ یہ تو ضابطہ کے خلاف ہے ، اور دین کے لئے کسی ضابطے کی بھی ضرورت نہیں ۔۔۔ مسئلوں کا نازک معاملہ ہوتا ہے ۔ کبھی کوئی کتاب دیکھنی ہوتی ہے اس میں تلاش کرنا ہوتا ہے ۔ کبھی غور کی ضرورت ہوتی ہے ۔۔۔ ادھر خط لانے والے کا تقاضا ہوتا ہے ، جلدی میں کوئی غلطی رہ جائے یا نظر چوک جائے ۔ چنانچہ ایک شخص دستی استفتار فرائض کا لائے ۔ میں نے جواب لکھ دیا ۔ جب وہ چلا گیا تب خیال آیا کہ جواب میں غلطی ہو گئی ۔ چونکہ اس شخص سے کچھ پتہ نشان دریافت نہ کیا تھا ۔ اس لئے سخت پریشان ہوا کہ نہ معلوم اس غلطی کا کہاں کہاں اثر پھیلے گا اور نہ معلوم

کس کس کے حقوق ضائع ہوں گے۔ نہایت حیران تھا، کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ آخر حق تعالیٰ سے دل میں دعا کی کہ اب میرے اختیار سے تو خارج ہو گیا آپ چاہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں کوئی آدھ گھنٹے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شخص چلا آ رہا ہے۔ کہا کہ مولوی صاحب میں تو بہت دور نکل گیا تھا۔ وہاں جا کر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ آپ نے اس فتوے پر مہر تو لگائی ہی نہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ ہاں بھائی ہاں لاؤ مہر تو میں لگایا نہیں کرتا۔ وہ تو حق تعالیٰ نے میری دعا قبول کی جو تم کو واپس بھیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے یہ جواب جلدی میں غلط لکھ دیا تھا۔ پھر اس کو صحیح جواب لکھ کر حوالے کیا اور عزم کر لیا کہ اب آئندہ کبھی دستی فتوے کا جواب ہاتھ کے ہاتھ لکھ کر نہ دوں گا۔

فرمایا کہ بعضے استاذ بچوں کو بہت مارتے ہیں۔ بعضوں کا فہم قدرتاً کم ہوتا ہے۔ لہٰذا اُن کو مارنا پیٹنا زیادتی ہے۔ بچوں کو جو زیادہ مارتے پیٹتے ہیں ان سے مواخذہ ہوگا۔ غصے میں اگر میرے ہوش بجا رہتے ہیں (اور الحمد للہ کہ رہتے ہیں) تو میں رسّی سے مارتا ہوں، رسّی میں خطرہ ہڈی وغیرہ کے ٹوٹنے کا نہیں ہوتا۔ اعتدال سے مارنا پیٹنا چاہئے۔ مجھے بچوں کے پیٹنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

فرمایا کہ دو چیزیں اہل علم کے واسطے بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہیں۔ حرص اور کبر یہ ان میں نہیں ہونا چاہئے۔

فرمایا کہ والد صاحب نے بہت شفقت کے ساتھ رکھا۔ بڑے منتظم تھے، اس کا بہت اہتمام تھا کہ تعلیم ہو تربیت ہو۔ عاقلانہ محبت تھی۔ مدتوں میرٹھ میں رہنا ہوا۔ رمضان شریف کے زمانہ میں ختم میں کہیں نہیں جانے دیتے تھے کہ اس سے نیت خراب ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی اس قدر رعایت کرتے تھے کہ بازار سے مٹھائی منگاتے تھے اور کہتے تھے کہ مٹھائی کے لئے وہاں جاتے ہیں تو ہم اس سے زیادہ تمھیں کھلائے دیتے ہیں لیکن مٹھائی کی لالچ میں جانا ہمیں بُرا معلوم ہوتا ہے، اس کا اثر اب تک یہ ہے کہ کسی سے کوئی چیز لیتے ہوئے غیرت آتی ہے۔ ہر جگہ دعوت میں ذلت سی معلوم ہوتی ہے بجز بے تکلفی کی جگہ کے ــــ اور طالب علموں کو تو کسی دعوت میں بھیجنا پسند ہی نہیں کرتا۔

جب ہم پیٹتے تھے تو روٹھتے تھے۔ ہمارا خفا ہونا یہی تھا کہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کھانے کو کہتے تو یہ کہہ دیتے کہ بھوک نہیں لگی۔ والد صاحب فرماتے کہ چونکہ ہم نے تم کو مارا تھا اس لئے بھوک نہیں لگی اچھا صندوقچہ لاؤ، ایک روپیہ نکال کر دیتے، پھر ہم کھانا کھا لیتے۔ فرماتے کہ اب کیسے بھوک لگ گئی؟

ادنیٰ ادنیٰ بات پر روک ٹوک کرتے تھے۔ ایک دفعہ عید کے واسطے انگرکھے سلے ذرا تکلف کے تھے پیک وغیرہ لگی ہوئی تھی، بچے تو تھے ہی عید سے ایک دن پہلے کا قصہ ہے۔ درزی سے تقاضا کر کے انگرکھا سلوایا۔ عصر کے بعد ملا۔ میں دوڑا ہوا خوش خوش یہ کہتا ہوا آرہا تھا کہ ابا جی! کل پہنیں گے والد صاحب وہاں بیٹھے ہوئے سواک کر رہے تھے، اٹھ کر ایک چپت لگایا کہ بڑے نالائق ہو۔ کوئی سنے تو یوں سمجھے کہ ان کو کبھی کپڑا پہننے کو نہیں ملا جو ایسے خوش ہو رہے ہیں۔

ان کی باتیں گو ذرا ذرا سی تھیں لیکن دل میں گھس گئیں وہی تو زمانہ تربیت کا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، میرے ساتھ تو ایسا احسان کیا کہ چار حروف دین کے پڑھا دیئے اگر چار گاؤں چھوڑ جاتے تب بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ تھا دیسے دنیادار کہلاتے تھے، اکثر دنیا دار علم دین کو حقیر رکھتے ہیں مگر والد صاحب مجھے بھائی پر ہر بات میں مقدم رکھتے تھے۔ ایک دفعہ تائی نے کہیں کہہ دیا کہ چھوٹے بیٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو کما کھائے گا۔ بڑا بیٹا کہاں سے کھائے گا، یہ سن کر والد صاحب کا منھ سرخ ہو گیا۔ غصہ ہو کر کہا کہ بھابی تم نے اس وقت مجھ کو بہت پریشان کیا میں قسم کھا کر کہتا ہوں روپے اس کی جوتیوں سے لگے رہیں گے اور یہ ان کی طرف منھ بھی نہ کرے گا۔ اگر کوئی درویش یہ بات کہتا تو کرامت سمجھی جاتی لیکن وہ دنیا دار آدمی تھے۔

میری شادی میں ایک شخص سے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا بڑا خوش قسمت ہے ہمیشہ فراغت و آرام میں رہے گا۔ جب سے پیدا ہوا ہے بسم اللہ سے لے کر شادی تک میں نے اس کے کاموں میں بہت ہی روپیہ صرف کیا ہے۔ دیکھئے ان کی خوش فہمی کہ انھوں نے کبھی میرے لئے یہ فکر نہیں کی کہ اس کے لئے معاش کی کیا صورت ہو گی۔

جب ہم لوگ پاجامہ بھی نہیں پہنتے تھے تب ہی سے انھوں نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ اس کو انگریزی پڑھائیں گے، اس کو عربی خدا نے ان کو پہچان ایسی دی تھی طبیعتوں کے انداز کی۔ یہ بڑی دانشمندی کی بات ہے۔

ایک بادشاہ نے اپنے دو غلاموں کو تعلیم دینا چاہا، ایک کو تیر اندازی کی، ایک کو خوشنویسی کی مگر دونوں میں ناکامی ہوئی - ایک ماہر سے مشورہ لیا کہ کس کو کون سی تعلیم دی جائے وہ ان دونوں کی طبیعتوں کے انداز سے پہچان گیا کہ خلاف تجویز بادشاہ کے اس کو تو تیر اندازی سے مناسبت ہے اور اس کو خوشنویسی سے ---- چنانچہ اسی طرح تعلیم دی گئی، دونوں اپنے اپنے فن میں کامل ہو گئے -

---

فرمایا کہ امیر غریب کی مہمانی میں کچھ تفاوت ہونا ضروری ہے لیکن پھر بھی یہاں امیروں کی اپنی حیثیت سے بہت کم خاطر کی جاتی ہے - اس سے غریب تو سمجھتے ہیں کہ یہ امیروں کی بڑی خاطر کرتا ہے اور بعضے امیر سمجھتے ہیں کہ ہماری کچھ بھی خاطر نہیں ہوئی - غرض دونوں طرف سے محل شکایت ہی بننا پڑتا ہے -

---

استفسار پر فرمایا کہ ذاکر شاغل کو تعویذوں کا استعمال جائز تو ہے لیکن توکّل کے خلاف ہے - حدیث شریف میں ہے "لا یسترقون وعلیٰ ربھم یتوکلون" اس میں اثر کدورت کا زیادہ ہے - دوا کے اندر نہیں - بات یہ ہے کہ دوا کو دنیا سمجھتے ہیں تعویذ کو دین - پھر دوا سے زیادہ تعویذ پر اتکال (بھروسہ) ہوتا ہے - لوگ تعویذ لکھواتے ہیں لکھ دیتا ہوں مگر میرا جی نہیں چاہتا اور یوں لکھنے کو لکھ دیتا ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے بہت ہی تکلیف پہنچائی ہو ---- لکھنے میں ہاتھ تو آگے کو چلتا ہے قلب پیچھے کو ہٹتا ہے - بڑی کشاکشی سے تعویذ لکھتا ہوں دل جوئی کے لئے لکھ دیتا ہوں ---- ہنس کر فرمایا اور جہاں دل شوئی ہوتی ہے وہاں صاف انکار، ایک صاحب نے عرض کیا کہ خاص تعویذ ہی کی درخواست نہ کرے بلکہ اختیار دے دے کہ چاہے تعویذ لکھ دیجئے چاہے دعا کر دیجئے -

فرمایا کہ جب ایک شخص کا مذاق معلوم ہو گیا کہ فلاں چیز اچھی نہیں لگتی پھر یہ کیوں کہے کہ اگر اچھی لگے تو کھا لو، یہ خیال ہی کیوں کرے کہ اس کو اچھی لگے گی - یہ بھی ایک رسم ہو گئی ہے آج کل اکثر چندہ میں بھی فہرست پیش کر کے لکھ دیتے ہیں کہ اگر گراں نہ ہو تو دے دیجئے - کون سا

ایسا شریف ہے جو کہہ دے گا کہ صاحب مجھے گراں ہے، کوئی شاذونادر ہوگا ایسا جو کہدے، تو میں ایک دو — پھر فرمایا کہ موٹی بات ہے جس سے دین کا علاقہ ہو اس سے دنیا کا کام لیناہی نہیں چاہئے۔ عرض کیا گیا کہ کیا حاجات کے لئے وظیفے پوچھنا بھی "عمل" ہے۔ فرمایا کہ جی ہاں وظیفے بھی "عمل" ہیں۔ بس دعا کے لئے کہے اور خود بھی دعا کرنا چاہئے۔ وہ اگر خود کچھ پڑھنے کو بتلادیں تو اس کو پڑھ لیا کریں۔

پھر فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب کے ایک خادم تھے جو شیعی سے سُنّی ہو گئے تھے انھوں نے اپنا خواب حضرت حاجی صاحب سے بیان کیا کہ گویا میں مسجد میں قضائے حاجت کر رہا ہوں فرمایا کہ تم کوئی "عمل" دنیا کے لئے مسجد میں بیٹھ کر کرتے ہو، اس سے مسجد ملوث ہوتی ہے۔ (جاری)

مولانا محمد عارف سنبھلی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

میرا مطالعہ

(۲)

یہاں تک تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے متعلق مودودی صاحب کے حوالوں کے غلط ہونے اور غلطی پر مطلع ہو جانے کے باوجود اس کا اعتراف اور اس سے رجوع نہ کرنے کی بات ہوئی ۔۔۔ لیکن اس معاملہ کا روایت کے علاوہ ایک "درایتی" پہلو بھی ہے۔ جسکو معمولی سے معمولی عقل و فہم رکھنے والا عام آدمی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

فرض کیجئے مودودی صاحب کو تاریخ کی کتابوں میں ایسی کوئی روایت نظر پڑی ہوتی جس میں ذکر کیا گیا ہوتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بر سرِ منبر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ "پر گالیوں کی بوچھاڑ" کرتے تھے۔ تب بھی اُن کو اس کے نقل کرنے اور اپنی کتاب (خلافت و ملوکیت) میں درج کرنے اور اس کی بنا پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر فردِ جرم لگانے سے پہلے اُنہیں اس "درایت" سے کام لینا چاہیئے تھا جس کو وہ صحاح کی حدیثوں کے معاملہ میں بھی استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں ۔۔۔ مودودی صاحب یہ بات ضرور جانتے ہوں گے کہ حضرت معاویہ کا حلم، ان کا تدبّر، ان کی سیاسی بصیرت تاریخ اسلام کے مشہور مسلّمات میں سے ہیں۔ خاص کر اُن کا حلم تو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکا ہے ۔۔۔ تو مولانا کو سوچنا چاہیئے تھا کہ جس

حکمراں میں حلم و تدبّر اور سیاسی بصیرت کی صفات اعلیٰ درجہ میں موجود ہوں، وہ ایسی احمقانہ حرکت کیسے کر سکتا ہے کہ برسر منبر اپنے سیاسی حریف کو گالیاں دے اور حریف بھی کون، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچازاد بھائی اور عزیز داماد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ — ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی وفات پر نصف صدی بھی نہیں گزری تھی حضرت معاویہ حضرت علی پر برسر منبر گالیوں کی بوچھاڑ اسی وقت کر سکتے تھے جب انھوں نے اپنے حق میں سیاسی خودکشی کا فیصلہ کر لیا ہوتا۔

اس کے علاوہ اور اس سے زیادہ اہم سوچنے کی دوسری بات یہ تھی کہ جس مجمع کے سامنے برسرِ منبر گالیاں دینے کی یہ بات مودودی صاحب لکھ رہے ہیں وہ (مودودی صاحب کی خاص زبان میں) آج کے "نسلی مسلمانوں" کا مجمع نہیں تھا، یہ صحابہ کرام، اہل بیت اور تابعین کا مجمع تھا، کیا یہ سب ایسے بے ضمیر، بزدل اور ایمانی غیرت سے خالی ہو گئے تھے کہ ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچازاد بھائی، آپ کے قوتِ بازو اور عزیز و محبوب داماد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو برسرِ منبر گالیاں دی جاتی تھیں بلکہ گالیوں کی بوچھاڑ کی جاتی تھی اور وہ سب خاموشی سے سنتے تھے۔ کیا قرنِ اوّل کے یہ مسلمان، ہندوستان و پاکستان کے عام جاہل مسلمانوں سے بھی گئے گزرے تھے۔ یہ ایسی کھلی موٹی بات ہے جس کو ہر معمولی سی عقل رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن مودودی صاحب نے اس طرف توجہ فرمانے کی بالکل ضرورت نہ سمجھی۔

درایت اور عقل عام کی یہ بات تو اس مفروضہ کی بنا پر عرض کی گئی کہ اگر تاریخ کی کسی کتاب میں ایسی کوئی روایت ہوتی تو عقل و درایت کے اس فیصلہ کی بنا پر وہ قابل ردّ ہوتی، مگر ہم عرض کر چکے کہ جو سنگین تہمت مودودی صاحب نے حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ پر لگائی ہے تاریخ کی کتابوں میں اس کا کہیں وجود نہیں اور جو پانچ حوالے مودودی صاحب نے دیئے ہیں وہ سب غلط اور فرضی ہیں۔

مولانا مودودی کی دوسری مزاجی خصوصیت

مولانا مودودی صاحب کی ایک دوسری خصوصیت ان کی تحریروں اور بیانات کا

تضاد و تناقض ہے. ناظرین کرام اس کی بھی صرف ایک مثال ملاحظہ فرمالیں:

حضرت سید احمد شہید رح کے جہاد اور ان کی قائم کی ہوئی اسلامی حکومت کا نقشہ کھینچتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں اور کیسے جوش وجذبہ سے لکھتے ہیں:

"انھوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا، اور جہاں جہاں اُن کے اثرات پہنچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابۂ کرام کے دور کی یاد تازہ ہوگئی"۔ (تجدید واحیائے دین صفحہ)

"... اُن کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظامِ حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے"۔ (تجدید واحیائے دین صفحہ ۱۔)

"... اُن کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا اس میں انھوں نے ٹھیک اس طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے؛ وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل وانصاف، وہی حدودِ شرعیہ .... وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاقِ صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا۔ غرض ہر پہلو سے انھوں نے اس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کردیا جو کبھی صدیق رضہ وفاروق رضہ نے کی تھی"۔

(تجدید صفحہ ۱۔)

یہ کارنامے ہیں حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ، اور ان کے پاکباز رفقاء کے، جن کی تصویر مولانا مودودی کے قلم نے اس طرح کھینچی ہے کہ کوئی دوسرا صاحبِ قلم اس سے بہتر سچی، اور اچھی تصویر غالباً نہیں کھینچ سکتا۔

ہر واقف کار جانتا ہے کہ حضرت سید الشہید رح ایک بہت بڑے صوفی اور سلسلۂ بیعت وارشاد اور تصوف کی لائن کے بہت بڑے امام تھے جن کے ارادتمندوں میں حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رح اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب شہید رح جیسی ہستیاں بھی شامل تھیں۔ اقامتِ حکومت اسلامیہ کے

سلسلہ میں ان کے یہ سنہری کارنامے ہیں جن کو مودودی صاحب نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر فاروق اعظم رضؓ کے کارناموں سے تشبیہ دی ہے. لیکن دوسری جگہ جب وہ تصوف اور اہل تصوف کی بے مقصدی کی لاحاصلی اور بے ثمری کا نقشہ کھینچنے پر آئے تو تحریر فرمایا:

"ایک موڑ آتا ہے جہاں آدمی کے دل میں بار بار یہ خیال چٹکیاں لیتا ہے کہ اس کام کے لئے بہرحال تزکیۂ نفس ضروری ہے اور تزکیۂ نفس کے وہ طریقے جو مکّے اور مدینے میں اختیار کئے گئے تھے کچھ واضح اور منضبط نہیں ہیں اور بعد کے ادوار میں جن بزرگوں نے ان طریقوں کو منضبط کیا وہ صوفیائے کرام ہیں"........

لہٰذا اس کام کے لئے جو تزکیہ مطلوب ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے تصوف کے معروف طریقوں میں سے کسی کو اختیار کرنا ناگزیر ہے..................

......میں ان تمام لوگوں سے جو اس کشمکش کو محسوس کرتے ہیں، عرض کرتا ہوں کہ براہ کرم اس مقام پر ٹھہر کر خوب اچھی طرح غور و تحقیق کریں اور ذرا بے لاگ طریقے سے کریں. کیا واقعی کہیں صوفیانہ لٹریچر میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اقامت دین اپنے وسیع و جامع تصور کے ساتھ ان بزرگوں کے پیش نظر تھی جن سے یہ صوفیانہ طریقے ماثور ہیں؟ کیا کہیں اس بات کا پتہ نشان ملتا ہے کہ اس مقصد کے لئے کارکن تیار کرنے کی غرض سے انھوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا تھا؟ کیا ان طریقوں سے تیار کئے ہوئے آدمیوں نے کبھی یہ کام کیا؟ اور کیا یہ طریقے اس کام میں مفید ثابت ہوئے؟" (رسائل و مسائل جلد دوم صفحہ ۲-۶)

پہلی عبارت میں انہی اہل تصوف کے ایک گروہ کی جدوجہد کو خالص اسلامی جہاد اور ان کی قائم کی ہوئی حکومت کو نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اور حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم کے طرز کی حکومت ٹھہرایا گیا تھا اور اس دوسری عبارت میں سرے سے اس کا انکار ہے اور تحدی اور چیلنج کے ساتھ انکار ہے کہ اہل تصوف میں سے کسی نے کبھی حکومت اسلامی کو اپنا نصب العین بنایا ہو اور اس کے لئے جدوجہد کی ہو اور کبھی کوئی صالح نتیجہ بھی ان کی جدوجہد

کا اگر انھوں نے وہ کی ہو انکلا ہو۔

تحریک اقامت دین کا داعی اگر ایسی متضاد اور مبالغہ سے بھری ہوئی باتوں پر اُتر آئے، تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دین کو کتنا نقصان پہنچائے گا اور اس کے متبعین کا ذہن کیسا بنیگا مودودی صاحب کی تحریروں میں اس طرح کی تضاد بیانی، مبالغہ آرائی اور اکابر و اسلاف امت پر بے جا تنقید کی اتنی مثالیں مل سکتی ہیں جن کو اگر جمع کیا جائے تو ایک پوری کتاب تیار ہو جائے لیکن ہم نے یہ کام ابھی تک ضروری نہیں سمجھا — ان سطور میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مولانا کے معتقدین جو ان کے بارے میں سخت غلو میں مبتلا ہیں ہماری ان معروضات پر غور کر کے اس غلو کے مرض سے نجات پا سکیں اور خود مولانا موصوف اپنی تحریروں پر نظر ثانی کر کے اپنی غلطیوں کی اصلاح اور ان سے رجوع کر سکیں۔ وباللہ التوفیق۔

آسان حج

یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا خلاصہ
پاکٹ سائز —— بہترین طباعت ۱/۲۵

بوارق الغیب

اہل بدعت کے خانہ ساز مشرکانہ یا نیم مشرکانہ عقیدے "علم غیب نبوی" کی تردید میں مولانا محمد منظور نعمانی کی معرکۃ الآرا و محققانہ تصنیف — جس میں ۳۰ قرآنی آیتوں سے بریلوی مبتدعین کے اس عقیدے کا باطل اور خلاف قرآن ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

اس مسئلہ میں اس کتاب نے حق کی حجت تمام کر دی ہے
عمدہ کاغذ پر شاندار طباعت و حسین گردپوش کے ساتھ۔ قیمت مجلد ۱۰/-

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

ارشد القادری صاحب کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب۔ بریلوی دیوبندی اختلافات کے ماہرین اور ممتاز اہل علم نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ کتاب صرف "زلزلہ" کا جواب ہی نہیں بلکہ بریلوی فتنہ پر ضرب کاری ہے۔ ہر بحث قابل دید، بصیرت افروز اور باطل سوز ہے۔ بالخصوص مسئلہ علم غیب اور کائنات میں تصرف کے عقیدہ کی جو تنقیح کی گئی ہے وہ عوام اور اہل علم سب کے لئے اس کتاب کا خاص تحفہ ہے۔ اس کتاب نے "زلزلہ" کا خاتمہ کر دیا ہے۔ قیمت ..

فیصلہ کن مناظرہ

اکابر علماء دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب۔ کتاب کے مقدمہ میں بریلی کے اس تکفیری فتنہ کی حقیقت اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے نیز یہ بتلایا گیا ہے کہ اب اہل حق کو اس سے کیسے نمٹنا چاہئے۔ ۳/-

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات

حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر، جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے خون کا کفن پہنا، معاندین اہل بدعت نے خوف خدا سے بے نیاز ہو کر جو مکروہ الزامات لگائے ہیں ان کا تسلی بخش اور مدلل جواب۔ ۲/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ ۶/-

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز روزہ، زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان، ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۶/-

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

اسلام کے کلمۂ دعوت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی ایمان افروز تشریح۔ ۱/۲۵

نماز کی حقیقت

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اور اپنی نماز میں خشوع کی کیفیت پیدا کرنے کیلئے اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ ۲/۵۰

برکات رمضان

ماہ رمضان اور اسکے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت موثر اور شوق انگیز بیان۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسے عارفین و محققین کے طرز پر۔ ۲/-

آپ حج کیسے کریں؟

حج کے موضوع پر اردو میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی منفرد و ممتاز ہے کہ یہ بہت آسان اور دل نشیں انداز میں حج کا طریقہ اور احکام و مناسک بھی بتاتی ہے اور وہ ذوق و شوق بھی پیدا کرتی ہے جو حج و زیارت کی جان ہے۔ ۲/-

ناشر: **الفرقان بکڈپو، ۳۱ نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ**

Regd. No. 1 LW/NP-62

Monthly **AL FURQAN** 31, Naya Gaon West Lucknow (U. P.)

VOL. 47 NO. 7 JULY 1979 Phone : 45547

چندہ سالانہ
ہندوستان سے ۱۵/-
پاکستان سے ۳۰/-
بنگلادیش سے ۱۹/-
فی شمارہ ۱/۵۰

ممالک غیر چندہ سالانہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ کے بعد اب نئی شرح یہ ہے
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

جلد (۴۷) | بابت اگست ۱۹۷۹ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ | شمارہ (۸)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی پی روانہ ہو گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع اگلے مہینے کی ۵ تاریخ تک آجانا چاہیے اسکے بعد رسالہ کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ پچیس روپے ہندوستانی سکہ میں بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں تیس روپے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

گذشتہ شمارے میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس کے بعد اگست ستمبر کا مشترک شمارہ ان شاء اللہ ستمبر (شوال) میں شائع ہوگا بعد میں بعض وجوہ سے رائے بدل گئی، اب اگست کا یہ شمارہ ان شاء اللہ وقت پر شائع ہو جائے گا۔ اس کے بعد ستمبر اکتوبر (شوال ذیقعدہ) کا مشترک شمارہ ان شاء اللہ اکتوبر (وسط ذیقعدہ) تک شائع ہو سکے گا

ایک اور عظیم سانحہ

ہمارے اکثر ناظرین کو اخبارات وغیرہ کے ذریعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز فرزند اس کے اردو ترجمان "تعمیر حیات" کے ایڈیٹر اور "پیام انسانیت" کی دعوت اور اس طرح کے دوسرے میدانی کاموں میں مولانا علی میاں کے رفیق خاص اور دست راست مولوی اسحاق جلیس ندوی کے حادثہ رحلت کا علم ہو چکا ہوگا

صرف ۴ ہفتے پہلے ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان "البعث الاسلامی" کے رئیس التحریر مولانا علی میاں کے حقیقی اکلوتے بھتیجے و لخت جگر اور قوت بازو مولانا محمد میاں حسنی نے صرف ۴۴ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے سب اہل تعلق کو "الوداع" کہا تھا ابھی اس صدمہ کا زخم ہرا ہی تھا کہ بالکل اسی نوع کا یہ دوسرا انتہائی المناک سانحہ قضا و قدر کے فیصلہ کے مطابق ظہور میں آگیا۔ اسحاق جلیس صاحب کی عمر بھی اس وقت ۴۴ سال ہی تھی۔

اُن کی بعض غیر معمولی خصوصیات، اعلیٰ صلاحیتوں اور قوت عمل کے لحاظ سے ان کو نادرۂ روزگار کہا جاسکتا تھا، اور ان سے بڑی امیدیں تھیں ـــــ لیکن ـــ یفعل اللہ مایشاء و یحکم ما یرید،

ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا رب فعال لما یرید اور احکم الحاکمین ہونے کے ساتھ حکیم ورحیم اور ارحم الراحمین بھی ہے۔ یقیناً ایک وقت آئے گا جب ہم پر بھی منکشف ہو جائے گا کہ جن حادثات وسانحات کو ہم نے اپنی نادانی سے بے وقت سمجھا تھا اُن کے ظہور و وقوع کے لیے وہی مناسب ترین وقت تھا، وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

مرحوم کے والد بزرگوار صوبہ سرحد کے ایک معزز گھرانے کے پٹھان تھے اور فوج کے ایک مرکز میں امام اور دینی معلم کے منصب پر فائز تھے، اسی سلسلہ سے اُن کا قیام مہاراشٹر کے مشہور شہر احمد نگر میں رہا اور وہیں مرحوم کا نشو و نما ہوا، انھوں نے دینی عربی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں پائی۔ اب سے ٹھیک ۲۰ سال پہلے ۱۹۵۹ء میں فراغت حاصل کی، یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالعلوم کے سابق شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ کی وفات کے بعد درسِ حدیث کا کوئی بہتر انتظام ہونے تک کے لیے دارالعلوم میں حدیث کے ایک دو سبق پڑھانے کی ذمہ داری اس عاجز نے قبول کر لی تھی، اس وجہ سے مرحوم سے اچھی واقفیت اُن کی طالب علمی ہی کے زمانہ سے تھی، وہ اپنی جماعت میں بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہو گا کہ دارالعلوم کے تمام طلبہ میں فہم و فکر اور ذہانت و فعالیت میں منفرد اور وجاہت و خوش گفتاری کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے ـــــ اسی سال (۵۹ء) میں مولانا علی میاں کی زیر سیادت "مجلس تحقیقات ونشریات" قائم ہوئی۔ مولوی اسحاق جلیس صاحب کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے مولانا نے ان کو مجلس کا معاون سکریٹری مقرر کر دیا۔ اگرچہ عہدہ کے لحاظ سے وہ "معاون سکریٹری" تھے لیکن مجلس کا زیادہ کام وہی کرتے تھے، انھوں نے اپنی خداداد قابلیت اور محنت سے مجلس کو تھوڑے عرصہ میں بہت ترقی دی ـــــ کچھ عرصہ کے بعد خرابی صحت اور بعض ذاتی حالات سے مجبور ہو کر وہ وطن ـ (احمد نگر) چلے گئے، اور پھر مہاراشٹر ہی میں پونہ کے ایک کالج میں تدریسی ذمہ داری قبول کر لی۔ اسی دوران انھوں نے وہاں شعبۂ لائبریری سائنس میں اس فن کی تعلیم بھی حاصل کی، نیز انگریزی میں اچھی خاصی دسترس بھی حاصل کر لی؛ ـــــ اتفاق سے انہی ایام میں مولانا علی میاں کا اُدھر کا

مقرر ہوا، مولانا نے ان کو دارالعلوم آجانے کا حکم دیا اور دارالعلوم کے وسیع کتب خانہ کی جدید ترتیب وتہذیب کا کام اُن کے سپرد ہوا، کچھ دن بعد پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کی ادارت کی ذمہ داری بھی اُن کے حوالہ ہوئی، انھوں نے ان دونوں کاموں کو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے انجام دیا، "تعمیر حیات" کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اُس کی اشاعت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوگیا۔

وہ جس درجہ کے صاحب قلم تھے اسی درجہ کے خطیب اور مقرر بھی تھے، خاصکر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مخلوط اجتماعات اور خالص غیر مسلم مجمعوں میں وہ جس طرح اصلاحی ودعوتی تقریر کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنی تقریر میں حسب موقع ہندی اور انگریزی زبانوں کے استعمال پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ پشتو اور مرہٹی گویا ان کی مادری زبانیں تھیں۔

صاحب قلم اور خطیب ومقرر ہونے کے ساتھ مرحوم سحر خیز اور ذاکر شاغل بھی تھے ـــ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندہ میں یہ صفات جمع فرمادے بلاشبہ اُس پر اس کا خاص انعام واحسان ہے

وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون

مولانا علی میاں سے ان کو ارادت بلکہ کہنا چاہیے کہ فدائیت کا تعلق تھا، انھوں نے اپنے کو کلی طور پر مولانا کے سپرد کردیا تھا۔

لیکن اللہ کی مشیت کہ مولانا محمد میاں مرحوم کی طرح اُن کی بیماری اور انتقال کے وقت بھی مولانا علی میاں یہاں نہیں تھے، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس اعلیٰ کے مشاورتی جلسہ میں شرکت کے لیے مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے ـــ یہ جلسہ ۲۰ر جولائی سے ہونے والا تھا، مولانا یہاں سے ۱۵ر جولائی کی شام کو روانہ ہوگئے تھے اور ۱۷ر کی صبح مدینہ منورہ پہنچنا تھا، ابھی وہاں پہنچے بھی نہیں تھے کہ مولوی اسحاق جلیس مرحوم کے پیٹ میں کچھ تکلیف شروع ہوئی اور جلد ہی اُس نے ایسی شدت اختیار کرلی کہ علاج کے لیے میڈیکل کالج میں داخل کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا ـــ

لیکن ـــ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" ـــ مسلسل یہی اطلاع ملتی رہی کہ حالت قابل اطمینان نہیں ہے ـــ ۱۸ر جولائی چہارشنبہ کی صبح یہ عاجز انھیں دیکھنے کے لیے میڈیکل کالج گیا، اُس وقت ان کے سانس کی کیفیت خطرہ کے قرب کا پتہ دے رہی تھی، لیکن ان کا

حال وہ تھا جو مرد مومن کا ہونا چاہیے — معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اپنے بارہ میں اندازہ ہے اور وہ سفر آخرت کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔

اسی دن عصر کے قریب ان کی روح نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور جسم سے مفارقت اختیار کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۰

جو احباب و مخلصین تیمارداری کے سلسلہ میں اُن کے پاس تھے انھوں نے بتلایا کہ سانس کی تکلیف کے باوجود مرحوم نے آخری وقت سے بہت پہلے سے ذکر تسلسل کے ساتھ شروع کر دیا تھا کلمۂ شہادت اور درود شریف مسلسل پڑھتے رہے، ان کے علاوہ بھی ذکر کے دوسرے کلمے زبان پر جاری رہے، بالکل آخری وقت میں باآواز درود شریف پڑھی اور کلمۂ شہادت ادا کیا جس کا آخری حصہ سنا بھی نہیں جا سکا — اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مُدْخَلَہٗ وتقبل حسناتہ وتجاوز عن سیئاتہ۔

انھوں نے خواہش ظاہر کی تھی اور وصیت کی تھی کہ ان کو مولانا علی میاں کے خاندانی قبرستان "تکیہ شاہ علم اللہ" میں دفن کیا جائے — ایسا ہی کیا گیا۔

دارالعلوم میں مرحوم کی نماز جنازہ پنجشنبہ کی صبح بعد نماز فجر پڑھی گئی اور اُسی وقت ایک خاص بس کے ذریعہ جنازہ تدفین کے لیے رائے بریلی روانہ ہو گیا، وہاں دوسری نماز جنازہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی دامت برکاتہم نے پڑھائی جن کو اللہ تعالیٰ نے بے سان و گمان ایک "لطیفہ غیبی" کے طور پر وقت سے پہلے "تکیہ شاہ علم اللہ" پہنچا دیا تھا۔ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ۰

پسماندگان میں مرحوم کی بیوہ اہلیہ، چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں — دو بڑے لڑکے دارالعلوم ہی کے درجۂ حفظ سے فراغت حاصل کر کے حافظ ہو چکے ہیں اور آگے دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اُن سے چھوٹے دونوں دارالعلوم ہی میں قرآن پاک حفظ کر رہے ہیں، ایک کا قریب الختم ہے اور دوسرے نے ابھی شروع کیا ہے، دو پارے ہو چکے ہیں۔

راقم الحروف کے نزدیک اس زمانہ میں کسی بندہ کا اپنے بچوں کو قرآن پاک حفظ کرانا اس کے کمال دینداری اور سچی خدا طلبی کی خاص الخاص علامت ہے۔ ظاہر ہے کہ حفظ میں بچہ کو

بڑی محنت کرنی پڑتی ہے، پھر اس کو یاد رکھنے کے لیے ساری عمر محنت اور وقت کا کچھ حصہ اس پر صرف کرنا پڑتا ہے۔ اور اس دنیا میں اس سے کسی منفعت کی امید نہیں کی جا سکتی نِس للہ فی اللہ قربانی ہی قربانی ہے ——— فی زمانا یہ خصوصیت صرف حفظ قرآن کی ہے ———

اس عاجز کو مرحوم کی زندگی میں اُن کی اس قربانی کا علم نہیں تھا، انتقال کے بعد جب بچوں کو دیکھا اور یہ تفصیل معلوم ہوئی تو اُن پر بڑا ہی رشک آیا اور دل نے کہا کہ انکے ربِ کریم کا ان پر خاص الخاص فضل تھا اور وہ ہمارے اندازوں سے زیادہ عظیم اور بلند تھے ———

اللہ تعالیٰ اُن کے اس عمل اور اولاد کی اس قربانی کو اپنی شانِ عالی کے مطابق قبول فرمائے، اُن کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے، درجات بلند فرمائے۔ اُن کے ان بچوں کو دین و دنیا کی بلندی نصیب فرمائے اور سب پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے ——— ناظرین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

مرحوم مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی

ترجمہ :ــــــ مولوی سید عبداللہ الحسنی

ایک عجیب وغریب تضاد ـــ جسکی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی

[الفرقان کے گذشتہ شمارہ میں نگاہ اولیں کے صفحات میں مرحوم مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی پر جو تعزیتی نوٹ شائع ہوا ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ ان کے اس معرکۃ الآرا افتتاحیہ کا ذکر تھا جو ماہ رجب کے البعث الاسلامی میں شائع ہوا تھا، ناچیز مدیر "الفرقان" نے لکھا تھا کہ "میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے "ندائے غیب" سمجھا اور طے کرلیا کہ اس کو اردو میں منتقل کرا کے "الفرقان" میں شائع کرنا ہے" میں نے ان سے اس کے ترجمہ کی فرمائش بھی کی اور انھوں نے وعدہ بھی کیا" لیکن ان کی ناگہانی موت نے اس کی مہلت نہ دی، اور وہ خود اس کا ترجمہ نہ کرسکے، جس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ کام میں نے ان کے ہونہار فرزند مولوی سید عبداللہ الحسنی کے سپرد کیا، خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے اس کو بڑے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا اور ترجمہ وانشا کی بڑی صلاحیت کا ثبوت دیا، یہ مضمون اس شمارہ میں شائع ہورہا ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور صلاحیتوں میں برکت عطا فرمائے اور وہ اپنے خاندان اور ملت کا نام روشن کریں ـــــــ مدیر]

آج اگر کوئی سوال کرے کہ امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ اور اسلامی انقلاب کی سب سے اہم

اور اول شرط کیا ہے ؟ تو ہم پورے اعتماد و یقین کے ساتھ بلا توقف کہیں گے کہ اس تضاد اور تناقض کو ختم کرنا جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں اور دائروں میں پایا جاتا ہے، اور جس نے ہماری حکومتوں، ہماری تنظیموں اور ہمارے دینی مراکز نیز ہمارے علماء و قائدین، ہمارے جوانوں و بوڑھوں، عوام و خواص حتیٰ کہ ہمارے وسائل و ذرائع سب کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا ہے اور اب گویا وہ تضاد و تناقض ہماری زندگی کا لازمہ اور ہماری طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، اس "تضاد" اور "دو عملی" نے ساری فکری و اجتماعی اور اصلاحی کوششوں کا دروازہ بند کر دیا ہے، اور ان کو لا حاصل و بے اثر بنا دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے متقابل و متضاد عناصر نے "بقائے باہم" کے عصری اور ترقی یافتہ اصول پر ایک دوسرے سے سمجھوتا کر لیا ہے، اور دونوں دوش بدوش زندگی گذار رہے ہیں، نہ ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے پروگراموں کا قرآن مجید کی تلاوت سے آغاز، عریاں ناچ، بے حیائی کے مناظر اور ہیجان انگیز گانوں سے نبرد آزما ہے، نہ یہ انتشار انگیز، ہیجان خیز پروگرام تلاوت سے الجھتے ہیں، نہ رقص و سرود کے ان پروگراموں کے آیات قرآنی کی تلاوت سے افتتاح کرنے میں لوگوں کو کوئی تضاد، بوالعجبی، بلکہ "ستم ظریفی" محسوس ہوتی ہے جو سراپا گوش اور محو دید افراد خاندان کے درمیان جن میں باپ بھی ہوتے ہیں اور بیٹے بھی، مائیں بھی ہوتی ہیں اور بیٹیاں بھی، کیف و طرب اور داد و تحسین کی ایک فضا پیدا کر دیتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان متضاد عناصر نے "ناجنگ معاہدہ" کر لیا ہے اور یہ بھی آیت قرآنی مرج البحرین یلتقیان ○ بینھما برزخ لا یبغیان[1] کی ایک تفسیر و تصویر ہے۔

پھر یہ دیکھ کر انتہائی رنج و افسوس ہوتا ہے کہ یہ تضاد ہمارے اس دور میں اپنی بدترین شکل میں ان ملکوں اور علاقوں میں زیادہ نمایاں ہے اور حد کو پار کر رہا ہے جو اسلام کے مقدس و مضبوط اور آہنی قلعے سمجھے جاتے تھے، اور جن سے مسلمانان عالم ہی کو نہیں بلکہ پورے عالم

---

[1] اس نے دو دریا رواں کیے جو آپس میں ملتے ہیں، دونوں میں ایک آڑ ہے کہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔
سورہ رحمٰن آیت ۱۹-۲۰

انسانیت کو اخلاق و کردار کی رہنمائی ملتی تھی اور جو توحید و سنت کے داعی و علمبردار اور شعائر اسلام کے محافظ و پاسباں تھے، میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس موقع پر خاص طور سے اس ملک اور اس حکومت کا نام لوں جس میں اس طرح کے تضاد کا وجود ضمیر و ایمان کے لیے سب سے زیادہ باعث تکلیف و آزمائش ہے، یہ وہی ملک ہے جس کا ہم مسلمانان عالم پر یہ احسان ہے کہ اسی کے طفیل ہم نے فرعونیت، فینقیت، آشوریت، برہمنیت، کسرویت اور قیصریت کی تاریکیوں سے نجات پائی، جس نے سب سے پہلے یہ نعرہ لگایا کہ

لا کنیسا ، لا سلاطین ، لا الٰہ

جس سے دنیا کو ایمان و توحید، اور عدل و مساوات کی دولت نصیب ہوئی، کون نہیں جانتا کہ مصر اپنے اس فرسودہ تمدن و مردہ تہذیب میں جس کی بنیاد ظلم و بربریت، طغیان و سرکشی اور انسانیت کی تذلیل پر تھی۔ اور جس کا خمیر کبر و انانیت پر اٹھا تھا، جس نے فرعون سے انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ لگوایا، اور جس نے اپنے ہی بنی نوع، بنی اسرائیل کی گردن میں طوق و سلاسل ڈال کر غلامی کے پھندوں میں جکڑ کر زندہ درگور کر دیا، اس مصر کو ایمان و یقین، توحید و سنت، خداشناسی و خودشناسی کی دولت جزیرۃ العرب ہی سے ملی تھی، اسی طرح عراق و شام فلسطین و ہندوستان اور پاکستان وغیرہ تمام ممالک اس بارے میں جزیرۃ العرب کے زیر بار احسان اور اس کے خوان کرم کے ریزہ چیں ہیں، سب کو ہدایت کا نور اور یقین کی کرن وہیں سے ملی۔

اب صورت یہ ہے کہ تمام مسلم و عرب ممالک میں یہ تضاد اپنی بدترین صورت اور ہولناک شکل میں موجود ہے لیکن جزیرۃ العرب اور گہوارۂ اسلام کا معاملہ سارے ملکوں سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہے، کیونکہ جو کچھ مصر و شام میں برداشت کیا جا سکتا ہے اس قطعۂ ارضی میں نہیں برداشت کیا جا سکتا، اور جو کچھ ہم لبنان میں دیکھ سکتے ہیں وہ مصر میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے کہ ہر ایک کی تاریخ الگ ہے اور ہر ایک کا منصب و مقام جدا، اسی طرح ہر ملک دوسرے ملک سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ جس شد و مد کے ساتھ اس مقدس سرزمین میں کتاب و

سنت کی دعوت دی جاتی اور جس بلند آہنگی اور جوش وخروش سے ہر موقعہ پر اسلام کا نام لیا جاتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے اس کا وظیفہ پڑھا جاتا ہے، وہ کسی اور ملک میں موجود نہیں، مجھے خوب یاد ہو کہ چند سال پہلے میں ایک مرتبہ سعودی ریڈیو سے ایک تقریر سن رہا تھا، تقریر نہایت جاندار، روح پرور اور ایمان افروز تھی، اور ریڈیو سے پہلی مرتبہ میں اس مقرر کو سن رہا تھا، فوراً میرا ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوا کہ ہو نہ ہو یہ ایک زبردست روحانی پیشوا اور بڑا دینی واعظ ہے، جو اسلام کی اس قدر حسین وجمیل تصویر اپنی تقریر میں پیش کر رہا ہے، جو دلوں کو کھینچ رہی ہے اور ذہنوں کو گرویدہ بنا رہی ہے، وہ اسی مملکت کے سربراہ تھے، اسی طرح مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے ایک وزیر مملکت اور شاہی خاندان کے ایک عالی مرتبہ فرد کی ایک گفتگو (TALK) سنی تھی، جو اول الذکر سے ان تمام صفات میں کسی طرح کم نہ تھی۔ آپ کانفرنسوں کے اس طویل وعریض سلسلہ کو چھوڑ دیں جو عالم اسلام پر بادلوں کی طرح چھایا ہوا ہے اور جو علماء ومشائخ کی اندرون وبیرون ملک میں آمد ورفت کا ذریعہ اور تمام دوسرے عربی ممالک سے (جن کے دروازے اسلام کے لیے بند ہیں) اسلامی عناصر کے ایک جگہ جمع ہو جانے کی تقریب بنتی رہتی ہیں، اب اگر کوئی اس موقف سے ذرا کبھی ٹکراتا ہے، اور اس صدا سے ذرا کبھی الجھتا ہے۔ جو مسجد کے منبر ومحراب اور تخت شاہی سے یکساں طور سے دی جا رہی ہے، تو قدرتی طور پر لوگوں کو اس سے استعجاب وحیرانی ہوتی ہے، ان دوسرے مسلم وعرب ملکوں کا یہ مسئلہ نہیں ہے جن کو یا تو اسلامی دعوت وتحریکات سے کوئی سروکار نہیں، یا وہ کھلے طور پر اور علانیہ اسلامی تعلیمات اور ان کے احیاء وترویج کی کوششوں سے برسرپیکار اور ہر وقت آمادۂ جنگ نظر آتے ہیں، اور ان کے خلاف سازش اور منصوبہ بندی میں مصروف رہتے ہیں، ان کی صورت حال واضح ہے۔

لیکن جب ہم اس مقدس ملک میں تضاد وتناقض کے حیرت انگیز مناظر دیکھتے ہیں ایک ایسے ملک کو جس نے دنیا کو زہد وایثار، سادگی وجفاکشی کا سبق دیا، تن آسانی عافیت کوشی، راحت طلبی، تن پروری بلکہ عیش پرستی کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں، اور وہ مغربی تہذیب کی لائی ہوئی بدعتوں بلکہ لعنتوں کا فریفتہ نظر آتا ہے، اور وہ ایسے

داخلی امراض میں مبتلا ہے جس سے پوری سوسائٹی، اور پورا معاشرہ بلکہ پورا اسلامی وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے، تو ہم سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں

انچہ می بینیم در بیداریست یارب یا بخواب؟

اے جزیرۃ العرب کے پاسبانو! اس کی نئی نسل کے سرپرستو اور نگہبانو! اے تاریخ نو کے معمار و! جب تک تم کو دین اسلام کی دعوت کا دعویٰ رہے گا، جب تک تم کتاب وسنت کے علمبردار بنے رہو گے، اور جب تک تم اسلام کو دستور حیات، نظام زندگی اور اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے رہو گے، دوسرے ممالک کے مقابلہ میں ہمارا احتساب تم سے سخت تر ہو گا، کیونکہ جس قدر اس میدان میں تمھاری دعوت و سرگرمیاں تیز رہیں گی اسی قدر ہمارا احتساب اور گرفت سخت ہو گی، ہم بار بار بغیر کسی حجاب اور جھجک کے کہتے رہیں گے کہ تمھارے قول اور فعل میں تضاد نہ ہونا چاہیے، شہر کی عام زندگی ہو یا گھروں کی خانگی زندگی، اس میں اور تمھارے اقوال میں کوئی تضاد، کوئی ٹکراؤ نہ ہونا چاہیے، سینما ہالوں، تھیٹروں اور ٹیلی ویژن میں جو چیزیں تمھارے نونہالوں اور جگر گوشوں کو دکھائی جاتی ہیں نہ وہ تمھارے اقوال کے برعکس ہوں نہ اسلامی اقدار کے مخالف۔

آج اسلام کی جس پرجوش طریقہ پر وکالت کی جارہی ہے اور جس اچھوتے انداز سے اسکی طرف دعوت دی جارہی ہے، اور بہ بانگ دہل جس طرح اسلام بلکہ توحید و کتاب وسنت کی طرف بلایا جارہا ہے ...... جس طرح اسلامی سرگرمیوں اور اسلامی تحریکات کی سرپرستی اور پشت پناہی کی جارہی ہے، جس فراخدلی اور فراخ دامانی سے اسلامی لٹریچر پھیلایا جارہا ہے، جس فیاضی و دریادلی سے وفود بھیجنے، قرآن مجید کے طبع کرانے پر، اور حفظ قرآن کے مدارس قائم کرنے پر دولت صرف کی جارہی ہے کیا یہ ہماری موجودہ عیش پرستانہ زندگی سے ہم آہنگ ہے؟ جو عقیدہ و عزم کو کمزور اور جسم وجان کو بے روح کردے، کیا یہ ہماری پرتعیش زندگی، بے قابو کردینے والے گانے، ہیجان پیدا کرنے والے پوسٹر اور تصویریں، ٹیلی ویژن و ریڈیو پر عریاں مظاہرے اور برہنگی و فواحش کو دعوت دینے والے مناظر ہمارے ان اقوال زریں سے میل کھاتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں! -ان میں پورا تضاد و تفاوت

پایا جاتا ہے ویسا ہی تضاد و تفاوت جو گلزار اور ترقی یافتہ شہر، اور پسماندہ دیہات میں ہوتا ہے، دولت کے جھولے میں جھولنے والے مالداروں اور ٹکڑے ٹکڑے کے محتاج فقیروں میں ہوتا ہے، ان اقوال میں اور اس زندگی میں مکمل تضاد پایا جاتا ہے، مغرب کی تقلید کی یہ امیرانہ زندگی، ہر طرح کے قیود اور پابندیوں سے گریزاں زندگی، عیش کی دلدادہ زندگی، لذتوں اور لہو ولعب کی شیدا زندگی (جس سے آپ حضرات خود بھی واقف ہیں اور محسوس کرتے ہیں) اس دعوت اور دعوے سے کوئی مطابقت بلکہ مناسبت نہیں رکھتی جس کے آپ حامل ہیں۔

آج جزیرۃ العرب میں دو دھارے بہہ رہے ہیں ایک اسلامی دھارا اور ایک سیکولر دھارا، یا پھر دوسری تعبیر میں یوں کہہ لیجیے ایک دھارا جس کی بنیاد عقائد و حقائق پر ہے، دوسرا دھارا جس کی بنیاد مغربی تہذیب و ترقیات کی پرستش پر، ایک دھارا منبر اور اسٹیج سے بہتا ہے اور کتابوں، مقالات، کانفرنسوں ومجلسوں، اور اخبارات ومجلات کی شکل میں گرتا ہے، دوسرے کا تعلق کارزارِ حیات، سوسائٹی کے قلب وجگر، تہذیب وتمدن کی گہرائیوں، انسان کے پسندیدہ مشغلہ وذوق (HOBBY) اور جذبات واحساسات سے ہے۔

جب کوئی شخص جمعہ کا خطبہ یا وعظ سنتا ہے تو اس کے ذہن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے یا وہ حضرت حسن بصری کی مجلس میں ان کی سحر بیانی سے انگشت بدنداں اور دم بخود اور دل کے کانوں سے ان کی باتوں کو قلب وجگر میں اتار رہا ہے، لیکن جب وہ ذرا آگے بڑھ کر کسی سینما ہال میں داخل ہوتا ہے، یا کسی قریب کی دکان پر فحش و عریاں لٹریچر کا مطالعہ کرتا ہے، یا پھر دوستوں واحباب کے ساتھ ان قصیٹرول میں آتا ہے جو خاص طور سے اسی لیے تیار کیے گئے ہیں یا کسی تجارتی مرکز سے گزرتا ہے اور آرائش وزیبائش کے سامان پر نظر پڑتی ہے "میک اپ" اور بناؤ سنگار کے طریقے اور آلات دیکھتا ہے یا پھر ان خلیجوں پر نظر جماتا ہے جو جنت ارضی کا سماں دکھا رہے ہیں اور پھولوں کا گل ان بنے ہوئے ہیں اور ان کے نوجوانوں میں حلت وحرمت سے لاپروائی وبے اعتنائی کا مشاہدہ کرتا ہے، نئے نئے فیشنوں کے پیچھے مرمٹنے والے نوجوانوں کا بغور مطالعہ کرتا ہے جو بغیر کسی عقل ودانش اور صبرو تحمل اور ضبط نفس اور قناعت کے اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگے چلے جارہے ہیں تو اسکو امریکہ

کے شہروں میں سے کسی شہر کا گمان سا ہونے لگتا ہے گویا وہ عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی تہذیب کے سایہ میں زندگی بسر کرتا ہے۔

میں نہیں کہتا ہوں کہ آپ اس "حمام" میں تنہا اور اکیلے ہیں، دوسرے ممالک میں مصر و لبنان میں اس سے کہیں زیادہ سخت، کہیں زیادہ مضر، کہیں زیادہ مہلک چیزیں پائی جاتی ہیں، لیکن دنیا کے نقشہ میں اے بلد امین تیرا جو مقام ہے وہ کسی کو حاصل نہیں، اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ جس کے آثار پاکستان و افغانستان اور ایران و ترکی (اور یہ سب عجمی ممالک ہیں) میں نمایاں ہو چلے ہیں، جو جگہ اور مرتبہ تجھکو حاصل ہے اس میں تیرا کوئی حریف نہیں، اس لحاظ سے واجب ہو جاتا ہے کہ تو انقلاب اسلامی اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے دروازے کھول دے، صرف کھول ہی نہ دے (یہ بڑا ظلم ہوگا اگر میں صرف اسی قدر تمنا رکھوں) بلکہ اب تجھکو خود آگے بڑھ کر اسکی قیادت کرنی چاہیے اور اس مبارک قافلہ کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لینی چاہیے ؎

جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لیکن یہ کام بغیر اس ثقافتی و تہذیبی تضاد کو دور کیے ممکن نہیں، اس تضاد کا دور کرنا اور اس کا ازالہ کرنا ان رکاوٹوں کے دور کرنے سے جو راستوں و سڑکوں کی تعمیر میں دیو پیکر پہاڑوں اور قوی ہیکل چٹانوں کی شکل میں آتی ہیں یا پل بنانے اور اسٹیشن کی تعمیر میں درپیش ہوتی ہیں زیادہ اہم ہے، نہ اس کے مقابلہ میں ان بوسیدہ عمارتوں اور کھنڈرات کی صفائی کا کوئی مسئلہ ہے جو عالی شان عمارتوں کی تعمیر اور نئے طرز کے ہوٹل کے قیام کے لیے ضروری ہے، مسئلہ صرف اس تضاد کے دور کرنے اور ختم کرنے کا ہے، یہ مبارک کوشش اس وقت تک نفع بخش و سودمند نہیں ہو سکتی، جب تک تیرے اندر امراء و حکام اور وہاں کے باشندوں اور فرزندوں میں ایسے لوگ موجود رہیں گے، جو قول و عمل کے تضاد اور اندر و باہر کے اختلاف کے مہلک اثرات سے ان کوششوں کو برباد و رائیگاں کرتے رہیں گے، اگر قول و عمل میں تطابق ہو اور اندر و باہر یکساں ہو جائے اور خون و آنسو کی آمیزش سے یہ سرزمین مبارک سیراب ہو جائے تو تھوڑی محنت وہ نتائج برآمد کر سکتی ہے جو وہم و گمان میں بھی نہ آسکتے تھے۔ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

اسلامی انقلاب اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو کبھی کسی چیز کی اتنی شدید ضرورت نہیں پڑی جتنی آج اس کو اس تضاد و تناقض کے ملبہ کو دور کرنے کی ہے، اور دونوں سطحوں سے دور کرنے کی ہے، حکومتی سطح سے بھی، اور قومی سطح سے بھی، یہی تشکیل اسلامی کی پہلی شرط ہے، جس کو انقلاب اسلامی سے بھی پہلے آنا چاہیے، کم ازکم اس کو انقلاب کے شانہ بشانہ چلنا چاہیے، ہماری امیدیں سعودی عرب اور جزیرۃ العرب سے تو یہ ہیں کہ وہ اس میدان میں قائدانہ کردار ادا کرے اور اس مبارک قافلہ کا (جس میں ایمانی روح بیدار ہو چلی ہے اور دین کی باد بہاری کے دلنواز جھونکے دنیا کے مشام جان کو معطر کرنے لگے ہیں) شریک سفر ہو۔ اور اس میں بھی اپنی اولیت و فوقیت ثابت کردے، اور پھر دوسرے ممالک یکے بعد دیگرے آگے بڑھ بڑھ کر اپنی حیثیت و کردار کے مطابق اس سے حصہ پائیں۔

زبان غیب پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

۱۔ یاایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ: البقرہ ۲۰۸	مومنو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔
۲۔ ومن احسن دینا ممن أسلم وجھہ للہ وھو محسن واتبع ملۃ ابراھیم حنیفا واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا: سورہ نساء ۱۲۵	اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے، اور ابراہیمؑ کے دین کا پیرو ہے جو یکسو (مسلمان تھے اور خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنایا تھا۔

زخموں سے چور، غموں سے نڈھال افغانستان چیخ چیخ کر آواز دے رہا ہے کہ اے جزیرۃ العرب کے شاہین و شہباز، اے نیستان عرب کے شیرو، آگے بڑھو!

آج پاکستان جو اندرونی و بیرونی (مغربی) دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے اور جس دلدل میں پھنسا ہوا ہے اس کا لاغر اور نڈھال جسم زبان حال سے فریاد کناں ہے کہ تمہارے دل و جان اسکی اعانت و فریاد رسانی میں فرش راہ ہوں، اور قول و عمل کی یکسانی و تطابق کے ساتھ ایک ہو کر اسکی پشت پناہی کی جائے، اس کو دلدل سے نکالا جائے اور دشمنوں کے نرغہ سے نجات

دلائی جائے۔ اے قائدین عرب! آج کا نوجوان منتظر ہے تمہاری فاتحانہ یلغار اور شوخیٔ کردار کا، اور اس سوزِ عشق کا جو اس "نا مرد" میں بے خطر کود پڑے، اس کو گل و گلزار بنا دے، جو جزیرۃ العرب کو خاکستر کرنے کے لیے بیتاب و بیقرار ہے اور اس کو دنیا کے نقشہ میں وہی مقام و مرتبہ حاصل ہو جو اسے کسی زمانہ میں حاصل تھا۔

لیکن اے جزیرۃ العرب، کیا یہ مقام و مرتبہ اس کھلے ہوئے تضاد و تناقص سے حاصل ہو سکتا ہے کیا آج تیرے امکان میں یہ ہے کہ دنیا کو مخاطب کر کے کہہ سکے، ؎

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

کیا آج بھی ممکن ہے کہ تو اپنے کو جان جوکھوں میں ڈال کر خطروں میں کود پڑے اور مصائب و آلام کے گھٹا ٹوپ بادلوں کے سایہ میں دوڑ جائے اور ہر اس آواز پر لبیک کہے جو اسلام کی حمایت اور دین کی حمیت کے لیے دی جائے اور مستانہ وار اس کے لیے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دے؟ حالانکہ تیرا حال یہ ہے کہ تجھے عشرت کدوں میں دادِ عیش دینے سے فرصت نہیں، غم و آلام کا تیرے پاس گزر نہیں، عمدہ و لذیذ کھانوں کو چھوڑنا گوارا نہیں، پر تکلف اور شاہانہ دعوتوں کو ترک کرنا قبول نہیں، بڑے بڑے ٹھیکوں، تجارتوں، جائدادوں اور کمپنیوں سے بے نیاز ہونا ممکن نہیں، نغمہ و ساز اور عود و بخور سے دوری ناقابلِ عمل، جنسِ نازک اور عقل ناقص کے تابع و غلام بنکر رہنا قابلِ قبول، اور اس پر علماء کا سکوت (الا ماشاء اللہ) یا صحیح تعبیر میں اونچی اونچی بلڈنگوں، بڑی بڑی تنخواہوں، عمدہ و نرم گدوں پر آرام کی عادت[1] ایسے متبدر وہ زجو ہر ذمہ داری اور الجھن سے دور، اور ہر پریشانی اور مصیبت سے آزاد ہیں، وفود کی آمد و رفت میں مشغولیت اور مسلسل اسفار نے کسی مردانہ و قلندرانہ کام کے لیے گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

کام صرف ایک کانفرنس سے دوسری کانفرنس، ایک مجلس سے دوسری مجلس، ایک موضوع سے دوسرے موضوع، ایک گفتگو سے دوسری گفتگو، ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل، انٹر کانٹیننٹل[2] سے مریڈیان اور مریڈیان سے لندن و سوئزرلینڈ، اور لبنان کے عشرت کدوں میں منتقل ہونا

---

[1] مکہ مکرمہ کے مضافات (حدود حرم) میں ایک شاندار مغربی طرز کا ہوٹل جو حال میں تعمیر ہوا ہے۔

[2] جدہ کا نو تعمیر مشہور ہوٹل جو شاہی کی تقریبات کے ساتھ مخصوص ہے، اور جس کا ایک شب کا کرایہ ناقابلِ قیاس حد تک بڑھا ہوا ہے۔

رہ گیا۔ تاکہ نہ غور و فکر کی فرصت ملے، اور نہ اپنی کمزوریوں پر نظر پڑے، نہ طرز معیشت بدلنے کی فکر ہو، اور نہ ان چیلنجوں کی طرف رخ ہو جو ہمارے دروازوں کو بڑی درشتی اور سختی سے کھٹکھٹا رہے ہیں، تم نے اپنے نونہالوں اور جگر گوشوں کو نئے نئے فیشنوں کا ایسا دلدادہ بنا دیا ہے کہ ان کو عمدہ عمدہ کھانے اور جدید سے جدید لباس کو زیب تن کرنے کے علاوہ کوئی فکر دامن گیر نہیں، نہ ان کو ان انقلابات و حوادث کی کوئی خبر ہے اور نہ خدا کی بھیجی ہوئی فتنہ انگیزیوں اور آفات سے کوئی دلچسپی۔

یہ ایک ایسا تکلیف دہ اور خطرناک تضاد ہے جس کو میں کسی لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ اس کی حیثیت ایک ایسے چیلنج کی ہے جو اب تمام اسلامی کوششوں اور سرگرمیوں کو چیلنج کر رہا ہے۔

جس سخت و مہیب زمانہ سے دنیا گذر رہی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ اسلام کے یہ قائدین اس خطرناک "چیلنج" سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے، جس چیز نے اس وقفہ کو اور نازک بنا دیا ہے جس سے عالم عربی گزر رہا ہے وہ مصر کی جدید سیاست اور اس کا نیا رخ ہے اور ایک ایسی چھلانگ لگائیں گے جس سے وہ تمام خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائیں جو اپنے سینوں میں لیے ہوئے ان کے فاتح و غازی آباد و اجداد اور سلطان صلاح الدین ایوبی اپنے مقبروں میں محو خواب ہیں، اور جس سے شہدائے بدر و حنین، احد و قادسیہ اور یرموک و اجنادین کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور راحت پائیں۔

اگر اسلام کی عزت و ناموس ہمیں عزیز نہ ہوتا اور "عربی شہسواروں" کی صلاحیت و فطرت پر اعتماد و یقین نہ ہوتا تو نہ قلم میں یہ جولانی آتی اور نہ زبان میں یہ روانی ہوتی، میں اپنی اس تلخ نوائی پر معذرت خواہ ہوں کہ

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

عتیق الرحمن سنبھلی (مقیم لندن)

کیا برطانیہ کی قسمت میں کچھ لکھا ہے؟

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کی یہاں آمد و قیام کے دس دن

برطانیہ، ۹۰ فی صدی غیر مسلم اکثریت کا ملک۔ غیر مسلم اکثریت بھی وہ جس کی اسلام دشمنی اور کم سے کم بیزاری یا بیگانگی مشہور و مسلم ہے۔ مسلمانوں کی تعداد یہاں پندرہ بیس لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اور وہ بھی تھوڑے ہی دنوں سے۔

زیادہ سے زیادہ بیس سال ہوتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد کسی شمار و قطار کے قابل ہونا شروع ہوئی، اس وقت یہاں اسلامی آثار و نشان کے نام سے دو ایک مسجدیں رہی ہوں گی۔ جن میں سے ایک ووکنگ کی مشہور مسجد شاہجہاں بیگم ہے۔

مسلمانوں کی کافی تعداد ہو جانے کے باوجود یہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ کوئی چار پانچ سال تک اسلام کے آثار و نشان، یا مسلمانوں کی اسلامیت کے مظاہر میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ مگر پھر اللہ کے کرم سے اس بارے میں بھی کچھ صورتیں فرق اور ترقی کی پیدا ہونا شروع ہوئیں، جن میں سب سے زیادہ وسیع الاثر اور سریع الاثر صورت تبلیغی جماعتوں کی آمد اور جدو جہد کی تھی۔ جن کی جدو جہد نے مسجدیں بھی بنوائیں، نمازی بھی بنائے اور مسلمانوں کی صورتوں میں اسلام کا رنگ بھرا۔

آج (مذہبی پہلو سے) گرجاؤں اور کلیساؤں کے اس ملک، اور دوسری طرف (مذہب فراموشی کے پہلو سے)، رقص گاہوں اور شراب خانوں کے اس ملک میں تین سو سے اوپر مسجدیں

ہیں۔ اور خالی مسجدیں ہی نہیں مسجد کے آباد کرنے والے نمازی بھی ہیں۔ اس وقت رمضان قریب ہے۔ رمضان بھر یہ مسجدیں آپ کو تراویح کی شب زندہ داری اور کلام اللہ کی تلاوت و قرأت سے گونجی ہوئی ملیں گی۔ مغرب کے وقت بڑے اہتمام اور شوق سے مل جل کر افطار کرنے والوں کا کم و بیش مجمع آپ کو ہر مسجد میں ملے گا۔ جمعہ کی نماز میں پورے سال ہر مسجد بھر جاتی بلکہ کہیں کہیں دو دو جماعتیں ہوتی ہیں۔

تبلیغی جماعت کی برکت سے اوسطاً مہینے میں کم سے کم ایک بار ضرور ہر مسجد دو تین دن کے لیے خصوصی طور پر آباد ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ یہاں شہروں کی مساجد میں جمعہ کے علاوہ ہفتہ بھر کی نمازوں خصوصاً دن کے اوقات میں حاضری عموماً بہت کم ہی رہتی ہے۔ اس لیے تبلیغی جماعتوں کا یہ ہر ہفتہ کا سہ روزہ تبلیغی پروگرام بہت ہی قابل قدر اور اس آیت قرآنی کی ایک عملی تفسیر نظر آتا ہے جس میں ارشاد ہے:۔

فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ۝ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ۝

(سورۃ النور آیت ۳۶، ۳۷)

اُن گھروں (اللہ کے گھروں) میں کہ حکم دیا ہے اللہ نے اُن کی تعظیم کیے جانے اور اس کے نام کی یاد ان میں کیے جانے کا، تسبیح کرتے ہیں اُن میں اُس کی صبح و شام وہ لوگ کہ نہیں غافل کر پاتی ہے اُن کو تجارت، اور خرید و فروخت اللہ کا ذکر کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے۔ وہ خوف کھاتے ہیں اُس دن کا کہ اُلٹ پلٹ ہو جائیں گے اُس میں دل اور آنکھیں۔

تبلیغی جماعت کے ہر ہفتے کے ان سہ روزہ پروگراموں کے علاوہ مختلف نوعیتوں اور پیمانوں کے بڑے بڑے اجتماع بھی وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف علاقوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دوسری جماعتیں بھی اپنی اپنی مخصوص مسجدوں میں اپنے اپنے انداز پر کچھ تبلیغی پروگرام کرتی رہتی ہیں

ہندوستان اور پاکستان کے علماء و مشائخ کو مدعو کرنے اور جگہ جگہ اُن کے مواعظ و بیانات کرانے کا بھی سلسلہ کافی دن سے شروع ہو چکا ہے اور دن بدن ترقی پر ہے۔ اس سلسلے سے جہاں کچھ نقصان دیکھنے میں آ رہا ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی آ جاتے ہیں جو واقعی دینی ذوق اور ایمانی جذبہ اُبھارنے کے بجائے فرقہ وارانہ جذبات کو فروغ دینے اور مسلکی اختلافات بھڑکانے ہی پر اپنے بیانات کا زور صرف کرتے ہیں وہاں اللہ کے ایسے بندے بھی ان آنے والوں میں ہوتے ہیں جن سے مثبت دینی فائدہ مسلمانوں کو پہنچتا ہے، اپنی حقیقی ذمہ داریوں اور اپنی کوتاہیوں کا احساس ان میں پیدا ہوتا ہے اور تعلیم و تزکیہ کا نبوی مشن اُن کے بیانات اور اُن کی مجالس سے کسی نہ کسی درجہ میں پورا ہوتا ہے۔

غرض جس طرح اور ساری دنیا میں آج جس تیزی سے شر بڑھ رہا ہے اسی تناسب سے خیر کے لیے جدوجہد بھی بڑھ رہی ہے، یہی حال انگلستان کا بھی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ خیر کی جدوجہد کے اثرات شر کے سیلاب کے مقابلے میں اس وقت تک بہت کمزور رہے ہیں لیکن اگر خیر کی جدوجہد ہمت ہارنے اور شکست ماننے کے بجائے اپنا تناسب اسی طرح بڑھاتی ہی جاتی ہے تو اثرات کا نقشہ جو کچھ بھی ہو۔ بہرحال اس میں امید بندھانے کا سامان ہے نہ کہ مایوس کرنے کا شر اور شیطنت کے فروغ کے باوجود اگر خیر اور ہدایت حق کے لیے جدوجہد کرنے والوں میں پست ہمتی نہیں آتی بلکہ جوش اور جذبہ کا در بڑھتا ہے اور اُن کے قافلے کی تعداد بھی گھٹنے کے بجائے بڑھنے ہی کی طرف جا رہی ہے تو مستقبل اور انجام کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن، یہ علامت ہے کہ اللہ کو اب کچھ منظور ہے۔ شب کی تاریکی کو ان شاء اللہ پھٹنا ہے اور صبح حق نمودار ہونی ہے خواہ کتنی بھی دیر لگ جائے، کتنا بھی عرصہ کشمکش حق و باطل میں گزر جائے۔

ہم نے کہا اور یہی ایمان ہے کہ مستقبل اور آج کے واقعات پر مرتب ہونے والے نتائج کا علم حقیقی صرف اللہ کے پاس ہے، ہم محض اندازے اور گمان کی حد تک ہی کسی اچھی امید اور حسن ظن کا اظہار آج کے کسی واقعہ کے نتائج سے متعلق کر سکتے ہیں۔ اسی نوعیت کی یہ بات ہے کہ ان دنوں میں ایک ایسا واقعہ سرزمین انگلستان کے حصے میں آیا ہے جس نے ہم جیسے کتنوں ہی کے دل میں

حُسنِ امید اور حُسنِ ظن کی یہ روشنی جھکائی ہے کہ شاید خدا کو انگلستان کے حق میں کوئی خیر منظور ہے۔ اس کی شکل کیا ہوگی؟ اسے بھی وہی جانے اور کتنا عرصہ اس کے ظہور میں لگے گا؟ اسے بھی وہی جان سکتا ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم کی ذات گرامی سے ہندوستان و پاکستان کا کوئی بھی تھوڑا بہت پڑھا لکھا مسلمان مشکل ہی سے ناواقف ہوگا۔ اُنکی ذات سے جتنا فیض و خیر، ہم جلیسوں کے بشری علم و اندازے میں، ہندوپاکستان کے مسلمانوں کو (جا ہے وہ کہیں بھی بستے ہوں) پہنچا ہے۔ بظاہر کوئی دوسری زندہ ہستی اس پائے کی اس وقت موجود نہیں ہے۔ وہ عمر کے پورے اسّی سال پورے کرنے والے ہیں۔ برسہا برس کے عوارض نے ادنیٰ نقل و حرکت سے بھی معذور کر دیا ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت بھی مدتوں سے اُن جاں نثار خدام کے ذریعہ پوری ہوتی ہے جنھوں نے اپنی جان کو گویا آپ کی جان سے باندھ رکھا ہے اور شب و روز کے ہر لمحہ میں آس پاس رہتے ہیں۔ کئی سال ہو چکے کہ اپنے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ کے اتباع میں اپنی عمر کا آخر محسوس کرتے ہوئے روضۂ نبوی (علیہا و علیٰ صاحبہا الصلوات و التسلیمات) کے جوار ہی میں جان دینے اور اُسی خاکِ پاک کا پیوند بننے کی آرزو میں مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی ہے۔ اور وہاں سے سال بھر میں بس ایک سفر مہینے ڈیڑھ مہینے کے لیے ہندوستانی متوسلین کی اس بے شمار تعداد کی حسرت دور کرنے کے لیے ہندوستان (سہارن پور) کا ہوتا ہے جو حجاز پاک کا سفر کر کے فیض صحبت پانے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

جو شخص بھی قریب سے حضرت مولانا کی جسمانی معذوری کو دیکھنے کا موقع پالے گا وہ بخوبی اندازہ کر سکے گا کہ یہ ایک سفر بھی اُن کے لیے کس قدر زحمت کا باعث ہوتا ہوگا، اس لیے کسی دوسرے سفر کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟ اور پچھلا سال تو عوارض اور امراض کی ایسی شدت کا گزر چکا ہے کہ اہل تعلق کو ہر وقت کوئی ناشنیدنی سننے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس لیے جب اس تمام پس منظر میں مئی کے آخری دنوں میں سے ایک دن اس راقم الحروف نے اپنے ایک دوست کی زبان سے اچانک سُنا کہ ۲۷ جون کو "شیخ زکریا" تشریف لا رہے ہیں۔ یعنی انگلستان تشریف لا رہے ہیں۔ تو صدفی صد نا قابلِ یقین بات معلوم ہوئی۔ مگر پھر انھوں نے اطلاع اور ذریعہ

اطلاع کی پوری تفصیل بتائی تو خبر کو قابلِ قبول ماننے کے ساتھ ساتھ ایک طرف تو اس کی حیرت انگیزی میں کوئی فرق نہیں آیا یا دوسری طرف ایک ایسے احساس خوش نصیبی کی لذت دل نے اس خبر سے پائی کہ کیسے بیان ہو۔ حضرت کے عوارض و امراض کی شدت کا ایک عرصے تک تسلسل سنتے سنتے اور اپنے قصدِ سفر کی راہ میں دور تک موانع اور مشکلات دیکھتے ہوئے اس کی توقع قریب قریب نہ ہونے کے درجہ میں رہ گئی تھی کہ اس زندگی میں حضرت کی زیارت ایک بار پھر ہو سکے گی۔ ایسی حالت میں جب یہ خبر کان کے پردے سے ٹکرائی تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیسی مسرت اور احساس خوش بختی کی کیا کیفیت دل پر طاری ہوئی ہوگی۔ اس وقت بے اختیار اپنے والد ماجد کی تحریروں میں بہ کثرت استعمال شدہ یہ مصرع زبان پر آگیا

کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

۱۷؍ جون کے انتظار میں ایک ایک دن گنا جا رہا تھا کہ تاریخ قریب آنے لگی مگر کوئی چرچا اور تذکرہ سننے میں نہیں آیا تو انہی مخبر دوست سے پوچھا کہ بھئی کیا ہوا؟ ۱۷؍ تو قریب آ گئی۔ کوئی تازہ اطلاع اور نہیں آئی، تب معلوم ہوا کہ آئی ہے اور اب ۱۷؍ کی جگہ تاریخ ۲۴؍ ہو گئی ہے۔ اور یہ انشاء اللہ نہیں بدلے گی۔ اور اس دوسری خبر کی تفصیلات کی نوعیت نے بھی اطمینان دلایا کہ ان شاء اللہ اس تاریخ پر تشریف آوری ہو ہی جائے گی۔

حضرت شیخ الحدیث کی یہ تشریف آوری آپ کے خلیفہ مجاز مولانا یوسف متالا صاحب کی دعوت پر موصوف ہی کے قائم کئے ہوئے مدرسہ عربیہ اسلامیہ "دار العلوم ہولکمب بری" (لنکا شائر) (HOLCOMB BURY) (LANCASHIAE-) میں ہو رہی تھی۔ اس دار العلوم سے باضابطہ اعلان جاری ہوا کہ حضرت ۲۴؍ کو تشریف لا رہے ہیں اور ایک ہفتہ قیام فرمائیں گے چنانچہ ارادہ کر لیا کہ یہ ہفتہ انشاء اللہ حضرت کی خدمت ہی میں گزارنا ہے۔

۲۳؍ اور ۲۴؍ (بروز ہفتہ و اتوار) کو برمنگھم میں پورے ملک کا ایک بڑے پیمانے کا تبلیغی اجتماع تھا برمنگھم، دار العلوم ہولکمب بری اور لندن کے درمیان میں ہے، اس لیے سفر ۲۳؍ ہی سے شروع کر دیا تا کہ اس اجتماع خیر میں بھی تھوڑی سی شرکت ہو جائے۔ اس اجتماع میں (پاکستان کے)

حضرت قاضی عبدالقادر صاحب مدظلہٗ بھی شرکت فرما رہے تھے جو مدینہ منورہ سے حضرت کے قافلہ کے ہراول کے طور پر دو دن پہلے تشریف لے آئے تھے۔ اجتماع کے اس وقفہ کا زیادہ تر وقت حضرت قاضی صاحب کی صحبت اور معیت ہی میں گزرا۔ اجتماع کے خاتمہ پر قریب چھ بجے برمنگھم سے دارالعلوم کے لیے روانہ ہو کر قاضی صاحب اور ہم لوگ تھوڑا آگے پیچھے ۸ اور ۹ کے بیچ میں دارالعلوم پہنچ گئے۔ سفر کار سے تھا۔ جو انگلینڈ میں عام ہے۔ اور کار ہمارے کرمفرما اور خاص احباب حافظ محمد ابراہیم صدیقی صاحب کی اور رفاقت علاوہ حافظ صاحب کے ایسے ہی دوسرے محب خاص مولانا محمد عیسیٰ صاحب (امام مسجد ایٹن پارک لندن) کی اور ایک دوسرے مہربان پٹیل صاحب کی تھی سفر دو گھنٹے کا تھا مگر ہم لوگ ایک گفتگو کی محویت میں سب کے سب ہی اس موڑ کے سائن سے غافل ہو گئے جس پر ہمیں مین روڈ (موٹروے) کو چھوڑ کر دارالعلوم کے لیے مڑنا تھا۔ اور

"یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد"

کے مصداق قریب چالیس میل آگے نکل کر یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ ہم اپنی راہ چھوڑ کر آگے نکل آئے چنانچہ اب پلٹے اور یہ مفت میں اسی میل کی مسافت بھی پڑی اور گھنٹے سوا گھنٹے کی تاخیر بھی۔ بہر حال دارالعلوم پہنچے۔ جو بڑی شہری آبادی "بوسٹن" سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہولکمب ہل HOLCOMB HILL نامی پہاڑی پر واقع ہے۔ یہ اصل میں ایک سینی ٹوریم تھا۔ جو کسی وجہ سے چھوڑ دیا گیا تو اسے غالباً ۱۹۷۵ء میں ایک لاکھ پندرہ ہزار پونڈ کے عوض دارالعلوم کے لیے خرید لیا گیا۔ بہر حال دارالعلوم پہنچے۔ حضرت قاضی صاحب اور ان کے رفقاء سفر (جناب حافظ پٹیل صاحب (امیر جماعت تبلیغ برطانیہ) اور مولانا یعقوب صاحب کاوی وغیرہ) پہلے پہنچ چکے تھے۔ نماز عصر کا وقت تنگ ہو رہا تھا جلدی سے نماز ادا کی۔ اس کے بعد قاضی صاحب کے ساتھ کھانا کھایا اور اب مغرب کا وقت آ گیا۔ کوئی پونے دس کا وقت ہو گا۔ (انگلینڈ میں آجکل دن اتنا بڑا ہے کہ مختلف علاقوں کے فرق کے اعتبار سے پونے پانچ، پانچ پر سورج نکلتا ہے اور ساڑھے نو پونے دس پر غروب ہوتا ہے۔)

حضرت شیخ الحدیث کے متعلق ہمیں برمنگھم ہی میں اطلاع مل چکی تھی کہ جہاز لیٹ ہو جانے کی وجہ سے ساڑھے دس کے قریب مانچسٹر کے ہوائی اڈے پر اتر پائیں گے۔ مغرب کی نماز میں اس کا

اعلان بھی کر دیا گیا۔ قرب و جوار اور دور دراز سے سینکڑوں آدمی شیخ کے استقبال اور دیدار کے لیے ابتدائی اطلاع کے مطابق تین چار بجے ہی سے پہنچ چکے تھے۔ نیا اعلان سن کر چشم براہ ہو گئے۔ حضرت کو جس جگہ سے کار سے اتر کر اپنے کمرے تک پہیوں والی کرسی کے ذریعہ آنا تھا اس جگہ سے کمرہ تک لوگ دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔ اس طرح کمرہ تک پہنچتے پہنچتے اکثر لوگوں کو آپ کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع مل گیا۔

خیال کیا، بلکہ یقین سا تھا کہ اس وقت رات میں اس سے زیادہ ملاقات کی کسی صورت کا کوئی سوال نہیں۔ صبح آٹھ بجے کے جدّہ سے چلے ہوئے رات کے ساڑھے دس بجے منزل پر پہنچ رہے ہیں۔ تعب و تکان کا کیا حال ہو گا۔ اچھا بھلا تندرست آدمی بھی اتنے لمبے سفر کے بعد آرام ہی چاہے گا، چہ جائیکہ ایک پیر ضعیف و مریض مگر حیرت کی انتہا نہ رہی جب نماز عشاء میں اعلان سنا کہ لوگ اسی وقت حضرت سے عرض سلام اور مصافحہ کی شکل میں مل سکیں گے ——— یا اللہ! یہ مجاہدہ اور اہل شوق و محبت کی یہ رعایت! اس سے جہاں یہ اندازہ ہوا کہ مجاہدہ کرتے کرتے انسان تحمل اور برداشت کے کس درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور اہل اللہ کو عین اخلاق الٰہی کے مطابق[1] اہل شوق و طلب کی کتنی رعایت ملحوظ رہتی ہے۔ وہاں ایک اشارہ میرے اپنے ذہن کو یہ بھی ملا کہ یوں تو یہ حضرات اپنا ایک لمحہ بھی کہیں کبھی ہوں ضائع نہیں جانے دیتے مگر یہاں، میرے فہم و اندازے کے مطابق، وہ اپنے بس بھر جس افاضے اور خلق اللہ کی طرف زیادہ سے زیادہ کھینچنے کی نیت اور امید سے تشریف لائے تھے اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں کے قیام کا ایک ایک لمحہ وصول کرنا اور اس کے لیے بہر قیمت وہ طرز عمل اختیار کرنا منظور تھا جو اس مقصد و مدعا کے زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر حاصل ہونے میں مددگار ہو سکے ——— لوگ جانتے ہیں کہ ؏

"فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق"

اس امر کا باعث ہوتی ہے کہ میکدے میں ہجوم زیادہ ہو۔

بہر حال حیرت اور مسرت کے ساتھ یہ اعلان سنا کہ اسی آدھی رات کے وقت ملاقات ہو گی۔

---

[1] اخلاق الٰہی سے متعلق ایک حدیث میں آتا ہے کہ بندہ اگر میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ بڑھ کر آتا ہوں۔ الخ

چنانچہ ہوئی اور قریب قریب ایک گھنٹہ اس عمومی ملاقات میں لگا جس میں قطار باندھ کر لوگ سلام اور مصافحہ کرتے ہوئے گزرتے گئے۔ الحمدللہ یہ سعادت اپنے حصے میں بھی آئی۔ دل و نگاہ دونوں مدت سے پیاسے تھے، مصافحہ کے ساتھ آنکھیں بھی ان مبارک ہاتھوں سے لگا کر اس پیاس کو کچھ بجھانے اور پیاس دل گزارنے کی کوشش کی۔ امید کے مطابق التفات پایا تو اظہار خوش نصیبی کے پیرائے میں اس زحمت فرمائی پر زبان سے بھی شکر گزار ادا ـــــ کیا مبارک رات تھی۔

نازم بچشم خویش کہ روئے تو دیدہ است

ایک ڈیڑھ بجے سو کر چار بجے فجر کے لیے اٹھنا ہوا، اور اس کے بعد رات تک کا وہ پروگرام شروع ہو گیا جس کا حضرت کے دوران قیام میں روزمرہ کے لیے اعلان ہو گیا تھا، یعنی سوا چار بجے نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اوراد و وظائف۔ ۸ ۱/۲ بجے ناشتہ۔ ۱۰ ۱/۲ بجے سے ۱۱ ۱/۲ تک تصوف و تزکیہ سے متعلق شیخ کی کسی کتاب سے تعلیم۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا۔ ۲ ۱/۲ بجے ظہر کی نماز۔ نماز کے بعد مشائخ کا معمول بہ ختم اور اجتماعی دعا۔ پھر ذاکرین کا ذکر بالجہر اور بقیہ لوگوں کی درود و استغفار اور تسبیحات میں مشغولیت۔ اس کے بعد ۶ بجے شام کی چائے۔ پھر ۶ ۱/۲ بجے سے ۷ ۱/۲ تک حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی کا بیان۔ ۸ بجے نماز عصر۔ نماز کے بعد شام کا کھانا۔ پونے دس بجے مغرب کی نماز اور نماز کے بعد نماز گاہ ہی میں قریباً پون گھنٹے کی حضرت کی عمومی مجلس۔ اور پھر ۱۱ ۱/۲ بجے عشاء کی نماز۔

یوں تو کئی سو آدمی مستقل طور سے دارالعلوم میں مقیم ہی رہتے تھے۔ اور اس طرح ہر پروگرام میں اچھا خاصہ مجمع ہوتا تھا لیکن دارالعلوم کی یہ خانقاہ جو حضرت کی آمد سے قائم ہو گئی تھی اس کی اصل بہار شام چھ بجے سے شروع ہوتی تھی، جبکہ قرب و جوار کے لوگ اپنی دوکانوں، دفتروں اور کارخانوں وغیرہ سے چھٹی پا کر جوق در جوق وہاں پہنچ جاتے تھے۔ اس وقت یہ مجمع ہزاروں کا ہوتا تھا۔ اور اس بہار کا بھی اصل شباب نماز مغرب سے شروع ہوتا تھا اس کے بعد متصلاً اسی جگہ حضرت مجمع کے بیچ میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ یہ وقت چوبیس گھنٹوں کا حاصل تھا، صاف معلوم ہوتا تھا کہ دلوں پر سکینت اور فیضان حق کا نزول ہو رہا ہے۔ اور کیسے نہ ہوتا جبکہ ایک بندۂ حق اپنی پوری توجہ قلبی کے ساتھ مراقب ہو کر درمیان میں بیٹھا ہے اور ارد گرد کا

سارا مجمع فیضانِ حق کے کچھ چھینٹے پانے کی نیت سے ایک جذبۂ طلب اور حسنِ عقیدت کے ساتھ نظریں اُس کے چہرے پر جمائے ہوئے، اس کے اپنے الفاظ میں، اُس کی "درخواست" اور ہماری تعبیر میں اس کی ہدایت پر کم سے کم ایک ہزار بار درود شریف کا ورد پورا کرنے میں مصروف رہتے۔

حضرت نے پہلے ہی دن مجلس میں تشریف فرما ہوتے ہی فرمایا تھا کہ بھئی میرے پاس صرف بیٹھنے اور مجھے دیکھنے کے لیے جمع ہو جانے سے کچھ نہیں ملے گا۔ جو کچھ ملے گا کچھ کرنے سے ملے گا۔ اور کچھ کرنے کے سلسلے میں اس وقت (یعنی اس مجلس کے وقت) میں کم از کم اتنا ضرور کرو کہ ایک ایک ہزار بار درود شریف ہر شخص پڑھ لے۔ اور اس کے علاوہ اوقات میں ہر غیر ضروری بات سے اپنے وقت کی حفاظت کرتے ہوئے دل اور زبان کو زیادہ سے زیادہ اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو۔

اس مجلس کے آغاز میں ہر دن حضرت کسی نہ کسی درجے اور کسی نہ کسی پیرائے میں مذکورہ بالا ہدایت کی یاد دہانی ضرور فرماتے تھے، اور اندازہ یہ ہے کہ کم از کم اس مجلس کے وقت میں تو تمام ہی حاضرین آپ کی ہدایت پر عمل کرتے تھے۔ اور اس طرح یہ مجلس گویا مجلس درود ہو جاتی تھی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا۔ (جو کوئی مجھ پر ایک بار درود بھیجے اللہ اُس پر دس بار درود بھیجتا ہے) اس مبارک حدیث کی روشنی میں کیونکر کسی شبہہ کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ اس مجلس کے دوران میں دل و روح میں جو ایک غیر معمولی سکینت و شادمانی اور ایک بیان سے بالاتر حلاوت ایمانی کا احساس طاری رہتا تھا وہ کوئی واہمہ نہیں عین ایک حقیقت کا احساس اور اُس رحمت و عنایت حق کا عکس تھا جو اس خاموش درود خوانی کے جواب میں اس مجلس پر برس رہی ہوتی تھی۔

اتنی دیر کی خاموشی کے بعد کہ ایک ہزار مرتبہ درود کا ورد پورا ہو جائے، اُن لوگوں کی بیعت شروع ہوتی تھی جو حضرت سے بیعت ہونا چاہتے تھے۔ اس بیعت کا طریقہ یہ تھا کہ حضرت اپنی زبان سے بیعت کے الفاظ فرماتے جسے حضرت کے خدام میں سے ملک عبدالحفیظ صاحب، لاؤڈ سپیکر پر دہرا کر اس ہدایت کے ساتھ مجمع تک پہنچاتے کہ جو لوگ واقعی بیعت کا ارادہ کر کے آئے ہوں وہی ان الفاظ کو دہرائیں۔ بیعت کے الفاظ میں کیا ہوتا ہے؟ ایمان کی تجدید، گناہوں سے توبہ اور آئندہ کے لیے اطاعت و راست روی کا عہد و اقرار۔ یہ اس مجلس کا خاتمہ ہوتا تھا۔ یعنی درود سے شروع ہو کر توبہ و استغفار

پر یہ مجلس ختم ہوتی تھی ــــــ اس کے علاوہ اور کیا کسی مجلس کے بابرکت اور ایمان آفریں ہونے کے لیے چاہیے؟

اس انداز پر اور اس شان سے حضرت کے قیام انگلستان کے یہ دس گیارہ دن گزرے۔ انہی میں سے درمیان کا ایک دن (پنجشنبہ ۲۰ جون) برطانیہ کے تبلیغی مرکز (ڈیوز بری) کے لیے رکھا گیا تھا۔ پورے قیام میں بس یہی ایک سفر حضرت نے دارالعلوم سے باہر کا فرمایا۔ صبح ساڑھے دس گیارہ بجے روانگی ہوئی۔ ۱۲ بجے ڈیوز بری سے چند میل ورے باٹلی پہنچ کر ذرا دیر کا قیام فرمایا۔ کیونکہ یہاں خواتین کی بیعت کا پروگرام تھا۔ اس بیعت سے فراغت فرما کر آپ ڈیوز بری کے مرکز میں تشریف لے آئے۔ عشا تک وہیں قیام رہا۔ عشا پڑھ کر وہاں سے پھر دارالعلوم کو واپسی ہوگئی۔ اس قیام میں بھی نظام الاوقات اور پروگرام بالکل وہی رہا جو دارالعلوم میں رہتا تھا۔

حضرت دارالعلوم سے ڈیوز بری چلے تو وہاں کے مقیمین کا بیشتر حصہ بھی آپ کے آگے پیچھے اس طرح وہاں سے منتقل ہوگیا جیسے شمع کے ساتھ پروانے۔ اور اُن کے علاوہ ڈیوز بری کے جوار سے جو آمد شروع ہوئی تو ہر طرف سے موٹریں ہی موٹریں آتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ دارالعلوم تو بالکل ہی آبادی سے الگ اپنی دنیا آپ ہے، مرکز کے ساتھ بھی کوئی خاص آبادی نہیں، مگر دونوں جگہ جنگل میں منگل کی شان تھی۔ معلوم ہوتا تھا، دنیا کی ساری رونق اور زندگی یہیں کھنچ آئی ہے۔

اگر اسے سفر کہا جا سکے تو ایک سفر ڈیوز بری کے علاوہ بھی حضرت نے اور کیا اور وہ دارالعلوم سے آٹھ دس میل پر واقع اس علاقے کے بڑے شہر بولٹن کی زکریا مسجد کا سفر تھا۔ یہاں اتوار ۲۳ جولائی کو ۱۲ بجے دن سے ظہر تک کا پروگرام تھا، جہاں مفتی محمود الحسن صاحب کا بیان، خواتین کی بیعت اور دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ اس پروگرام میں راقم حروف شریک نہیں ہو سکا کیونکہ اُسے اسی دن دو بجے لندن کے لیے واپس ہونا ضروری تھا ــــــ ابتداءً حضرت کی واپسی بھی اتوار ہی کی تھی اسی کے مطابق میں نے بھی اتوار تک کے ارادے سے لندن چھوڑا تھا۔ مگر بعد میں حضرت کے

قیام میں کچھ اضافہ طے ہو گیا اور واپسی جمعرات ۵ر جولائی کو طے پائی۔ اگرچہ میں بعض مجبوریوں سے اپنا قیام نہ بڑھا سکا اور حضرت سے اجازت اور آپ کی دعائیں لیکر حضرت کی بولٹن روانگی کے بعد لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔

۵ر جولائی کی صبح ۹ بجے حضرت مانچسٹر ایرپورٹ سے پرواز کر کے دس بجے کے قریب لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر تشریف لائے۔ یہاں سے آپ کو ایرانڈیا کے ذریعہ دہلی تشریف لیجانا تھا۔ طیارہ کا اصل وقت دس بجے تھا مگر رات ہی کو اس کا علم دارالعلوم میں ہو گیا تھا کہ دس بجے کے بجائے دو بجے پرواز ہو گی، اس لیے جو آخری فلائٹ اس طیارہ سے سفر کے لیے مانچسٹر سے ہو سکتی تھی وہ اختیار کی گئی۔ مگر یہ مزید دو گھنٹے لیٹ ہوا اور چار بجے گیا۔

دو بجے کی اطلاع ہم لندن کے لوگوں کو بھی مل گئی تھی، اس لیے گیارہ کے قریب ہیتھرو پہنچے۔ اُس وقت حضرت مخصوص انتظامات کے تحت برٹش ایرویز کے میڈیکل یونٹ کے ایمرجنسی وارڈ میں تشریف فرما تھے، ہمیں وہیں حاضری کا موقع مل گیا۔ مگر عین اُسی وقت ایرانڈیا کے ——————— "مہاراجہ لانج" سے بلاوا آگیا جہاں آرام کا مستقل بندوبست ہو رہا تھا چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہاں جا کر رخصتی ملاقات کی تکمیل کی۔

خدا اُن لوگوں کو سدا خوش رکھے جو حضرت کے اس سفر کا ذریعہ بنے اور راقم الحروف جیسے کتنے ہی آرزومندوں کو انگلستان ہی میں بیٹھے بیٹھے حضرت کی زیارت نصیب کرادی۔ غیب اور حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے مگر جہاں تک اپنے دل کی بات ہے سو وہ تو یہی کہتا ہے کہ حضرت کی معذوریاں جس درجہ کی ہیں ضعف و پیری کی جو کیفیت ہے اور مدینے ہی کی خاک پاک کا پیوند بننے کی جو آرزو لیے ہوئے آپ مستقلاً اسی خاک سے لگ بیٹھے ہیں ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا بہت ہی مشکل ہے کہ محض کچھ لوگوں کی دلداری کے لیے آپ اس ظلمت کدہ فرنگ کے سفر پر آمادہ ہو گئے ہوں۔ بلکہ اس آمادگی کے پیچھے مشیت حق کا کوئی ایسا فیصلہ شاید کارفرما تھا جو اس ملک کے مسلمانوں یا خود اس ملک ہی کو کچھ دینے کے لیے کیا گیا ہو! ہماری دانست میں اس سرزمین پر یہ دس دن جس انداز اور کیفیت کے گزرے ہیں ایسے انداز اور ایسی کیفیت کا تجربہ اس سے پہلے اس سرزمین نے کبھی نہیں کیا ہوگا۔ اور لوگوں کے دلوں نے کبھی نورِ حق اور رحمت حق

برسنے کا ایسا تجربہ اس سے پہلے اس سرزمین پر کبھی نہ کیا ہوگا۔

خدایا! ہمارا یہ حسن ظن اور حسن امید بیکار نہ جائے تو فعال لما یرید ہے۔ جس سرزمین پر چاہے پھول کھلا سکتا ہے۔ ہم نے تیری رحمت کی بارش برستی ہوئی یہاں ان دنوں میں دیکھی ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ یہ ضرور اس سرزمین کو نہال کرنے اور تیرے کلمے کو فروغ عطا ہونے کا باعث بنے گی۔

صفحہ ۳۵ کا بقیہ

مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے میں مرزا علی نظر بیگ صاحب کے یہاں ٹھہروں گا۔ چونکہ شہر میں ہوں گا تم کبھی عقد کے وقت بلا لینا۔

پھر فرمایا کہ انھوں نے بڑی ہمت کی کوئی رسم نہیں کی۔ وہاں بڑی رسمیں ہوتی ہیں اس لیے میں نے یہ موقع مناسب سمجھا۔ دونوں کام ہو گئے۔

انتخاب مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانویؒ کی محفل ارشاد

(۲)

فرمایا کہ علماء کو اموال کے لینے میں سخت احتیاط چاہیے، آجکل اس کی پروا نہیں کی جاتی۔ اس باب میں بہت تسامح (چشم پوشی) سے کام لیا جاتا ہے، اس کا ضرر بہت زیادہ ہے، دین کی سخت بے وقعتی ہوتی ہے۔ امراء کی طرف اگر خود التفات کیا جائے خواہ کیسے ہی خلوص سے ہو، ان کو یہی گمان ہوتا ہے کہ ان کی کچھ غرض ہے ــــ برخلاف غرباء کے ــــ ان سے ذرا شیریں کلامی کی جائے تو پانی پانی ہو جاتے ہیں، نثار ہونے لگتے ہیں۔ دین کی وقعت کو محفوظ رکھنے کے لیے میں امراء سے از خود کبھی تعلق نہیں پیدا کرتا۔ ہاں وہ خود ہی تعلق پیدا کرنا چاہیں تو اِبا (انکار) بھی نہیں کرتا۔ حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب امیر تمھارے پاس دین کی وجہ سے آیا تو وہ نرا "امیر" نہیں وہ "نعم الامیر" ہو گیا۔ دنیا دار سمجھ کر اس سے ہرگز بے التفاتی نہیں کرنی چاہیے۔

فرمایا کہ نئے آنے والوں کے سامنے میں کبھی قصداً بھی نفل بیٹھ کر پڑھنے لگتا ہوں (چھوٹے) بچوں سے خوب ہنستا بولتا ہوں۔ غرض ہر طرح بے تکلفی کے ساتھ ان کے سامنے رہتا ہوں تاکہ ان کو میرا کچا چٹھا معلوم ہو جائے اور دھوکہ نہ ہو۔ اول ہی دن اپنے سب اترے پترے کھول دیتا ہوں، یہ نہ ہو کہ وہ تو کچھ سمجھ کر مجھ سے رجوع کریں اور بعد کو میں کچھ اور ثابت ہوں ــــ اسی واسطے قبل بیعت میں کچھ دن قیام کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ جو وسوسے عمر بھر میں آنے والے ہوں وہ سب ایک دم آ جائیں اور ختم بھی ہو جائیں۔ اس کے بعد بیعت کا

لطف بھی ہے۔ ورنہ جب کوئی نئی بات دیکھتا نیا وسوسہ دل میں پیدا ہوتا، عمر بھر یہی قصہ رہتا اور کبھی باہم مناسبت پیدا نہ ہوتی اور بلا مناسبت کے کچھ نفع نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے میں سفر میں بیعت کرنا پسند نہیں کرتا۔ بیعت میں جلدی کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ میں تو کہہ دیتا ہوں کہ معاملے کی بات ہے۔ آپ میری طرف سے اطمینان کر لیجیے میں آپ کی جانب سے اطمینان کر لوں۔ میں آپ کو کچھ تعلیم کر دوں آپ اس پر کاربند ہوں۔ اگر آپ اس پر کاربند ہوں اور آپ کچھ نفع محسوس کریں تو مجھ سے رجوع کریں۔ ورنہ مجھ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جائیں۔ اسی طرح میں اپنا اطمینان کر لوں دیکھوں کہ آپ کام میں مشغول ہو گئے یا نہیں۔ اگر میرا اطمینان ہو جائے تو خیر ورنہ میں آپ کو جواب دیدوں۔ دونوں طرف آزادی رہے۔ دوسرے یہ بھی بات ہے کہ آجکل اصل چیز بیعت کو سمجھتے ہیں اور تعلیم کو اس قدر ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ اصل چیز تعلیم ہے۔ گو بیعت کی برکات کا میں منکر نہیں ہوں لیکن دارومدار نفع کا بیعت پر نہیں۔ نفع کے لیے محبت اور اتباع کافی ہے۔ لوگوں نے اس میں اس قدر غلو کر رکھا ہے کہ اگر میں یوں کہدوں کہ تعلیم کچھ نہ کروں گا صرف بیعت کر لوں گا تو ہزاروں مرید ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور اب میں کہتا ہوں کہ تعلیم کرنے کے لیے تیار ہوں اور یقین بھی دلاتا ہوں کہ نفع میں ذرہ برابر فرق نہ ہو گا۔ اور بیعت نہیں کرتا، لیکن اس پر کوئی راضی نہیں ہوتا۔ میں تو یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ بلا بیعت کے بھی پورا پورا نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ذکر شغل بتلا دیا اور اس کو کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے نزدیک وہ اس قابل ہو گئے کہ ان کو اجازت بیعت لینے کی میں نے دی۔ اس وقت انھوں نے کہا کہ ابھی ہم تو خود بیعت ہوئے ہی نہیں۔ چنانچہ اجازت میں نے پہلے دی اور بیعت بعد کو کیا۔

بہ سلسلہ گفتگو فرمایا کہ شروع شروع میں بمقام کانپور جب میری عمر کوئی بیس برس ہو گی ایک وکیل صاحب نے میرا بیان سن کر کہا کہ یہ شخص ملّانوں میں کہاں جا پھنسا۔ یہ تو وکالت کا امتحان پاس کرتا تو اس کا کوئی نظیر نہ ہوتا۔ ایک بار الہ آباد میں اسی واقعہ کو بیان فرما کر اور دیگر مؤیدات کا ذکر کر کے فرمایا کہ میرا مقصود ان واقعات سے یہ ہے کہ اگر ہم لوگ ملّا نے دنیا کمانے پر آجائیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما کر دکھا دیں۔ لیکن باوجود اس قدرت کے بقدر ضرورت

پر راضی رہ کر خدمتِ دین میں مشغول ہیں۔ ——— وعظ میں اس بات کا ذکر فرمارہے تھے کہ ہم لوگوں کو پست ہمت، احدیوں کی پلٹن، کم حوصلہ، ترقی کے دشمن نہ معلوم کیا کیا خطاب دیے جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر آپ کا کوئی نوکر جس کو آپ صرف پانچ روپے ماہوار دیتے ہوں دوسرے شخص کے بیس روپے ماہوار پر لات مار کر کہدے کہ میں اپنے آقا کو نہ چھوڑوں گا تو میں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اس کو وہی خطاب دیجیے گا کہ بڑا پست ہمت کم حوصلہ شخص ہے کہ ترقی کو چھوڑ رہا ہے۔ یا یہ کہیے گا کہ سبحان اللہ کیسا عالی حوصلہ اور بلند نظر شخص ہے کہ اپنے آقا کی وفاداری میں بیس روپے پر لات ماردی اور اپنے آقا کے پانچ روپے پر قناعت کی۔ اسی طرح اگر ہم لوگ دنیا کمانے پر آجائیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما کر دکھا دیں پھر بھی اپنے آقا یعنی حق تعالیٰ کی وفاداری کو نہیں چھوڑتے اور خدمت دین میں مشغول ہیں اور اپنے ان ہی سوکھے ٹکڑوں پر راضی ہیں تو ہم کو پست ہمت اور کم حوصلہ کیوں کہا جاتا ہے۔ ان ہی وکیل صاحب مذکور نے بعد اس وعظ کے جو حال میں بمقام کانپور ہوا تھا حضرت سے عرض کیا کہ میں دوران وعظ میں یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

تو مکمل از کمال کیستی		تو منور از جمال کیستی[عہ]

وکیل صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد فرمایا کہ اس شعر کا جواب اس وقت میرے ذہن میں آیا تھا لیکن میں نے کہا کہ میں کیوں کمال اور جمال کا دعویٰ کروں اس لیے خاموش رہا۔ وہ جواب یہ تھا ؎

من مکمل از کمال حاجیم		من منور از جمال حاجیم[عہ]

فرمایا کہ کھانے کی نیت سے ہاتھ دھونا سنت ہے۔ . . . . ایک بار فرمایا کہ دونوں ہاتھ دھونا سنت ہے، اور رومال وغیرہ سے پونچھنا نہیں چاہیے۔ البتہ کھانے کے بعد جو ہاتھ دھوئے ان کو پونچھے۔ اور قبل کھانے کے صرف ہاتھ دھوئے کُلّی نہ کرے۔ سنت یہی ہے۔ کیونکہ ہاتھ گو پاک ہوں لیکن موقعہ بے موقعہ پڑتے رہتے ہیں۔ کہیں

عہ (ترجمہ) اے مخاطب! تو کس کے کمال سے مکمل ہے؟ اور کس کے جمال سے منور ہے؟

عہ (") میں حاجی صاحب (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح) کے کمال سے مکمل ہوں اور ان ہی کے جمال سے منور ہوں۔

کھجلا لیا، کہیں ناک میں انگلی دیدی۔ اس لیے ہاتھوں کا دھونا سنت ہوا۔ منھ تو پاک ہی رہتا ہے۔ اس کے دھونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ البتہ بعد کھانے کے ہاتھوں کو دھونے کے بعد کلی بھی کر کے منھ کو صاف کرلے۔

فرمایا کہ میرا مدتوں سے یہ خیال ہے کہ دیہات میں وعظوں کا اہتمام ہو۔ وہاں کے لوگ بہت جلد حق کو قبول کرتے ہیں ان کو اس سے بہت نفع ہوگا۔ کچھ واعظ خاص طور سے دیہات ہی میں جا جا کر وعظ کہا کریں اور نذرانہ بالکل نہ لیں۔ نہ کسی کی دعوت قبول کریں۔ اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ ان بیچاروں کو سادے سادے وعظ ہی کافی ہیں۔ بہت لمبے چوڑے اور مدلل مضامین کی ضرورت نہیں ہے۔

فرمایا کہ دوسروں پر ہنسنا نہیں چاہیے۔ اکثر دیکھا ہے جو جس پر ہنسا خود اس عیب یا مصیبت میں مبتلا ہوا۔

مرادآباد کے وعظ کی بابت جامع ملفوظات نے دریافت کیا تو فرمایا کہ جی ہاں ہوا تھا۔ اس آیۃ پر بیان کیا تھا مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ (الآیہ) چونکہ ارادہ اور مراد کا بیان تھا اس لیے وعظ کا نام بھی المراد تجویز کر دیا ہے۔ المراد مرادآباد کے بھی مناسب ہے۔ احقر کی طبیعت اس لطیف صنعت پر شگفتہ ہو گئی۔ عرض کیا آیۃ بھی ارادۂ آخرت کے متعلق حضور کو مرادآباد کے مناسب خوب مل گئی مناسبت کی رعایت تو کسی حال میں متروک نہیں ہونے پاتی۔ ہنس کر فرمایا کہ جی ہاں طبیعت میں شاعری کا مادہ بہت ہے۔ گو شعر کہنے پر تو قدرت نہیں لیکن جہاں تک ہو سکتا ہے طبیعت یہی چاہتی ہے کہ رعایتِ شاعرانہ بھی رہے تو اچھا ہے۔ لیکن خواہ مخواہ کبھی اس کے پیچھے نہیں پڑتا۔ جو بات بے تکلف سوجھ گئی اور اصل مقصود میں ذرا مخل نہ ہوئی تو خیر ایسی رعایتوں کو بھی استحسان کے مرتبہ میں جی چاہا کرتا ہے۔
پھر فرمایا کہ جامع مسجد میں وعظ ہوا تھا۔ وہاں ہمیشہ ڈھائی بجے جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور

اس وقت یہاں پہنچنے کے لیے مجھ کو چار بجے وہاں سے روانہ ہو جانا ضروری تھا۔ کیوں کہ پانچ بجے گاڑی چلتی ہے۔ تین بجے کہیں نماز ختم ہوتی تب وعظ شروع ہوتا تو چار بجے تک کیا ہو سکتا تھا۔ وہاں لوگوں نے خاص اس دن کے لیے جمعہ کا وقت بدل دیا۔ اور سب جگہ خوب اعلان کر دیا کہ بجائے ڈھائی بجے کے ڈیڑھ بجے نماز ہوگی۔ لیکن مجھ کو یہ گوارا نہیں ہوا کہ نماز کا وقت بدلا جائے۔ میں نے اس رائے کی مخالفت کی میں نے کہا کہ اگر ایک متنفس کو بھی نماز نہ ملی تو اس کی محرومی کا میں باعث ہوں گا۔ دوسرے ایسی حرکتوں سے مولوی لوگ خواہ مخواہ بدنام بھی ہوتے ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ ہر شخص کو اعلان کی خبر پہونچ ہی جائے کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ سب لوگ اعلان کے وقت اپنے گھروں پر ہی موجود ہوں۔ آخر کیا ایک شخص بھی ایسا نہ نکلے گا کہ وہ اعلان کے بعد گھر پہنچا ہو اور اس کو کسی نے اعلان کی اطلاع بھی نہ کی ہو۔ چنانچہ میں نے یہ تجویز کیا کہ نماز تو اپنے مقررہ وقت پر ہی ہو یعنی ڈھائی بجے البتہ میں اپنے وعظ کو مقدم کر دوں۔ ڈیڑھ بجے وعظ شروع کر دیں گے، ڈھائی بجے بند کر کے نماز پڑھیں گے نماز سے فارغ ہو کر پھر وعظ کہنا شروع کر دیں گے۔ اس میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ ڈیڑھ بجے بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور اطمینان سے بیان کرتا رہا۔ جب وقت ہو گیا تو حاضرین نے وقت کی اطلاع کر دی۔ نماز پڑھ کر پھر کہنا شروع کر دیا۔ نماز سے قبل تو گھنٹہ بھر تک تمہید ہی کی تقریر کرتا رہا۔ بعد نماز کے پھر شروع کر کے ٹھیک چار بجے ختم کر دیا۔ لیکن سب ضروری مضامین بیان ہو گئے۔ بہت کافی وقت مل گیا تھا۔ —— گاڑی مسجد کے دروازہ پر پہلے سے معہ اسباب کھڑی کرا رکھی تھی، انتظام تو آخر کرنے ہی سے ہوتا ہے، بے کیے تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ اور انتظام میں تھوڑی بہت تکلیف ضرور کرنی پڑتی ہے۔ اور اس وقت دیکھنے والوں کو چاہے خواہ مخواہ کی طوالت معلوم ہوتی ہے لیکن انجام میں بڑی سہولت اور راحت ہوتی ہے۔ بیان ختم ہونے پر لوگوں نے مصافحہ کرنا شروع کیا۔ حاجی مرتضیٰ علی[1] صاحب نے کہنا چاہا کہ مصافحہ کا وقت نہیں، جانے والے ہیں۔ لیکن میں نے منع کر دیا کہ جناب یہ اطلاع نہ کیجیے، ورنہ جانا بالکل ہی رک۔

---

[1] حاجی مرتضیٰ علی مراد آبادی حضرت شاہ محمد کمل مراد آبادیؒ کے پرپوتے تھے۔

جائے گا۔ پھر میں نہ جا سکوں گا۔ کس کس سے میں مباحثہ کروں گا۔ غرض کسی کو نہ معلوم ہوا کہ یہ رخصت ہو رہا ہے۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا اسٹیشن پہنچ گیا۔ کسی کو خبر نہیں کی ورنہ جناب بہت لوگ اصرار کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کا مجھ کو لحاظ کرنا پڑتا ہے۔

مراد آباد کے وعظ کا ذکر آیا تو فرمایا کہ مرزا علی نظر بیگ کہتے تھے کہ اس آیت کا میں نے بار بار وعظ سنا ہے لیکن ہر مرتبہ نیا مضمون سننے میں آیا۔ کبھی یہ نہیں ہوا کہ ایک وعظ کے مضامین دوسرے وعظ کے مضامین سے مل گئے ہوں۔ گو ایک ہی آیۃ کے متعلق مضامین تھے لیکن ہر وعظ دوسرے سے مختلف تھا۔ پھر فرمایا کہ مجھے تو مضامین یاد بھی نہیں رہتے۔ جو مضمون اُس وقت ذہن میں آیا وہی بیان کر دیا۔

ظہر کا وضو فرماتے جاتے تھے اور دو دن کے بعد کے مشتاقوں سے باتیں بھی فرماتے جاتے تھے فرمایا کہ وہاں (مراد آباد) کے لوگ مجھ کو بہت ہی بے مروت کہتے رہے لیکن میں نے کہا کہ جناب اگر میں مروت میں رہوں تو کوئی کام ہی نہ کر سکوں گا۔ فرمایا کہ وعظ کے بعد اس قدر دماغ خستہ ہو گیا تھا کہ اسٹیشن پہنچ کر گاڑی میں لیٹ گیا۔ وہاں بالکل آزاد تھا۔ ہمارے درجہ میں کوئی نہیں تھا بس میں تھا اور مولوی ظفر۔ نماز پڑھ کر سو گیا۔ مغرب تک خوب سوتا رہا مغرب کے بعد پھر سو گیا۔ بس جناب سوتے ہوئے ہی آئے۔ بہت آرام ملا۔ وہاں آرام کہاں مل سکتا تھا۔

پھر فرمایا کہ میں نے جامع مسجد (مراد آباد) دیکھی بھی نہیں تھی۔ نہایت اچھے موقع پر ہے بہت پُر فضا مقام ہے۔ بہت اونچی کرسی، دریا کا کنارہ، شہر سے باہر، پُر لطف منظر—— وہاں کے امام ایک بزرگ مولانا دائم علی صاحب ہیں جو مولانا عالم علی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ میں نے کبھی وہاں وعظ نہیں کہا تھا۔ میرا قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی بزرگ ہوں وہاں میں کچھ بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ مولوی صاحب خود ہر جمعہ کو وعظ فرمایا کرتے ہیں۔ لیکن خود انھوں نے ارشاد فرمایا کہ نماز جمعہ کی بھی مجھ ہی سے پڑھوائی اور وعظ کی بھی فرمائش کی۔ ۵ بجے شام کو مراد آباد پہونچا تھا۔ دوسرے دن شام کو ۴ بجے روانہ ہو گیا۔ بس سفر ہی سفر رہا۔ اس میں بھی جتنا وقت قطع مسافت

میں گذرا آرام تھا۔ اور جس قدر وہاں گذرا وہ مشقت کا تھا۔ چونکہ تنہائی نہیں ملتی اس لیے آرام نہیں ملتا۔

دریافت پر فرمایا کہ مرادآباد میں تمام مسجد اندر باہر سے بھری ہوئی تھی۔ کئی ہزار آدمی تھے مگر وہاں کے لوگوں کو ہے وعظ سے رغبت اور اشتیاق۔ اکثر یہی دیکھا ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ اِدھر اُدھر کے دیہات سے لوگ بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کل تو ہر طبقہ کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے عہدیدار، وکلاء، نئی وضع کے لوگ بہت دور تک پھیلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بیچ کے در میں کھڑے ہو کر بیان کیا۔ اسی میں آسانی ہوئی۔ ایک صاحب نے کہا کہ فلاں صاحب پر بہت حالت طاری ہو جاتی ہے اور خوب نعرے مارتے تھا ـــــ فرمایا جی ہاں بہت چیخ چلّا رہے تھے۔ لیکن مجھے چیخنے چلّانے سے ڈر نہیں معلوم ہوتا ہنسی سی معلوم ہوتی ہے کہ لوگ کیا کر رہے ہیں پھر مولوی رحم الٰہی صاحب کی بابت تذکرہ ہوا فرمایا کہ مولانا شیخ محمد صاحب سے بیعت ہیں اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری کے پیر بھائی ہیں۔ ان پر واقعی بہت حالت طاری ہوتی ہے کہ سنبھلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ عالم شخص ہیں، صاحب نسبت ہیں ضعف قلب سے بھی یہ بات ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کہ حضرت مولانا گنگوہی جب یہاں (یعنی خانقاہ امدادیہ میں) تھے تو حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا کہ حضرت مجھے رونا نہیں آتا اور ذاکرین پر بہت گریہ طاری ہوتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ ہاں جی اختیاری بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی آنسو بھی نکلتا ہے۔ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ جب مولانا ذکر کرنے بیٹھتے تو تاب نہیں ہوتی تھی۔ اس قدر گریہ طاری ہوتا تھا کہ پسلیاں ٹوٹنے لگتیں۔ عرض کیا کہ حضرت اب تو ہڈیاں پسلیاں ٹوٹی جاتی ہیں۔ فرمایا کہ ہاں یہ بھی ایک عارضی حالت ہوتی ہے۔ جاتی بھی رہتی ہے۔ بس پھر گریہ وغیرہ سب جاتا رہا۔ مولانا نے پھر شکایت کی حضرت اب رونا نہیں آتا۔ فرمایا کہ پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ کیا کرو گے رو کر ــــــــ

دریافت پر فرمایا کہ مرادآباد جانا اس لیے ہو گیا کہ وہاں بہت دن سے وعظ کا وعدہ تھا۔ موقع خاص یہ ہو گیا کہ حاجی مرتضیٰ علی کے یہاں عقد تھا۔ انھوں نے مجھ کو شرکت کے لیے لکھا۔ میں نے لکھ دیا کہ تقریبات کی شرکت میں نہیں کیا کرتا۔ گو رسوم سے بھی خالی ہوں لیکن

(باقی بر صفحہ ۷۸)

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

تحریک خلافت ــــ میری نظر میں

نئی پود رفتہ رفتہ اپنے ماضی سے بے خبر ہوتی جارہی ہے، جن مجاہدین اور تنظیموں نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائی، سربکف میدان میں آکر ملک وملت کی راہ میں قربانیاں دیں، ہم دن بہ دن ان کے ناموں سے بھی ناآشنا ہوتے جارہے ہیں۔ دور کیوں جائیے۔ ماضی قریب کی ایسی عظیم شخصیتوں کے نام لیجیے اور دورِ حاضر کے نوجوانوں سے ان کے حالات اور کارناموں کے بارے میں پوچھیے، اکثر کو آپ ان کے ناموں سے بھی ناواقف پائیں گے اس کے برخلاف فلمی ستاروں، ایکٹروں کے پرائیوٹ حالات بھی ان کے نوک زبان ہوں گے۔

تحریک خلافت جس نے پورے ہندوستان کو آزادی کے جذبات سے سرشار کیا، ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کا محیر العقول منظر پیش کیا، سارے ہندوستان کو اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور حکومت برطانیہ کے خلاف صف آرا کردیا، غیر منقسم ہند کے باشندوں کو خودشناسی و خودنگری سے مالا مال کیا، ہماری قوم اُسے بالکل بھلا چکی ہے۔ مولانا محمد علی شوکت علی کون تھے؟ مولانا محمود حسن، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ نے ملک وملت کے لیے کیا کیا؟ موتی لال نہرو لوکمانیہ تلک، سبھاش چندر بوس نے مادرِ وطن کی کیا خدمت کی؟ اس قسم کے سوالات نئی نسل کے لیے پہیلیوں اور معموں سے کم نہیں۔

قاضی عدیل عباسی کی تازہ تصنیف

خدا بھلا کرے جناب قاضی محمد عدیل عباسی کا انھوں نے "تحریک خلافت" لکھ کر ہماری تاریخ کے بے انتہا درخشاں سنہرے باب کو اجاگر کیا ہے۔ قاضی صاحب موصوف خود تحریک خلافت کے بقایا مجاہدین میں ہیں، وہ شروع سے آخر تک اس تحریک سے وابستہ اور اس میں تن من دھن سے شریک رہے، جیل بھی گئے، اس لیے انھیں تحریک خلافت پر قلم اٹھانے کا حق تھا۔ انھوں نے زیادہ تر اپنے چشم دید حالات وواقعات لکھے ہیں۔ تحریک خلافت کا دور دیکھنے والے اکثر بلکہ قریباً سب ہی اہل قلم اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ قاضی صاحب اسی گذرے ہوئے قافلہ ہی کے ایک فرد ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر اپنا فرض ادا کیا ہے اور نئی نسل پر بہت بڑا احسان بھی۔

موصوف بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ تحریک خلافت کی تاریخ نویسی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں انھوں نے بہت محتاط سنجیدہ محققانہ انداز میں اس ہنگامہ خیز ہمہ گیر دور میں تحریک کا مبصرانہ جائزہ لیا ہے۔ اس کامیاب تصنیف پر ہم قاضی صاحب کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

حسن انتخاب

وزارت تعلیم حکومت ہند کے "ترقی اردو بورڈ" نے یہ کتاب فوٹو آفسیٹ پر دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ بڑی آب وتاب سے شائع کی ہے۔ اس کتاب کو شائع کر کے بورڈ نے اردو مطبوعات کی فہرست میں ایک نہایت مفید اور قیمتی کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ "ترقی اردو بورڈ" کے ذمہ داروں کو ہم اس حسن انتخاب اور اردو نوازی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کتاب کے مجموعی صفحات ۲۷۹ ہیں کتابت بہت باریک حروف میں ہے (لیکن بہترین کتابت اور آفسٹ کی طباعت کی وجہ سے حروف روشن ہیں) اگر اوسط درجہ کے حروف میں کتابت ہوتی تو ۴۰۰ سو صفحات سے کم نہ ہوتے۔

"تحریک خلافت" میں قاضی صاحب نے تحقیق اور دیدہ وری کے ساتھ اس دور کی تحریک آزادی کی بھی پوری تاریخ سمیٹ لی ہے۔ ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے رہائی دلانے میں جن افراد اور تنظیموں کا جتنا حصہ رہا ہے اسے پورے انصاف کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ پوری کتاب لائق مطالعہ ہے لیکن چند مقامات جن سے میں خاص طور سے متاثر ہوا اس وقت انہی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

تحریک آزادی میں علماء کا حصہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ چند صدیوں سے ہندوستان کے علماء اور مشائخ نے اپنی سیاسی و ملی ذمہ داریوں کو جس طرح پورا کیا ہے اس کی مثال دوسرے ممالک کے علماء کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی —— لیکن ہمارے ملک کے مورخین تاریخ کے اس باب کو چھپانے بلکہ مٹانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں —— غیر مسلم تاریخ نویسوں کی کیا شکایت کی جائے اکثر و بیشتر مسلمان مورخین نے بھی علماء کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے —— علماء و مشائخ کے خلاف لکھتے ہوئے اور ان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ان کے قلم کی جولانیاں آسمانوں سے باتیں کرتی ہیں، مگر جہاں مشائخ و علماء کے کارناموں کا ذکر آتا ہے وہاں زبان قلم خاموش ہوجاتی ہے یا مجبوراً دبے لہجے میں تذلیدہ بیانی کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اللہ کا فضل ہے کہ قاضی صاحب اس ذہنیت کا شکار نہیں ہوئے —— بلکہ اس کے برعکس انھوں نے نہایت زور و قوت کے ساتھ اس طبقہ کے کارناموں کا ذکر کیا ہے ——

"تحریک شیخ الہند" یا "ریشمی رومال کی تحریک" کے بارہ میں انھوں نے مختصر مگر بہت جامع لکھا ہے۔ قاضی صاحب کا بیان پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کس قدر دور رس اور ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے تمام ممالک اسلامیہ کو استعماری پنجوں سے نجات دلانے کا پروگرام بنایا تھا۔ قاضی صاحب نے اس تحریک کے چند ایسے مخفی گوشوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے کتابیں عام طور سے خالی ہیں، چند ایسے انکشافات کیے ہیں جو "نقش حیات" میں بھی نہیں ہیں، اس طرح تحریک آزادی کے مورخین کے لیے

تحقیق و تلاش کے نئے میدان فراہم کیے ہیں۔

شیخ الہند نے اپنی تحریک غیر معمولی رازداری کے ساتھ چلائی تھی۔ پورا منصوبہ اور پلان انہی کے ذہن میں تھا ـــــ شاگردوں، مریدوں، اور تحریک کے کارکنوں کو صرف اُن کاموں کا علم ہوتا جن کی انجام دہی ان کے ذمہ کی جاتی ـــــ مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے مقربین اور رازداروں کو بھی شیخ الہند نے اپنی تحریک کی پوری تفصیلات سے مطلع نہیں کیا۔ اسی لیے ان کی تحریک کے اکثر گوشے ہماری نگاہوں سے اوجھل رہے ـــــ قاضی صاحب نے مختلف حضرات سے معلومات فراہم کر کے بعض ایسے مخفی گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ فرصت ملنے پر "تحریک خلافت" اور بعض دوسرے ماخذ سے اخذ کر کے "تحریک ریشمی رومال" سے متعلق معلومات ایک مضمون کی صورت میں مرتب کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کروں۔

سرسید مرحوم کے بارہ میں قاضی صاحب کا نقطۂ اعتدال

مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں دہلوی کے بارہ میں اکثر لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، ایک طبقہ ہے جو اُن کے اس کارنامہ سے کہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کر کے وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا، اس قدر متاثر ہے کہ اُن کو اپنے دور کا سب سے بڑا مسلمان مفکر ہی نہیں عظیم سیاسی رہنما اور رازی و غزالی کے درجہ کا دین کا رازداں بھی سمجھتا ہے، اور اسی وجہ سے اُن علماء کے خلاف سخت زبان استعمال کرتا ہے جنھوں نے سرسید احمد خاں کے مخصوص متجددانہ افکار و معتقدات پر سخت تنقید کی تھی اور اُن کے خیالات کو زیغ و ضلال اور دین میں تحریف قرار دیا تھا۔

اور دوسرا طبقہ ہے جو اُن کے ان مذہبی افکار و معتقدات ہی کی وجہ سے اُن سے اس درجہ بیزار ہے کہ کسی حیثیت سے بھی ان کی عظمت اور بڑائی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ـــــ اب رفتہ رفتہ اس دوسرے طبقہ کی آواز دبتی جا رہی ہے یا کہا جائے کہ اُس میں حقیقت پسندی اور اعتدال آگیا ہے ـــــ لیکن پہلے طبقہ کا اب بھی یہی حال ہے کہ سرسید احمد خاں مرحوم کی سیاسی

فکر اور مخصوص مذہبی خیالات و معتقدات پر تنقید بھی اس کو گوارا نہیں —— اور اکثر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ مرحوم کے حالات و خیالات سے واقف بھی نہیں ہوتے۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کرنے اور اس کے لیے علی گڑھ کالج قائم کرنے کے سلسلہ میں سرسید احمد خاں نے جو جد و جہد کی اور انتہائی مخالف فضا میں جس طرح جان و مال کی بازی لگا کر یہ مہم چلائی اس کا اعتراف کرنا چاہیے اور ماننا چاہیے کہ انھوں نے قوم کی یہ بہت بڑی خدمت کی۔ اور اس لحاظ سے وہ قوم کے بڑے محسن ہیں —— لیکن اسی کے ساتھ اس واقعی حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب سے بحد مرعوب تھے اور اسی مرعوبیت کے نتیجہ میں انھوں نے اسلامی حقائق و معتقدات کی جو نئی تشریح و تفسیر بلکہ تحریف کی وہ ان کی بڑی گمراہ کن غلطی تھی۔ اور جن علماء نے اُن کی اس غلطی کا نوٹس لیا اور عوام کے سامنے حقیقت کو واضح کیا انھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اگر علماء نے اس وقت جرأت سے یہ فرض ادا نہ کیا ہوتا تو ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل سخت گمراہی میں مبتلا ہو گئی ہوتی —— سرسید احمد خاں نے اسلامی حقائق و معتقدات کی جو نئی تشریحات کی تھیں اُن پر علماء دین کی تنقید ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی اب شاذ و نادر ہی ایسے افراد ہوں گے جو ان مخصوص مذہبی خیالات و معتقدات میں سرسید احمد خاں کے پیرو ہوں —— علماء کی بروقت تنقید و احتساب نے اُن کی تشریحات و تحریفات کو نسیاً منسیاً کر دیا۔

افسوس بلکہ دکھ کی بات ہے کہ انھی علماء کرام کے ہمارے زمانہ کے بعض اخلاف و وارثین (جو ماشاء اللہ خود بھی اپنے دور کے مشاہیر علماء میں سے ہیں) سرسید احمد خاں کے مخصوص معتقدات پر ان کے معاصر علماء کی تنقید کا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا کہ ان علماء نے کوئی ایسا غلط کام کیا تھا جس کے لیے اُن کے اخلاف اور وارثوں کو اُن کی طرف سے معذرت کرنے کی ضرورت ہے ——

حق یہ ہے کہ صفائی سے کہا جائے کہ سرسید احمد خاں مرحوم کا قوم پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ان کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور علی گڑھ کالج قائم کیا جو اب یونیورسٹی ہے —— اور اسی طرح اُن علماء نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی اور اپنا فرض ادا کیا جنھوں نے سرسید احمد خاں کے غلط اور گمراہ کن خیالات و معتقدات پر تنقید کر کے مسلمانوں کے دین کی حفاظت فرمائی ——

اگر اس میں کسی طرف سے بھی حد سے تجاوز ہوا تو وہ بیشک، قابل مذمت ہے۔

جناب قاضی عدیل عباسی صاحب علیگیرین ہیں۔ انھوں نے علماء کے زیر سایہ مدارس میں تعلیم پانے کے بجائے سرسید مرحوم کے چمنستان سے خوشہ چینی کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی اور اس کے بانی کی محبت ان کی رگ و پے میں رچ بس گئی ہے۔ اس کے باوجود سرسید کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ جادۂ اعتدال سے ایک قدم نہیں ہٹے۔ سرسید کی عبقریت، کمالات، خدمات اور کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے بڑے ادب اور سلیقہ کے ساتھ سرسید کی تحریک کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے ——— اور ان علماء کے موقف کو سراہا ہے جنھوں نے ان کے متجددانہ اور نیچریانہ خیالات و معتقدات کا سختی سے احتساب کیا تھا ——— کتاب کے صفحہ ۵۴ سے ۶۳ تک انھوں نے سرسید مرحوم کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے بہت متوازن، معتدل اور بے لاگ انداز میں لکھا ہے۔ یہ پوری بحث بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ ہم اس بیان کو مختصراً نقل کر رہے ہیں :-

سرسید مرحوم قاضی عدیل عباسی کی نظر میں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں جو عظیم شخصیت ابھری وہ سرسید کی تھی سرسید ایک بڑے ذی علم، روشن خیال، ذہین اور عالی دماغ انسان تھے۔ ان کو اگر عہد آفریں کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ سرسید ایسے روشن ضمیر اور دانا تھے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کوئی اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکا تھا، آج کا یہ منظر دیکھ لیا تھا اور اس کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔

سرسید نے دین داری اور مذہب کو جدید علوم اور جدید تہذیب سے ملا کر ایک نیا معاشرہ تعمیر کیا۔ سرسید انتہائی مخلص انسان تھے اور استقلال مزاج، صبر، بردباری، سنجیدہ شعور میں یکتائے روزگار تھے۔ انھوں نے مراسم کی زنجیریں توڑیں اور نئے آئین تہذیب و تمدن مرتب کیے جو آج بھی رائج ہیں، سرسید اور ان کے رفقاء نے مل کر ایک ایسا کالج بنایا جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور

جس نے ملت اسلامیہ ہندیہ کو سچے خدمت گذار اور وہ سب کچھ دیا جو اسے درکار تھا۔ سرسید نے قوم کو ہمت دلائی، کام کرنے کے لیے اکسایا، ناامیدی میں امید کا چراغ جلایا، ان سے کہا کہ اپنی خامیوں کا احساس کرو اور ان کو دور کرو۔ خودشناسی و خود اعتمادی اور قول و عمل میں راستبازی کی تعلیم دی اور اپنے صبرو استقامت سے قوم مسلم کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑایا۔ لیکن سرسید ہندوستان کی سیاست پر اس وقت نمودار ہوئے جبکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان بری طرح کچلا گیا تھا۔ قتل، پھانسیوں اور جائدادوں کی ضبطی کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو عرصہ تک جاری رہا تھا، اور مکمل تسلط ہونے کے بعد ہی انگریز حکومت نے جونیئر ملازمتوں سے مسلمانوں کا مکمل اخراج کر دیا تھا۔ بڑی ملازمتیں تو خیر ہندوستانیوں کو ملتی ہی نہ تھیں۔ سرسید ان حالات سے بے انتہا متاثر تھے۔ سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے الگ رہیں اور صرف تعلیم تک اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دینے میں سرسید کا منشا یہ تھا کہ مسلمان انگریز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں انگریز ہندوستان سے نہ جائیں کیونکہ وہی مسلمانوں کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

کم و بیش ۹۰ سال سے زائد گذر جانے کے بعد آج جب ہم سرسید کی تقریر پڑھتے ہیں تو جہاں تک سیاسی فکر کا سوال ہے ہمیں سرسید عظیم نہیں معلوم ہوتے البتہ جہاں تک ان کی تعلیمی خدمتوں کا معاملہ ہے وہ آسمان عظمت کے مہر و ماہ نظر آتے ہیں۔ سرسید کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اندازہ ہی نہ کر سکے کہ ملک ضرور آزاد ہو گا اور نہ یہ سوچ سکے کہ تب مسلمانوں کا کیا حال ہو گا، ان کے پاس ہندوستان کی مختلف قوموں اور خاص کر ہندو مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی حل نہ تھا اس لیے انھوں نے راہ فرار اختیار کی، یہ بڑی جرائت کا کام ہے۔ جس شخص نے اتنا بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا ہو، جس نے ماحول کی پروانہ کی ہو اور جملہ فرسودہ توہمات کو کچل ڈالا ہو وہ اتنا کم نظر تو نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرسید نے اپنی دیدہ وری سے اس کو سمجھ لیا ہو کہ جو جال بچھا ہوا ہے اس کا توڑنا ان کے بس کا کام نہیں اور ایک عبوری دور

کے لیے ایک پالیسی اختیار کر لی ہو۔

سرسید صرف انگریزوں کی حکومت ہی سے مرعوب نہ تھے بلکہ ان کی تہذیب سے بھی اتنا ہی مرعوب تھے، جس کسی نے تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا مطالعہ کیا ہے یا سرسید کی تحریروں کو دیکھا ہے اسے معلوم ہے کہ وہ انگریزوں کی عادات اور ان کے اطوار اور رہن کے رہنے اور کھانے کے طریقوں کے کتنے مداح تھے بلکہ مشرقی طرز کو غیر مہذب اور دیہاتی پن قرار دیتے تھے۔

مذہب کے معاملہ میں بھی اُن کی مرعوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ کلام پاک کی جو تفسیر انھوں نے لکھی اس میں ملائکہ، الجنہ، معجزات، معراج جسمانی سب کا انکار کیا ہے۔ انگریزوں نے اپنے پروپیگنڈے کی فنکاری کے مظاہرے سے یہاں بھی تساہلی نہیں برتی اور اپنے ریزہ چینوں کی معرفت یہ مشہور کر دیا کہ علماء نے سرسید پر جو کفر کا فتویٰ دیا تھا وہ اس لیے تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کذب صریح ہے۔ انگریزی زبان، علوم جدیدہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کی کسی عالم نے کبھی مخالفت نہیں کی۔ سید جمال الدین افغانی جنھوں نے سرسید پر برملا کفر کا فتویٰ دیا تھا خود ان علوم کی تعلیم کا زبردست مبلغ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید جس طرح قرآن پاک کی تفسیر کرتے تھے اور پھر جس طرح مسلمانوں کو انگریزوں کے قدموں میں اس وقت ڈال رہے تھے جب دنیا میں اسلام کی تباہی کا انگریز زبردست جال بچھا رہا تھا ان سے علماء حق نے بیزاری ظاہر کی تھی۔ پس سرسید پر کفر کا فتویٰ اس لیے تھا کہ انھیں نیچری قرار دیا گیا تھا، انگریزی تعلیم دلانے کی وجہ سے نہیں۔

اس مسئلہ پر ایک عظیم ترین عالم و محقق و عارف کی رائے ذیل میں درج کی جاتی ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن رح نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی بنیاد رکھنے کے لیے جو اجتماع کیا گیا تھا اس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبے میں فرمایا: "آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی اجنبی زبان

سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔"

(تحریک خلافت صفحہ ۶۲ تا ۶۳)

مولانا علی میاں مدظلہ العالی نے بھی "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں سرسید اور انکی تحریک پر بہت معقول، متوازن تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ لیکن طبقہ علماء کے ممتاز فرد ہونے کی بنا پر شاید کوئی انکی رائے کو جانبداری پر محمول کرے۔ قاضی صاحب علیگ ہیں اور جدید تعلیمیافتہ طبقے میں قابل احترام شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنی انصاف پسندی اور حق پرستی کی بنا پر سرسید کی تحریک پر جو مبصرانہ، محققانہ رائے قائم کی ہے وہ "شهد شاهد من اهلها" کی مصداق ہے۔

تحریک خلافت کی ممتاز شخصیات

تحریک خلافت اور تحریک آزادی میں جن علماء، شعراء، ادباء، لیڈران نے حصہ لیا تھا قاضی صاحب نے ہر ایک کی ذات و خدمات کا بہت مبصرانہ تذکرہ کیا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، حسرت موہانی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر کچلو وغیرہ کو قاضی صاحب نے قریب سے دیکھا تھا اس لیے انکے کارناموں اور خدمات کا بلا کم و کاست تذکرہ کیا۔ مولانا آزاد کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، قاضی صاحب کی تحریر سے مولانا کی زندگی کے چند نئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا آزاد نے ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے ہجرت کا فتویٰ صادر کیا تھا، اس فتوے کی بنا پر ہزاروں گھرانے افغانستان کی طرف ہجرت کے لیے نکل پڑے وہاں جا کر ان مہاجرین کو بڑی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بہت سے افراد مشکلات کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گئے اور اکثر مہاجرین کو چار و ناچار ہندوستان لوٹنا پڑا۔ معلوم نہیں کس بنیاد پر پڑھے لکھے طبقہ میں بھی یہ بات مشہور ہو گئی کہ ہجرت کا یہ مشہور فتویٰ مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے دیا تھا۔ قاضی صاحب نے حوالہ جات کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ یہ فتویٰ مولانا آزاد کا تھا مولانا عبد الباری کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

"تحریک خلافت" کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے علمی بد دیانتی ہوگی اگر ہم اس کے بعض کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ نہ کریں، اگرچہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے پھر بھی دل کی خلش کو قاضی صاحب اور دوسرے اہل علم کی خدمت میں پیش کر دینا امید ہے کہ معیوب نہ سمجھا جائے گا۔ (جاری)

مولوی احمد نصر مظاہری بنارس

میرے محسن میرے مربّی

حضرت مولانا محمد اسعد اللہ نور اللہ مرقدہٗ

اپنے محسن و مربی، مدرسہ عالیہ مظاہر علوم کے ناظم اعلیٰ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ ارشاد حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ کی خبر وفات جب سے سنی ہے، حضرت کے احسانات اور عنایتیں جو اس ناچیز کے اوپر تھیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی ہیں۔

شوال ۱۳۹۱ھ کی بات ہے کہ میں مظاہر علوم میں داخلے کے لیے حاضر ہوا، چونکہ اس سے قبل میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے مدرسہ وصیتہ العلوم الہ آباد میں ایک زمانہ تک زیر تعلیم رہا تھا اس وجہ سے والد محترم کی فرمائش پر حضرت کے خدام میں سے مولانا جامی صاحب اور مولانا فاروق صاحب نے حضرت ناظم صاحب کے نام خطوط بھی لکھ کر دیدیئے تھے۔ تاکہ داخلے وغیرہ میں آسانی ہو سکے۔ میں جس دن سہارنپور پہونچا جمعہ کا دن تھا، مدرسہ میں پہنچکر معلوم ہوا کہ حضرت ناظم صاحب جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا فرماتے ہیں، نماز جمعہ کے لیے جاچکے ہیں، بعد نماز جمعہ ملاقات ہو سکے گی۔ میں نے دار الطلبہ قدیم کے ایک حجرہ میں سامان رکھا، نماز جمعہ کے لیے مدرسہ کی مسجد میں چلا گیا، بعد نماز معلوم ہوا کہ حضرت نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں وعظ بھی فرماتے ہیں اس لیے ذرا تاخیر سے تشریف لاویں گے۔ ۲-۳ کے درمیان تشریف لائے۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے بعد یہ دوسرے تھانوی بزرگ تھے جنکی زیارت ہونے والی تھی، حضرت الہ آبادی وصال فرما چکے تھے تاہم اُن کا شاہانہ رعب، دبدبہ

ابھی کل کی بات تھی کہ بچشم خود ان آنکھوں نے دیکھا تھا چنانچہ حضرت ناظم صاحب سے ملاقات کا تصور ہی پورے جسم میں لرزہ پیدا کیے ہوئے تھا۔ ڈرتے ڈرتے حاضری ہوئی سلام کے بعد مصافحہ کیا اور ادب سے ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ فرمایا کہ کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت میرا نام احمد نصر ہے، میرے والد کا نام ڈاکٹر محمد ظفر ہے، میں بنارس کا رہنے والا ہوں، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے مدرسہ میں پڑھتا تھا اب مظاہر علوم میں داخلے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ مولانا جامی صاحب اور مولانا فاروق صاحب نے آپ کے نام خطوط تحریر فرما کر دیے ہیں وہ پیش خدمت ہیں۔ یہ کہکر میں نے وہ دونوں خطوط پیش کر دیے۔

حضرت میرے اس مفصل جواب سے بہت مسرور ہوئے۔ فرمایا سنائیے ان حضرات نے کیا لکھا ہے۔ چنانچہ میں نے اُن خطوط کو سنایا۔ سنکر فرمایا کہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی قدس سرہٗ کو میں اپنا مربی مانتا ہوں، دل میں اس بات کی حسرت ہی رہ گئی کہ ملاقات کا شرف حاصل ہو مگر خدا کو منظور نہ تھا نہ ہو سکی۔ مولانا جامی صاحب اور مولانا فاروق صاحب میرے شاگرد ہیں میں ان کی قدر کرتا ہوں ———— پھر فرمایا کہ گھبرائیے نہیں انشاء اللہ تعالیٰ سب کام داخلے وغیرہ کا بآسانی ہو جائے گا اور جب تک داخلہ وغیرہ نہ ہو سکے آپ کھانا میرے ساتھ کھائیے گا۔

حضرت کی خصوصی توجہ سے سارا کام بآسانی ہوتا چلا گیا داخلہ بھی ہو گیا، قیام گاہ بھی تجویز ہو گئی، طعام کا نظم بھی ———— اب تعلیم شروع ہو چکی تھی اس وجہ سے صرف بعد عصر روزانہ حاضری دیتا۔ ایک مرتبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں تبلیغی اجتماع تھا میں اس سے قبل کبھی تبلیغی اجتماع میں شریک نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی اچھی رائے میں اس جماعت کے متعلق رکھتا تھا۔ خیال ہوا کہ قریب سے جا کر دیکھوں تو سہی کہ یہ لوگ کیا کرتے اور کیا کہتے ہیں؟ حضرت ناظم صاحب سے وہاں جانے کی اجازت چاہی۔ فرمایا شوق سے جاؤ اور ازراہ کرم آمد و رفت کے لیے سفر خرچ بھی عنایت فرمایا۔ حضرت تبلیغی جماعت کے بہت حامی تھے حتیٰ کہ بیعت کے وقت مریدین سے تبلیغی جماعت میں نکلنے کا عہد بھی لیتے تھے۔

جمعرات کا دن تھا میں طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ نانوتہ گیا پورے اجتماع میں شریک رہا۔

حضرت مولانا انعام الحسن صاحب مدظلہٗ امیر جماعت سے قلب بیحد متاثر ہوا۔ ان کے بیان میں بلا کی جاذبیت تھی، جس قدر بھی شکوک و شبہات اس کام کی طرف سے تھے سب ختم ہو گئے، اور دل اس کام کی اہمیت کا قائل ہو گیا۔ یہ حضرت ناظم صاحب کے طفیل میں اور ان کی توجہ کی برکت سے ہوا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں آپ کو اولاد کی طرح مانتا ہوں، کوئی ضرورت پیش آوے تو بلا تکلف کہدیں۔ ـــــ وقتاً فوقتاً خفیہ طور پر حضرت مالی اعانت بھی فرماتے رہتے تھے۔ ـــــ حضرت مرحوم مغفور کے یہ احسانات زندگی بھر یاد آتے رہیں گے۔

حضرت کے خادم خاص میاں محمد گورا اتفاق سے پندرہ بیس دن کے لیے اپنے گھر جانے لگے چونکہ دارالطلبہ قدیم کی مسجد میں امامت وہی کرتے تھے اس لیے سوال پیدا ہوا کہ کون اب امامت کرے گا۔ حضرت ناظم صاحب نے ازراہ ذرہ نوازی مجھے منتخب فرمایا اور میں حضرت کے حکم کی تعمیل میں کئی ماہ تک امامت کرتا رہا۔ حضرت کے اُن خادم کے آجانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت مرحوم نماز باجماعت بہت پابندی کے ساتھ ادا فرماتے تھے ـــــ ۲۹ سال تک آپ نے نماز اس طرح ادا فرمائی کہ جماعت کیا بلکہ تکبیر اولیٰ بھی فوت نہیں ہوئی۔ معمولات کے بھی بہت پابند تھے اکثر و بیشتر مغرب اور عشاء کے فرض کے بعد جب قرأت وغیرہ کی خامیوں پر توجہ فرماتے تو مسجد میں سناٹا چھا جاتا تھا اور میں نہایت شوق اور طلب سے حضرت کی باتیں سنتا، ناگواری کا اثر تو کجا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا کہ اصلاح فرمائی جارہی ہے چنانچہ بفضلہ تعالیٰ حضرت کے بار بار توجہ دلانے سے نماز اور امامت کے سلسلہ کی بہت سی غلطیوں کی اصلاح ہو گئی۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ بیٹا میں خیر خواہی کی بناء پر تم کو ٹوکتا ہوں تم بُرا مت ماننا اور اگر ناگوار خاطر ہوا ہو تو معاف کر دینا ـــــ حضرت کے اس جملہ پر جو اثر پڑنا چاہیے تھا وہ پڑتا اور میں گویا زمین میں گڑ جاتا۔ ـــــ ایک مرتبہ فرمایا کہ کسی سے قرض مت لینا یہ فساد کی جڑ ہے۔ تقویٰ کی زندگی اختیار کرنا یہ زاد آخرت ہے ـــــ نہ کسی کی برائی کرنا نہ سننا۔

ایک مرتبہ چند طلبہ نے جو کہ مجھ پر حضرت کی اس نظر کی وجہ سے حسد کرتے تھے، میری ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر زبردستی ایک معاملہ میں پھنسا دیا۔ میں کم عمر ناتجربہ کار، ان شاطر طلبہ کے عزائم سے بے خبر ان کے چکمے میں آگیا، جب ہوش آیا تو اس وقت تیر کمان سے نکل چکا، ارباب مدرسہ نے

اُس معاملہ میں فیصلہ میرے خلاف کر دیا۔ (اگرچہ بعد میں وہ معاملہ رفع دفع ہو گیا) مگر چونکہ میں اُس معاملے میں خدا شاہد ہے کہ بالکل بے قصور اور مظلوم تھا اور فیصلہ میرے خلاف ہو گیا تھا اس وجہ سے میں دل برداشتہ ہو گیا تھا ــــــ چند روز کے بعد حضرت ناظم صاحب نے طلب فرمایا اور تنہائی میں فرمایا کہ "بیٹا میرا قلب تمھاری طرف سے بالکل صاف ہے میں تو اس کی تفصیل سے بھی ناواقف ہوں اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، تم میری طرف سے مطمئن رہنا ــــــ حضرت کے اس فرمانے کے بعد دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور بصیرت کا دل سے قائل ہو گیا، کہاں تک اُن احسانات کا ذکر کروں جو حضرت نے میرے اوپر فرمائے۔ حق تعالیٰ ان احسانات کا صلہ حضرت کو اپنے شایان شان عطا فرمائے۔

رمضان المبارک کے مبارک موقع پر

ہمیشہ کی طرح اس سال بھی عام خریداروں کے لیے خصوصی رعایت کا اعلان —— ۱۵ ستمبر تک موصول ہونے والے ہر آرڈر پر اپنی مطبوعات پر ۲۰ فیصد اور دیگر اداروں کی مطبوعات پر ۱۰ فیصد رعایت دی جائے گی۔ بعد کمیشن -/۱۰۰ روپے کے ہر آرڈر پر اپنی مطبوعات پر ۲۵% اور دوسروں کی مطبوعات پر ۱۵% رعایت دیجائیگی۔

منیجر

مولانا محمد منظور نعمانی کی چند عظیم تصانیف

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان اور بے حد دلنشین و مؤثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ۔ مولانا موصوف کی سب سے زیادہ مقبول کتاب۔ قیمت ۴/۵۰

معارف الحدیث

احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ —— مولانا موصوف نے اس انتخاب میں حدیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت محمدیہ کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے۔ قیمت مکمل ۴ جلد غیر مجلد -/۳۰، (مجلد و بگزین کے لیے فی جلد ۵۰/۲ مزید)

منتخب تقریریں

مولانا نعمانی مدظلہ کی ایمان افروز، اصلاحی و تبلیغی تقریروں کا مجموعہ جو اپنے اندر افادیت اور جامعیت کے ہزاروں پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ قیمت صرف -/۶

تصوف کیا ہے؟

مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد اویس ندوی کی مشترکہ تالیف۔ ان تمام حق پسند حضرات کے لیے اطمینان کا باعث ثابت ہوئی ہے جو تصوف کے بارے میں انصاف سے غور کرنا چاہتے ہیں۔ قیمت -/۵

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی دو نئی تصانیف

تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ

حضرت سید احمد شہیدؒ کے عظیم اصلاحی و مجاہدانہ کارناموں پر ایک اجمالی نظر اور اپنوں اور پرایوں کی ان کوتاہیوں اور زیادتیوں کی دلخراش داستان جو اللہ کے حق میں روا رکھی گئیں۔ قیمت ۳/۵۰

عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح

جماعت اسلامی کے بانی و رہنما مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے دین کی بنیادی اصطلاحوں (الٰہ، رب، دین، عبادت) کی ایک نئی تشریح کی تھی جو ان سے پہلے کسی مفسر، کسی محدث، کسی امام و مجتہد اور کسی فقیہ و متکلم اسلام نے نہیں کی۔ اور دعویٰ کیا تھا کہ دین کی ان بنیادی اصطلاحوں کا مفہوم و مطلب ان لوگوں نے صحیح سمجھا تھا جن کے زمانہ میں قرآن کا نزول ہوا۔ (خواہ وہ مسلمان ہوں جیسے صحابہ کرام یا ابو لہب و ابو جہل جیسے دشمنان اسلام) لیکن بعد میں جو لوگ اسلامی معاشرہ میں پیدا ہوئے وہ ان کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے۔ جس کی وجہ سے اس طویل مدت میں قرآن اور اسلام کی دعوت و تعلیم کو صحیح نہیں سمجھا جاسکا۔

مولانا ندوی مدظلہ نے مولانا مودودی کے اس دعوے کا اس تصنیف میں کتاب و سنت اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں محاسبہ کیا ہے، اور بتلایا ہے کہ یہ طرز فکر کتنا غلط، دین کے لیے کس قدر مضر اور دین والی امت کے لیے کس قدر خطرناک ہے۔ قیمت صرف -/۵

تفسیر ماجدی

مولانا عبد الماجد دریابادی (مدیر صدق جدید) کی مشہور و مقبول تفسیر — اب تک گیارہ پارے شائع ہو چکے ہیں۔

جلد اول مجلد۔ از پارہ ۱ تا پارہ ۵ -/۱۷

جلد دوم مجلد از پارہ ۶ تا پارہ ۱۰ -/۱۸

جلد سوم — گیارھواں پارہ -/۵

تفسیر ابن کثیر اردو

علامہ ابن کثیرؒ کی عظیم الشان مقبول عام و مستند تفسیر مع حواشی و اضافات۔ تین جلدوں میں مکمل۔

قیمت مجلد کامل سیٹ -/۱۷۵

زاد سفر مکمل

مستند احادیث نبوی کا مختصر لیکن جامع انتخاب۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ (شارح صحیح مسلم) کی مقبول و معروف کتاب "ریاض الصالحین" کا سلیس ترجمہ ضروری حواشی و تشریحی عنوانات کے ساتھ — ترجمہ از:- امۃ اللہ تسنیم صاحبہ ہمشیرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ نیا ایڈیشن ۲۲×۱۸ سائز پر عکسی طباعت کے ساتھ۔

قیمت جلد اول -/۱۵ جلد دوم -/۲۰

تبلیغی نصاب عکسی

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی کی مقبول عام تصنیف جو اب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

قیمت جلد اول مجلد سادہ -/۱۲، پلاسٹک -/۱۴، ریگزین -/۱۶

قیمت جلد دوم پلاسٹک -/۱۹

آپ بیتی مولانا عبد الماجد دریابادیؒ

مولانا موصوف کے قلم سے نکلی ہوئی "آپ بیتی" اور خود نوشت سوانح حیات — جس میں گذشتہ لکھنؤ اور اودھ کی ثقافت و تہذیب مشاہیر دین و ادب اور تمام معاصرین و احباب کے جیتے جاگتے تذکرے اور چلتی پھرتی تصویریں موجود ہیں — "آپ بیتی" میں مولانا کے جادو نگار قلم نے اپنی گذشتہ زندگی کے ساتھ عہد رفتہ کو اس طرح آواز دی ہے کہ وہ حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ قیمت -/۲۵

وفیات ماجدی یا نثری مرثیے

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے قلم سے لکھے گئے تعزیتی مقالے اور شذرے کا ایک منتخب مجموعہ۔

حکیم عبد القوی دریابادی کے قلم سے۔ قیمت مجلد -/۱۵

خطبات ماجد یا ہدیۂ زوجین

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے چار خطبات نکاح کا مجموعہ۔ مولانا کی دوسری تحریروں کی طرح یہ خطبے بھی ادبی شاہکار ہیں اور مذہبی حیثیت سے ان کی افادیت ہمیشہ بہار ہے۔ قیمت -/۱۰

معاصرین

اس کتاب میں مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے اپنے ننانوے معاصرین کا سرسری خاکوں میں تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۱۔ تینتالیس بڑے ۲۔ انتیس برابر والے ۳۔ اٹھائیس چھوٹے — بے حد مفید و معلوماتی کتاب ہے۔ قیمت -/۲۰

حج و مقامات حج

اعمال عمرہ و حج اور زیارۃ مقدسہ کے لیے ایک رہبر کتاب جس میں مسائل حج و عمرہ کے ساتھ اہم مقامات کی جغرافیائی تشریح بھی کی گئی ہے۔ قیمت -/۵

تفاسیر قرآن وعلوم قرآنی

تفسیر ابن کثیر اردو مکمل مجلد ۱۶۵/-
تفسیر حقانی ۱۵۰/-
تفسیر ماجدی اول مجلد ۱۸/-
" دوم مجلد ۱۸/-
" سوم ۵/-
تفسیر حل القرآن مکمل مجلد ۱۰۰/-
معارف القرآن مکمل ۸ جلدیں ۱۵۰/-
تفسیر رشیدی ۴/-
تفسیر الفوز الکبیر اردو ۳۳۵/-
فہم قرآن ۱۰/-
فضائل قرآن ۱/۵۰
قرآن کی باتیں ۲/-
قرآن اور تصوف ۱۰/-
قرآن مجید کی پہلی کتاب ۲/۲۵
قرآن اور تعمیر سیرت ۱۵/-
قرآن اور حدیث ۴/-
تدوین قرآن ۵/-
لغات القرآن ۵/-
معرکۂ ایمان و مادیت ۵/-

حدیث وعلوم حدیث

ایضاح البخاری ۱ تا ۳ ہر قسط ۶۵/-
تجرید بخاری اردو ۲۵/-
صحیح مسلم مکمل اردو ۲۰/-
ترمذی شریف اردو ۲۵/-
ترجمان السنہ مکمل ۱۰۰/-
حدیث رسول کا قرآنی معیار ۳/۷۵
شمائل ترمذی مع شرح خصائل نبوی ۱۸/-
مؤطا امام مالک اردو ۴۰/-
مجمع بحار الانوار عربی مکمل ۱۵۰/-
حصن حصین اردو کلاں ۲۵/-

فقہ وفتاوی

جواہر الفقہ (حضرت مفتی محمد شفیع صاحب)
اول ۲۴/- دوم ۲۴/-
حضرت عبداللہ بن مسعود اور انکی فقہ ۱۰/-
تاریخ فقہ اسلامی ۱۵/۷۵
فتاویٰ رحیمیہ اول ۲۰/- دوم ۲۰/-

سیرت نبوی

نبی رحمت ۳۰/-
اسوۂ حسنہ ۵/-
پیغمبر عالم ۱۲/-
پہلی تقریر سیرت ۴/-
دوسری تقریر سیرت ۵/-
خطبات مدراس ۶/۲۵
رسول اکرم کی سیاسی زندگی ۱۵/-
محسن عالم ۱/۵۰
نشر الطیب خورد ۴/-
منصب نبوت اور اسکے عالیمقام حاملین ۱۴/-
شان رسالت ۱/۵۰
وفات النبی ۳/۵۰
ہمارے حضور ۴/-
رسول اللہ کے تین سو معجزات ۴/-

نعتیہ مجموعے

عربی میں نعتیہ کلام ۱۰/-
کلید باب رحمت ۱/۲۵
گلبانگ حرم ۱۰/-
بادۂ وحدت ۱/-
گلزار مدینہ -/۶۰
گلہائے مدینہ ۱/۵۰
گلدستۂ نعت ۱/-
زمزمۂ نعت ۱/-
عقیدت کے پھول -/۶۰
نورشش ۱/-
نعت حضور ۳/۵۰
حمد باری -/۶۰
شمع رسالت -/۴۰

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گرانقدر تصانیف

کتاب	قیمت
ارکان اربعہ	۱۵/-
سیرت سید احمد شہید جلد اول ۲۰/- دوم	۲۰/-
کاروان مدینہ	۱۲/-
نقوش اقبال	۱۴/-
دریائے کابل سے یرموک تک	۱۴/-
پرانے چراغ	۱۶/-
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں	۶/-
تاریخ دعوت و عزیمت اول	۲۳/-
دوم ۱۵/- سوم	۱۴/-
جب ایمان کی بہار آئی	۱۲/-
دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں	۶/-
شرق اوسط کی ڈائری	۱۵/-
ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں	۵/-
تذکرہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ	۴/-
ذکر خیر	۳/-
قادیانیت مطالعہ اور جائزہ	۶/-
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر	۱۲/-
مقام انسانیت	۲/-
مذہب یا تہذیب -/۵۰ صورت و حقیقت	-/۵۰
آنکھوں کی سوئیاں -/۵۰ انسان کی تلاش	-/۵۰

سیر و سوانح، تذکرے

کتاب	قیمت
الفاروق	۱۵/۷۵
اسوۂ صحابہ اول ۹/۴۰ دوم	۱۲/۸۰
اسوۂ صحابیات	۳/-
امت مسلمہ کی مائیں	۲/۷۵
اسلام کی بہادر بیٹیاں	۳/-
امام رازی	۱۲/۵۰
الغزالی	۷/۸۰
الانور	۴۰/-
تابعین	۱۶/-
چار تارے	۴/۵۰
حیاۃ الصحابہ مکمل مجلد اردو	۵۵/-
حیات خلیل مکمل	۲۰/-
رسول اللہ کی صاحبزادیاں	۲/۷۵
سیرت عائشہ	۱۱/-
سیرت عمر بن عبدالعزیز	۶/۲۵
سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی	۱۵/-
صدیق اکبرؓ	۲۵/-
تذکرۃ الرشید	۳۵/-
تذکرۃ الخلیل	۱۰/-
تذکرہ علماء اعظم گڑھ	۱۴/-
تذکرۂ مدنی	۶/-

رد بدعت

کتاب	قیمت
بدعت کیا ہے؟	۹/۵۰
بدعت کی باتیں	۱۰/-
بریلوی فتنہ کا نیا روپ	۶/۵۰
بدعت اور شرک	۱/۵۰
فیصلہ کن مناظرہ	۲/۵۰
وہابی کی پہچان	-/۳۰
انگشت بوسی سے بائبل بوسی تک	۲/۵۰
اظہار حقیقت	۱/-
بریلی کا نیا دین	۳/-
باطل شکن	۳/-
بہار تعزیہ و بدعات مروجہ	-/۳۰
پیام صلح و اتحاد	۱/۲۵
چراغ سنت	۴/-
حق پر کون ہے؟	۲/-
حق نما	-/۸۰
زلزلہ در زلزلہ	-/۵۰
شہادت کا بیان	۱/۲۵
شان مصطفیٰ	۳/-
طریقہ فاتحہ	۱/۲۵
فلاح المسلمین اول ۱/۵۰ دوم	۱/۲۵
اصلاح المسلمین	۱/۷۵

ملنے کا پتہ: الفرقان بکڈپو - ۳۱ نیا گاؤں مغربی - لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

چندہ سالانہ
ہندوستان سے ۱۵/-
پاکستان سے ۳۰/-
بنگلادیش سے ۱۶/-
فی شمارہ ۱/۵۰

ممالک غیر سے چندہ سالانہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح یہ ہے۔
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد (۴۷) | بابت ستمبر ۱۹۷۹ء مطابق شوال المکرم ۱۳۹۹ھ | شمارہ (۹)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی پی روانہ ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۵ تاریخ تک آجانا چاہیے اس کے بعد رسالہ کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ پچیس روپے ہندوستانی سکہ میں جنگ کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں تیس روپے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجدیں۔

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

گذشتہ شمارے میں اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے بعد ستمبر اکتوبر کا مشترک شمارہ انشاء اللہ وسط ذیقعدہ تک شائع ہو جائے گا — وہ شمارہ تیاری کے قریب تھا، لیکن ایک وقتی مانع کی وجہ سے اس وقت اس کی اشاعت مناسب نہیں سمجھی گئی، اب صرف ستمبر کا یہ شمارہ نذر ناظرین کیا جا رہا ہے۔ اس میں صفحے کم ہیں، انشاء اللہ آئندہ تلافی ہو جائیگی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

کئی مہینے سے یہی ہو رہا ہے کہ نگاہِ اولیں کے ان صفحات میں کسی کے حادثۂ وفات کی اطلاع اور اُس سے متعلق اپنے احساسات و تاثرات اور رنج و غم کا اظہار اور جانے والوں کے لیے ناظرین کرام سے دعائے مغفرت کی استدعا کی جا رہی ہے — گزشتہ دو ڈھائی مہینوں میں متعدد ایسی ہستیاں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس دار فانی سے دار البقا کی طرف منتقل ہو گئیں جن کا حق ہے کہ الفرقان میں اُن کے سانحۂ ارتحال کا تذکرہ کر کے ناظرین سے مغفرت و رحمت کی دعا کی درخواست کی جائے — بعض پہلوؤں سے ان میں سب سے اہم حادثہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی وفات کا ہے، جنھوں نے آج سے صرف ۴ دن پہلے امریکہ کے ایک ہسپتال میں وفات پائی اور اخبارات و ریڈیو کی اطلاعات کے مطابق ان کی میت امریکہ سے لاہور لائی جا چکی ہے اور آج ہی لاہور میں ان کی نماز جنازہ اور تدفین ہونے والی ہے یا ان سطروں کے لکھے جانے کے وقت تک تدفین ہو چکی ہوگی ـــــ اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی ـــــ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔ (بعد کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ آج ۲۶ ستمبر کو بعد نماز ظہر نماز جنازہ قطر یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ یوسف القرضاوی نے پڑھائی اور اس کے بعد تدفین ہوئی)

مولانا انعام کریم مدنی :-

ہندوستان و پاکستان کے اُن حضرات میں سے جو جماعت دیوبند کے اکابر سے تعلق رکھتے ہیں خاصکر اہل علم کے طبقہ میں شاید ہی کوئی ایسے صاحب ہوں جن کو مدینہ منورہ حاضری نصیب ہوئی ہو اور وہ مولانا انعام کریم صاحب سے واقف نہ ہوں ـــــ موصوف اصلاً دیوبند کے متوطن تھے، نوعمری ہی میں مدینہ منورہ چلے گئے اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بڑے بھائی مولانا سید احمد صاحب مدنیؒ کے قائم کیے ہوئے "مدرسۃ العلوم الشرعیہ" سے وابستہ ہو گئے ـــــ راقم الحروف نے ان کو سب سے پہلے مدینہ منورہ ہی میں دیکھا جب اللہ تعالیٰ نے ۴۹ء میں پہلی بار حاضری نصیب فرمائی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مجھے ایک تعارفی خط اپنے بھتیجے سید حبیب مدنی صاحب کے نام لکھ کر دیدیا تھا، میں مدینہ منورہ پہنچکر سب سے پہلے "مدرسہ" جا کر اُن سے ملا اور حضرت مولانا کا خط دیا، وہ بڑی عنایت سے پیش آئے، اُن کے قریب میں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے، سید حبیب صاحب نے اُن سے فرمایا کہ مدرسہ سے متعلق کسی مکان میں میرے قیام کا انتظام کر دیں ـــــ یہی مولانا انعام کریم صاحب تھے ـــــ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر یہ بھی خاص انعام ہوا کہ میرے قیام کا بندوبست اس مکان میں ہوا جس میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا، اور اُن کے بعد کچھ مدت تک حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی علیہ الرحمہ کا بھی قیام رہا تھا ـــــ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جب جب مدینہ منورہ حاضری نصیب فرمائی ہمیشہ مولانا انعام کریم صاحب کی عنایات اس عاجز پر مبذول رہیں۔ ــــــ اب جبکہ "مدرسۃ العلوم الشرعیہ" ایک نہایت عالی شان عمارت ہے، اس کے نگراں اور منتظم وہی تھے، دوسری منزل کے ایک کمرے میں ان کا قیام تھا، خود بھی بہت صفائی پسند اور لطیف المزاج تھے۔ اُن کا کمرہ ہمیشہ بہت صاف ستھرا رہتا، اہلیہ کا بھی بہت مدت پہلے انتقال ہو چکا تھا، اُس وقت سے تجرد کی زندگی گزار رہے تھے ــــــ "مدرسہ" کی عمارت مسجد نبوی کے بالکل متصل ہے ۲۰ قدم سے زیادہ فاصلہ نہ ہوگا ــــــ مولانا انعام کریم صاحب پانچوں وقت بڑے اہتمام اور بڑے ادب سے مسجد شریف میں حاضر ہو کر اکثر اگلی صفوں میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے، میں نے ان کو مسجد شریف میں کبھی شیروانی کے بغیر نہیں دیکھا، نماز سے فارغ ہو کر مواجہہ شریف میں ۴۔۵ گز کے فاصلہ سے ایک ستون کے پاس سراپا ادب بن کر کھڑے ہوتے اور خاموشی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ و مخاطب ہو کر صلوٰۃ وسلام عرض کرتے، یہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ایسے ادب اور ایسی خاموشی کے ساتھ مواجہہ شریف میں سلام عرض کرتا ہوا میں نے شاید ہی کسی دوسرے کو دیکھا ہو ــــــ جہاں تک اندازہ ہے چالیس برس سے زیادہ اُن کا مدینہ منورہ میں قیام رہا اور سفر یا بیماری کی مجبوری کے علاوہ اس معمول میں غالباً کبھی ناغہ نہیں ہوا ــــــ

مخدومنا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ مہاجر مدنی کا قیام بھی مسجد شریف کے قرب کی وجہ سے "مدرسۃ العلوم الشرعیہ" ہی کی عمارت کے ایک حصہ میں رہتا ہے، حضرت شیخ کے اکثر زائرین اور مہمانوں کی خاص کر چائے کی میزبانی مولانا انعام کریم صاحب ہی کرتے، راقم سطور کا تو مستقل معمول تھا کہ جس وقت چائے کی طلب اور خواہش ہوتی سیدھا مولانا کے کمرے پر پہنچتا اور وہ دیکھتے ہی، گیس کے چولھے پر چائے کا پانی رکھ دیتے اور صرف ۴۔۵ منٹ میں اپنے ذوق کے مطابق بہترین چائے میرے سامنے آجاتی جو مدینہ منورہ میں غالباً کسی دوسری جگہ کسی قیمت پر نہ مل سکتی۔

میرے چھوٹے لڑکے مولوی خلیل الرحمان سجاد سلمہ، جو مدینہ منورہ میں بسلسلہ تعلیم مقیم ہیں

(مولانا انعام کریم صاحب اُن کے ساتھ بھی بڑی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے) آخر رجب میں ان کا خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ مولانا بالکل اچانک داعی اجل کو لبیک کہکر عالم آخرت کی طرف روانہ ہو گئے اور "مدرسہ" کا کمرہ خالی چھوڑ کے "جنۃ البقیع" میں جا بسے ——— پھر جب وہ شعبان میں لکھنؤ آئے تو حادثہ کی تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ زندگی کے آخری دن حسب معمول فجر سے مغرب تک کی نمازیں مسجد شریف میں پڑھیں، نماز مغرب کے بعد اپنے معمول کے مطابق مواجہہ شریف میں اپنی خاص جگہ کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام بھی عرض کیا، اس کے بعد اپنے کمرہ پہ تشریف لائے، کمرہ کھولا، نماز مغرب کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کا معمول تھا، قرآن پاک کھول کے سامنے رکھا، کوئی دوسرا آدمی اس وقت موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد شیخ الحدیث مدظلہ، کے کوئی خادم مولانا انعام کریم کے کمرے پر آئے دیکھا کہ وہ کمرے کے باہر گیلری میں گرے ہوئے ہیں اور ہاتھ میں پانی کا گلاس ہے اور صرف جسم ہے روح پرواز کر چکی ہے ——— اندر دیکھا تو قرآن پاک رکھا ہوا تھا ——— اندازہ یہ کیا گیا کہ تلاوت شروع کرنے سے پہلے یا اثنائے تلاوت میں وہ گلاس ہاتھ میں لیکر پانی لینے کے لیے کمرے سے نکلے تھے، ٹھیک اسی وقت پیغام اجل آگیا اور روح فوراً لبیک کہہ کے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

کیسی قابل رشک ہے یہ زندگی اور کتنی لائق رشک ہے یہ موت! ——— اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور درجات عالیہ نصیب فرمائے۔

ایک بندی کا انتہائی قابلِ رشک خاتمہ

مشرقی افریقہ میں ری یونین ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو فرانس کے زیر حکومت ہے، سینٹ ڈینس اس کا مرکزی شہر ہے، وہاں کے ایک مرد صالح حاجی داؤد انگادہ ۱۹۵۵ء میں مکہ معظمہ میں مرشدنا حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری قدس سرہ سے بیعت ہوئے تھے، اس نسبت سے اس عاجز کے ساتھ بھی اُن کا تعلق رہا اور ہے۔ اُن کے دو صاحبزادے ماشاء اللہ

عالم دین ہیں ــــ رمضان مبارک میں اُن کے بڑے صاحبزادے مولانا احمد سعید انگار کا خط آیا جس میں انھوں نے اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی اطلاع دی اور حادثہ کی عجیب کیفیت لکھی۔ اُن کے خط کا متن یہ ہے

"ایک افسوسناک اور غمناک حادثہ کی اطلاع دے رہا ہوں، والدہ ماجدہ محترمہ ۱۳ رمضان المبارک کو بعد نماز مغرب انتقال فرما گئیں ــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ان کی طبیعت بالکل اچھی تھی، روزانہ کا معمول تھا رات کو ۲ بجے اٹھتیں تہجد اور اس کے بعد ذکر اذکار اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتیں پھر سحر کا کھانا تیار کرتیں اور سب کو کھلاتیں اور خود کھاتیں۔ دوپہر کو تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر تلاوت میں مشغول ہو جاتیں، ۱۳ رمضان کو بھی یہ سارے معمولات اسی طرح پورے ہوئے، کسی قسم کی کوئی تکلیف یا بیماری کا اثر نہیں تھا۔ عصر سے پہلے نواسے، چھوٹے چھوٹے بچوں سے بات چیت کی۔ افطار کا وقت آجانے پر افطار کیا۔ ہم سب لوگ نماز کے لیے مسجد چلے گئے تھے، والدہ صاحبہ نے مغرب کی نماز ادا کی، اوابین کے نفل پڑھنا چاہتی تھیں کہ لیٹ گئیں، ہم سب مسجد میں تھے قریب میں بہن کا بس ایک چھوٹا سا بچہ تھا اس سے پانی مانگا، اس نے پانی دیا، دو تین گھونٹ پیا، اور بس اسی پر خاتمہ ہو گیا۔ ہم لوگ مسجد سے آئے تو دیکھا کہ روح عالم بالا کی طرف پرواز کر چکی ہے ــــ"

آگے دعائے مغفرت کے لیے لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ والدہ ماجدہ مرحومہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے بیعت تھیں ــــ

واقعہ یہ ہے کہ موت کے جب ایسے واقعات علم میں آتے ہیں تو بڑا ہی رشک آتا ہے اور دل میں تمنا پیدا ہوتی ہے ــــ ناظرین کرام سے درخواست ہے کہ مرحومہ کے لیے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی دعا فرمائیں۔

مولانا موسیٰ ٹیمول سورتی :-

راقم الحروف [illegible] میں جنوبی افریقہ کے مخلصین کی دعوت پر وہاں گیا تھا، اُن حضرات نے ایسا پروگرام بنایا تھا کہ ملک کے جن شہروں اور بستیوں میں مسلمانوں کی قابلِ لحاظ آبادی تھی قریباً سب ہی جگہ جانا ہوا، اس دورہ میں ایک مقام پر مولانا موسیٰ ٹیمول میرے میزبان تھے اب جہاں تک یاد ہے میں صرف چند گھنٹے اُن کے پاس رہا تھا، اسی وقت سے تعلق پیدا ہوا اُن کے بڑی محبت بھرے خطوط آتے تھے، خطوط کی زبان ایسی ادیبانہ ہوتی کہ علاقہ گجرات کے کسی عالمِ دین کی ایسی تحریر دیکھنا پڑھنا مجھے یاد نہیں، اب سے قریباً ۲-۳ مہینے پہلے ان کا خط جنوبی افریقہ ہی سے آیا تھا جس میں انھوں نے اپنی صحت کی خرابی کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ فلاں حکیم صاحب کا علاج کرانے کے ارادے سے میں وطن (سورت) جانے کا ارادہ کر رہا ہوں ——— میں نے اس خط کا جواب بھی دیا تھا اور علاج کے بارہ میں کچھ مشورہ بھی دیا تھا ——— پھر اس کے بعد ان کا کوئی خط نہیں آیا ——— میں یہی سمجھا کہ وہ ابھی جنوبی افریقہ ہی میں ہیں۔ گزشتہ رمضان مبارک کے اواخر میں اُن کے بڑے بھائی مولانا غلام حسین ٹیمول کے ایک مکتوب سے معلوم ہوا کہ وہ سورت تشریف لے آئے تھے اور ۲۷ رمضان المبارک کو سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے، حرکتِ قلب کا بند ہو جانا اس کا بہانہ بنا ——— جیسا کہ عرض کیا اس عاجز کے خاص محبین و مخلصین میں سے تھے اللہ تعالیٰ اُن کے اور سب اہلِ اخلاص و محبت کے حق کے مطابق دعائے مغفرت کا اہتمام نصیب فرمائے، ناظرین کرام سے بھی استدعا ہے۔

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی :-

راقم سطور ۱۹۴۳ء کے اواخر میں جب بریلی سے منتقل ہو کر لکھنؤ آیا تو مرحوم مولانا عبد السلام صاحب قدوائی جو اس سے پہلے دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاذ تھے، "ادارہ تعلیماتِ اسلام" کے نام سے ایک تعلیمی [illegible] چلا رہے تھے، یہ ادارہ امین آباد میں ایک بالائی منزل پر تھا

اس کی طرف سے ایک ہفتہ وار "تعمیر" بھی جاری تھا، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان سب کاموں میں ان کے معاون اور رفیق تھے، ہفتہ میں ایک دن (غالباً اتوار کے دن) ادارہ میں، قرآن مجید کا اور حدیث کی کتاب "ریاض الصالحین" کا عوامی درس بھی ہوتا تھا، یہ عاجز بھی مولانا علی میاں کے ساتھ درس کی اس مجلس میں اکثر شریک ہوتا تھا، کبھی کبھی میں بھی کچھ عرض کرتا ـــــ اس ادارہ کے ذریعہ بہت مفید کام ہو رہا تھا لیکن حالات کی ناموافقت سے ادارہ اور اس کے کام جاری نہ رہ سکے۔

پھر مولانا عبدالسلام صاحب ناظم دینیات کی حیثیت سے "جامعہ ملیہ دہلی" میں بلا لیے گئے ـــــ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد وطن (تلونڈی ضلع رائے بریلی) تشریف لے آئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک عہدہ "معتمد تعلیم دارالعلوم" کا ہے، یہ نہایت اہم علمی اور تعلیمی عہدہ ہے ـــــ ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داری کے ساتھ اس عہدہ کی ذمہ داری بھی مولانا علی میاں پر تھی، جب مولانا قدوائی مرحوم "جامعہ ملیہ" سے تشریف لے آئے تو مولانا علی میاں کی تحریک پر ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے یہ ذمہ داری مولانا موصوف کے سپرد کر دی۔

ـــــ کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اچانک انتقال فرما گئے، ان کی رحلت سے "دارالمصنفین اعظم گڑھ" میں جو خلا پیدا ہوا اُس کا تقاضا ہوا کہ مولانا قدوائی اس خلا کو پر کریں ـــــ اس کے بعد سے اُن کا زیادہ قیام اعظم گڑھ ہی میں رہتا۔ لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم ہونے کی وجہ سے قریباً ہر مہینے لکھنؤ تشریف لاتے۔ وہ بڑے معاملہ فہم اور صائب الرائے تھے، اس کے ساتھ بڑے سادہ اور منکسر المزاج ـــــ رمضان مبارک میں ان کا قیام اعظم گڑھ ہی میں تھا، آخری دنوں میں وہ اپنے وطن تشریف لائے ـــــ رمضان مبارک کی آخری رات (پنجشنبہ اور جمعہ کی درمیانی رات) کو ۳-۴ بجے کے درمیان اُٹھے اور سحری کے لیے گھر والوں کو اٹھایا، اسی وقت فالج کا سخت حملہ ہوا اور بیہوشی ہو گئی اور چند گھنٹے اسی حالت میں گزار کے اپنے خالق کے حضور میں پہنچ گئے۔

مولانا علی میاں (رائے بریلی) میں معتکف تھے، ان کو جمعہ کی صبح کو پہلے علالت کی اطلاع ملی اور نماز جمعہ کے بعد انتقال کی خبر مل گئی، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کل عید کی نماز کے بعد

جنازہ کی نماز اور تدفین ہو گی ــــ مولانا علی میاں اپنے ہاں نماز عید ادا کرنے کے بعد کار سے تکونڈی تشریف لے گئے، جنازہ کی نماز مولانا ہی نے پڑھائی، معلوم ہوا کہ علاقہ میں مولانا کی مقبولیت کی وجہ سے اور عید کا دن ہونے کی وجہ سے بھی ہزارہا ہزار کا مجمع تھا ــــ کیسی خوش نصیبی کہ رمضان مبارک کے آخری دن جو جمعہ کا دن تھا، انتقال ہوا اور عید کے دن (جو رحمت کے نزول و ظہور کا دن ہے) اللہ کے ہزارہا ہزار بندوں نے مغفرت و رحمت کی دعاؤں کے ساتھ رحمت الٰہی کے سپرد کیا۔ اللّٰهم اغفر له وارحمه واكرم نزله ووسع مدخله

مولانا عبداللہ المیمنی المدنی :-

اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک مبتدعین اور بریلوی مکفرین کا بمبئی شہر پر ایسا تسلط تھا کہ کسی صحیح العقیدہ عالم کے لیے توحید خالص اور اتباع سنت اور شرک و بدعت سے اجتناب کے موضوع پر وعظ کہنا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا تھا ــــ اللہ تعالیٰ نے اس ضلال و فساد کی اصلاح میں اپنے جن بندوں سے کام لیا اُن میں ایک ہمارے مخلص دوست مولانا عبداللہ المیمنی بھی تھے، اب سے قریباً ۴۰ سال پہلے اُن کی کوششوں سے بمبئی میں علماء حق کے مواعظ کا سلسلہ شروع ہوا۔ بمبئی میں تبلیغی جماعت کا کام شروع کرنے اور آگے بڑھانے میں بھی ان کا خاص حصہ رہا ــــ اب سے قریباً ۲۸ ــ ۲۹ سال پہلے وہ مدینہ منورہ چلے گئے، اور ہجرت کی نیت کر کے وہیں مقیم ہو گئے تھے ــــ اس عاجز کے ساتھ خاص عنایت و محبت کا تعلق تھا، ایک دفعہ مدینہ پاک کے پورے زمانۂ قیام میں انہی کا مہمان رہا ــــ طویل عرصہ سے صحت خراب تھی بہت ضعیف ہو گئے تھے۔

مخلص مکرم جناب الحاج محمد یعقوب صاحب (بمبئی) کے خط مورخہ ۱۵ ستمبر سے معلوم ہوا کہ ۱۲ ستمبر کو مولانا موصوف نے مدینہ منورہ ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور جنۃ البقیع میں مدفون ہوئے ــــ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کی دعاؤں اور آرزوؤں سے بہتر معاملہ فرمائے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی :۔

مولانا بہت مدت سے گردہ کے مریض تھے، اس کے علاوہ دوسرے عوارض بھی پیدا ہو گئے تھے، ادھر کچھ عرصہ سے خبریں مل رہی تھیں کہ ان کی صحت زیادہ خراب چل رہی ہے۔ غالباً رمضان مبارک سے کچھ پہلے کسی نے بتلایا تھا کہ ان کے ایک صاحبزادے امریکہ میں ڈاکٹر ہیں اور وہ ان کو علاج کے لیے امریکہ لے گئے ہیں —— پھر اب سے قریباً دو تین ہفتے پہلے معلوم ہوا کہ وہاں کسی اسپتال میں مولانا کے معدہ کا آپریشن ہوا ہے اور ڈاکٹر مطمئن ہیں کہ آپریشن کامیاب رہا اور اب بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے ——

"جماعت اسلامی پاکستان" کا سرکاری ترجمان ہفتہ وار "ایشیا لاہور" الفرقان کے دفتر میں آتا ہے، کبھی کبھی میری نظر سے بھی گزرتا ہے، ادھر جب سے آپریشن کی اطلاع آئی تھی خاص طور سے اس کا انتظار رہتا تھا —— چند روز پہلے اس کا وہ شمارہ آیا جس پر ۹ ستمبر کی تاریخ پڑی ہوئی ہے لیکن خود اُسی کی اندرونی شہادت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دن کی تاخیر سے شائع ہوا ہے اس میں "مولانا مودودی رو بصحت ہیں" کے زیر عنوان پورے ایک صفحہ پر خاصی تفصیل سے ان کا حال لکھا تھا۔ اس میں یہ بھی تھا کہ

> "۹ ستمبر کو مولانا کے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق نے امریکہ سے اپنے بھائی سید حسین فاروق کو اطلاع دی ہے کہ ڈاکٹر اب مولانا کی صحت کے بارہ میں مطمئن ہیں۔"

اسی میں آگے یہ بھی تھا کہ

> "۱۱ اور ۱۲ ستمبر کی درمیانی رات کو ایک اور اطلاع اچھرہ (لاہور) میں مولانا کے صاحبزادے کو موصول ہوئی ہے کہ الحمد للہ اب مولانا محترم کی طبیعت ہشاش بشاش ہے اور تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔"

یہ اطلاعات مولانا کے بارہ میں مطمئن کر دینے کے لیے کافی تھیں —— اس کے باوجود دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس عاجز کا مولانا کے ساتھ جو ذاتی تعلق کسی زمانہ میں رہا تھا اُس کے علاوہ ایک اور دینی غرض سے بھی (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) میں ان دنوں میں برابر دعا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو کامل

صحت عطا فرمائے اور وہ صحیح سلامت جلدی واپس تشریف لائیں ـــــ لیکن قضا، وقدر کا فیصلہ کچھ اور ہو چکا تھا جو ہمارے لیے پردۂ غیب میں تھا۔

۲۳ر ستمبر کو اتوار کا دن تھا۔ ہر اتوار کو مکان کے قریب والی مسجد میں قرآن مجید اور بخاری شریف کا عوامی درس ۹ بجے سے قریباً ۱۱ بجے تک ہوتا ہے۔ میں درس سے فارغ ہو کر واپس آیا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا ابوالعرفان صاحب تشریف لائے ـــــ انھوں نے فرمایا کہ "مولانا مودودی صاحب کے بارہ میں آپ کو اطلاع مل گئی ہوگی؟ ـــــ میں نے کہا مجھے کوئی نئی بات معلوم نہیں ـــــ انھوں نے بتلایا کہ اطلاع ملی ہے کہ گزشتہ رات امریکہ میں مولانا کا انتقال ہو گیا۔ اور جماعت اسلامی ہند کے دفتر سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی ہے ـــــ اس قلبی تعلق کی بنا پر جو ایک طویل مدت تک اس عاجز کا مولانا مرحوم کے ساتھ رہا تھا، دل پر جو اثر ہونا چاہیے تھا ہوا ـــــ ان کے لیے اور ساتھ میں اپنے لیے بھی[1] مغفرت کی دعا کی ـــــ اور سوچا کہ مجھے بھی اسی منزل پر پہنچنا ہے اور کیا خبر کہ وہ وقت قریب ہی ہو ـــــ (مولانا مرحوم کی عمر مجھ سے صرف دو سال زیادہ تھی، ان کی پیدائش ۱۳۲۱ھ کی تھی اور میری ۱۳۲۳ھ کی)۔

مولانا ابوالعرفان صاحب نے دارالعلوم میں جلسۂ تعزیت کے بارہ میں گفتگو فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ چونکہ مولانا علی میاں یہاں تشریف نہیں رکھتے اس لیے جلسہ میں آپ ہی کو تقریر کرنی ہوگی ـــــ بالآخر یہ طے ہوا کہ آج شام ہی کو جلسہ ہو ـــــ اور اگرچہ اس طرح کے تعزیتی رسمی جلسوں میں شرکت کا بہت مدت سے میرا معمول نہیں ہے، لیکن مولانا مودودی صاحب کے تعلق سے میں نے منظور کر لیا اور جلسہ میں مولانا مرحوم کی حیات و خدمات پر تقریر بھی کی[2]۔

مولانا مرحوم کے بارہ میں اگر میں اپنے معلومات و احساسات یہاں حوالۂ قلم کرنا چاہوں تو

---

[1] حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی بندہ کسی دوسرے مسلمان بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرے تو پہلے اپنے لیے مغفرت مانگے ـــــ اس طرح اس کی حیثیت صرف سفارشی کی نہیں ہوگی بلکہ سائل کی بھی ہوگی۔ ۱۲۔

[2] اس تقریر کے کچھ حصے مقامی روزنامہ "قائد لکھنؤ" کے ۲۶ر ستمبر کے شمارہ میں شائع ہوئے تھے۔ ۱۲۔

اس کے لیے ایک دفتر چاہیے ـــــ تاہم ایک دو باتیں ذکر کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بعض غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں جو شاذ و نادر ہی کسی کو عطا ہوتی ہیں۔ انھوں نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ میری تعلیم (یعنی عربی دینی تعلیم) بہت کم ہوسکی تھی، والد صاحب مرحوم کے انتقال کی وجہ سے اس کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا ـــــ انگریزی تعلیم کے لیے بھی وہ کسی اسکول یا کالج میں ایک دن کے لیے بھی داخل نہیں ہوئے، صرف ذاتی محنت و مطالعہ سے انھوں نے اس میں بھی اتنی دسترس پیدا کر لی کہ بے تکلف مطالعہ کر لیتے تھے۔

ان کی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی جب اُن کی ادارت میں "جمعیۃ العلما" کا پہلا اخبار "مسلم" کے نام سے ۱۹۲۱ء میں نکلنا شروع ہوا جو ۱۹۲۳ء تک جاری رہا ـــــ اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں "الجمعیۃ" بھی انہی کی ادارت میں نکلا ـــــ اسی نو عمری میں انھوں نے "الجہاد فی الاسلام" جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی۔ یہ ان کی خداداد غیر معمولی صلاحیت ہی کا نتیجہ تھا۔

ان کا ایک قابلِ تقلید وصف یہ تھا کہ وہ اپنا وقت ضائع بالکل نہیں کرتے تھے جس زمانہ میں جو کام کرنا ضروری سمجھا اسی میں لگے رہتے اور پوری توانائی صرف کر دی ـــــ یہ بہت بڑی بات ہے۔ ایسے ہی لوگ کچھ کام کر لیتے ہیں۔

ایک اور بات جس کا ذکر یہاں مناسب سمجھتا ہوں یہ ہے کہ جب حیدرآباد سے "ترجمان القرآن" اُن کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا[1] تو اس کا خاص موضوع اور نشانہ یہ تھا کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارہ میں دلوں میں یقین و اعتماد پیدا کیا جائے اور مغربیت کے اثر اور مستشرقین کی کتابوں کے مطالعہ سے جو شکوک و شبہات اور وساوس خاص کر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔

---

[1] "ترجمان القرآن" حیدرآباد ہی سے دراصل ایک دوسرے صاحب نے جاری کیا تھا، اُن کا نام غالباً محمد مصلح تھا ـــــ جس طرح مرحوم عبدالمجید قریشی صاحب نے لاہور سے "تحریک سیرت" شروع کی تھی، اسی طرح قریباً اسی زمانہ میں محمد مصلح صاحب نے حیدرآباد سے "تحریک قرآن" چلائی تھی اور اس کے آرگن کے طور پر "ترجمان القرآن" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا وہی اس کے بانی اور ایڈیٹر تھے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے تو کسی معاملہ اور معاہدہ کے تحت وہ رسالہ مولانا مودودی صاحب نے ان سے لے لیا، اُن کی ادارت میں وہ محرم ۱۳۵۲ھ سے نکلنا شروع ہوا۔

اس میدان میں مولانا کی تحریروں کا خاص امتیاز یہ تھا کہ ان میں مرعوبیت کا اثر ذرہ برابر اور معذرت اور دفاع کا انداز بالکل نہ ہوتا تھا، بلکہ اقدام اور حملہ کا انداز ہوتا تھا۔ ان کی یہ تحریریں بڑی موثر اور یقین آفریں ہوتی تھیں ـــــ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان تحریروں نے کتنے بندوں کے دلوں سے شکوک و شبہات دور کر کے اسلامی عقائد و مسائل کے بارہ میں اعتماد و یقین پیدا کر دیا ـــــ اور یہ یقیناً ان کی بہت بڑی "حسنہ" اور دین کی بہت بڑی خدمت ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرما کر ان کے لیے مغفرت اور رحمت کا وسیلہ بنائے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے ان مضامین ہی نے اس زمانہ میں اس عاجز کو اور مجھ جیسے سیکڑوں "ترجمان" پڑھنے والوں کو ان کا نادیدہ عاشق بنا دیا تھا ـــــ پھر ایک عرصہ تک اس قلبی تاثر و تعلق میں "ترجمان" کے مسلسل مطالعہ سے اضافہ ہی ہوتا رہا، اور الفرقان کے صفحات میں بھی اس کا اظہار ہوتا رہا ـــــ پھر وہ ہوا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر تھا، (اس کا اجمالی ذکر آگے کی سطروں میں آ رہا ہے) ـــــ وکان امر اللہ قدراً مقدوراً ○

۲۲ر ستمبر (۰ر شوال) کو مولانا ابو العرفان صاحب سے مولانا کی خبر وفات سنکر اب سے ۴۰-۴۵ سال پہلے کا وہ دور پوری تفصیلات کے ساتھ گویا آنکھوں کے سامنے آگیا، جب راقم سطور کا ان کے ساتھ ایسا گہرا قلبی تعلق تھا کہ کم از کم میرے علم میں نہیں ہے کہ اس زمانہ میں کسی اور صاحب کا بھی مولانا سے ایسا تعلق رہا ہو، اس قلبی تعلق کے لیے "عشق" کا لفظ استعمال کیا جائے تو غلط نہ ہوگا ـــــ اس تعلق کی بنیاد جیسا کہ عرض کیا اب سے قریباً نصف صدی پہلے اس وقت پڑی تھی جب ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں حیدرآباد سے "ترجمان القرآن" مولانا کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا ـــــ اور اس تعلق کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) میں جب لاہور میں "جماعت اسلامی" قائم ہوئی تھی میں اس کی تاسیس و تشکیل میں ان کا شریک و رفیق تھا، اور "جماعت" کے بعض حضرات مجھے "ثانی اثنین" کہتے تھے

پھر جب جماعت کی مجلس شوریٰ کے ایک جلسہ میں میری اور مستری محمد صدیق صاحب مرحوم ہی کی تحریک پر یہ طے ہو گیا کہ دارالاسلام (پٹھان کوٹ) کو جماعت کا مرکز بنایا جائے اور جماعت کے

جن اہم ارکان کے لیے ممکن ہو وہ دارالاسلام ہی میں سکونت اختیار کرلیں، اور اس فیصلہ کے مطابق مولانا مودودی صاحب ۴۲ء کے وسط میں لاہور سے منتقل ہو کر دارالاسلام پہنچ گئے تو یہ عاجز بھی بریلی سے منتقل ہو کر وہیں پہنچ گیا — قریباً دس سال کے اس دور کو "قرب ووصل" کا دور کہا جاسکتا ہے —

پھر دارالاسلام کے اس قیام ہی میں بالکل خلاف توقع کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میں نے اس وقت صرف اپنی ذات کے لیے جماعت کے نظام سے الگ ہوجانا شرعاً ضروری سمجھا اور بالآخر انتہائی رنج وقلق کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے معذرت کردی لیکن جماعت کی اُس وقت کی دعوت اور اس کے اصل کام کے بارہ میں چونکہ میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اس لیے خیر خواہی وخیر اندیشی اور تعاون ودعاگوئی کا تعلق اس کے بعد بھی قائم رہا — مولانا کے ساتھ جو ذاتی تعلق تھا اپنے امکان کی حد تک میں نے اس کو بھی علیٰ حالہ باقی رکھنے کی کوشش کی اور جہاں تک مجھے علم ہے ہمارے درمیان کوئی ناخوشگواری پیدا نہیں ہوئی۔ (اگرچہ زمانہ کے امتداد کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر ان دونوں چیزوں میں کچھ نہ کچھ فرق پڑتا رہا) — یہ دور بھی قریباً ۱۰-۱۲ سال رہا، اس کو اگر "بین الوصل والفصل" کا دور کہا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا — اسی زمانہ میں ۱۹۵۲ء میں یہ عاجز پہلی دفعہ پاکستان گیا، لاہور میں مولانا سے ملاقات ہوئی — اُس وقت تک ان کی تفسیر تفہیم القرآن کی صرف پہلی جلد شائع ہوئی تھی، اس کا ایک نسخہ لاکر خود اپنے ہاتھ سے ہدیۃً عنایت فرمایا۔

اس کے بعد ایک وقت آیا کہ راقم سطور نے ۶۵ء کے اواخر میں پاکستان کا دوسرا سفر کیا یہ وہ وقت تھا کہ پاکستان کی الکشنی سیاست میں بھرپور حصہ لینے کی وجہ سے "جماعت" کے اصول اور طریق کار میں جو بڑی بڑی تبدیلیاں آئی تھیں[1] جن کے جواز کے لیے مولانا مودودی صاحب نے

---

[1] مثلاً الکشنی سیاست کے تقاضوں سے بعض ان باتوں اور طور طریقوں کو اپنا لیا گیا تھا جن کو پہلے صراحۃً ناجائز وحرام کہا گیا تھا — جس کی ایک افسوسناک مثال ۶۴ء کے صدارتی الکشن میں مس فاطمہ جناح کی حمایت بھی تھی۔ ۱۲

"دین میں حکمت عملی" کا نظریہ پیش فرمایا تھا) اس کی بنا پر "جماعت" کے صف اول کے قریباً ان سب ارکان کو جو کتاب وسنت کے علم اور اخلاص وتقوے میں یقیناً جماعت میں امتیازی مقام رکھتے تھے اور "سابقین اولین" میں سے تھے (اور یہ سب اس عاجز کے بھی جانے پہچانے دوست احباب تھے) مولانا مودودی صاحب سے شدید اختلاف ہو گیا تھا اور بالآخر انھوں نے جماعت سے قطع تعلق کر لیا تھا ـــــــ اُس وقت اِن دوستوں سے اس سلسلہ کے واقعات کی جو تفصیل معلوم ہوئی تو میں نے اُن کے موقف کو صحیح سمجھا اور اس کے بعد سے خود مولانا کے بارہ میں اور جماعت اسلامی کے بارہ میں میری رائے بدل گئی ـــــــ اور یہاں سے وہ تیسرا دور شروع ہو گیا جس کو "فصل اور فراق" کا دور کہا جا سکتا ہے۔

راقم سطور نے اُسی زمانہ میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ساتھ اپنے تعلق کے ان تینوں دوروں کا کچھ تذکرہ الفرقان کے صفحات میں کیا تھا (یہ اب سے ۲۲ سال پہلے کی بات ہے) اس کے بعد کچھ اور ایسے واقعات اور ایسی باتیں سامنے آئیں جن کا کچھ زیادہ اثر پڑا اور ان کی وجہ سے بُعد میں اور اضافہ ہوا۔

گزشتہ چند مہینوں میں متعدد ایسے محرکات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے میں نے ضرورت بلکہ ایک درجہ میں اپنی ذمہ داری سمجھی کہ ان تینوں دوروں کی سرگزشت (جو اس عاجز کی آپ بیتی کا ایک اہم باب اور ایک سبق آموز تاریخ ہے) پوری تفصیلات کے ساتھ قلم بند کر دی جائے۔ چنانچہ اس کو میں نے لکھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ کتابت بھی شروع کرا دی؛ سوچا تھا کہ الفرقان کا ستمبر، اکتوبر کا شمارہ مشترک شائع ہو (جس کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا) اور اسی ایک شمارہ میں یہ سرگزشت شائع کر دی جائے ـــــــ اس کے لکھنے کے درمیان خاصکر رمضان مبارک کے بعد سے دل پر اس کا شدید تقاضا اور داعیہ پیدا ہوا کہ یہ تیار ہو کر جلدی شائع ہو جائے اور مولانا مودودی صاحب کی نظر سے گزر جائے، میں نے اپنے قدیم تعلق کی بنا پر اور یہ سمجھتے ہوئے کہ بظاہر میری بھی اور ان کی بھی زندگی کا یہ آخری دور ہے اُن سے بعض اہم گزارشات کی تھیں اور جا بجا ان کو مخاطب بھی کیا تھا، اس لیے بھی ان دنوں میں اہتمام سے دعا کرتا رہا کہ

مولانا صحتیاب ہو کر امریکہ سے جلد ہی تشریف لے آئیں۔)

یہ سرگزشت سو صفحے سے بھی بڑھ گئی تھی، کتابت بھی آخری منزل میں تھی، دو تین دن کے بعد کاپیاں پریس جانے والی تھیں۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں اشاعت کا پروگرام تھا کہ ۲۳ ستمبر (۳۰ شوال) کو یہ غمناک اطلاع مل گئی کہ مولانا اب اس دنیا میں نہیں رہے، عالم آخرت کی طرف منتقل کر دیئے گئے، تو اس وقت اس کی اشاعت ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

بہرحال اب مرحوم مولانا مودودی اپنے رب کریم کے حضور پہنچ چکے، اللہ تعالیٰ جو غفور ورحیم اور تواب کریم ہے اُن کی حسنات اور دینی خدمات کو اپنی شانِ عالی کے مطابق قبول فرمائے، جزائے خیر سے نوازے اور ہمارے اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے مغفرت ورحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔

ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم۔

اپنے ناظرین کرام سے استدعا ہے کہ عام ایمانی رشتہ کی بنا پر بھی اور اس عاجز کے تعلق کا لحاظ فرما کر بھی ان تمام مرحومین کے لیے جن کی وفیات کا آج کی صحبت میں ذکر کیا گیا مغفرت ورحمت کی دعا کا اہتمام فرمائیں۔ —— اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔ واللہ یحب المحسنین۔

(صفی، ہاکلیھبیم) جب یہ ان کا کرم نہیں ہوتا — جلد سلسل درد غم نہیں ہوتا

حسن کا انتظام ہوتا ہے — عشق کا یونہی نام ہوتا ہے

غائب ہوا جاتا ہے حجابات کا عالم
مشہود لگا ہونے مغیبات کا عالم
محسوس لگا ہونے کہ دل عرش بریں ہے
اللہ رے یہ اُن کی ملاقات کا عالم
کہنے کی نہیں بات یہ کہتا ہوں مگر میں
پھر تا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم
بس پوچھیے ان سے جو محبت پہ فدا ہیں
حرکات کا سکنات کا لمحات کا عالم
قربان وہ کر دیتا ہے جنت کی بہاریں
پاتا ہے جو قسمت سے مناجات کا عالم
میں فرش کو بھی عرش سمجھنے لگا احمد
طاری ہوا جب اُن کے خیالات کا عالم

مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

مجلس بقیۃ السلف

حضرت مولانا محمد احمد پرتاپگڈھی مدظلہ العالی

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد مولانا محمد عاصم صاحب اور بعض دوسرے دوستوں کے ساتھ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی حضرت مولانا کا قیام عموماً صابری منزل میں رہتا ہے اسی لیے ہم لوگ حسب دستور وہاں حاضر ہوئے مگر وہاں جاکر معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کی طبیعت ان دنوں بہت زیادہ خراب ہے اور لوگ کثرت سے آتے رہتے ہیں جس سے سکون نہیں مل پاتا اس لیے ڈاکٹر ابرار احمد صاحب نے اصرار کر کے اپنے مکان میں منتقل کر لیا ہے فوراً ہی ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر حاضر ہوئے حسب معمول حضرت سراپا محبت بنکر ملے اور دیر تک دعائیں دیتے رہے پھر فرمایا کہ صحت انتہائی خراب ہے اور صابری منزل کی جگہ کو لوگ جان گئے ہیں ہر وقت لوگ گھیرے رہتے ہیں اس لیے یہاں آگیا ہوں تقریباً بارہ بج چکے تھے اس لیے ڈاکٹر صاحب کا نوکر حضرت مولانا کا کھانا لیکر آگیا۔ کھانا آتے ہی فرمایا کہ میں تو ڈاکٹر صاحب کا مہمان ہوں مجھے تو حق نہیں ہے کہ اس کھانے میں شریک کروں آپ لوگوں کے لیے الگ سے انتظام کر رہا ہوں۔ طبیعت کی خرابی کے باوجود کھانا چھوڑ کر اٹھنا چاہتے تھے کہ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم لوگ کھانا ساتھ لائے ہیں زحمت کی ضرورت نہیں ہے مگر پھر بھی کچھ چیزیں ہم لوگوں کی خاطر بازار سے منگا ہی لیں۔ کھانے کے بعد ہم مدرسہ بیت المعارف چلے آئے اور کچھ دیر آرام کے بعد ہم سب نے ظہر

کی نماز مدرسہ کی مسجد میں پڑھی، حضرت مولانا کمزوری اور تیز دھوپ و تپش کے باوجود جماعت میں شریک ہوئے جماعت کے بعد حضرت مولانا تو ڈاکٹر صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے، اور ہم لوگوں کو مولانا قمر الزماں صاحب نے چائے کے لیے مدرسہ میں روک لیا، ابھی ہم لوگ چائے پی کر حضرت مولانا کی خدمت میں چلنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ دیکھتے ہیں کہ مولانا دو آدمیوں کے سہارے خود تشریف لا رہے ہیں آتے ہی فرمایا کہ میں اس وقت آپ لوگوں کو چائے پر بلانا چاہتا تھا مگر معلوم ہوا کہ آپ لوگ یہاں چائے پی رہے ہیں تو میں بے اختیار چل پڑا کہ سرمد کا ایک شعر اور اپنا ایک شعر سناؤں سرمد کا شعر یہ ہے

سرمدؔ غم عشق بوالہوس را نہ دہند سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند

میرا شعر یہ ہے

نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے میں کچھ کہہ نہیں سکتا جو دستار فضیلت گم ہو دستار محبت میں

ان اشعار کی حضرت نے کوئی تشریح نہیں فرمائی مگر سرمد کے پہلے مصرعہ کو، اور دوسرے شعر کے اس مصرعہ کو کئی بار دہرایا "نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے میں کچھ کہہ نہیں سکتا"، "سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند"

اس استفہامیہ ابہام میں جو مبالغہ ہے اس کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں واقعہ ہے کہ دستار فضیلت آدمی کے اندر پندار اور غرہ پیدا کرتی ہے اور محبت، خاکساری، دردمندی اور بے نفسی پیدا کرتی ہے۔ ایسا محسوس ہوا کہ ان اشعار کو پڑھ کر دل و دماغ کی غفلت اور ذہنی کوتاہیوں اور سب سے بڑھ کر علم کے پندار کی خرابیوں اور غم عشق سے محرومی کی طرف اپنے مخصوص اندازِ محبت سے متوجہ فرمایا ہے۔ مولانا تھانوی فرماتے تھے کہ جناب مولوی پڑھتے ہیں اتنا ہی میں نے بھی پڑھا ہے مگر یہ فیضان علوم سب کچھ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں کا صدقہ ہے ہم نے مدرسوں میں بھائیوں کی فہرست پڑھی تھی مگر ان کے کھانے کے لیے حاجی صاحب کی خدمت میں جانا پڑا۔

یہ اشعار پڑھنے کے بعد حضرت وہیں کمرے میں بیٹھ گئے، اور دریائے فیض جاری ہو گیا چند شذرات الذہب جو میں محفوظ کر سکا ہوں وہ درج ذیل ہیں۔

فرمایا کہ قاضی سلیمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب رحمۃ للعالمین میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول میں قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد خداوندی لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ میں فرق بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنی عبدیت کا اظہار فرمایا ہے جو بڑی بات ہے اور نبی کا یہی مرتبہ ہوتا ہے وہ ہر موقع پر اپنی عبدیت کا اظہار فرمائے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ

لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا

جب اللہ کا بندہ خدا کی عبادت واطاعت کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ لوگ بھیڑ لگا کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ خود آپ کی عبدیت کاملہ کا اعلان و اظہار فرما رہے ہیں اس لما قام عبد اللہ یدعوہ سے کتنی محبت اور عظمت ٹپک رہی ہے۔

اسی ضمن میں فرمایا کہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ ذکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ذکر کرنے والے بندے کو یاد فرماتے ہیں، قرآن پاک میں ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ　　　تم مجھے یاد رکھو میں بھی تمھیں یاد رکھوں گا

تو ذکر کا اصل فائدہ یہی ہے، ایک بندہ ایک بہت ہی اچھا اور نیک کام کرتا ہے مگر اس کی اہمیت تو اسی وقت ہے جب وہ اللہ کے حضور میں مقبول بھی ہو یعنی اس کام کے ساتھ صرف بندہ کی رضا مندی کافی نہیں ہے بلکہ خدائے قدوس کی طرف سے بھی رضا ہو تب اس کی اہمیت ہے چنانچہ صحابہ کی شان یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ　　　ان سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہیں

یعنی ان کی طرف سے بھی رضائے خداوندی کا کام ہے اور وہ اللہ کے یہاں مقبول بھی ہے اسی لیے خدا تعالیٰ بھی ان کے کام سے راضی ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ولذکر اللہ اکبر (اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے) کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز کو ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا کہ مولانا تھانوی نے اپنے مواعظ میں ذکر کیا ہے کہ

ایک دیہاتی نے دلی جانے کا ارادہ کیا لوگوں نے پوچھا کہ دلی کیا کرنے جا رہے ہو بولا کہ شہزادی سے شادی کرنے جا رہا ہوں لوگوں نے پھر پوچھا کہ تم کیسے شہزادی سے شادی کر لوگے؟ اس نے کہا کہ میں تو شہزادی سے شادی کرنے پر راضی ہوں اب آدھا کام تو ہو گیا اب اس کی رضامندی کی بات ہے تو اب اسی لیے دلی جا رہا ہوں اس دیہاتی کی طرح ہم عمل کر کے سمجھتے ہیں کہ بس اتنا کافی ہے لیکن عمل تو وہی قیمتی ہے جو اللہ کے یہاں بھی مقبول ہو اگر صرف عمل پر اعتماد ہو اور اللہ کی رضا کا خیال اس میں شامل نہ ہو تو پھر ہماری مثال اس دیہاتی کی طرح ہے جو صرف اپنی رضامندی کی امید یا فریب پر شہزادی سے شادی کے لیے جا رہا تھا۔

فرمایا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ — قرآن پاک کو نہیں چھوتے ہیں مگر پاک لوگ

جس طرح ظاہری طہارت وضو یا غسل کے بغیر قرآن کا چھونا جائز نہیں ہے اسی طرح قرآن پاک پڑھنے والے کا قلب پاک و صاف نہ ہو تو قرآن پاک کے معانی و حکم اور اس کی روحانیت سے وہ بہرہ ور نہیں ہو سکتا اس لیے ظاہری طہارت کے ساتھ قلب کی صفائی بھی ضروری ہے۔

فرمایا کہ قرآن کے اندر ہے

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا — آپ اپنے رب کے حکم پر صبر سے جمے رہیے اس لیے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ اپنا کام کرتے رہیں، کسی کی پرواہ نہ کریں آپ کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا اس لیے کہ آپ میری نگاہوں کے سامنے اور میری حفاظت میں ہیں "فانک باعیننا" سے کتنی محبت ٹپک رہی ہے، سارے انبیاء پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگاہ کرم اور حفاظت ہوتی ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا کیا کہنا چنانچہ قرآن نے حضرت موسیٰ کے بارے میں بھی فرمایا ہے

وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ — میں نے اپنی طرف سے تمہارے اوپر محبت ڈال دی ہے تاکہ میری نگرانی میں پرورش پاؤ

پھر جب حضرت موسیٰ کو نبوت کے بعد فرعون کے دربار میں جانے کا حکم ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ

إِنَّنَا نَخَافُ أَن يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَن يَطْغَىٰ

ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہمارے اوپر زیادتی نہ کرے اور ظلم و بغاوت پر آمادہ نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ان کو تسکین دیتے ہوئے فرماتے ہیں

قَالَ لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ

ڈرو نہیں میں خود تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

انبیاء کا مرتبہ تو بہت بلند ہوتا ہے انبیاء کی سنت پر جو لوگ چلتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بھی حفاظت و نگرانی کا معاملہ رکھتا ہے اور کبھی آزمائش میں ڈال کر بھی اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں، پھر حضرت نے یہ شعر پڑھا۔

ناز کو ایک خصوصیت ساتھ میرے اگر نہیں
پھر یہ وہی بتائیں کیوں میری طرف نظر نہیں

فرمایا کہ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے کہا کہ حضرت ایک مخلوق جوق در جوق آپ کے یہاں آتی ہے کیا آپ نے کوئی عمل تسخیر کر رکھا ہے۔ فرمایا کہ میں تسخیر وغیرہ کچھ نہیں جانتا البتہ

أُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَنِي

میں ان سے محبت کرتا ہوں اس لیے وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

کسی نے حضرت گنج مراد آبادی سے کہا کہ حضرت آپ کا ہر عمل تو سنت کے مطابق ہے مگر آپ جو لوگوں کو بہت زیادہ ڈانٹتے اور بگڑتے ہیں یہ تو بہتر نہیں معلوم ہوتا فرمایا کہ جو شخص میرے پاس آتا ہے اس کے ساتھ اس کا شیطان بھی لگا رہتا ہے بس میں اسی کو ڈانٹتا ہوں بظاہر میں بگڑتا ہوں مگر دل میں اس کی طرف سے کوئی بات نہیں ہوتی۔

فرمایا کہ منصب ارشاد بڑا مشکل کام ہے۔ مرشد کو یہ سمجھنا چاہیے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں ہمیشہ ہر وقت اپنے قلب اور عمل کی نگرانی کرنی چاہیے، اسی طرح اتباع بھی بڑا مشکل کام ہے

... میں فنا کرنا آسان کام نہیں ہے قرآن پاک میں حضور کے اتباع کی شان [illegible] فرمایا گیا ہے کہ ... کے مطابق اتباع کرتا ہوں ورنہ میں فرشتہ نہیں ... میرے پاس کوئی خزانہ ہے بس میں تو اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف کی جاتی ہے۔

وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ

[illegible] اتباع کا ذکر خصوصیت سے کرنے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ایک طرف صاحب ارشاد (نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والا) ہوتا ہے تو دوسری اس کی حیثیت یہ ہے کہ وہ صرف وحی کا متبع ہوتا ہے۔ فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک کا ادب قرآن نے کئی جگہ [illegible] ہے ایک جگہ ہے

وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا　　جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ

یہی ادب اپنے سے بڑوں کا بھی ہونا چاہیے ہمارے اندر سے ادب تو بالکل نکل گیا ہے ہر شخص اپنی رائے کا پابند ہے۔

کسی نے سوال کیا کہ حضرت آپ کے اشعار میں حضوری کا ذکر بار بار آتا ہے اس کا کیا مطلب ہے فرمایا کہ حضوری دو طرح کی ہوتی ہے ایک بالواسطہ اور ایک بغیر واسطہ، بلاواسطہ حضوری کبھی کبھی ہوتی ہے اگر ہر وقت ہو تو استغراق کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور بالواسطہ حضوری ہر وقت ہو سکتی ہے وہ اس طرح کہ ہر وقت اللہ کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتا رہے اور یہ سوچ کر کرے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے گویا اس طرح اسے ہر وقت خدا کے دربار کی حضوری حاصل ہے۔

فرمایا کہ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کچھ لوگ آئے جن میں ایک عالم بھی تھے کچھ دیر لوگ رہے اور حاجی صاحب ان سے باتیں کرتے رہے جب یہ لوگ چلے گئے تو عالم صاحب بولے حضرت میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ آپ کیسے مولوی ہیں کیا صرف پڑھنا پڑھانا اور وعظ تلقین کرنا اور ذکر و اذکار کرنا ہی عبادت ہے دوستوں اور ملاقاتیوں کے ساتھ مشغول رہنا ان سے باتیں کرنا عبادت نہیں ہے ان کے بھی تو حقوق ہیں۔

فرمایا کہ ایک آدمی کے حال پر دوسرے کو قیاس نہیں کرنا چاہیے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب دونوں کا حال جدا جدا تھا مولانا گنگوہی وقت کا بہت خیال اور ضبط رکھتے تھے اور مولانا نانوتوی کے یہاں وقت کی کوئی تحدید نہیں تھا ہر وقت لوگ ان کے یہاں آتے رہتے تھے اب کوئی آدمی ایک دوسرے سے مقابلہ کرے تو شیطان کو بہکانے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ عقیدت میں کمی کرا دیتا ہے جس سے آدمی بہت سے فائدے سے محروم ہو جاتا ہے۔

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہوتے تھے تو بہت آہ آہ کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنا زیادہ پریشانی کا اظہار کیوں کرتے ہیں فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کے سامنے اپنی بیماری کا اظہار کرنے کے بجائے مقابلہ کروں، اس کے برخلاف مولانا محمد قاسمؒ بالکل خاموش رہتے تھے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دوا علاج کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے تو اس میں کسی کے طرز عمل پر نکیر نہیں کرنی چاہیے، ذوق میں کچھ فرق ہوتا ہے۔

فرمایا کہ ایک بزرگ مفلوج ہو گئے تھے، اٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے مگر ہر وقت الحمد للہ الحمد للہ زبان سے کہتے رہتے تھے، لوگوں نے کہا کہ آپ تو اتنے معذور اور مجبور ہو گئے ہیں پھر یہ شکر کس چیز کا ہے، فرمایا کہ بھائی شکر اس بات کا کرتا ہوں کہ اس نے قلب کو بالکل محفوظ رکھا ہے اور وہ ہر بیماری سے خالی ہے، یہ اللہ کا کتنا بڑا کرم ہے، اس واقعہ کو بیان کر کے مولانا نے فرمایا کہ ہم لوگ صرف ظاہری چیزوں اور نعمتوں پر شکر کرتے ہیں اور بہت سے لوگ وہ بھی نہیں کرتے مگر باطن کی نعمتوں پر کم ہی زبان سے شکر نکلتا ہے مگر اللہ والوں کی نگاہ ظاہر سے زیادہ باطن کی نعمتوں پر رہتی ہے۔

فرمایا کہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اسم ذات کے ذکر میں زیادہ لگو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات لاتعداد ہیں اب ظاہر ہے کہ ہر صفت کے لیے کوئی نہ کوئی نام ہونا چاہیے اور اسمائے حسنیٰ عام طور پر ۹۹ مشہور ہیں تو آدمی اگر صفات کا ورد کرے تو تمام صفات کا احاطہ مشکل ہے اس لیے اسم ذات ہی کا ورد کرنا چاہیے ظاہر ہے کہ اللہ کی ذات و صفات ایک ہیں اس لیے آدمی جب اسم ذات کا ورد کرے گا تو خدا کی ساری

صفات اس میں خود بخود آ جائیں گی۔ (بعض لوگ ہر صفت کا الگ الگ ورد کرتے ہیں مجدد صاحب اسی کے بارے میں فرما رہے ہیں۔)

فرمایا کہ جتنے صفاتی نام ہیں ان کا اگر پہلا لفظ نکال دیجیے تو وہ بے معنی ہو کر رہ جائیگا مثلاً رحمٰن سے ر اور کریم سے کاف کو نکال دیجیے تو یہ الفاظ بے معنی ہو جائیں گے، مگر اسم ذات اللہ کے لفظ سے آپ اگر الف نکال دیں للہ رہ جائے گا اگر لام کو نکال دیجیے تو لہٗ رہ جائیگا اور اگر دوسرے لام کو بھی نکال دیجیے تو ہُ رہ جائے گا۔ اسی ضمن میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی ابتدا اپنی دو صفتوں رحمٰن اور رحیم سے کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ساری صفات الٰہی اسی صفت رحمت کا پرتو ہیں اس کی تفصیل بڑی لمبی ہے۔

فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں ربِّ اَرِنِیْ کہا اور جب تجلی الٰہی ہوئی تو تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے اور جب افاقہ ہوا تو فرمایا قَالَ سُبْحٰنَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ "تُبْتُ" میں نے توبہ کی، کس بات سے توبہ تھا، یہ توبہ اسی بات سے تھا کہ میں نے اپنی طرف سے تجلی الٰہی کی تجویز کر دی، صوفیا اسی بنا پر کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے احکام کے سامنے تجویز نہیں بلکہ تفویض (بالکل سپرد کر دینا) چاہیے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تجلی الٰہی کی درخواست نہیں کی مگر اللہ تعالیٰ نے خود حضرت جبرئیل کو بھیج کر معراج میں تجلی الٰہی سے نواز دیا۔

فرمایا یوں تو سارے انبیاء معصوم اور سراپا فضل و کمال ہوتے ہیں مگر خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں، جو چیزیں حضرات انبیا کو درخواست کرنے پر ملیں وہ چیزیں آپ کو خدائے قدوس نے خود ہی عنایت فرما دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے دربار میں جانے لگے تو یہ دعا فرمائی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ	اے رب میرے دل کو اطمینان نصیب فرما
لِیْ اَمْرِیْ	اور میرے اس کام میں آسانی عطا فرما۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خدا نے خود فرمایا کہ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ	کیا ہم نے آپ کا سینہ اطمینان سے نہیں بھر دیا

عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ اور آپ سے اس بوجھ کو نہیں ہٹا دیا جو آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔

فرمایا کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو نماز تہجد پڑھ رہے تھے، آں حضرت کا گزر ہوا تو دیکھا کہ حضرت ابو بکر صدیق آہستہ آواز سے اور حضرت عمر بلند آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا تو دونوں حضرات نے وجہ بیان کی جواب سنکر آپ نے حضرت ابو بکر سے فرمایا کہ آپ اپنی آواز کچھ تیز کر دیں اور حضرت عمر سے فرمایا کہ آپ کچھ آواز دھیمی کر دیں۔

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے عوارف المعارف میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر کی نیت بھی بخیر تھی اور حضرت عمر کی بھی مگر آپ نے درمیان کی راہ دیکر فنائے رائے کی تعلیم فرمائی۔

فرمایا کہ تزکیۂ نفس ہوتا نہیں بلکہ کیا جاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قرآن پاک میں تین باتیں وارد ہوئی ہیں

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔ اس میں آپ کا منصب یہ بتایا گیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے تلاوت کتاب فرماتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں معلوم ہوا کہ تلاوت کتاب اور تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ایک چیز تزکیہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد فرمایا ہے۔

تزکیہ نام ہے قلب سے رذائل کے دور کرنے اور اخلاق حسنہ پیدا کرنے کا انسان رذائل و فضائل دونوں کا مجموعہ ہے اس لیے اس کے اندر سے رذائل اور خاص طور رذائل باطنہ کا دور کرنا اور فضائل پیدا کرنا اسی کا نام تزکیہ ہے۔

رذائل دس ہیں راقم الحروف حافظہ میں محفوظ نہیں کر سکا، چند یہ ہیں، حسد، کبر، وجاہت طلبی، نظر بد وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اور نظر میں وہ اثر تھا کہ جو لوگ آپ کی صحبت میں جاتے تھے ان کا تزکیہ ہو جاتا تھا اور آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

اور بزرگان دین کی صحبت سے بھی یہ تزکیہ ہوتا ہے ان کی توجہ، دعا اور نظر میں اتنا اثر ہوتا ہے کہ دل کی دنیا بدل جاتی ہے اسی لیے بسا اوقات بڑے بڑے علما ایسے حضرات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اصطلاحی طور پر عالم نہیں تھے مگر اللہ نے ان کو یہ نعمت دی تھی، مثلاً حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی طرف حجۃ الاسلام حضرت اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی جیسے اپنے وقت کے بڑے علما نے رجوع کیا حالانکہ سید صاحب کی تعلیم کافیہ سے آگے نہیں تھی، اسی طرح مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ نے حاجی امداد اللہ صاحب سے رجوع کیا جو اصطلاحی طور پر عالم نہیں تھے۔

بسا اوقات ایک ایک رذیلہ کے نکالنے کے لیے بزرگان دین برسوں مجاہدہ کراتے ہیں فرمایا کہ کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیسے سمجھا جائے کہ کون عند اللہ زیادہ مقبول ہیں اس لیے کہ بہت سے مشائخ کی طرف لوگ بہت زیادہ رجوع کرتے اور بہت سے لوگوں کی طرف بہت کم لوگ رجوع کرتے ہیں فرمایا کہ اس کا فیصلہ تو بہت مشکل ہے مگر جس کی طرف پہلے اہل علم اور صلحا متوجہ ہوں اور عوام بعد میں رجوع ہوں وہ عند اللہ مقبول ہیں اور جن کے یہاں عوام پہلے متوجہ ہوں اور خال خال اہل علم متوجہ ہوں تو وہ عدم مقبولیت کی علامت ہے۔

فرمایا کہ ایک بار ہم لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے اور آگ جل رہی تھی میں نے حاضرین سے سوال کیا کہ یہ لکڑی جس سے اس وقت شعلے بھڑک رہے ہیں وہ اس لکڑی کے اندر موجود ہیں یا باہر سے ڈالے گئے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ اس کے اندر موجود ہیں، میں نے کہا کہ اگر یہ لکڑی اسی طرح چھوڑ دی جاتی تو مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتی مگر ایک چنگاری اس میں لگا دی گئی اب اس کے اندر جو شعلے پوشیدہ تھے وہ بھڑک اٹھے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر تمام کمالات پوشیدہ رکھے ہیں اب اگر کسی کی توجہ اور راہنمائی شامل ہو جاتی ہے تو وہ کمالات ابھر جاتے ہیں، کسی نے حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت آپ کی صحبت سے بہت فائدہ پہنچا، حاجی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اس کی مثال ایسی ہے کہ چراغ، تیل، بتی سب موجود تھا میں نے تو

صرف ایک دیا سلائی لگا دی، اور دیا سلائی لگا دینے سے یہ تمام چیزیں کام کی ہوگئیں ورنہ تیل خشک ہو جاتا، بتی کو الٹا لیجا"تا اور چراغ ٹوٹ پھوٹ کر بیکار ہو جاتا۔

فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے کہ

اَلْعَيْنُ حَقٌّ یعنی نظر کا لگنا صحیح ہے

تو بتلائیے کہ جب نظر بد میں یہ اثر ہے کہ آدمی تڑپنے لگتا ہے تو نظر نیک میں کوئی اثر نہ ہوگا، ایک جگہ میں نے علماء کے مجمع میں اسی مضمون کو ذرا تفصیل سے بیان کیا تو ان حضرات نے کہا کہ آپ نے بڑی اہم اور اچھی بات کی طرف توجہ مبذول کرادی۔ اصغر گونڈوی کا شعر ہے

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی
ہم آج تک ہیں دل پر چوٹ لیے ہوئے

مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت شاہ آفاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہمیشہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

سحر میں ساحری کے کیسا قدرت
تری آنکھوں میں جو اثر دیکھا

مولانا نے ان مختلف مجلسوں میں اپنے بہت سے حکیمانہ اور معرفت نواز اشعار اپنی پراثر زبان سے سنائے جب یہ شعر پڑھا کہ

شکر ہے دردِ دل مستقل ہو گیا اب تو شاید میرا دل بھی دل ہو گیا

تو فرمایا کہ لفظ "شاید" نے میری لاج رکھ لی ورنہ دعویٰ ہو جاتا اللہ تعالیٰ نے عبدیت کے اظہار کے لیے لفظ شاید خوب عطا فرما دیا، پھر بہت سے پرسوز اشعار ایسے انداز میں زبانِ پُر سعادت اور پردرد لہجہ میں پڑھے کہ مجلس کا عجیب عالم ہو گیا، جو چند شعر میں محفوظ کر سکا ہوں وہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

قیس بے چارہ رموزِ عشق سے تھا بے خبر ورنہ ان کی راہ میں ناقہ نہیں محمل نہیں
لطفِ جنت کا تڑپنے میں جسے ملتا نہ ہو وہ کسی کا ہو تو ہو لیکن ترا بسمل نہیں

تڑپنے سے ہم کو فقط کام ہے یہی بس محبت کا انعام ہے

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی
مدرسہ امدادیہ مراد آباد

"تحریک خلافت" ـــــ میری نظر میں

(قسط دوم)

مشکلات اور نزاکتیں:-

تحریک خلافت درحقیقت ایک پورے عہد اور پورے عالم کی تاریخ ہے۔ اس تحریک کا تعلق صرف ہند و پاک سے نہیں بلکہ ممالک عربیہ، ترکی، برطانیہ، جاپان، جرمنی، روس اور تمام دنیا سے ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں ان ممالک کے کیا حالات تھے، وہاں کی تہذیب و ثقافت کیا تھی؟ ان ممالک کے باشندوں کے سوچنے سمجھنے کا انداز کیا تھا؟ کون تنظیمیں اور حکومتیں وہاں کام کر رہی تھیں؟ ان سوالات کا جواب معلوم کیے بغیر اس موضوع کا حق ادا کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

پھر تحریک خلافت کا دور ہنگامہ خیز اور طوفانی دور تھا، ہر ملک اپنے حریف کو بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کے پروپگنڈے کرتا، بے بنیاد باتوں کو شہرت دیتا، خاص طور سے برطانیہ اور اس کے حلیفوں کو پروپگنڈہ اور مکر و تزویر میں استادانہ مہارت حاصل تھی انھوں نے اپنے ذرائع ابلاغ اور نشر و اشاعت کو استعمال کر کے اپنے حریف ممالک اور سیاسی مخالفین کو بری طرح بدنام کیا۔ لیکن وہ طوفانی دور گذرنے کے بعد انصاف پسند مورخین نے حقائق کو پیش کر کے مکر و تزویر کا جامہ چاک چاک کر دیا۔ ہر ملک کے منصف اہل قلم نے بعد میں چھان بین کر کے اپنے ملک کی تاریخ مرتب کی اور تحریک خلافت سے متعلق

وسیع معلومات سامنے آئیں جن سے اس تحریک کے بارہ میں نئی باتیں علم میں آئیں۔ اس لیے اس تحریک پر قلم اٹھانے والے کے لیے ضروری ہے کہ دور حاضر کے مصنفین نے سالہا سال کی تلاش و جستجو کے بعد تحریک خلافت کے دور کے حالات، اس دور کی ممتاز شخصیات، تحریکوں تنظیموں پر جو کتابیں لکھی ہیں ان کا غور و فکر سے مطالعہ کرے۔ اسی طرح اس دور کے اخبار و رسائل کی فائلیں باقاعدگی کے ساتھ دیکھے۔

غرضیکہ تحریک خلافت کی تاریخ لکھنے کے لیے جس محنت و مطالعہ، تلاش و تحقیق کی ضرورت تھی قاضی صاحب اپنے ضعف و ناتوانی اور مجبوریوں کی وجہ سے اس سے قاصر رہے۔ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ

"تحریک خلافت پر قلم اٹھانے کے معنی یہ تھا کہ عصر قدیم کی رعنائیوں اور عصر حاضر کے طلوع ہونے والے آفتاب کی تابناکیوں کا مطالعہ کیا جائے —— بستی جیسے دور افتادہ مقام پر جس کے لیے کتابیں میسر تھیں اور نہ اخبارات؛ اور نہ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں تلاش میں سفر کروں۔ اس لیے جو کچھ میسر تھا اسی پر اکتفا کرنی پڑی۔ جہاں تک تحریک خلافت کی تاریخ کا سوال ہے، اس کے تحقیقاتی مطالعہ کے لیے اخبارات کی فائلیں درکار تھیں۔ لیکن بجز مشرق (گورکھپور) اور زمیندار لاہور کے چند پرچوں کے جو ایک عزیز کے ہاں محفوظ تھے ہمدم (لکھنؤ) سیاست (امرتسر) مدینہ (بجنور) اور بندے ماترم (لاہور) وغیرہ کی فائل نہ مل سکی ...... اس عظیم کام کا بوجھ اٹھانے کے لیے میرے کندھے کمزور تھے۔ لیکن میں نے ہمت کر کے اس کو انجام دیا۔ اگر اسے نقش اول تصور کر کے کسی صاحب عزم میں نقش ثانی کی ترغیب پیدا ہو تو میں اسے اپنی کامیابی تصور کروں گا۔"

جناب قاضی عدیل عباسی صاحب کی اس تحریر کے بعد ہمیں مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں ہے۔ قاضی صاحب کا یہی بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا۔ اور تحریک خلافت جس میں وہ خود شریک تھے اپنے مشاہدات اور معلومات کی روشنی میں شستہ اور شائستہ انداز میں اس کی تاریخ لکھ دی۔

اور مطالعہ ومحنت، اخبار ورسائل کی چھان بین، عربی، انگریزی، اردو، ہندی کی جدید تاریخی تصنیفات کا عمیق مطالعہ اس تحریک کی تفصیلی اور تحقیقی تاریخ مرتب کرنے کا کام نئی نسل کے لیے چھوڑ دیا ۔۔۔ اس تمہید کے بعد چند موضوعات کے متعلق اپنے مطالعہ کی بنا پر چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

خلیفہ عبد الحمید اور مصطفیٰ کمال پاشا قاضی صاحب کی نظر میں:-

مصنف نے کتاب میں مصطفیٰ کمال پاشا کی بہت تعریف کی ہے اور خلیفہ عبد الحمید ثانی کو انگریزوں کا غلام، قوم وملت کا غدار، درباد صفت، ظالم وسفاک قرار دیا ہے۔ بڑی تکلیف کے ساتھ مجھے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ خلیفہ عبد الحمید ثانی پر تنقید بلکہ ان کی انتہائی تنقیص کرتے ہوئے محترم جناب قاضی صاحب کا قلم اپنی عام روش کے برخلاف متانت وشائستگی کے جادہ سے ہٹ گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "انگریزوں کے اثر میں اچھے اچھے تعلیم یافتہ انشاء پرداز، صوفی منش علماء اور زعماء آگئے تھے اور وہ جو چیز بھی پھیلاتا تھا اسے قرآن وحدیث کی طرح وحی ربانی تصور کرتے تھے۔ ان میں علماء سوء، زاغ صفت صوفی جن کو میراث میں عقابوں کے نشیمن ملے تھے اور بہت جاہ طلب غلامان فرنگ تھے۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ ان سب نے ایسے ایسے افسانے سلطان عبد الحمید کی تعریف میں وضع کیے تھے کہ باید وشاید۔ اگر ان افسانوں کو یہاں درج کیا جائے تو پوری ایک کتاب ہو جائے" (تحریک خلافت ص۲۰۰)

مصنف کو اپنے مطالعہ وتحقیق کی روشنی میں ہر شخصیت اور تحریک پر رائے قائم کرنے کا حق ہے، لیکن یہ بات تاریخ نویسی کے اصولوں کے خلاف ہے کہ اپنی تحقیق کو بیان کرتے ہوئے آدمی جذباتیت کا شکار ہو جائے اور دوسرا نقطۂ نظر رکھنے والوں کو طعن وملامت کا نشانہ بنائے۔

خلیفہ عبد الحمید ثانی کا معروضی مطالعہ

الفرقان کے صفحات کی تنگ دامانی کا خیال کرتے ہوئے ہم مصطفیٰ کمال پاشا اور خلیفہ

عبدالحمید ثانی کے بارے میں تفصیلی گفتگو نہیں کریں گے بلکہ مختصر طریقہ پر محترم جناب قاضی عدیل صاحب کو مطالعہ و تحقیق کی دعوت دے کر اپنے رہوار قلم کو روک لیں گے۔

خلیفہ عبدالحمید ثانی کی پیدائش ۱۸۴۲ء میں ہوئی۔ ۱۸۷۶ء میں آپ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ارکان سلطنت، امراء، وزراء، علما، عوام کے بیہم اصرار پر انھوں نے انتہائی نازک وقت میں ترکی سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی۔ اس وقت ترکی اقتصادی، معاشی، سیاسی، فوجی حیثیت سے سنگین حالات سے دوچار تھا۔ خزانہ تقریباً خالی تھا۔ خلافت ترکی غیر ملکی قرضوں کے نیچے دم توڑ رہی تھی۔ اس عظیم الشان سلطنت کا حصہ بخرا کرنے کے لیے یورپ و ایشیا کی تمام غیر مسلم سلطنتیں متفق ہو چکی تھیں۔ ترکی کو "مرد بیمار" کا خطاب دیا گیا تھا۔ اپنے مکرو تزویر اور سیاست سے برطانیہ نے عربوں اور ترکی مقبوضات کے دوسرے باشندوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔ برسر اقتدار آتے ہی خلیفہ عبدالحمید کو اندرونی، بیرونی سازشوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام غیر اسلامی دنیا خصوصاً برطانیہ نے اس کے خلاف پروپگنڈہ تیز سے تیز تر کر دیا۔ مغربی مورخین نے اسے ایک ظالم، جابر، خونخوار، غیر دانشمند، رجعت پسند حکمراں کے روپ میں پیش کیا۔ اور آج بھی اسی انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ صاحب المنجد نے (جو عیسائی ہے) اسے سلطان احمر (خونی سلطان) کے لقب سے یاد کیا ہے۔

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ اس غیور، دانشمند، مدبر خلیفہ نے برطانیہ اور دوسری بڑی طاقتوں کا آلۂ کار بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اسلام کے نام پر تمام مسلمانوں کو متفق کرنے کی تحریک چلائی تھی، وہ برطانیہ کی گندی سیاست کا کامیابی کے ساتھ جواب دے رہا تھا اس کی جرأت و شجاعت، سیاست و تدبر، پالیسی، حکمت عملی نے ایک بار پھر یورپ کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ مغربی مصنفین کے اس متعصبانہ طرز عمل پر خود یورپ کے بعض منصف مزاج اہل قلم چیخ پڑے۔ چنانچہ برطانیہ کی ایک خاتون جس نے ترکی اور خلیفہ عبدالحمید کے حالات کا قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ اس نے جھوٹے پروپگنڈے کا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک کتاب تصنیف کی اور بہت تفصیل کے ساتھ خلیفہ عبدالحمید پر کیے جانے والے

اعتراضات کا جواب دیا۔ اس خاتون نے خلیفہ کے اخلاق و عادات، سادگی، مذہبیت، سیاست وتدبر، بے تعصبی، عدل وانصاف کا تفصیلی نقشہ کھینچا اور ان کے دور میں ترکی کو جو ہمہ جہتی ترقی حاصل ہوئی اسے اعداد و شمار کی روشنی میں پیش کیا۔ انشاء اللہ خاں مرحوم ایڈیٹر وکیل (امرتسر) نے اردو میں اس کتاب کا ترجمہ "عہد حکومت الغازی عبدالحمید خاں ثانی" کے نام سے کیا اور چند ضمیموں کے ساتھ اسے شائع کیا تھا۔

خلیفہ عبدالحمید پر ایک بے بنیاد الزام

خلیفہ عبدالحمید ثانی پر قاضی صاحب نے ایک الزام یہ عائد کیا ہے کہ اس نے جدید طریقۂ حرب کو نظر انداز کر کے عسکریت کا خاتمہ کر دیا۔ اصلاحات کی مخالفت کی جس کسی نے اصلاح کی طرف توجہ دلائی اسے روباہ صفت سلطان نے خاموشی سے قتل کرا دیا۔ یہ الزام بھی بالکل خلاف حقیقت اور ترکی کے دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ عبدالحمید نے اپنے دور میں ترکی کو ہر طرح کی ترقی دی۔ زرعی، تجارتی، اقتصادی اصلاحات کے ساتھ اس نے جدید طریقۂ حرب کو اپنانے کی کامیاب کوشش کی۔ شیخ حسن آفندی نے اپنی عربی کتاب "نبذۃ تاریخیۃ فی المآثر الحمیدیہ" میں بہت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ خلیفہ عبدالحمید نے اپنے دور میں کیا کیا اصلاحات کیں، زرعی اور اقتصادی اعتبار سے ترکی کو کتنا آگے بڑھایا، اپنی فوج کو جدید آلات حرب اور طریقہ حرب سے لیس کرنے میں کس قدر کامیابی حاصل کی۔ شیخ حسن آفندی کی کتاب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس وقت کے ترکی اور اسلام کے دشمنوں کے پروپیگنڈے سے تاثر کا نتیجہ ہے۔ کاش قاضی صاحب اس کتاب سے واقف ہوتے۔

صہیونیت چراغ پا

یہودیوں کی عالمگیر صہیونی تحریک (جو روس، امریکہ، یورپ کی سیاست، صحافت، تجارت، مالیات پر کنٹرول کیے ہوئے تھی) بھی سلطان پر چراغ پا ہو گئی۔ منشی عبدالرحمٰن

خاں نے اپنی کتاب "عالمگیر یہودی منصوبہ" میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :-

"اگست ۱۸۹۷ء میں باسل کے مقام پر یہودیوں کی پہلی کانفرنس ہوئی جس میں سرزمین فلسطین پر یہودیوں کے وطن کے قیام کی جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا۔ یہودیوں نے فلسطین کے بارے میں مراعات حاصل کرنے کے لیے مشہور یہودی ڈاکٹر ہرٹزل کو مقرر کیا، تاکہ فلسطین میں ایک خود مختار حکومت کے قیام کے لیے راستہ ہموار کیا جاسکے۔ اس غرض کے لیے ایک طرف تو اس نے ترکی کے اندر اپنی ریشہ دوانیاں شروع کردیں، اور دوسری طرف ۱۸۹۸ء میں جرمنی کے قیصر ولیم کو شیشے میں اتار کر اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ ترکی کے دورہ کے دوران سلطان عبدالحمید سے یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے اور وہاں آباد ہونے کی اجازت لے دے۔ قیصر ولیم نے جب اس موضوع پر سلطان سے گفتگو کرنی چاہی تو وہ ٹال گئے اور قیصر نے اس خوف سے اس بات پر زور نہیں دیا کہ کہیں برلن کو بغداد سے ملانے والی ریلوے لائن جرمنی کے ہاتھ سے نہ جاتی رہے۔

سلطان عبدالحمید کو ڈاکٹر ہرٹزل کی ریشہ دوانیوں کا علم ہوگیا تو انھوں نے ۱۹۰۲ء میں ایک خط کے ذریعہ اس کو اپنی ریشہ دوانیوں سے باز رہنے کی سخت تنبیہ کی، جس کا مضمون خود ڈاکٹر ہرٹزل نے ۱۹۳۴ء میں تل ابیب میں شائع کردیا (اپنی ڈائری میں) یوں نقل کیا ہے: "ڈاکٹر ہرٹزل کو بتادو کہ وہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کی تمام کوششیں ختم کردے۔ جب تک عثمانی سلطنت کا ایک غیور فرد بھی زندہ ہے اسے فلسطین نہیں مل سکتا۔"

ڈاکٹر ہرٹزل کی ناکامی کے بعد یہودیوں نے ترکی کی "مجلس اتحاد و ترقی" (جس کا ایک ممبر مصطفیٰ کمال پاشا بھی تھا) میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کرنا شروع کردیا۔ جو خفیہ ذرائع سے سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے سرگرم عمل تھی۔ چنانچہ یہ مجلس اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ اور شوکت پاشا نے فوج کی مدد سے ۱۹۰۹ء میں حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ۱۹۱۳ء میں جو وزارت بنی اس میں یہودیوں

نے اپنی عیاریوں سے پراٹوکول میں طے شدہ منصوبہ کے تحت مندرجہ ذیل تین یہودی نژاد وزیر شامل کردیئے۔

(۱) اجباریہ آفندی، یہ رومانیہ کا رہنے والا تھا اور ایک یہودی اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اسے تعمیرات عامہ کا محکمہ سونپا گیا۔ (۲) نسیم مزلک، اسے تجارت و زراعت کا محکمہ دیا گیا۔ (۳) جاوید بے، یہ محکمہ مالیات کا انچارج تھا۔

۱۹۱۳ء میں ان یہودی وزیروں نے ایک قانون پاس کرادیا کہ یہودیوں کو فلسطین میں جائداد بنانے کی اجازت دی جائے۔ یہ قانون پاس کرانے کے بعد ان وزیروں نے سلطان کی فلسطینی جاگیریں دھڑا دھڑ یہودیوں کے ہاتھ بیچنی شروع کردیں، جو کہ فلسطین کی سب سے زیادہ زرخیز زمینیں تھیں، اسے یہودی تنظیموں نے مشترکہ طور پر خرید لیا۔" (ص ۱۲-۱۳-۱۴)

چند مزید شہادتیں

مجمع البحوث الاسلامیہ کے فاضل رکن استاذ رفیق العصار نے اپنے مقالہ "الصہیونیۃ العالمیہ ومأساۃ فلسطین العربیۃ" میں، اور جامعۃ الدول العربیہ کے سکریٹری ڈاکٹر سید توفل نے اپنے مقالہ "الصہیونیۃ وفلسطین" میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ فلسطین کے بارے میں خلیفہ عثمانی سے مراعات نہ ملنے کے بعد یہودیوں نے "انجمن اتحاد و ترقی" میں اثر و رسوخ پیدا کیا اور انھیں آلہ کار بنا کر سرزمین فلسطین پر پنجے جمائے یہ دونوں مقالے مجمع البحوث الاسلامیہ مصر کی کتاب المؤتمر الرابع۔ المسلمون والعدوان الاسرائیلی" میں شائع ہوئے ہیں۔ شیخ حسن آفندی نے بھی اپنی کتاب میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ "انجمن اتحاد و ترقی" غیر ملکی حکومتوں اور تنظیموں کی شہ پر خلیفہ عبدالحمید کے خلاف طوفان مچائے ہوئے تھی۔

جناب مولوی محمد انشاء اللہ خاں مرحوم ایڈیٹر وکیل (امرتسر) نے اپنی کتاب "تاریخ خاندان عثمانیہ" میں مصطفیٰ کمال پاشا کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی خدمات کو سراہا ہے۔

انھوں نے اپنی کتاب کا دوسرا حصہ کمال اتا ترک کے فضائل و مناقب کی نذر کر دیا ہے۔
لیکن خلیفہ عبد الحمید ثانی کا تذکرہ کرتے وقت اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ "انجمن اتحاد و ترقی" غیر ملکی طاقتوں کا آلۂ کار بن کر عبد الحمید خاں کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے تھی اور اس معرکہ آرائی میں وہ حق بجانب نہیں تھی۔ مجموعی حیثیت سے انھوں نے خلیفہ عبد الحمید کو سراہا اور اسے مدبر، کامیاب حکمراں قرار دیا ہے۔
میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ خلیفہ عبد الحمید شخصی حکمرانوں کے عیوب سے بالکل پاک تھا۔ بلا شبہ اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ آخر وہ بھی انسان تھا اور دنیا کی ایک بہت بڑی سلطنت کا خود مختار حکمراں۔ لیکن قاضی صاحب نے اس کی جو تصویر کھینچی ہے، افسوس ہے کہ وہ حقائق و واقعات سے بھی بہت دور ہے، اور مغرب کے متعصب مورخوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ـــــ اس کی معزولی کے بعد سلطنت ترکی کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور ترکی اپنی بین الاقوامی عزت و وقار کھو بیٹھا۔

مصطفیٰ کمال پاشا اور انجمن اتحاد و ترقی

مصطفیٰ کمال پاشا "انجمن اتحاد و ترقی" کا اہم رکن تھا۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کے بارے میں احتیاط کی بنا پر اگر یہ نہ کہا جائے کہ وہ صیہونیوں اور غیر ملکی طاقتوں کے تعاون اور شہ پر قائم ہوئی، تو دستاویزی ثبوت اور تاریخی حقائق کی بنا پر اتنا ضرور کہا جائیگا کہ اس انجمن میں صیہونیوں اور غیر ملکی طاقتوں نے پورا پورا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ بلا شبہ اس انجمن کے بہت سے اراکین مخلص اور محب وطن تھے لیکن وہ لوگ بھی اپنی سادہ لوحی و ناتجربہ کاری کی بنا پر دوسروں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئے۔
مصطفیٰ کمال پاشا نے غیر معمولی ہمت و شجاعت اور تدبر سے ترکی کا تحفظ کیا۔ اتحادیوں کی اجتماعی طاقت اور یونانیوں کو ذلت آمیز شکست دے کر تھوڑی دیر کے لیے مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا۔ ترکی کی کامیابیوں کی خبر سے عالم اسلام میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان کے مسلمان جو خلافت کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے

خوشیاں منانے لگے۔ شعراء نے مصطفیٰ کمال پاشا اور ترک مجاہدین کی شان میں قصائد کہے۔ صحافیوں اور انشا پردازوں نے تحریر کا جادو جگایا۔ شعلہ بیان مقرروں نے مسلمانوں کو فتح و کامرانی کے نشہ سے سرشار کر دیا — لیکن انقلاب اور فتح کے بعد کمال اتاترک نے جو اقدامات کیے ان کی وجہ سے مسلمانوں پر مایوسی کے مہیب بادل چھا گئے۔ اقبال، محمد علی جوہر جیسے مفکرین اور قائدین بیتاب ہو کر رہ گئے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے برسر اقتدار آنے کے بعد متواتر ایسے قوانین نافذ کیے جن کی وجہ سے ترکی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا خاتمہ کر دیا۔ ترکی جو عالم اسلامی کی قیادت کر رہا تھا اسلامی دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے یورپ سے سامان حرب اور جدید علوم و فنون ہی درآمد نہیں کیے بلکہ تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات، عقائد و نظریات، قوانین و آئین بلکہ ہر مفید اور مضر چیز درآمد کی۔ ترکی اپنی قوت ایجاد کو کام میں لانے کے بجائے مغرب کی تقلید اور ذہنی فکری غلامی میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ عربی رسم الخط کو ممنوع قرار دے کے لاطینی رسم الخط نافذ کیا۔ دینی مدارس و مکاتب بند کرا دیے۔ قانون کے ذریعہ بے پردگی کو رائج کیا۔ غرضیکہ اسلام اور اس کے شعائر کا نام و نشان مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

چند اور کارنامے

کمال اتاترک نے علماء اسلام اور مشائخ کو تختہ دار پر لٹکایا یا پابند سلاسل کر دیا۔ تمام اسلامی تحریکوں پر یک لخت پابندی عائد کر دی۔ بدیع الزماں سعید نورسی جو ترکی میں تحریک اسلامی کے حدی خواں تھے انھیں جور و استبداد کی چکی میں پیس دیا۔ انھیں مدت العمر جیل کے ظلمت کدوں میں بند کر کے انسانیت سوز مظالم ڈھائے۔ بار بار ان کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ بدیع الزماں سعید نورسی کے حالات کے لیے مشہور نومسلم خاتون مریم جمیلہ کی کتاب "اسلام — ایک نظریہ ایک تحریک" اور پاکستانی مصنف ثروت صولت کی کتاب "بدیع الزماں سعید نورسی — شخصیت اور تحریک" کا مطالعہ کیا جائے۔

خلافت ترکی کا خاتمہ کر کے مصطفیٰ کمال پاشا نے عالم اسلام کی اجتماعیت پر

کاری ضرب لگائی۔ ہمیشہ کے لیے ملت کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ ترکی میں جو خلافت قائم تھی عملاً اگرچہ وہ اس دور میں زیادہ موثر نہیں تھی لیکن وہ بے جان اور نام کی خلافت بھی اسلام دشمن طاقتوں کی نیند حرام کیے ہوئے تھی۔ انھیں خطرہ تھا کہ کسی وقت خلافت کے زیر سایہ تمام اسلامی ممالک متحد ہو کر ناقابل تسخیر قوت نہ بن جائیں۔ خلافت کا خاتمہ کر کے دانستہ یا نادانستہ طور سے انگریزوں اور تمام اسلام دشمن طاقتوں کا وہ مقصد پورا کر دیا گیا جس کے لیے وہ صدیوں سے جد و جہد کر رہے تھے۔ جناب صباح الدین عبدالرحمن رقمطراز ہیں

"خلافت کا سقوط پورے عالم اسلام کا ایک بڑا دردناک حادثہ تھا۔ مسلمانوں کی تیرہ سو برس کی مذہبی، سیاسی اور بین الاقوامی مرکزیت جاتی رہی۔ وہ عیسائیوں کی چالبازیوں سے ضرورات کھا گئے۔ لیکن اس میں ان کی نااہلی، ناعاقبت اندیشی اور نااتفاقی کا بہت کچھ دخل تھا۔ حوادث زمانہ کے وہ تھپیڑے بلکہ طمانچے کھاتے رہے لیکن ان کو ہوش نہیں آیا۔ وہ اب پیچھے مڑ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ خلافت کی مرکزیت کے خاتمہ کے بعد وہ محض سیاسی کھلونے بن کر رہ گئے، ان کو ایک لڑی میں پرونے والی کوئی قوت باقی نہیں رہی۔

(محمد علی کی یاد میں ص ۱۴۹-۱۵۰)

اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو مصطفیٰ کمال پاشا کے ان اقدامات کی روشنی میں اس کی تحریک اور انقلاب کے محرکات، پس منظر، مقاصد کی نشاندہی آسانی سے کی جا سکتی ہے۔

جناب قاضی صاحب نے "تحریک خلافت" کے آخر میں کتابیات کی جو مختصر فہرست درج کی ہے اس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی کی تاریخ و تحریکات اور شخصیات کے بارے میں ان کے سامنے کوئی اہم کتاب نہیں تھی۔ بلکہ انھوں نے۔ جو کچھ لکھا ہے اپنی پرانی معلومات پر بھروسہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ قاضی صاحب اس موضوع سے متعلق قدیم و جدید کتابوں کا از سر نو مطالعہ کر کے اپنی کتاب پر نظر ثانی کریں۔

علی برادران اور گاندھی جی

کوئی تحریک یا تنظیم ہو اس کے ہمدرد اور ممبر اگرچہ بے شمار ہوتے ہیں لیکن اسے کامیابی سے ہم کنار کرنے اور ترقی دینے کا سہرا دو ایک مخلص سر پھروں کے سر ہوتا ہے، جو اس تحریک کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں، اور جانی مالی قربانیاں پیش کر کے اس تنظیم کو آگے بڑھاتے ہیں۔ تحریک خلافت کے حامل نثار سپاہی بھی اگرچہ لاکھوں سے متجاوز تھے۔ ہر مذہب و ملت، فرقہ و جماعت کے لوگوں نے اس میں حصہ لیا لیکن اپنے محدود مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس تحریک کے روح رواں محمد علی اور شوکت علی تھے۔ محمد علی اور تحریک خلافت لازم ملزوم ہو گئے ہیں۔ آج بھی محمد علی کا نام لیتے ہی تحریک خلافت اور تحریک خلافت کا نام لیتے ہی محمد علی یاد آتے ہیں۔ بلاشبہ شیخ الہندؒ، مولانا عبدالباریؒ، گاندھی جی کی قیادت اور سرپرستی میں تحریک خلافت شباب تک پہنچی۔ لیکن اسے ایک عمومی تحریک اور تمام ہندوستان کا جذباتی مسئلہ بنانے میں سب سے زیادہ حصہ ان دو بھائیوں کا تھا۔

خلافت کے مسئلہ نے مولانا محمد علی کو ماہی بے آب بنا رکھا تھا۔ انھوں نے اس مسئلہ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ یہ خصوصیت غالباً صرف محمد علی کو حاصل ہے کہ خلافت کی تحریک میں ان کے پورے گھرانے حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ ہمدرد کی فائلوں اور ان کے مکاتیب کا مطالعہ کیجیے۔ آج بھی سوز دروں کی آنچ، جذبات کی حدت و حرارت آپ کو آبدیدہ کر دے گی۔ مولانا دریابادی مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"خلافت کے اس قضیہ نے دل کی وہ حالت کر دی ہے کہ اگر خداوند کریم کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو نہ معلوم میری کیا کیفیت ہو جاتی۔"

(محمد علی کی ڈائری جلد اول ص ۱۵۳)

ہمدرد اور کامریڈ کی فائلیں گواہ ہیں کہ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر و تحریر اور گراں قیمت اوقات بلکہ زندگی کو تحریک خلافت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

"تحریک خلافت" کا بار بار مطالعہ کرنے کے بعد میرا اپنا احساس یہ ہے کہ مولانا محمد علی

کو اس کتاب میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ قاضی صاحب نے گاندھی جی کو اس تحریک کا روح رواں قرار دیا ہے۔ یہ علی برادران کی بہت بڑی حق تلفی ہے۔ گاندھی جی کی شرکت اور ان کی رہنمائی نے بلا شبہ اس تحریک کو غیر معمولی تقویت پہنچائی ان کی یہ قومی، انسانی ہمدردی لائق صد ستائش ہے۔ لیکن ان کو تحریک خلافت کی روح رواں قرار دینا میرے خیال میں حقیقت کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ گاندھی جی کو مہاتما گاندھی اور ہندوستان کا متفقہ عوامی لیڈر بنانے میں محمد علی جوہر کا ہاتھ سب سے زیادہ رہا ہے۔ ستمبر ۱۹۲۷ء میں پشاور کے اندر ایک بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے برملا کہا

"کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا، اس سے پہلے وہ خوش وضع، عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی، جو تیار کردہ تقریریں شاندار الفاظ میں کرتے اور چند تجویزیں منظور کرانے کی خواہش سے سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر نشستند و گفتند و برخواستند کا نظارہ پیش کرتے تھے، مگر جس دن سے محمد علی اور شوکت علی اس میں شریک ہوئے اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی۔ چنانچہ کلکتہ میں صدر لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگریس نے ترک موالات کو اپنا شعار بنایا —— یہ حقیقت ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی کہ سب سے جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتے رہے۔ کیونکہ وہ کہتے تھے اور بالکل بجا کہتے تھے کہ یہ تمام دورے تحریک خلافت سے متعلق ہیں۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما جی نے دورے کے مصارف خلافت کے سرمائے سے لیے۔ حتیٰ کہ کانگریس کے لیے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے ان کے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کیے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی۔" (ہمدرد ہر ستمبر ۱۹۲۷ء)

(مولانا محمد علی کی یاد میں ص ۱۸۱-۱۸۲)

"تحریک خلافت" پر یہ تاثراتی تحریر کافی طویل ہو گئی۔ اگر محمد علی مرحوم کے بارے

میں بحث کو آگے بڑھاؤں تو مضمون طویل ہوتا چلا جائے گا اس لیے اس موضوع سے صرف نظر کرتے ہوئے دور حاضر کے محققین اور مصنفین سے درخواست کروں گا کہ وہ اس کتاب پر اس زاویہ نگاہ سے بھی نظر ڈالیں کہ علی برادران کو اس کتاب میں ان کا صحیح مقام مل سکا ہے یا نہیں؟

دو خامیاں

یہ کتاب فوٹو آفسٹ کے ذریعہ معیاری طباعت و کتابت کے ساتھ شائع ہوئی لیکن اس کے اندر الفاظ و حروف کی غلطیاں افسوس ہے کہ بہت زیادہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاپی اور پروف کی تصحیح کا اہتمام بالکل نہیں کیا گیا ہے۔ بعض صفحات میں تین تین چار چار غلطیاں ہیں۔ مثال کے طور پر ص۲۸ کو غور سے دیکھ لیا جائے۔ کتابیات کے اندر حیات سلیمان کو حیات سلیمانی اور رئیس الاحرار کو رئیس الامرا لکھ دیا گیا ہے۔ ایک بات جو سب سے زیادہ کھٹکی وہ یہ ہے کہ اعداد و شمار اور صفحات کے ہندسے بھی پابندی کے ساتھ انگریزی میں لکھے گئے ہیں۔ اردو کتاب میں انگریزی رسم الخط میں اعداد و نمبرات زیب نہیں دیتے۔

آخر میں درخواست ہے کہ قاضی صاحب میری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور کارآمد و درست ہونے کی صورت میں قبول فرمائیں۔

گاہ باشد کہ کودک ناداں — بہ غلط بر ہدف زند تیرے

چندہ سالانہ
ہندوستان سے -/۱۵
پاکستان سے -/۳۰
بنگلادیش سے -/۱۶
فی شمارہ ۱/۵۰

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے چندہ سالانہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے جواب نئی شرح یہ ہے
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

جلد (۴۷) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۷۹ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ شمارہ (۱۰)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی روانہ ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت، اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۱۰ تاریخ تک آجانا چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ پچیس روپے ہندوستانی سکہ میں بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں تیس روپے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ آسٹریلیا بلڈنگ، لاہور کو بھیجدیں۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

عرض حال

کاغذ کی گرانی، اللہ کی پناہ!

ناظرین کو غالباً یاد ہوگا، گزشتہ سال (۱۹۷۸ء) کے آخری شمارہ میں "تب اور اب" کے زیر عنوان لکھا گیا تھا کہ ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۴ء) میں جب الفرقان جاری ہوا تھا تو اُس وقت اس کے لیے عمدہ سفید چکنا کاغذ زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین روپے رم کے حساب سے مل جاتا تھا، اس کے بعد کئی سال تک بھی یہی نرخ رہا تھا ـــــ لیکن اب اسی کاغذ کی قیمت فی رم ۱۰۵/ ادا کی جاتی ہے۔"

یہ اب سے صرف ۱۰ مہینے پہلے دسمبر ۷۸ء میں لکھا گیا تھا ـــــ اب حالت یہ ہے کہ اُس کاغذ کی قیمت اس وقت سو روپئے سے اوپر ہے اور کبھی کبھی بازار میں وہ کسی قیمت پر بھی نہیں ملتا۔ چنانچہ ستمبر کے شمارہ کے لیے نہیں مل سکا تھا مجبوراً بالکل معمولی قسم کا کاغذ لگانا پڑا، وہ بھی ۹۲/ فی رم خریدا گیا تھا۔ ممکن ہے اکتوبر کے اس شمارہ میں بھی وہی لگانا پڑے ـــــ (معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں کوئی حکومت نہیں ہے، جو یہ دیکھے کہ کون چیز کس قیمت پر فروخت ہو رہی ہے۔)

کاغذ کی قیمت میں اس بے حساب اضافہ کا نتیجہ یہ ہے کہ الفرقان کے ایک پرچہ کی تیاری اور روانگی پر اس وقت ڈیڑھ روپیہ سے کچھ زیادہ صرف ہوتا ہے اور خریدار حضرات سے ۱۵/ روپئے سالانہ یعنی صرف سوا روپیہ وصول ہوتا ہے اور ایجنسیوں سے اس سے بھی کم، ایک اچھی خاصی تعداد میں ہدیتہً بھی جاتا ہے ـــــ جو رسائل یا اخبارات "جماعتوں" یا "اداروں" کی طرف سے نکلتے ہیں اُن کے مصارف تو ان اداروں یا جماعتوں کے لاکھوں کے بجٹ کا جزء ہوتے ہیں اور اُن کے لیے آمدنی کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ الفرقان کی نوعیت یہ نہیں ہے ـــــ بعض مخلصین کے عطیات سے اس کو سہارا ملتا رہتا ہے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے) اور خسارہ کا باقی بوجھ کتب خانہ الفرقان اٹھاتا ہے ـــــ اس طرح ابتک گاڑی چل رہی ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا چلتی رہے گی ـــــ واقعہ یہ ہے کہ ان حالات میں الفرقان کا جاری رہنا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی شان کرم ہی کا کرشمہ ہے اور آئندہ کے لیے بھی اس کی کریمی سے یہی امید ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے رمضان مبارک میں شائع ہونے والے اگست کے شمارہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ اب اس کے بعد ستمبر اکتوبر کا مشترک شمارہ انشاء اللہ اکتوبر میں وسط ذیقعدہ تک شائع ہوگا ۔۔۔ اس میں خود اس عاجز کا ایک ہی مضمون آنا تھا جس میں پوری تفصیل کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم کے ساتھ اپنی رفاقت کی سرگزشت، اور ان کے بارہ میں اپنا حالیہ موقف سپردقلم کیا گیا تھا، اور قدیم تعلق کی بنا پر مولانا کی خدمت میں کچھ مخلصانہ گزارشات کی تھیں۔ اور جیسا کہ گزشتہ شمارہ سے ناظرین کو معلوم ہو چکا اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی، بس طباعت کا مرحلہ باقی تھا کہ ۲۳ ستمبر کو مولانا کے حادثۂ انتقال کی خبر ملنے پر اس کی اشاعت اس وقت ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ۔۔۔ اور پھر بہت عجلت کے ساتھ صرف ایک ہفتہ میں ستمبر کا شمارہ تیار کرا کے روانہ کر دیا گیا۔ جس میں مولانا مرحوم کے حادثۂ رحلت اور ان کے بارہ میں اپنے کچھ احساسات و تاثرات کے ذکر کے ساتھ الفرقان کی اشاعت کے پروگرام میں مذکورہ بالا تبدیلی کی بھی اطلاع دیدی گئی تھی۔

اب یہ اکتوبر کا شمارہ انشاء اللہ اوائل نومبر میں شائع ہو جائے گا ۔۔۔ اس کے بعد خدا نے چاہا تو نومبر دسمبر کا شمارہ مشترک شائع ہوگا اور اس میں اس مضمون کا ایک حصہ ناظرین کرام لاحظہ فرمائیں گے جو ستمبر اکتوبر کے شمارہ میں شائع ہونے والا تھا۔۔۔۔۔

خطاب عید الفطر:۔

اِسی شمارہ میں "نگاہِ اوّلیں" کے بعد ہی ناظرین کرام کے سامنے اس عاجز کی وہ تقریر آئے گی جو گزشتہ عید الفطر میں نماز عید کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں کی گئی تھی۔ یہ تقریر ستمبر کے شمارہ میں شائع ہونی چاہیے تھی اور اُسی کے لیے اس کی کتابت کرائی گئی تھی لیکن کاتب صاحب کتابت کر کے وقت پر نہیں دے سکے اس لیے اُس میں وہ شامل نہیں ہو سکی اب اس شمارہ میں شائع کی جارہی ہے ـــــ جو کچھ اس خطاب میں حاضر مخاطبین سے عرض کیا گیا تھا وہی الفرقان کی وساطت سے اس کے ناظرین کی خدمت میں عرض کیا جارہا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ خود اس عاجز کو بھی اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے ـــــ وہ بندہ بڑا محروم ہے جس کو اللہ تعالیٰ اچھی باتیں کہنے کی توفیق دے اور وہ خود ان باتوں پر عمل کا اہتمام نہ کرے کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت (ایک خط کا جواب)

"خطاب عید الفطر" کے بعد مندرجہ بالا عنوان کے تحت ناظرین کرام ایک صاحب کا خط اور راقم سطور کی طرف سے اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں گے ـــــ جن صاحب کا یہ خط ہے میں اُن سے بالکل واقف نہیں (پتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ کے اسپتال سے متعلق ہیں غالباً ڈاکٹر ہوں گے) ـــــ اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی مجھ سے اور الفرقان سے بھی اتنے ناواقف ہیں کہ انھوں نے مجھے خط کچہری روڈ کے اس پتہ پر لکھا ہے جہاں میرا قیام اور الفرقان کا دفتر اب سے پانچ سال پہلے تھا ـــــ بہرحال میں نے اُن کے خط کا جواب املاء لکھانا شروع کیا اور وہ بلا ارادہ بہت طویل، پورا ایک مضمون ہو گیا، پھر میں نے محسوس کیا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی کارآمد باتیں لکھوا دی ہیں، اس لیے الفرقان میں بھی اس کی اشاعت کا فیصلہ کر لیا گیا۔

مولانا مودودی صاحب مرحوم کا ایک مضمون:۔

مولانا مرحوم کے ساتھ اپنی رفاقت سے متعلق جو مضمون اس عاجز نے ستمبر اکتوبر کے شمارہ کے لیے لکھا تھا، اس کے سلسلہ میں مجھے مدت کے بعد "ترجمان القرآن" کے قدیم فائلوں کی ورق گردانی کی بھی نوبت آئی، اس مطالعہ میں مرحوم کے ایسے بہت سے مضامین بھی نظر سے گزرے جن کے بارہ میں میرا غالب گمان ہے کہ موجودہ دور کے ان کے نام لیوا اکثر محبین و متبعین ان سے قطعاً ناواقف اور بے خبر ہیں، اگر وہ ان کی نظر سے گزریں تو امید کی جا سکتی ہے کہ مولانا مرحوم کے بارہ میں ان کی بہت سی غلو آمیز غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں کی کچھ اصلاح ہو جائے ـــــــ اسی غرض سے ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء) کا (گویا اب سے ۴۰-۴۱ سال پہلے کا) لکھا ہوا ان کا ایک مضمون اس شمارہ میں بھی شائع کیا جا رہا ہے ـــــــ ناظرین کو اس سے معلوم ہو گا کہ رجب ۱۳۵۸ھ میں مولانا مودودی صاحب نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ (بنگلہ والی مسجد، بستی نظام الدین اولیاء دہلی) جا کر حضرت مولانا سے ملاقات کی تھی اور اس وقت کے ان کے تبلیغی کام کے خاص میدان عمل علاقۂ میوات کا خود دورہ کر کے کام اور اس کے اثرات و نتائج کو بچشم خود دیکھا تھا۔ اس کے اگلے مہینے شعبان ۱۳۵۸ھ کے "ترجمان القرآن" میں انھوں نے "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے وہ مضمون لکھا تھا جو ناظرین اس شمارہ میں پڑھیں گے۔

یہ عاجز راقم سطور اس وقت تک حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت سے واقف نہیں تھا، اگرچہ ایک دو دفعہ ان کو دیکھا تھا (اور شاید یہ دیکھنا ہی میرے ایک باطنی مرض کی وجہ سے حجاب بن گیا تھا) اور ان کے تبلیغی کام سے تو میں بالکل ہی ناواقف تھا، بعض لوگوں سے کچھ ذکر سنا تھا لیکن اس سے میں اس کی حقیقت اور نوعیت کو بالکل نہیں سمجھ سکا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا بہت پست تصور تھا، اس لیے میرے دل میں اس کو جاننے کی طلب بھی نہیں تھی۔ بلکہ مولانا مودودی صاحب کے اس مضمون سے بھی میرے اندر یہ طلب پیدا نہیں ہوئی، حالانکہ مضمون ایسا تھا کہ اس کے پڑھنے کے بعد اس کام کو دیکھنے اور سمجھنے کی طلب پیدا ہونی چاہیے تھی خاص کر اس حالت میں کہ مولانا مودودی صاحب کی رائے و فکر سے میں اس

زمانہ میں بہت زیادہ متاثر تھا۔ غالباً اس کا سبب بھی میرا وہی باطنی مرض تھا جس کی طرف میں ابھی اوپر اشارہ کر چکا ہوں ـــــ یا یوں سمجھا جائے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وقت مقرر تھا وہ ابھی نہیں آیا تھا۔

مرحوم مودودی صاحب کا یہ مضمون اس شمارہ میں اس لیے شائع نہیں کیا جا رہا ہے کہ اس میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کے تبلیغی کام اور اس کے طریق کار کے بارہ میں بہت اچھی رائے ظاہر کی گئی ہے اور صرف اسی کو خدمتِ دین کا صحیح طریقہ بتلایا گیا ہے ـــــ ہر وہ شخص جو تبلیغی کام اور اُس کے ذمہ داروں سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ وہ حضرات اپنی ذات اور اپنے کام دونوں کے لیے اس کو مضر بلکہ گویا زہر سمجھتے ہیں کہ اخبارات و رسائل میں اُن کے کام کی تحسین و تعریف اور تشہیر کی جائے۔ (اس معاملہ میں اُن کا جو اصول اور طرز عمل ہے اس کا کچھ تذکرہ راقم سطور نے "جماعت اسلامی" اور "تبلیغی جماعت" سے متعلق خط کے جواب میں بھی کیا ہے جو اسی شمارہ میں شائع ہو رہا ہے۔) واقعہ یہ ہے کہ اس بارہ میں اُن کا اصول اور طرز عمل بالکل نرالا اور دوسروں کے لیے ناقابل فہم ہے۔ خود راقم سطور ایک زمانہ تک اس سے پوری طرح متفق اور مطمئن نہیں ہو سکا تھا، لیکن طویل مدت کے تجربہ نے یقین دلا دیا کہ اس کام کے لیے خاص کر اس زمانہ میں یہی طرز عمل صحیح ہے۔

الفرقان کے اس شمارہ میں مودودی صاحب مرحوم کا یہ مضمون صرف اس لیے شائع کیا جا رہا ہے کہ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "جماعت اسلامی" کے قیام سے ڈیڑھ دو برس پہلے تک بھی خدمتِ دین اور احیاءِ دین کی جد و جہد کے طریق کار کے بارہ میں اُن کا نقطۂ نظر کیا تھا، وہ کن طریقوں کو غلط اور کن کو صحیح سمجھتے تھے۔

"درس قرآن" اور "معارف الحدیث" کا سلسلہ:۔

خود اس عاجز راقم سطور کو دلی افسوس ہے کہ اس سال کے اکثر مہینوں میں ان دونوں سلسلوں کا انقطاع اور ناغہ رہا، بعض حالات کی وجہ سے یہ بالکل غیر ارادی طور پر ہوا، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ آئندہ سال ایسا نہ ہو۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں

عید الفطر کا خطاب

ناچیز مدیر الفرقان نے معمول کے مطابق گذشتہ عید الفطر کی نماز دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ادا کی تھی اور نماز کے بعد عمومی خطاب بھی کیا تھا۔ بعض مخلصین نے اسکو ریکارڈ کر لیا تھا۔ دار العلوم کے بعض عزیز طلبہ نے اسکو ریکارڈ مشین سے کاغذ پر منتقل کیا۔ اب اس عاجز کی نظر سے گزرنے کے بعد وہی نذر ناظرین الفرقان کیا جا رہا ہے۔ کہیں کہیں معمولی حذف و اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے اسکو نافع بنائے اور ان مخلصوں عزیزوں کی سعی مشکور فرمائے اور ان کو جزائے خیر سے نوازے، جنھوں نے اسے محفوظ اور پھر کاغذ پر منتقل کیا۔ "انہ شکور کریم"۔ [نعمانی]

(خطبۂ مسنونہ کے بعد) میرے بھائیو اور عزیزو! آج عید کا دن ہے اور ہم آپ عید کی نماز ادا کرنے ہی کے لئے اپنے گھروں سے یہاں آئے ہیں۔ ہمارا آپ کا اس وقت اتنی بڑی تعداد میں اللہ کے اس گھر میں نماز کے لئے جمع ہونا اس بات کی علامت اور شہادت ہے کہ خدا کے فضل سے ہم مسلمان ہیں اور ہم کو کسی نہ کسی درجہ میں ایمان کی دولت نصیب ہے۔

میرے بھائیو، عزیزو! اس دنیا میں ایمان سب سے بڑی دولت اور نعمت ہے لیکن بہت سے بھائی نہیں جانتے کہ ایمان کیا ہے، اور اس کی کیا حقیقت ہے؟ — اس وقت میں سب سے پہلے ایمان

کی حقیقت ہی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں:

ہماری اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے اور سب سے آخر میں ہمارے آپ کے ہادی اور آقا سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، ان سب نے بہت سی ایسی باتوں اور ایسی حقیقتوں کی ہمیں خبر دی جن کو ہم خود نہیں جان سکتے، نہ آنکھوں سے ان کو دیکھا جا سکتا ہے، نہ کانوں سے وہ چیزیں سننے کی ہیں، نہ کسی اور ذریعے سے ان کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ان ان دیکھی اور ان سنی اور ان جانی حقیقتوں پر پورا یقین کرنا کہ یہ حق ہیں، بلاشبہ حق ہیں، ہماری دیکھی بھالی چیزوں سے بھی زیادہ یقینی ہیں۔ بس اس یقین کرنے اور مان لینے ہی کا نام ایمان ہے۔ ہم نے اللہ پاک کو نہیں دیکھا، ہم نے اس کی آواز نہیں سنی، اللہ پاک کو ہم نے کسی علم اور حساب کے ذریعہ بھی نہیں جانا۔ ہاں اللہ کے سب پیغمبروں نے اور سب سے آخر میں سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس کی یہ صفات ہیں، ہمیں اور تمہیں اور سب کائنات کو اسی نے پیدا فرمایا ہے، ہم نے کسی اور ذریعے سے یہ بات نہیں جانی، صرف آپ کو صادق و سچا یقین کر کے اس بات کو قبول کر لیا، دل سے مان لیا، بس اسی کا نام ایمان ہے۔ اللہ نصیب فرمائے، اپنی دیکھی بھالی چیزوں سے بھی زیادہ پکا یقین، نصیب فرمائے۔ واقعہ یہ ہے کہ میری، آپ کی آنکھیں غلطی کر سکتی ہیں اور کرتی ہیں۔ میں نے اور آپ نے عمر بھر تجربہ کیا ہے۔ آنکھ بعض وقت ایک چیز کو بہت بڑا دیکھتی ہے اور وہ چھوٹی نکلتی ہے۔ اسی طرح بعض وقت آنکھ کسی چیز کو چھوٹا دیکھتی ہے اور وہ بہت بڑی نکلتی ہے۔ سورج جب صبح نکلتا اور شام کو غروب ہوتا ہے، تو ہماری نظروں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قطر ایک دو فٹ سے زیادہ نہیں ہے، لیکن یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سورج ہماری اس پوری دنیا سے بھی بہت بڑا ہے۔ اسی طرح سفر میں جب ہم کسی ٹرین کو دور سے آتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کے انجن کی لائٹ بہت بڑی معلوم ہوتی ہے، جب قریب آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قطر ایک فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا وہ اسی طرح ہے، بال برابر فرق نہیں ہے۔ بس اسی یقین کا نام ایمان ہے۔

میرے دوستو عزیزو! اپنے دلوں کو جھانک کے دیکھو! میں بھی دیکھوں اور آپ بھی

دیکھیں، کیا یہ بات نصیب ہے؟ —— ابھی ابھی ہم آپ نے نماز پڑھی۔ نماز میں میرے محترم بھائی مولانا برہان الدین صاحب نے پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ کا پہلا رکوع پڑھا اس میں یہ آیت میں نے بھی سنی اور آپ نے بھی سنی قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ [1] اس آیت میں دو حقیقتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ سب کو موت آنی ہے کسی کو اس سے مفر نہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کو ہم بھی جانتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جو کوئی اس دنیا میں پیدا ہوا اس کا انجام موت ہے اس میں کسی کے لئے شبہ کی گنجائش نہیں —— اس کے آگے جو دوسری بات فرمائی گئی ہے کہ اس کے بعد خداوند عالم الغیب والشہادہ کے سامنے پیشی ہوگی، وہ غیب کی بات ہے۔ ایمان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کو سچا جان کر غیب کی اس دوسری بات کا ہمیں اس پہلی بات سے بھی زیادہ یقین ہو جس کو ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کی اس اطلاع کی بنا پر ہمیں یقین ہو کہ مرنے کے بعد ایک وقت ہماری پیشی اس اللہ کے سامنے ہوگی جو ظاہر کو بھی جانتا ہے اور باطن کو بھی۔ وہ میرے دل کے خطروں کو بھی جانتا ہے وہ میرے دل کے وسوسوں اور ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ میں نے بہت سے کام ماں باپ سے بھی چھپا کر کئے ہیں۔ میں نے اور آپ نے بہت سے کام اپنی رازدار بیوی اور دوستوں سے چھپا کر کئے ہیں، میں نے اور آپ نے کوشش کی ہے کہ ہماری ان حرکتوں کا کسی کو پتہ نہ چلے لیکن میں اور آپ اگر اللہ پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع پر ایمان رکھتے ہیں، تو ہمیں یقین ہونا چاہیئے کہ ہمارے یہ سارے اعمال اللہ کے علم میں ہیں اور اس کے حضور میں ہماری پیشی ہوگی، اور ہمارے اعمال ہمارے سامنے کر دیئے جائیں گے (فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝)

بھائیو اور عزیزو! میں نے یہ سب کچھ زبان سے کہہ دیا اور آپ نے سن لیا، ذرا تفصیلی

---

[1] (ترجمہ) اے ہمارے پیغمبر آپ (ہمارے بندوں کو) بتا دیجئے کہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، بچنا چاہتے ہو وہ آکر رہے گی۔ اس کے بعد تمہاری پیشی ہوگی اس اللہ کے سامنے جو عالم الغیب والشہادہ ہے تو وہ تم کو بتلائے گا تمہارے اعمال جو تم دنیا میں کرتے تھے۔ ۱۲

طور پر غور کیجیے، ہمارا کیا حال ہوگا اُس دن ـــــــ دنیا میں اکسرے کی وہ مشینیں ہیں جو گردہ کی پتھری دکھا دیتی ہیں، سینے اور پھیپھڑے کے داغ نظر آجاتے ہیں ـــ اللہ تعالیٰ کے یہاں میرے دل کے سارے کالے دھبّے، میرے دل کے سارے کالے ارادے، میرے سارے بُرے کام، میری غیبتیں، میرا جھوٹ، میرا ظلم، یہ سب کچھ اس اللہ کے علم میں ہے جو آپ میں سے کسی کے بھی علم میں نہیں ہے، اُس اللہ کے سامنے میری پیشی ہوگی، میرے دوستو بزرگو! ہماری آپ کی سب کی پیشی ہونی ہے: "ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ"ـــ یہاں تو مشین سے ایکسرے کرنا ہوتا ہے، مگر اللہ کے یہاں اس طرح کی کسی مشین کے بغیر میری پوری زندگی کا ایکسرے ہے، میرے ظاہر کی میرے باطن کی اس کو پوری خبر ہے "ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ" اور اتنا ہی نہیں "فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ"ـــ تمہیں بتا دیا جائے گا، بلکہ دکھلا دیا جائے گا کہ تم یہ ہو ـــ اور کس طرح؛ اللہ کی پناہ! ـــ فرمایا گیا ہے: "اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاھِھِمْ وَتُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْھِمْ وَتَشْھَدُ اَرْجُلُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ o" یعنی اُس دن منہ پر مہر لگا دی جائیگی، بولنے والی زبان کو حکم ہوگا کہ آج تجھے بولنے کی اجازت نہیں، گویا منہ سی دیا جائے گا اور حکم ہوگا ہاتھوں کو، پاؤں کو، تم بولو، کہ تمہیں کس کس کام میں استعمال کیا گیا؟ ـــــــ میرے بھائیو کیا حال ہوگا اسوقت میرا اور آپ کا؟ میرے ہاتھ، میرے پاؤں گواہی دیں گے کہ مجھے فلاں کام کے لئے، فلاں گناہ کے لئے استعمال کیا گیا ـــ میرا ایک ایک عضو، میرے جسم کا ایک ایک حصّہ میرے خلاف گواہی دے گا، اُس وقت بندہ کہے گا ـــ: "لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا"؛ تم میرے خلاف گواہی دے رہے ہو، تم کو کیا ہو گیا ہے؟ ـــ "قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ"ـ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضا جواب دیں گے کہ ـــ جس اللہ کے حکم سے سب بولنے والے بولتے ہیں ہم اسی کے حکم سے بول رہے ہیں،

آج ان باتوں کا سمجھنا اور یقین کرنا زیادہ مشکل نہیں رہا، گراموفون، ریکارڈ مشین، ٹیلیوژن ان ایجادات نے ان باتوں کا سمجھنا بہت آسان کر دیا ہے۔ صحابۂ کرام اور بعد کے دور کے ہمارے اسلاف کرام نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے

بیان پر ان کو ان سب باتوں کا اس سے زیادہ یقین تھا جتنا اپنی آنکھوں سے دیکھی چیزوں پر ہوتا ہے، اور اس کے اثرات ان کی زندگی میں محسوس ہوتے تھے ــــ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی "مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ" (جو کوئی گناہ کرے گا، جو بری حرکت کرے گا اس پر مار پڑے گی، اسے سزا ملے گی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو قریب تھے بتایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے: "مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ" ــ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا حال یہ ہو گیا کہ اٹھنے کے لائق نہیں رہے، گویا آیت سن کے کمر ٹوٹ گئی ــــ عرض کیا کہ حضرت میری تو کمر ٹوٹ گئی، اس آیت نے تو میری کمر توڑ دی ـــــ اس آیت کا مضمون یہ ہے کہ جو کوئی بری حرکت کرے گا جو غلطی کرے گا اس پر آخرت میں مار پڑے گی ـــــــــــــــ اب ہم میں سے کون ہے جس نے کوئی برا کام یا کوئی گناہ نہ کیا ہو ــــ (آگے حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابوبکر کو تسلی دی کہ اللہ کے بہت سے بندے وہ ہیں جن کو دنیا میں ہی بیماری یا کوئی تکلیف دیکر اللہ تعالیٰ ان کا حساب صاف کر دیتا ہے اور انشاء اللہ تم بھی انہی بندوں میں ہو ــــ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کو تسلی ہوئی اور وہ اٹھنے کے قابل ہو سکے۔) اگر ہم کو حقیقی ایمان و یقین نصیب ہو تو اللہ تعالےٰ کا ارشاد: ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ سن کر ہم کو لرز جانا چاہیئے، فکر میں ڈوب جانا چاہیئے۔

ایک صحابی کا واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ کسی علاقہ سے آئے اور اسلام قبول کیا۔ حضورؐ کا طریقہ تھا کہ ایسے نئے آنے والوں کو آپ کسی صحابی کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ وہ ان کو قرآن مجید اور دین کی ضروری باتیں سکھا دیں، تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا وہ کچھ دن آتے رہے اور سیکھتے رہے۔ چند روز کے بعد ان کا آنا بند ہو گیا۔ حضورؐ نے جب کئی دن تک ان کو مسجد میں نماز میں بھی نہیں دیکھا تو آپ نے حضرت علیؓ سے ان کے بارے میں دریافت کیا جن کے سپرد ان کی تعلیم ہوئی تھی ــ انھوں نے بھی کہا کہ ــ کئی دن سے وہ میرے پاس بھی نہیں آئے ہیں ــ آپ نے حاضرین سے فرمایا ان کا پتہ چلایا جائے، ان کے بارے میں فکر ہے ــ حسن اتفاق سے ایک صاحب کی ان سے ملاقات ہو گئی، وہ سر پر لکڑی کا گٹھا بیچنے کے لئے

رکھے ہوئے تھے (غالباً روزانہ یہی کرتے تھے، جنگل سے لکڑیاں لے آتے، اسے بیچ لیا اور اس سے گذارہ کر لیا) تو وہ اسی حال میں ان کو مل گئے۔ انھوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارا ذکر فرما رہے تھے۔ تمہارے نہ آنے سے حضور کو بڑی فکر ہے۔ انھوں نے لکڑی کا گٹھا جلدی کسی خریدار کے ہاتھ بیچا، اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے فرمایا خیریت تو ہے؟ کہاں ہو کس حال میں ہو؟ کئی روز سے نہیں دیکھا اور تمہاری تعلیم کا سلسلہ بھی معلوم ہوا کہ جاری نہیں ہے۔ انھوں نے کہا۔ حضرت میں نے سمجھا، میری تعلیم پوری ہو گئی۔ آپ نے فرمایا، بھئی تم نے چار چھ دن میں کیا پڑھ لیا۔؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے یہ آیت بھی پڑھ لی: فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ۔ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ آخرت میں اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ بھی دیکھ لے گا) اور جب یہ آیت میں نے پڑھ لی تو میرا حال یہ ہو گیا ہے (سننے کی بات ہے) میرا حال یہ ہو گیا ہے کہ اب کوئی بھی کام کرنا ہوتا ہے، چھوٹا، بڑا، تو سوچتا ہوں قیامت میں اس کا انجام کس طرح سامنے آئے گا۔ اگر اطمینان ہوتا ہے کہ اچھی بات ہے اور اچھا انجام ہے تو قدم اٹھتا ہے اور اگر شک بھی ہو جاتا ہے تو میرا قدم نہیں اٹھتا۔ تو آپ نے فرمایا، پھر تو تمہارے لئے یہی کافی ہے۔

تو میرے دوستو عزیزو! اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ یقین اور یہ حالت نصیب فرمائے اور آپ کو بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم ان چیزوں کے منکر تو نہیں ہیں لیکن جیسا یقین ہونا چاہیئے میرے دوستو وہ یقین نصیب نہیں ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس کا احساس اور اس کی فکر بھی نہیں ہے۔ ہم کو بخار آجائے تو پریشانی ہو جاتی ہے۔ ٹی بی ہو جائے تو اور زیادہ فکر اور پریشانی ہو جاتی ہے اور اگر خدا نہ کرے کینسر ہو جائے تو پھر تو مصیبت ہی آجاتی ہے، عزیز قریب بھی فکر مند ہو جاتے ہیں، خدا کی قسم کینسر سے ہزار درجہ بڑا ہے کینسر میرے اندر اور آپ کے اندر یہ موجود ہے کہ اس یقین میں کمی ہے۔ ہمیں کینسر سے زیادہ اس بات کی فکر ہونی چاہیئے کہ اس یقین کی کمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے روئیں، اللہ تعالیٰ سے دعائیں کریں کہ اللہ تعالیٰ ان باتوں پر یقین نصیب فرمائے حضور نے جو کچھ آخرت کے بارے میں فرمایا، جو کچھ جنت کے بارے میں فرمایا، جو کچھ دوزخ کے بارے

میں فرمایا اس پر یقین ہو، ایسا یقین جو زندگی پر غالب آجائے اور زندگی اس کے ماتحت چلے۔ ہم میں اور صحابہ کرامؓ میں میرے دوستو، اصل فرق یہی تھا۔ تابعین میں سے ایک بزرگ ہیں۔ مجھے نام میں شبہ ہو رہا ہے حضرت حسن بصریؒ ہیں یا کوئی دوسرے ہیں، انھوں نے اپنے شاگردوں سے فرمایا، جنھوں نے صحابہ کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ نماز روزہ جیسی عملی عبادات میں تم سے بہت بڑھے ہوئے نہیں تھے یعنی ان کی فضیلت یہ نہیں تھی کہ وہ نفل نمازیں تم سے زیادہ پڑھتے تھے اور نفلی روزے زیادہ رکھتے تھے "وَلٰكِنَّهُ شَيْءٌ وَقَرَ فِي قُلُوبِهِمْ" ایک چیز تھی جو ان کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی، وہ کیا چیز تھی وہ یہ یقین ہی تھا۔ اور ہمارے اندر اس یقین ہی کی کمی ہے۔ اگر یقین میں کمی نہ ہوتی تو ہمارا یہ حال نہ ہوتا۔

اب تک میں نے صرف ایمان و یقین کے بارے میں عرض کیا۔ اب کچھ اعمال اور عملی زندگی کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں ــ ہم ذرا اپنے اعمال پر نگاہ ڈالیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام دیئے تھے زندگی کا جو طریقہ بتایا تھا، ہم میں سے کون ہے جو کہہ سکے کہ میں اس پر ٹھیک ٹھیک چل رہا ہوں۔ حضور نے کچھ چیزوں کے بارے میں سختی سے ممانعت فرمائی ان کے پاس نہ جاؤ قرآن مجید میں بھی ممانعت فرمائی گئی، کچھ چیزوں کے بارہ میں حکم دیا کہ ان کو بڑے اہتمام بڑی پابندی سے ادا کرو، ذرا غفلت نہ ہو، نماز ہے، روزہ ہے، زکوٰۃ ہے، ہمیشہ سچ بولو، جھوٹ اور خاص کر جھوٹی گواہی سے اور فلاں فلاں گناہوں سے بچو!!

اب ہر شخص ہم میں سے اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ میں حضورؐ کی ان ہدایات پر کہاں تک اور کیسا عمل کر رہا ہوں۔ مجھے الحمد للہ نماز نصیب ہے، آپ بھائیوں کو بھی نماز نصیب ہے مگر میں اللہ کے گھر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جیسی نماز ہونی چاہیئے ہمیشہ حسرت رہتی ہے کہ ویسی نماز نصیب ہو جائے، لوگ تو دیکھ رہے ہیں، میں ہاتھ باندھے کھڑا ہوں اور میرا منھ قبلہ کی طرف ہے اور اللہ میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ اس وقت اس کا رخ کدھر ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو وہ نماز نصیب فرمائے جس میں دل کا رخ بھی اسی کی طرف ہو۔

میرے بھائیو! ہماری یہ ناقص نمازیں بھی یقیناً کام آئیں گی، یہ ٹوٹی پھوٹی نمازیں ہزار درجہ بہتر ہیں نماز نہ پڑھنے سے، انشاء اللہ یہ بھی کام آئیں گی لیکن ان کی ایک قیمت ہے۔ مگر جو نماز حضورؐ

نے بتائی تھی جس کے بارے میں ارشاد فرمایا "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، وہ معراج المومنین ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ بھائیوں کو اس کا کوئی ذرہ نصیب فرمائے۔ اسی طرح اللہ کا ذکر جیسا چاہیئے ویسا نصیب ہو، اللہ کا خوف نصیب ہو، اللہ کی محبت نصیب ہو۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کے لئے حضورؐ نے فرمایا ہے، اللہ کی کتاب میں فرمایا گیا ہے اور ان کے بارے میں دوستو! ہر ایک اپنا حال جانتا ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۝ اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرمائے اور آپ کو بھی۔

پہلی بات ایمان ویقین کی تھی، دوسری بات یہ تھی کہ ہم اپنے اعمال پر نگاہ ڈالیں — قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون ۝ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ سب کچھ نوٹ کیا جا رہا ہے، ریکارڈ ہو رہا ہے۔ ہم آپ سوچا کریں کہ میرا ہر عمل نوٹ کیا جا رہا ہے میری ہر بات — ریکارڈ ہو رہی ہے، میرا بولنا ریکارڈ ہو رہا ہے، چلنا پھرنا ریکارڈ ہو رہا ہے، میری ساری زندگی ریکارڈ کی شکل میں پیش ہوگی، آنے والے اس دن اور اس وقت کا خیال کر کے اپنی زندگی اور دن رات کے اپنے اعمال پر نگاہ ڈالا کریں، اس لحاظ سے جہاں نگاہ ڈالیں گے تو داغ ہی داغ نظر آئیں گے، کالے کالے دھبے نظر آئیں گے، پھر اللہ کی پکڑ اور اس کے جلال سے ڈر کے سچے دل سے توبہ کر لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ معاف فرمائے گا اور رحم و کرم فرمائے گا ھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہٖ ویعفو عن السیئات ۝ اگر توبہ کا یہ دروازہ کھلا نہ ہوتا تو ہم جیسوں کا کہیں ٹھکانہ نہ تھا، ہم ایسے بنائے گئے ہیں کہ گناہ وقصور ہماری سرشت میں داخل ہیں، گناہ تو ہم سے ہوں گے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی یہ کریمی ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد اگر سچے دل سے معافی مانگو گے تو بڑا گناہ ہو، چھوٹا گناہ ہو، پہلی دفعہ ہوا ہو، ہزار دفعہ ہوا ہو، سچے دل سے معافی مانگو گے تو معاف کر دیں گے: ومن یعمل سوءً او یظلم نفسہ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفوراً رحیماً ۝ سبحان اللہ گنہگاروں کے لئے کیسی خوشخبری ہے فرمایا گیا ہے — یعنی جو بندہ ہمارا کوئی گناہ کرے یا اپنے نفس پر بڑے سے بڑا ظلم کر ڈالے "ثم یستغفر اللہ" پھر دل سے اللہ سے معافی مانگے، تو وہ دیکھے گا کہ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے — اس سلسلہ میں ایک آیت اور سن لیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو حکم ہے: إِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ اللہ اللہ! میرے دوستو! اس کو غور سے سنو، حضور کو حکم ہوتا ہے إِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا یعنی اے ہمارے رسول جب تمہارے پاس ہمارے ایمان والے بندے آئیں تو ان سے کہو "سلام علیکم" تم کو سلام ہے، حضور کی طرف سے اور اللہ پاک کی طرف سے، اور ان کو بشارت دو، خوشخبری سناؤ کَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ" اللہ نے تمہارے لئے رحمت اپنے اوپر واجب کرلی ہے یعنی اپنے لئے طے فرمالیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ رحمت ہی کا معاملہ فرمائے گا اور اس کا ظہور اس طرح ہوگا کہ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ کہ جو کوئی تم میں سے جہالت سے گناہ کرے، پھر توبہ کرلے اور اپنا حال درست کرلے تو اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

آیت میں "جہالت" کے معنی نہ جاننے کے نہیں ہیں، قرآن پاک میں "جہالت" کے لفظ کا مطلب ہوتا ہے ناعاقبت اندیشی، یعنی انجام اور نتیجہ سے بے فکر ہو کر کوئی کام کرنا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ۔۔ اے رسول، ایمان والے بندوں کو سلام کے ساتھ یہ خوشخبری سنادو کہ ہمارے جو بندے آخرت کے انجام سے غافل ہو کر گناہ میں مبتلا ہو جائیں اس کے بعد وہ سچے دل سے توبہ کرلیں اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائے گا مواخذہ اور عذاب کچھ نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں آخری بات میں آپ بھائیوں دوستوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کو روزانہ کا وظیفہ اور معمول بنالو کہ کم از کم ایک دفعہ اپنے اعمال نامہ پر نظر ڈال لیا کرو کہ میری زندگی کیسے گزر رہی ہے، جو کام کر رہا ہوں اللہ کے حکم کے مطابق کر رہا ہوں یا اس کے خلاف چل رہا ہوں جتنا زیادہ سوچو گے اپنے اندر قصور ہی قصور پاؤ گے اور اس کے بعد قیامت کی پیشی کو یاد کرو، جب خود ہمارے ہاتھ پاؤں ہمارے خلاف گواہی دیں گے اس کے بعد سچے دل سے اللہ سے معافی مانگو اور ارادہ کرو کہ گناہوں سے اپنے آپکو بچانے کی کوشش کریں گے اور اللہ سے دعا کرو کہ اے اللہ! میں ارادہ کرتا ہوں کہ گناہ نہ ہو تو میری مدد فرما میں خود کسی لائق نہیں ہوں ضعیف الارادہ ہوں

شیطان کے شر اور نفس کے فریب سے خود نہیں بچ سکتا، تو میری مدد فرما اور گناہوں سے میری حفاظت فرما، اگر روز مرّہ کا یہ معمول ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضرور مدد ہوگی اور انشاء اللہ عملی زندگی کی بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی اور پھر اللہ کی رضا اور جنت نصیب ہو جائے گی۔

میرے بھائیو! یہ عید کا دن ہے ایسے خوشیوں کے موقعوں پر کوشش کی جاتی ہے کہ سب کو خوش کیا جائے، جن سے تعلقات اچھے نہیں ہوتے ان سے بھی اچھی طرح ملا جاتا ہے، بچوں کو عیدی دی جاتی ہے، گھر کے خادموں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

اے اللہ کے بندو، اے میرے بھائیو دوستو! آج کی عید حبیب عید ہے، حبیب ارادہ کر لو کہ یہاں سے اٹھنے سے پہلے اپنے اللہ کو خوش کرنا ہے، اپنے اللہ کی ناراضی دور کرنا ہے، ہم سب نے اللہ کو بے حد ناراض کیا ہے، جو گناہ بھی ہم نے کیا ہے وہ اللہ کو ناراض کرنے والا ہے، آج یہاں اللہ کے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہم سب اپنے ایک ایک گناہ سے جو یاد ہیں وہ، اور جو یاد نہیں ہیں ان کو یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کو سب معلوم ہے، اپنے سب گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں، اللہ سے معافی مانگیں اور آئندہ کے لئے یہ ارادہ کریں کہ ان گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ اور چند باتوں کی پابندی کا عہد کریں — آپ سب بھائی نماز پابندی سے پڑھتے ہی ہوں گے جو بھائی پابندی سے نماز نہ پڑھتے ہوں، وہ سن لیں، اچھی طرح سن لیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ کلمہ شریف پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی مسلمان نہیں ہوگا، اسی طرح مسلمان ہونے کے لئے نماز کی پابندی بھی ضروری ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ کلمہ شریف زبانی کلمہ ہے اور دن میں پانچ وقت کی نماز عملی کلمہ ہے اس کو کلمہ کی طرح ضروری سمجھو۔ پانچ وقت کی نماز کی اگر اب تک پابندی نہیں کی تو اللہ سے عہد کرو کہ انشاء اللہ آج کے بعد نماز قضا نہیں ہوگی۔ میری عمر ستر برس سے اوپر ہو چکی ہے اور تجربہ ہے کہ نماز کی پابندی نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ یہ نہ طے کیا جائے کہ جماعت سے نماز پڑھیں گے۔ جب یہ طے کرو گے تو کبھی کبھی جماعت تو چھوٹ جائے گی لیکن نماز انشاء اللہ قضا نہیں ہوگی، میں نے بزرگوں سے سنا ہے اور جو کچھ میرے بزرگوں نے کہا حق ہے اور میرا ذاتی تجربہ بھی ہے اگر کوئی شخص یہ طے کر لے کہ میری جماعت

قضا نہیں ہوگی تو اس کی جماعت ... تو کبھی قضا ہوگی لیکن نماز قضا نہیں ہوگی، اور جو یہ طے کرلے کہ میری تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو، میں جماعت شروع ہونے سے پہلے مسجد میں رہوں تو اس کی تکبیر اولیٰ تو کبھی کبھی فوت ہوگی لیکن جماعت انشاء اللہ فوت نہیں ہوگی، اور جو شخص یہ طے کرلے کہ میں مسجد میں ایسے وقت پہنچا کروں گا کہ کچھ سنتیں اور نفل پڑھنے کے بعد کچھ دیر جماعت کے انتظار میں مجھے بیٹھنا پڑے جس کی حدیث شریف میں بڑی فضیلت آئی ہے تو کبھی کبھی ایسا ہوگا کہ یہ بات کسی وجہ سے حاصل نہیں ہوسکے گی لیکن انشاء اللہ اس کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوگی۔

میرے بھائیو، دوستو! مجھے بھی یہ سب باتیں نصیب نہیں ہیں، اللہ تعالےٰ نصیب فرمائے — اس وقت آپ سے یہی کہتا ہوں کہ یہ عہد کرلیجئے کہ نماز پابندی سے پڑھیں گے اور جماعت کی بھی پابندی کریں گے۔ اگر اتنا نصیب ہوگیا تو انشاء اللہ زندگی بہت کچھ سنور جائے گی۔ نماز میں یہ خاصیت ہے کہ اگر فکر کے ساتھ اور صحیح طریقہ سے پابندی کی جائے تو وہ زندگی کو پاک صاف کردیتی ہے۔

میرے بھائیو! میں نے اس وقت آپ سے کہا ہے کہ ایمان ٹھیک کرلو، توبہ کی عادت ڈالو، اپنے کو پانچ وقت کی نماز کا پابند بنالو، اور اس کے ساتھ حضور کے تعلیم فرمائے ہوئے کچھ کلمات ہیں ان کی عادت ڈالو، روزانہ کا معمول بنالو، انشاء اللہ دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے تعلق بڑھے گا۔ حضورؐ کے تعلیم فرمائے ہوئے کلمے یہ ہیں: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر۔ اسی طرح استغفار درود شریف — اس دنیا میں ان کلموں کی بظاہر کوئی قیمت نہیں ہے، قیامت میں جاکر معلوم ہوگا کہ یہ ایک دفعہ کا سبحان اللہ کتنی قیمت کا ہے۔ ایک دفعہ کے استغفار درود شریف کی کیا قیمت ہے — یہاں ہمارے ملک جو سکہ چلتا ہے اس کو یہاں کے سب لوگ جانتے ہیں، گاؤں کے لوگ بھی جانتے ہیں کہ یہ سو کا نوٹ ہے یہ دس کا نوٹ ہے، لیکن اگر میرے ہاتھ میں امریکہ کا ایک ہزار ڈالر کا ڈرافٹ ہو اور میں محلہ کے دوکاندار سے کہوں کہ مجھے اس کے بدلے میں ماچس دیدو تو وہ اسے دیکھے گا کہ یہ ایک روپیہ کا بھی نوٹ

نہیں ہے، دو روپے کا بھی نہیں ہے، پانچ پیسے کا سکہ بھی نہیں ہے، وہ کہے گا کہ مولوی صاحب! ماچس لینا ہو تو لے لو اسے اپنے پاس رکھ لو، یہ میرے کس کام کا۔ اور ٹھیک ہے اس بے چارہ کا کہنا، لیکن بینک والے جانتے ہیں کہ اس کی قیمت کیا ہے۔ بینک میں جب جاؤ گے تو وہاں اس کی صحیح قیمت ملے گی۔

تو میرے بھائیو! یہ کلمات: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر، درود شریف استغفار، یہ کلمات بند نوٹ ہیں، ان کی قدر و قیمت قیامت میں اور حشر میں معلوم ہوگی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ بندہ نے ایک دفعہ جو سبحان اللہ یا الحمد للہ یا لا الٰہ الا اللہ کہا تھا اس کی کیا قیمت ہے کیا اجر و ثواب ہے؟

اسی طرح سن لو ایک دفعہ کا جھوٹ، ایک دفعہ کی غیبت، ایک دفعہ کا ظلم، ہم اسے کچھ نہیں سمجھتے، وہاں جا کر معلوم ہوگا کہ یہ تو پہاڑ کے برابر گناہ تھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اس کا احساس نصیب فرمائے، یقین عطا فرمائے۔

پھر اس سب سے زیادہ اہم معاملہ حقوق العباد کا ہے، اگر ہم نے کسی پر ظلم کیا ہے، کسی کا حق مارا ہے، کسی کا دل دکھایا ہے، کسی کی غیبت کی ہے تو اس کی معافی صرف توبہ و استغفار سے نہ ہو سکے گی، اس کے لئے ضروری ہے کہ جس کا ہم پر جو حق ہے وہ ادا کیا جائے یا اس سے معاف کرا لیا جائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ دنیا میں جس کے ذمہ کسی کا حق رہ گیا ہوگا، آخرت میں اس کا بدلہ دلوایا جائے گا، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دلوا دی جائیں گی، بعض ایسے لوگ ہونگے جنھوں نے دنیا میں پابندی سے نمازیں ادا کی ہوں گی، زکوٰۃ ادا کی ہوگی، صدقات دیئے ہوں گے، روزے رکھے ہوں گے، حج کیا ہوگا، لیکن دوسروں کے حق مارے ہوں گے، ظلم کئے ہوں گے غیبتیں کی ہوں گی، تو ان کی ساری نیکیاں ان مظلوموں کو دلوا دی جائیں گی اور ان کے گناہ ان پر لاد دیئے جائیں گے اور وہ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے ـــ تو میرے بھائیو، حقوق العباد کی بہت زیادہ فکر کرو، ایسا نہ ہو کہ آخرت میں تمہارا نماز روزہ اور تمہاری ساری نیکیاں چھن جائیں۔

میں نے شروع میں ایک بات کہی تھی۔ اب آخر میں پھر اس کو دہراتا ہوں، آج عید کا دن

ہے، خوشی کا دن ہے، اللہ و رسول نے بھی اس کو خوشی کا دن قرار دیا ہے، ہماری اور آپ کی عید جب ہے کہ ہمارا اللہ اور اس کے رسول پاک کی روح ہم سے خوش ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری مغفرت کا فیصلہ ہو جائے اور یقین ہے کہ اگر ہم اس وقت سچے دل سے توبہ کریں اور اپنے گناہوں سے معافی مانگیں تو ابھی اسی وقت ہماری مغفرت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ آؤ اب اللہ کی طرف دل سے متوجہ ہوں اور توبہ کریں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ نَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ إِلَيْكَ۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ نَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ إِلَيْكَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ إِلَيْكَ۔

اے اللہ ہم آپ کے بندے آپ کے گھر میں، آپ کے حضور میں حاضر ہیں، اے اللہ ہم دل و زبان سے گواہی دیتے ہیں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم آپ پر ایمان لائے، ہم گواہی دیتے ہیں کہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے نبی برحق ہیں ہم ان پر ایمان لائے۔ اور آپ کے سارے انبیاء پر ایمان لائے، جو آپ کی طرف سے کسی زمانہ میں دنیا کے کسی حصہ میں آئے۔ اے اللہ ہمیں حقیقتِ ایمان نصیب فرما، اے اللہ ہمیں حقیقتِ ایمان نصیب فرما۔

اے اللہ تیرے حضور میں اقرار کرتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد زندگی جیسی بن جانی چاہیئے تھی وہ نہیں بنی، بہت سے اعمال جن کا تاکید سے حکم دیا گیا تھا ان کے ادا کرنے میں ہم سے بڑی کوتاہی ہوئی اور بہت سے وہ گناہ جن سے سختی سے منع کیا گیا تھا، اے اللہ ہم ان میں مبتلا ہوئے اور بری طرح ملوث ہوئے، اے اللہ اے غفور و رحیم ۔ ہم تیرے حضور میں اپنے سارے جرائم اور مظالم کا اقرار کر کے معافی اور مغفرت کے طالب ہیں، تیرے دامنِ عفو کے سوا کہیں پناہ نہیں، تو معاف کرے گا تو معافی ملے گی، تیری پکڑ سے اور تیری مار سے کوئی بچا سکنے والا نہیں اے اللہ بس تو ہی تو ہے: اللّٰھم لا ملجأ ولا منجا منك الا الیك۔ اللّٰھم لا ملجا ولا منجا منك الا الیك۔ اللّٰھم لا ملجا ولا منجا منك الا الیك۔

اے اللہ تو ہمارے ساتھ وہ معاملہ فرما جو تیری شانِ رحیمی، شانِ کریمی کے لائق ہے، جس کا تو نے اپنی رحمت والی آیات میں ذکر فرمایا ہے، وہ معاملہ نہ فرما جس کے ہم اپنی بداعمالیوں

کی وجہ سے مستحق ہو گئے ہیں۔ اے اللہ تو کریم ہے اور اکرم الاکرمین ہے، رحمٰن و رحیم ہے اور ارحم الرّاحمین ہے. ہم خالی ہاتھ ہیں، اور بالکل خالی ہاتھ ہیں اور تجھ سے جنت جیسی قیمتی چیز مانگتے ہیں، اے اللہ محض اپنے کرم سے عطا فرما دے، تیرے خزانہ میں کوئی کمی نہیں آئے گی ۔۔ اے غفور رحیم، اے ارحم الراحمین، ہم سب کے لئے مغفرت مقدر فرما دے، ہم سب کے لئے رحمت مقدر فرما دے، ہم سب کے لئے جنّت مقدر فرما دے۔ ہمارے ماں باپ جو تیرے حضور میں حاضر ہو چکے ہیں، اور جو بھی تیرے ایمان والے بندے اوّلین و آخرین تیرے حضور میں حاضر ہو چکے تیرا جو بندہ بھی ایمان کا کوئی ذرّہ لے کر حاضر ہو چکا، ہم ان سب کے لئے تجھ سے مغفرت مانگتے ہیں رحمت مانگتے ہیں، جنت مانگتے ہیں، اے اللہ تو سبھی کو عطا فرما دے تو بھی تیرے خزانہ میں قطعاً کوئی کمی نہیں آئے گی۔ آپ کے لئے جس طرح ایک کو جنّت میں بھیجنا آسان ہے، اسی طرح ساری مخلوق کو جنت میں بھیجنا آسان ہے۔ اے اللہ ہر ایمان والے کے لئے جنت کا فیصلہ فرما دے اور ہم سب کو ان میں شامل فرما۔

اللّٰھمّ انا نسئلک الجنۃ وما قرّب الیھا من قول وعمل ونعوذ بک من النّار وما قرّب الیھا من قول وعمل۔ اللّٰھمّ انا نسئلک من خیر ما سألک منہ نبیّک محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم ونعوذ بک من شرّ ما استعاذ منہ نبیّک محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم۔ ربّنا تقبّل منّا انّک انت السّمیع العلیم وتب علینا انّک انت التّواب الرّحیم ٭ وصلّ اللّٰھمّ علی سیّدنا محمّد النّبی الامّی وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین ومن تبعھم باحسان الیٰ یوم الدّین ۔ ☆☆☆

جماعت اسلامی۔ اور۔ تبلیغی جماعت

ایک خط اور اس کا جواب

مخدومی المکرم المحترم　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدمت اقدس میں جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت سے متعلق ایک بہت ضروری عریضہ پیش ہے۔ امید ہے حضرت والا اس کی اہمیت کے پیش نظر جواب سے نوازیں گے۔

جماعت اسلامی کے سامنے اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ تبلیغی جماعت اور اسکی سرگرمیاں ہیں چنانچہ تبلیغی جماعت کی روز بروز بڑھتی ہوئی دینی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے جماعت اسلامی کی جانب سے تبلیغی جماعت پر کچھ نئے قسم کے الزامات عاید کیے جارہے ہیں اور خاص طور پر پڑھے لکھے نوجوان طبقے میں ان کی اشاعت کی جارہی ہے۔ جماعت اسلامی اپنے مخصوص پروپیگنڈے کے ذریعہ یہ تاثر پیدا کررہی ہے کہ تبلیغی جماعت چونکہ زندگی کے ایک مخصوص اور متعین حصے کو ہی اسلامی بنانا چاہتی ہے جبکہ جماعت اسلامی کا واحد نصب العین یہ ہے کہ پوری زندگی کو سو فی صدی اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس لیے تبلیغی جماعت انسان کی مکمل رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے اس کی تمام تر سرگرمیاں نماز، روزہ، کلمے اور دعائیں سکھانے اور فضائل بتانے تک محدود ہیں جبکہ جماعت اسلامی مکمل اقامت دین کی داعی ہے اور اقامت دین سے مراد یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے۔ انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام شعبوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقا، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ سو فیصدی اسلام کے مطابق ہو۔ جماعت اسلامی کا واحد نصب العین یہی اقامت

دین ہے اور اس کی تمام تر سرگرمیوں کا واحد محرک رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے۔ اس کے برعکس تبلیغی جماعت کو مسلمانوں کو درپیش کسی بھی انفرادی یا اجتماعی مسئلہ سے خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی کوئی دلچسپی یا سروکار نہیں ہے ؟؟؟ ـــــــــــ

حضرت والا آج کے حالات میں یہ انتہائی اہم اور عام طور پر مسلمانوں کو متاثر کرنے والے الزامات بہت ہی قابل غور و فکر ہیں تبلیغی جماعت کے دفاع کے لیے ہی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کی تسلی و تشفی اور اشکالات دور کرنے کے لیے ایسے پروپیگنڈے اور غلط فہمیوں کا ازالہ نہایت ضروری ہے ـــــــ اس سلسلہ میں حضرت والا سے انتہائی عاجزانہ استدعا کے ساتھ پوری امید ہے کہ حضرت والا اس کا تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے جس سے تبلیغی جماعت کی جو تصویر جماعت اسلامی عوام کے سامنے پیش کر رہی ہے اس کا دوسرا صحیح رخ سامنے آسکے اور اس سے جو لوگ متاثر ہیں ان کی تسلی و تشفی بھی ہو سکے ـــــــــ

جماعت اسلامی کا تبلیغی جماعت پر الزام حسب ذیل ہے:-

تبلیغی جماعت جو کچھ کہتی اور کرتی ہے وہ صرف یہ کہ زندگی کے کچھ مخصوص حصے میں مخصوص اور متعین مسائل کو لیکر اٹھتی ہے اس کا منشا صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ نماز اور روزہ سے نابلد ہیں انھیں نماز سکھائیں اور پڑھائیں ان کے کلمے اور دعاؤں کی تصحیح کرائیں انھیں نماز روزے وغیرہ کے فضائل سے آگاہ کریں اس کی تعلیم کے لیے اپنا کچھ وقت نکالیں چنانچہ روزانہ بے شمار افراد ان کے چلّوں میں جاتے اور گشت وغیرہ کرتے ہیں مسائل و فضائل کو سیکھتے سکھاتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کا یہ مقصد کبھی نہیں رہا کہ وہ اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت میں جیسا کہ وہ ہے سمجھیں اور دوسروں کے سامنے اسے اسی حیثیت سے پیش کریں، انھیں باطل افکار و نظریات اور ملحدانہ طرز حیات سے جو آج انسانی معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، انھیں ان کے مرکز کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ وہ ان مسائل پر کوئی اظہار خیال نہ کریں جن کا تعلق اجتماعی معاملات سے ہے اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں ملک کے مختلف سیاسی و غیر سیاسی پارٹیوں اور ایوان حکومت میں کیا سازشیں ہو رہی ہیں، مسلم پرسنل لا کیا ہے، اور یکساں سول کوڈ کیا ہے، مسلمانوں کا تعلیمی مسئلہ کس طرح حل ہو اور اس کی اہمیت

کیا ہے، فرقہ وارانہ فسادات کے اندر مظلومین اور سیلاب و خشک سالی کے متاثرین تک کے سلسلے میں تبلیغی جماعت کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ غیر مسلموں میں مسلمانوں اور اسلام کے تعلق سے کیا بدگمانیاں پائی جارہی ہیں اور ان کا ازالہ کس طرح ہو، غیر مسلموں میں اسلام کا تعارف ہونا چاہیے اور وہ کس طرح ہو ان سب امور سے بھی تبلیغی جماعت کو کوئی دلچسپی نہیں ہے، اس کے افراد اپنے اجتماعی معاملات و مسائل میں کیا طرز اختیار کرتے ہیں اس کی بھی اسے کوئی فکر نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نماز روزے کی پابندی چلّوں اور گشت میں تعاون اجتماعات میں شرکت کے ساتھ ساتھ محکمہ آبکاری کا انسپکٹر ہو یا کوئی رشوت اور سود کا لین دین اپنے کاروبار میں کرتا ہو عدالتوں میں جھوٹے مقدمات لڑتا لڑواتا ہو اسی طرح اور کوئی ناجائز ذرائع آمدنی رکھتا ہو اس سے تبلیغی جماعت کوئی باز پرس نہیں کرتی کیونکہ یہ اس کا ذاتی اور معاشی معاملہ ہے اسی طرح کوئی شخص کیونزم، کانگریس، جنتا پارٹی یا کسی بھی جماعت یا پارٹی کا علمبردار ہو اس کے سیاسی نظریات کیا ہیں وہ سیاسی امور میں کیا طرز اختیار کرتا ہے، تبلیغی جماعت کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے؟؟؟ ————

جواب از ناچیز محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

مخلص مکرم ……! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا مفصل خط ملا —— اس سے اندازہ ہوا کہ آپ کو تبلیغی جماعت اور اس کے کام سے الحمدللہ محبت ہے اور آپ اس کو صحیح دینی خدمت یقین کرتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اندازہ ہوا کہ ابھی آپ کا مزاج پورا تبلیغی نہیں بنا ہے، اگر آپ پورے "تبلیغی" ہوتے تو آپ کو اس کی فکر نہ ہوتی کہ جماعت اسلامی کے حضرات کی ان باتوں کا کسی تحریر یا مضمون کی شکل میں جواب دیا جائے اس کے بجائے آپ کی کوشش صرف یہ ہوتی کہ کسی طرح ان بھائیوں کو عمل تبلیغ کو اس طرح دکھایا جائے کہ وہ اس کے سب پہلوؤں اور اثرات ونتائج کو خود دیکھ لیں۔ تبلیغ والوں کی حکمت عملی یا کہیے کہ طریق کار یہی ہے اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جو لوگ تقریر تحریر سے کسی طرح مطمئن نہیں

ہو سکتے، وہ ذاتی علم و مشاہدہ کے بعد کام کرنے والوں کے شریک حال ہو جاتے ہیں۔ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق مقدر ہی نہ ہو۔

سب سے پہلے خود میرا قصہ سنیئے! ۔ شاید آپ نے کسی سے سنا ہو کہ میں جماعت اسلامی کے قیام سے بھی بہت پہلے سے مرحوم مولانا مودودی صاحب کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا تھا۔ ان کے فکر اور ان کی تحریروں سے بہت متاثر تھا۔ گویا اُن کا عاشق تھا (آج جو لوگ جماعت اسلامی میں بہت نمایاں ہیں اُن میں اکثر اُس وقت ان کو جانتے بھی نہ ہوں گے) پھر جب ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم ہوئی تو میں مولانا موصوف کے ساتھ اس کے بانیوں میں تھا۔ پھر جب جماعت اسلامی کا مرکز ۱۹۴۲ء میں لاہور سے "دارالاسلام" منتقل ہوا اور مولانا مودودی وہیں تشریف لے آئے تو میں بھی ہجرت کر کے وہیں پہونچ گیا ——— پھر ان کے ساتھ اسی قیام ہی کے زمانہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ میں شرعی طور پر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے جماعت اسلامی کا رکن رہنا چاہیے یا نہ رہنا چاہیے؟ چند مہینے غور و فکر کے بعد میں نے اپنے حق میں یہی طے کر لیا کہ اب مجھے رکن رہنا نہیں چاہیے۔ لیکن اُس وقت اس فیصلہ کی بنیاد میرے اور مودودی صاحب کے درمیان کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا۔ میں اُس وقت بھی ان کی اصل دعوت اور جماعت اسلامی کے کام کو صحیح سمجھتا تھا۔ (انشاء اللہ الفرقان کے آئندہ شمارے میں شائع ہونے والے میرے ایک مضمون سے اس کی کچھ تفصیل معلوم ہو جائے گی)۔

میں اس وقت تک حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے بارہ میں کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتا تھا اگرچہ ایک دو دفعہ دیکھا تھا اور ملا تھا لیکن میرے دل نے اس سے کوئی خاص تاثر قبول نہیں کیا۔ اور ان کے تبلیغی کام اور اس کے طریق کار سے تو بالکل ہی ناواقف تھا۔ مجھے آج بھی یقین ہے کہ اگر اس وقت کوئی صاحب مجھے اس تبلیغی کام میں شرکت کی دعوت دیتے اور تقریر یا تحریر سے سمجھانے کی کوشش فرماتے تو غالباً میں بالکل متاثر نہ ہوتا۔ اُس وقت میرے سوچنے کا خاص ڈھنگ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ منظور تھا کہ جماعت اسلامی سے قطع تعلق کے کچھ ہی دن بعد ایک عجیب اتفاق سے (جس کو لطیفۂ غیبی ہی کہا جا سکتا ہے) چند روز میرا قیام رائے پور ضلع سہارنپور کی خانقاہ میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہا۔ میں اگرچہ

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت نہیں تھا بلکہ اُس زمانہ میں مجھے خانقاہی اذکار و اشغال سے کوئی مناسبت ہی نہیں تھی ــــ لیکن حضرت کی شخصیت سے میں بہت متاثر اور بہت معتقد تھا ــــ ایک دن حضرت نے ایک سلسلۂ کلام میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بہت بلند کلمات میں فرمایا جو حضرت کی عام عادت نہیں تھی، اور مجھ سے ارشاد فرمایا کہ آپ کا جب دہلی جانا ہوا کرے، تو حضرت کی خدمت میں ضرور حاضر ہوا کریں! ــــ اس کے دو چار دن بعد میں اپنے اُس وقت کے مستقر بریلی واپس ہونے کے لیے رائے پور سے سہارنپور آیا تو یہاں میں نے سنا کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بہت سخت بیمار ہیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے ابھی دہلی جا کر ان کی عیادت و زیارت کرنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسی بیماری میں رخصت ہو جائیں اور مجھے محرومی کا ہمیشہ افسوس رہے ــــ میں سہارنپور سے سیدھا دہلی پہونچا۔ دیکھا کہ حضرت مولانا سخت مریض ہیں اور انتہائی درجہ میں کمزور ہیں، جسم میں ہڈی چمڑے کے سوا کچھ نہیں ہے میں نے مصافحہ کرنا چاہا تو، بجائے مصافحہ کے حضرت مولانا نے میرے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لیے اور بغیر کسی گفتگو اور تمہید کے فرمایا ــــ مجھے دیکھنے کیوں آئے ہو، دین کی فکر کرو! میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں، فرمایا کہ وعدہ کرو کم سے کم ایک ہفتہ ضرور دو گے۔ میں نے ان کی بیماری اور کمزوری کی حالت دیکھتے ہوئے بغیر کچھ سوچے سمجھے وعدہ کر لیا ــــ یہ گفتگو رات میں عشاء کے دیر بعد ہوئی، میں اسی وقت نظام الدین پہنچا تھا۔ پھر فجر کی نماز کے بعد حاضر ہوا تو فرمایا کہ اب آپ چلے جائیے مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ اس بیماری سے میں اچھا ہو جاؤں گا، پھر جب کام کے سلسلہ میں میرا سفر ہوگا تو اطلاع دوں گا، اُس وقت آپ ایک ہفتہ کے لیے آجائیں ــــ میں بریلی چلا آیا ــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ بات اُس وقت کے میرے مزاج کے خلاف تھی، کہ یہ جانے بغیر کہ ایک ہفتہ کس کام کے لیے دینا ہوگا، میں نے وعدہ کر لیا (یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی کا کرشمہ تھا) اب یاد نہیں کہ کتنی مدت کے بعد مولانا کی طرف سے اطلاع آئی کہ فلاں تاریخ کو میں جماعت کے ساتھ لکھنؤ جانے والا ہوں، آپ بریلی سے لکھنؤ پہونچ جائیں! میں مقررہ وقت پر پہونچ گیا۔ حضرت مولانا دہلی سے تشریف لے آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں فرمایا کہ آپ بھی میرے ساتھ رہیں اور جب تک ایک ہفتہ پورا نہ ہو جائے، کام کے بارہ میں آپ مجھ سے

کوئی سوال اور کوئی بات نہ کریں، جو کچھ بات کرنی ہو ہفتہ پورا ہونے کے بعد کریں! میں نے اپنے کو اس کا پابند کر لیا ——— ۴-۵ دن گذرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ امت میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کا یہ نہایت صحیح طریقہ ہے، یہ یقین دن رات کی رفاقت اور مشاہدہ سے ہوا، اور ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اگر حضرت مولانا مجھے گفتگو فرما کر مطمئن کرنا چاہتے تو غالباً میں مطمئن نہ ہوتا۔

قرآن مجید سے بھی اس حکمت عملی کا اشارہ ملتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے واقعہ کے سلسلہ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی (جس کا نام زلیخا مشہور ہے اور جس کے گھر میں حضرت یوسفؑ ایک زرخرید غلام کی حیثیت سے رہتے تھے) ان پر فریفتہ ہو گئی تو مصر کی عورتوں میں اس کا چرچا پھیل گیا۔ اور اس کی سہیلیوں نے اس کی اس حرکت کو بہت ہی ذلیل حرکت سمجھا ——— تو قرآن مجید میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جب زلیخا کو ان سہیلیوں کی لعنت ملامت کی باتیں پہنچیں تو اس نے یہ تدبیر کی کہ ان سب کی دعوت کی اور ان کے سامنے کھانے کی ایسی چیزیں رکھی گئیں جن کو چھری سے کاٹ کاٹ کے کھانا تھا، اس لیے ہر ایک کو چھری بھی دیدی گئی، اور ٹھیک اسی وقت زلیخا نے حضرت یوسف کو بلایا۔ وہ بے چارے غلام کی حیثیت میں تھے فوراً حاضر ہو گئے۔ جب مہمان عورتوں کی ان پر نظر پڑی تو ان کے تو ہوش غائب ہو گئے۔ قرآن شریف میں ہے کہ انھوں نے اس بے ہوشی اور وارفتگی کے عالم میں چھریوں سے اپنے ہاتھ کاٹ لیے (قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ) پھر زلیخا نے ان سے کہا ذٰلِکُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ "(یہی ہے وہ جس کی محبت کی گرفتاری پر تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔) اب یہ خود تمہارا کیا حال ہوا۔؟

تو زلیخا نے ان عورتوں کی لعنت ملامت کا جواب دینے اور ان کو مطمئن کرنے کے لیے ان سے لمبی چوڑی بات نہیں کی، کوئی مقالہ پڑھ کر نہیں سنایا، بس حضرت یوسف کو ایک نظر دکھلا دیا۔ تو حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حکمت عملی کے مطابق عمل کیا۔ اس اتفاقی تجربہ کے بعد تبلیغی کام کے سلسلہ میں میں نے خود بھی یہی رویہ اختیار کر لیا تھا اور میں نے اس کو ہمیشہ کامیاب پایا! حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ۱۹۴۴ء یا ۱۹۴۵ء میں ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ دہلی سے پشاور تک کا میں نے سفر کیا تھا، مجھ کو ہی جماعت کا امیر بنا دیا گیا تھا۔

دو تین دن ہمارا قیام لاہور بھی رہا قیام حسب معمول ایک مسجد میں تھا۔ آخری دن صبح کے وقت ایک صاحب تشریف لائے انھوں نے تعارف کرایا کہ حاجی عبدالواحد صاحب ایم اے جو آپ کے دوست ہیں میرے بھی خاص دوستوں میں ہیں انھوں نے مجھے آپ کی جماعت کے بارہ میں اور خود آپ کے بارہ میں بتلایا ہے میں اس وقت اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کی جماعت کے کام اور نظام کو آپ سے سمجھوں اور اگر سمجھ میں آجائے تو اس میں حصہ بھی لوں، ان کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ ٹیلی فون یا تار کے محکمہ کے ایک افسر ہیں۔ میں نے ان سے نیازمندانہ طریقہ سے عرض کیا کہ میں اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو اس کام کے بارہ میں کچھ عرض کر کے مطمئن کر سکوں۔ یہ کام دیکھنے سے اور عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ خود میں نے بھی اسے دیکھ کے اور عمل کر کے ہی کچھ سمجھا ہے۔ اس لیے آپ سے میری مخلصانہ گذارش ہے کہ آج ہم لوگوں کی یہاں سے روانگی ہے فلاں وقت فلاں ٹرین سے انشاء اللہ روانہ ہوں گے۔ آپ کے لیے ممکن ہو تو دو چار دن کے لیے ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں! —— وہ یہ سنکر خفا ہو گئے۔ بولے وہ دنیا کا کونسا کام ہے جو بتانے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آسکتا، میں نے سنا تھا کہ آپ لوگ ہر ایک سے یہی کہتے ہیں کہ ساتھ چلو، دیکھو تو سمجھ میں آئے گا! —— آپ ساری دنیا کو بیوقوف اور بے عقل سمجھتے ہیں —— ہم مودودی صاحب کے پاس جاتے ہیں اور ان سے انکی جماعت اور ان کے کام کے بارہ میں بات کرنا چاہتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں کہ پہلے میری الماری بھر کی کتابیں پڑھ لو اس کے بعد بات کرو! —— آپ لوگوں کے پاس آتے ہیں تو آپ کہتے ہیں پہلے چلّہ بھر کے لیے یا دس دن یا تین دن کے لیے ساتھ چلو! —— بہرحال وہ خفا ہو کر یہ فرماتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں نے ان کی خفگی زائل کرنے کے لیے کچھ عرض کیا لیکن بظاہر وہ خفا ہی رہے۔

ٹرین کے وقت پر جب ہماری جماعت اسٹیشن پہونچی تو دیکھا کہ وہی صاحب بیگ ہاتھ میں لیے تشریف لا رہے ہیں۔ مجھ سے ڈانٹ کے فرمایا لیجیے میں تین دن آپ کے ساتھ رہنے کے لیے آگیا ہوں! —— چنانچہ وہ تین دن ہمارے ساتھ رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسا فضل فرمایا کہ ان تین ہی دنوں میں تبلیغی کام کے بارہ میں ان کو پورا اطمینان اور شرح صدر ہو گیا اور پھر تو پورے "تبلیغی" ہو گئے۔ (حالانکہ خود یہ عاجز کبھی پورا "تبلیغی" نہیں ہو سکا —— یہ اللہ کی دین ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء)

یہ تھے ہمارے محترم دوست عبدالحمید صاحب جو آخر میں پاکستان کے ٹیلی فون اور تار کے ڈائرکٹر جنرل ہو گئے تھے اور اسی عہدہ سے غالباً ریٹائر ہوئے[1]) ـــــ تین دن پورے ہونے پر وہ روتے ہوئے ہم لوگوں سے رخصت ہوئے اور مجھ سے فرمایا کہ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ مجھ سے زبانی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر آپ مجھے زبانی سمجھانے کی کوشش کرتے تو شاید میں نہ سمجھ سکتا اور اس طرح مطمئن نہ ہوتا۔

اسی سفر میں ایک دوسرا واقعہ راولپنڈی میں پیش آیا۔ مسجد میں ہمارا قیام تھا۔ میرا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد جماعت کے اپنے ساتھیوں کو اور مسجد کے نمازیوں میں سے جو لوگ ٹھہر جاتے ان کو بھی ساتھ بٹھا کر "ریاض الصالحین" سے حدیثیں پڑھ کر ان کا ترجمہ اور کچھ تشریح کیا کرتا تھا۔ اس درس کے ختم پر ایک صاحب نے جو بڑے متین اور سنجیدہ معلوم ہوتے تھے مجھ سے کہا کہ میں آپ سے چند منٹ الگ کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ الگ بیٹھ گیا، انھوں نے فرمایا کہ میں اس تبلیغی کام کو آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں اور مجھے کچھ اشکالات ہیں، آپ اجازت دیں تو وہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے معمول کے مطابق ان سے بھی نیاز مندی سے عرض کیا کہ میں اپنے کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ میں آپ جیسے حضرات کے اشکالات رفع کر سکوں اور مطمئن کر سکوں۔ البتہ میری آپ سے مخلصانہ گذارش ہے کہ ہماری جماعت کل انشاء اللہ یہاں سے پشاور کے لیے روانہ ہوگی، آپ جماعت کے ساتھ تشریف لے چلیں جو کچھ ہوتا ہے سب آپ خود دیکھ لیں گے، اس کے بعد آپ کی جو رائے قائم ہوگی وہ زیادہ صحیح ہوگی۔ انھوں نے بتلایا کہ میں یہاں ایک سکول سے متعلق ہوں، اس لیے میرے لیے آپ کے ساتھ چلنے کا امکان نہیں ہے، میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں عرض کر سکتا کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ آپ کو موقع دے آپ کسی جماعت کے ساتھ رہ کر خود دیکھیں[2] ـــــ اس گفتگو کے بعد وہ صاحب تشریف لے گئے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ اپنے گھر تشریف لے گئے۔

اگلے دن صبح کو میں نے ان کو فجر کی نماز میں بھی دیکھا، اس کے بعد وہ "ریاض الصالحین" کے

[1] شاید کہ عبدالحمید صاحب غیر منقسم ہندوستان کے فٹ بال کے ممتاز اور مشہور کھلاڑیوں میں تھے، کلکتہ میں کوئی بڑی نامور ٹیم "موہن بگان" کے نام سے تھی یہ اس کے کیپٹن بھی رہے تھے ـــــ لیکن ہماری جماعت کے ساتھ تین دن گزارنے کے بعد بس تبلیغی ہو گئے۔ اور اس دینی جدوجہد کے میدان میں بھی اللہ کی توفیق سے وہ ممتاز رہے۔

[2] یہاں یہ بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ جماعت میں جس سطح کے حضرات ہوں گے ان کی رفاقت سے اسی سطح کے مطابق تبلیغی کام کو سمجھا جا سکے گا ـــــ خوب سمجھ لیا جائے کہ تبلیغی کام کوئی مضمون یا کتاب نہیں ہے ایک عمل ہے اور "زندگی" ہے۔

درس میں بھی شریک رہے۔ درس کے ختم پر آج پھر انھوں نے فرمایا کہ میں چند منٹ علاحدہ بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ الگ بیٹھ گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ سفر تو نہیں کر سکتا تھا لیکن کل صبح آپ سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں یہیں آج کا دن اور رات جماعت ہی کے ساتھ گذاروں گا۔ میں برابر جماعت ہی کے ساتھ رہا۔ اس وقت میں آپ سے صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کے فضل سے آپ کی جماعت کے ساتھ رہنے سے مجھے بہت دینی نفع ہوا اور مجھے ایمان میں تازگی محسوس ہوئی اور میرے بہت سے اشکالات کا جواب بھی مل گیا ــــــ اس کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہو گئے ــــــ راولپنڈی سے ہماری جماعت پشاور چلی گئی، وہاں سے کوہاٹ وغیرہ بھی جانا ہوا، وہی ہمارے سفر کی آخری منزل تھی، اس کے بعد واپسی ہو گئی۔

اس واقعہ کے ۲-۳ مہینے کے بعد مولانا مودودی صاحب کے رسالہ ترجمان القرآن میں (جو اس وقت تک غالباً جماعت اسلامی کا واحد ترجمان تھا) کسی صاحب کا ایک خط شائع ہوا۔ جو انھوں نے امیر جماعت کے نام لکھا تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ

> "میں ۳ سال سے جماعت اسلامی کا رکن ہوں اور مجھے جماعت کے تعلق سے بہت کچھ علمی اور دینی نفع ہوا ہے لیکن ابھی حال میں ایک دوسری دینی جماعت کے چند لوگوں کے ساتھ مجھے صرف ۲۴ گھنٹے گزارنے کا مجھے موقع ملا، میں نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کا دین کا تصور تو مکمل نہیں ہے ناقص ہے، لیکن ان کے ساتھ رہ کر اور انھیں دیکھ کر دل کہتا تھا کہ یہ لوگ جنتی ہیں، جو کیفیت مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہ کر نصیب ہوئی وہ اس سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس لیے آپ سے میری گزارش ہے کہ جماعت کے ذمہ دار حضرات کو غور فرمانا چاہیے کہ ہم میں کیا کمی ہے اور اس کا تدارک کرنا چاہیے۔"

یاد آتا ہے کہ ترجمان القرآن میں خود مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کے کسی دوسرے ذمہ دار کی طرف سے اس خط کا جواب بھی ساتھ ہی شائع ہوا تھا۔

یہ خط پڑھ کر مجھے خیال ہوا کہ غالباً یہ صاحب جنھوں نے مولانا مودودی صاحب کو یہ خط لکھا ہے، ان کو کسی تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت گزارنے کا اتفاق ہوا ہو گا ــــــ اُس وقت تک دفتر ترجمان القرآن میں کام کرنے والے بعض حضرات سے میرا اچھا ربط و تعلق تھا۔ میں نے دریافت کرایا کہ

یہ خط کن صاحب کا تھا اور وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ تو معلوم ہوگیا کہ وہ صاحب راولپنڈی کے ہیں، نام بھی لکھا تھا جو اب مجھے یاد نہیں رہا ــــــ پھر میں نے راولپنڈی کے اپنے دوستوں سے اس بارہ میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ وہی صاحب تھے جو راولپنڈی میں مجھ سے ملے تھے، اور جماعت کے ساتھ ایک دن رات دیئے تھے۔ اگر وہ ۳۔۴ دن بھی ساتھ رہے ہوتے تو امید تھی تصور دین کے ناقص یا کامل بلکہ غلط یا صحیح ہونے کے بارہ میں اُن کا ذہن صاف ہو جاتا۔

الغرض میرا سو فیصدی تجربہ ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ پر عمل کرنے کی توفیق دی اور اس کے ساتھ دعا کے اہتمام کی بھی توفیق ملی تو نتیجہ ایسا ہی نکلا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے" دراصل مولانا مودودی صاحب کی تحریروں نے ان بیچاروں کے دلوں میں یہ بٹھا دیا ہے کہ اُن کے علاوہ سب لوگوں کا تصور دین ناقص ہے۔ دین کو بس انھوں نے صحیح سمجھا ہے، اگلوں نے بھی صحیح نہیں سمجھا تھا۔ "لا الٰہ الا اللہ" کا مطلب تک صحیح نہیں سمجھا تھا[1]۔

اس لیے آپ سے میری گذارش ہے کہ جب جماعت اسلامی کے کوئی صاحب آپ سے اس طرح کی بات کریں جو آپ نے خط میں لکھی ہے یا آپ کو خود ہی ان حضرات سے بات کرنے کا اتفاق ہو تو ضرور اس کی کوشش کریں کہ وہ حضرات چند بار مرکز نظام الدین تشریف لے جائیں اور خاصکر صبح بعد نماز فجر کا بیان سنیں جو اکثر حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری فرماتے ہیں، اور جماعتوں کی روانگی کے وقت جو "ہدایات" دی جاتی ہیں، ان کو بھی غور اور توجہ سے سنیں، روانگی کی دعا میں بھی شرکت کریں، اگر ۳۔۴ دفعہ بھی انھوں نے ایسا کیا تو انشاء اللہ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس تبلیغی کام میں اسلام کے کسی خاص جز یا اجزاء کی دعوت دی جاتی ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تمام ہدایات و تعلیمات پر ظاہراً و باطناً عمل پیرا ہونے کی۔ اگر اللہ نے قلب سلیم سے محروم نہیں فرمایا ہے تو انشاء اللہ ساری غلط فہمیاں دور ہو کر حقیقت سامنے آجائے گی۔ ہاں تقریر و بیان میں جدید فلسفیانہ اصطلاحات اور لیڈرانہ ماڈرن تعبیرات نہیں ہوں گی۔ جو زیادہ تر صرف گزشتہ ۴۰۔۵۰ سال کے اندر گھڑی گئی ہیں بلکہ قرآن پاک اور ارشادات نبوی کی پرانی اصطلاحات و تعبیرات میں دین کی دعوت اسی طرح انشاء اللہ سامنے آئے گی جس طرح اپنے اپنے زمانہ میں حضرت حسن بصری، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی، حضرت مجدد الف ثانی جیسے اللہ کے مقبول بندے ہمیشہ دیتے رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر

---

[1] عنقریب شائع ہونے والے میرے ایک مضمون سے انشاء اللہ اس کی تفصیل معلوم ہو جائے گی۔

کے حساب سے ان سب کا تصور دین ناقص تھا اور یہ دین کے کسی کسی جز ہی کی دعوت دیتے تھے، پورے دین کی دعوت لیکر بس ہمارے اس زمانہ میں مولانا مودودی صاحب مرحوم ہی کھڑے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان بھائیوں کو عقل سلیم دے۔ اور مولانا کی مغفرت فرمائے۔

بہرحال میرے نزدیک ان حضرات کی خدمت اور خیر خواہی کا طریقہ یہی ہے جو میں نے عرض کیا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس راستہ سے بھی ہر ایک کو ہدایت مل ہی جائے۔ قرآن پاک جو کلام الٰہی اور سراپا ہدایت ہے اس کے بارہ میں بھی فرمایا گیا ہے کہ "یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا"۔۔۔ اب آپ کا کام صرف یہی ہے کہ اخلاص کے ساتھ اور صحیح طریقہ پر اپنے ساتھ اپنے ان بھائیوں کی بھی اصلاح کی کوشش کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کا بھی اہتمام کریں ۔۔۔۔ ہوگا وہ جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔

اگر آپ جواب اور صفائی کے پیچھے پڑیں گے تو کس کس چیز کا جواب اور کس کس الزام کی صفائی پیش کریں گے ۔۔۔۔ یہ جو باتیں آپ نے اپنے خط میں نقل کی ہیں یہ تو ادنیٰ معیار کے حضرات کی باتیں ہیں۔ ان لوگوں میں جو گھٹیا معیار اور پست ذہنیت کے لوگ ہیں وہ تو ایسی ایسی خرافات تبلیغ والوں کے بارہ میں صرف کہتے نہیں بلکہ لکھتے ہیں، میرا گمان ہے کہ اس سے جماعت اسلامی کے شریف الطبع حضرات کو بھی شرم آتی ہوگی۔

قریباً ایک سال ہوا ہوگا یا کچھ کم و بیش، کسی صاحب نے رسالہ "تجلّی" کا ایک پرچہ دکھایا اس میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے کسی صاحب نے لکھا تھا کہ ایمرجنسی کے زمانہ میں جب جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے جیلوں میں بند کردیے گئے تھے، تو تبلیغی جماعت کے لوگ اُن سے کہتے تھے کہ آپ لوگ اگر ہماری جماعت میں داخل ہوجائیں تو چھوٹ جائیں گے۔[1]

یہ کتنی ذلیل اور تکلیف دہ بات ہے، اور ظاہر ہے کہ جس نے یہ گھڑی ہے وہ بیچارہ تبلیغی جماعت سے اتنا ناواقف ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ "جماعت اسلامی" یا "جمعیۃ العلماء" جیسی منظم جماعتوں اور پارٹیوں کی طرح کی کوئی تنظیم نہیں ہے، جس کے ارکان، یا ممبران، یا ہمدردان یا متفقین بنائے جاتے ہوں، وہ تو صرف اپنی اور امت کی اصلاح کے لیے محنت اور قربانی کی دعوت ہے اور اس کا ایک طریق کار ہے، اس کا نہ دفتر ہے نہ رجسٹر ہے نہ لٹریچر ہے نہ کچھ ہے، حتیٰ کہ اس کا نام تبلیغی جماعت بھی کبھی اسی طرح

---

[1] اس خط کے لکھتے وقت "تجلّی" کا وہ پرچہ سامنے نہیں تھا اس لیے اس کی اصل عبارت نقل نہیں کی جاسکی، یہ اطمینان ہو کہ مضمون یہی تھا۔

نہیں رکھا گیا جس طرح جماعتوں اور تنظیموں کے مخصوص نام رکھے جاتے ہیں ـــــ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ یہ نام "تبلیغی جماعت" ہم نے نہیں رکھا، ہم تو بس کام کرنا چاہتے تھے۔ اس کا کوئی خاص نام رکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی، لوگ کام کرنے والوں کو "تبلیغی جماعت" کہنے لگے، پھر یہ اتنا مشہور ہوا کہ خود ہم بھی کہنے لگے۔

تو آپ سے مجھے عرض کرنا ہے کہ جماعت اسلامی کے بعض لوگ تو "تبلیغی جماعت" کے بارہ میں اس طرح کی ذلیل باتیں بھی کرتے ہیں، آپ کہاں تک اور کس کس بات کی صفائی دیں گے۔

نیز آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بریلوی حضرات سے آپ کا واسطہ نہیں پڑتا، میرا خیال ہے کہ آپ جس علاقہ میں ہیں وہ علاقہ اس بلا سے محفوظ ہے ـــــ "تبلیغی جماعت" کے خلاف بریلویوں کی سرگرمیوں سے متعلق لوگ مختلف علاقوں سے مجھے خطوط لکھتے رہتے ہیں اور اُن کے پمفلٹ اور اشتہارات بھی بھیجتے رہتے ہیں، اگر آپ اُن کے وہ اشتہارات اور پمفلٹ دیکھیں تو "جماعت اسلامی" والوں کو بہت ہی "غنیمت" سمجھیں ـــــ ان بریلوی حضرات سے میرا ایک زمانہ میں زیادہ واسطہ رہا ہے، اس لیے میں اُن سے اور ان کی فطرت سے زیادہ واقف ہوں، ان لوگوں کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ تبلیغی جماعت کے کام کے نتیجہ میں زمین ہمارے پاؤں کے نیچے سے نکلتی جا رہی ہے، اور ہماری چراگاہیں ہمارے لیے بے آب و گیاہ بنجر ہوتی جا رہی ہیں، اس لیے انھوں نے اپنی ساری طاقت اب تبلیغ والوں ہی کے خلاف پروپیگنڈے پر لگا دی ہے۔ اُن کے پاس "جماعت اسلامی" والوں کی طرح اخبارات و رسائل تو ہیں نہیں، وہ بس پمفلٹ اور اشتہارات کے ذریعہ گولہ باری کرتے ہیں اور اُن کے پیشہ ور مقررین تقریروں میں زہر اگلتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ پروپیگنڈہ بہت ہی گھٹیا قسم کا ہوتا ہے، وہ صرف اُن لوگوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے جن میں تعلیم کے علاوہ عقل و شعور کی بھی بہت کمی ہو، اور شاید وہ انھیں کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں ـــــ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگ "تبلیغ" والوں کے اس رویہ سے بہت پریشان ہیں کہ یہ کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتے۔ چھوٹے سے چھوٹے اور گندے سے گندے بہتانوں کی بھی تردید نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے اکھاڑے میں گرمی نہیں آتی اور جنگ آگے نہیں چلتی۔

واقعہ یہ ہے کہ میں خود ایک زمانہ تک تبلیغی اکابر کے اس رویہ سے متفق نہیں تھا، میں چاہتا تھا کہ جو باتیں سراسر بہتان کے طور پر کہی جاتی ہیں ان کی تو ضرور تردید کی جائے اور پوری قوت کے ساتھ تردید کی جائے ـــــ لیکن تجربہ نے مطمئن کر دیا کہ اس تبلیغی کام اور اس کے ذمہ داروں کے لیے یہی رویہ صحیح ہے۔ جو انھوں نے اپنا رکھا ہے کہ بس اپنا کام

کرو، مخالفین کے معاملہ کو خدا کے سپرد کرو اور اس سے دعا کرو، ہاں اپنا احتساب خود کرتے رہو۔

قریباً ۲۰-۲۵ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے، پاکستان میں تبلیغی اجتماع ہوا، اس میں حضرت مولانا مرحوم تشریف لے گئے تھے۔۔۔۔۔ اجتماع کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے کسی اخبار یا رسالہ میں حضرت مولانا مرحوم سے نسبت کر کے ایک ایسی بات شائع ہوئی جو میرے نزدیک بلاشبہ غلط تھی، میں نے اس کی تردید ضروری سمجھی اور مولانا مرحوم کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ مولانا نے مجھے جواب میں لکھوایا کہ آپ اس کی تردید میں کچھ نہ لکھئے، اگر آپ تردید کریں گے تو وہ لوگ آپ کی تردید کی تردید کریں گے اور دوبارہ وہی پھر لکھیں گے اور پہلے سے بھی زیادہ زور سے لکھیں گے۔ آپ پھر تردید کریں گے تو وہ تیسری بار لکھیں گے اور اور زیادہ زور کے ساتھ لکھیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ جو غلط بات ابتک صرف ایک دفعہ چھپی ہے وہ دو دفعہ اور تین دفعہ اور زیادہ زور کے ساتھ چھپے گی۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ شدت کے ساتھ اسی پر قائم رہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اب بھی اسی شدت کے ساتھ اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے۔

ایک بات اور بھی آپ کے سوچنے کی ہے۔ اگر جماعت اسلامی کے حضرات کی ان باتوں کا جواب دینے کی کوشش کی جائے جو آپ نے خط میں لکھی ہیں تو اس کا ذریعہ کیا ہوگا؟ میری طرح آپ کو بھی اندازہ ہوگا کہ نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے وسائل اور ان کے استعمال کی مہارت کے لحاظ سے جماعت اسلامی ہندوستان و پاکستان میں دوسری تمام منظم جماعتوں اور سیاسی پارٹیوں سے بھی فائق ہے۔ . . . . ۔۔۔۔۔ اور تبلیغی جماعت کا حال آپ کو معلوم ہے کہ اخبار یا رسالہ نکالنے یا اشتہار و پمفلٹ کے ذریعہ اپنی بات پہونچانے کے وہ قائل ہی نہیں اور اس معاملہ میں اس حد تک پہونچے ہوئے ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ جماعت کے کام کی دوسرے اخبارات و رسائل میں اشاعت ہو۔

میرے ذاتی علم میں یہ واقعہ ہے کہ ایک جگہ تبلیغی اجتماع ہونے والا تھا۔ تبلیغ والوں کے علم میں آیا کہ بعض اخبارات نے اس کا خاص انتظام کیا ہے کہ وہ روزانہ پورے اہتمام سے اجتماع کی کارروائی شائع کریں گے۔ تو چند باوقار حضرات کی ایک جماعت نے اخبارات کے دفتروں کا گشت کیا اور لجاجت و خوشامد سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ تو آپ کا بڑا تعاون یہی ہے کہ آپ ہمارے کام کی اپنے اخبارات کے ذریعہ تشہیر نہ کریں۔ ان کو سمجھایا کہ ہمارا کام اگرچہ کوئی راز نہیں ہے لیکن اس کی مصلحت اسی میں ہے کہ اخبارات کے ذریعہ اس کی تشہیر نہ ہو۔ اس نظریہ سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن تبلیغی کام کرنے والوں نے اسی کو اپنا رکھا ہے۔

بعض حضرات تبلیغی جماعتوں میں ایسے لوگوں کو دیکھ کر جنکی شکل صورت دینداروں کی نہیں ہوتی، مخلصانہ طور پر اعتراض کرتے ہیں ان کو بتلانا چاہیے کہ تبلیغ والے تو دیسوں کو بلکہ زانیوں، شرابیوں کو بھی خوشامد کر کے ساتھ لیتے ہیں ـــ حضرت مولانا محمد الیاسؒ فرماتے تھے کہ میں نے تو دھوبی کی بھٹی لگائی ہے، اس میں بھنگی کے گھر کا کپڑا بھی آئے گا اور گود میں سنا کپڑا بھی آئے گا۔ پھر اللہ جسے چاہے گا پاک فرما دے گا۔

میں نے آپ کے خط کا جواب لکھنا شروع کیا تھا تو اندازہ تھا کہ آپ کے خط سے کچھ بڑا ہو جائے گا۔ لیکن بات میں بات نکلتی چلی گئی اور بجائے خط کے یہ ایک اچھا خاصا مضمون ہو گیا، بلکہ اب سوچ رہا ہوں کہ الفرقان کا اکتوبر کا شمارہ جو اس وقت تیار ہو رہا ہے، آپ کا خط اور اپنا جواب اس میں شائع کر دوں ـــ چونکہ آپ نے خط اشاعت کے لیے نہیں لکھا ہے اس لیے اس میں آپ کا نام نہیں دیا جائے گا۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرتا ہوں ـــ جماعت اسلامی کے بعض حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو آپ جیسے حضرات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور کسی طرح معاف نہیں کرتے اور اس میں وہ بالکل مخلص ہوتے ہوں گے۔ ان سے پیچھا چھڑانے کی ایک آسان ترکیب میں آپ کو بتاتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ وہی ان کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے۔ ابھی حال میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے (افسوس ہے کہ اس کا نام میرے نزدیک انتہائی نامناسب بلکہ خود کتاب کے مقصد کے لیے بھی مضر ہے، اگر کتاب کی اشاعت سے پہلے مجھے معلوم ہو جاتا تو میں کتاب کے مصنف و مرتب صاحب کو اصرار سے مشورہ دیتا کہ وہ یہ نام ہرگز نہ رکھیں) اس کا نام ہے "آپ بیتی کی روشنی میں مودودیت بے نقاب" یہ دراصل چند ایسے حضرات کے مضامین یا ان کے مضامین کی تلخیص کا مجموعہ ہے جو جماعت اسلامی کے صف اول کے ارکان میں تھے اور اس کے بڑے پر جوش و سرگرم داعی رہے تھے، جماعت اسلامی کے بانی مرحوم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے خاص رفقاء میں تھے۔ پھر برسوں کے بعد انھوں نے یہ محسوس کر کے بلکہ گویا آنکھوں سے دیکھ کے مودودی صاحب دین کی جو تشریح کر رہے ہیں اور جس پر جماعت اسلامی کی بنیاد ہے وہ حقیقت میں ایک طرح کی تحریف ہے۔ اور یہ راستہ زیغ و ضلال کا ہے۔ مولانا مودودی کا ساتھ چھوڑا اور جماعت اسلامی سے علاحدگی اختیار کی۔ اور پھر انھوں نے اپنی یہ "آپ بیتی" پوری تفصیل کے ساتھ لکھی[1]ـــ یہ حضرات اس عاجز کے بھی جانے پہچانے ہیں یہ سب جماعت کے عام رکن اور ورکر نہیں بلکہ اس کے رہنماؤں میں اور بعض بانیوں میں تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ "شہادت حق" ہے اور جماعت اسلامی کے لوگوں پر اللہ کی حجت ہے۔ میں نے ان مضامین کو پڑھا ہے اور میری رائے یہ ہے کہ جو بھی حق کا طالب اور مخلص ان مضامین کو

[1] یہ مضامین ان حضرات نے مختلف اوقات میں لکھے اور بعض رسائل میں یا کتابی شکل میں الگ الگ شائع ہوئے تھے۔ ۱۲

پڑھے گا اگر اللہ نے اس کو قلب سلیم عطا فرمایا ہے تو وہ ان حضرات کے موقف کو برحق سمجھے گا اور ان سے اتفاق کرے گا۔ اور اس کو معلوم ہو جائے گا کہ جماعت اسلامی کے حضرات مودودی صاحب کے بارہ میں اور دین کے بارہ میں کیسی غلط فہمی میں ہیں ——— اس لیے میرا مشورہ ہے آپ یہ کتاب منگوا لیں[1]۔ اور آپ کے جو دوست احباب آپ سے اس طرح کی باتیں کرتے ہوں، جو آپ نے خط میں لکھی ہیں۔ ان کو مطالعہ کے لیے بس یہ کتاب دیدیں۔

میرا خیال ہو کہ دین کے بارہ میں مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی سنگین و خطرناک غلطیوں سے عام مسلمانوں کو واقف کرانے کے لیے، جو کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں ان میں سے جو میری نظر سے گذری ہیں یہ کتاب ان میں سب سے زیادہ مفید ہے۔

اس کے مرتب مولانا عبدالقدوس رومی مفتی شہر آگرہ ہیں ———

آپ کے خط کا جواب الحمدللہ پورا ہو گیا۔ اس کے بعد آپ سے اور الفرقان کے ذریعہ تبلیغی کام کرنے والے سب ہی دوستوں سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ دوسروں کے اعتراضات و الزامات سے بہت زیادہ فکر ہم آپ کو اس کی کرنی چاہیے کہ خود اپنا احتساب کرتے رہیں اور اپنا جائزہ لیتے رہیں ———

میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ اجتماعات اور مرکزوں میں روانگی کے وقت جماعتوں کو جو ہدایات دی جاتی ہیں وہ دراصل اصلاح و ہدایت کا اور اس کے لیے دینی دعوت و محنت کا مکمل نصاب ہے۔ ان ہدایات کی پابندی کا پورا اہتمام کیا جائے ——— یہ عاجز تو اب معذور ہو گیا ہے مقامی مرکز تک بھی جانا نہیں ہوتا لیکن مختلف مقامات کے مخلص اور درد مند دوستوں سے برابر سنتا رہتا ہوں کہ کام کی سطح میں بڑا فرق اور انحطاط ہو رہا ہے ——— میرے نزدیک اس کا خاص سبب یہی ہے کہ بہت سے بھائی اب ہدایتوں کو بس رسمی طور پر سن لیتے ہیں ان پر عمل کا جو اہتمام ہونا چاہیے اس میں بہت کمی ہے اس لیے آخری گزارش یہی ہے کہ دل و جان سے اس کا اہتمام کیا جائے کہ اجتماعات اور مراکز میں ہدایتوں کا دینا اور سننا "رسم" اور "عادت" نہ بن جائے بلکہ ہدایت دینے والے کی دلی فکر اور کوشش اور اللہ سے دعا یہ ہو کہ یہ باتیں سننے والے بھائیوں کے دلوں میں بیٹھ جائیں، اور سننے والوں کی فکر یہ ہو کہ یہ باتیں اسی طرح ہمارے ذہن نشین ہو جائیں کہ ہم انہی کی روشنی میں زندگی گزارنے کے عادی بن جائیں۔

---

[1] یہ کتاب "کتب خانہ الفرقان" سے بھی طلب کی جا سکتی ہے۔ قیمت ۵ روپے ہے محصول ڈاک اس کے علاوہ (نیجر کتب خانہ الفرقان)

ایک اور چیز جس کا اہتمام بے حد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جماعت میں جو صاحب دعوت کی بات کرنے والے ہوں وہ اگر عالم نہیں ہیں اور تبلیغی کام کرنے والے علماء کی صحبت میں بھی زیادہ نہیں رہے ہیں تو وہ اپنی دعوتی گفتگو میں ہرگز حضرت مولانا انعام الحسن صاحب یا حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری جیسے حضرات علماء کی نقل کرنے اور لمبی تقریر فرمانے کی کوشش نہ کریں، سیدھی سادی مختصر بات کریں جیسی پرانے میواتی میاں جی حضرات کیا کرتے تھے ـــــ وہ لوگ بالکل سادی اور مختصر بات کرتے تھے ـــــ میرا اندازہ ہے کہ ان بے پڑھے لکھے ـــ یا بہت کم پڑھے لکھے مخلص بندوں کی ان سیدھی سادی باتوں سے اللہ کے ہزاروں بندے اللہ والے اور جنتی بن گئے ـــــ جو شخص تبلیغی کام کو اچھی طرح نہ سمجھے اور اس کی تربیت حاصل نہ کرے اس کو دعوتی گفتگو کے لیے کھڑا نہیں کرنا چاہیے ـــ اس سلسلہ میں ایسی ایسی باتیں میرے سننے میں آئی ہیں جو بہت ہی فکر و تشویش میں ڈالنے والی اور علماء حق کو بھی تبلیغ سے بدظن کرنے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور اپنے دین کے کام کی غلطیوں سے حفاظت فرمائے۔ والسلام

۲۳ ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم

احیاءِ دین کی جدوجہد کا صحیح طریقہ اور ایک قابلِ تقلید نمونہ

[مرحوم مولانا مودودی صاحب نے یہ مضمون اب سے ٹھیک ۴۳ سال پہلے لکھا اور شعبان ۱۳۵۵ھ (اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے "ترجمان القرآن" میں "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ——— نگاہِ اولیں میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ الفرقان میں اب یہ کس غرض سے شائع کیا جا رہا ہے ——— یہاں مضمون پر جو عنوان قائم کیا گیا ہے وہ ادارۂ الفرقان کی طرف سے ہے۔]

گذشتہ ماہ رجب کے اواخر میں مجھ کو دہلی سے متصل ایک علاقہ میں جانے کا اتفاق ہوا جو "میوات" کے نام سے معروف ہے۔ ایک مدت سے سن رہا تھا کہ وہاں مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی رہنمائی میں خاموشی کے ساتھ ایک تحریک چل رہی ہے۔ جس نے دس بارہ سال کے اندر اس علاقہ کی کایا پلٹ دی ہے۔ آخر کار شوقِ طلب نے مجھے مجبور کر دیا کہ خود جا کر حالات کی تحقیق کروں۔ اس سفر میں جو کچھ میں نے دیکھا اور جو نتائج میں نے اخذ کیے میں چاہتا ہوں کہ انھیں ناظرین ترجمان القرآن تک بھی پہونچا دوں تاکہ اللہ کے جو بندے درحقیقت کچھ کرنا چاہتے ہیں ان کو کام کرنے کے لیے ایک صحیح راہ مل سکے۔

میو قوم دہلی کے آس پاس الور، بھرت پور، گوڑگانوہ اور دوسرے متصل علاقوں میں آباد ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس کی مجموعی تعداد ۳۰ لاکھ سے کم نہیں ہے۔ اب سے

صدیوں پہلے غالباً حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء و متبعین کی کوششوں سے اس قوم میں اسلام پہونچا تھا، مگر افسوس کہ بعد کے زمانوں میں مسلمان حکمرانوں اور جاگیرداروں کی غفلت سے وہاں اسلامی تعلیم اور اسلامی تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ حکومت کے مرکز سے اس قدر قریب آباد تھے ان میں قدیم جاہلیت کی تمام خصوصیات باقی رہیں اور رفتہ رفتہ وہ اسلام سے اس قدر بعید ہوتے چلے گئے کہ ان میں بجز اس خیال کے کہ "ہم مسلمان ہیں" اور کوئی چیز اسلام کی باقی نہ رہی۔ ان کے نام تک مسلمانوں کے سے نہ رہے تھے۔ ناہر سنگھ اور محبوب سنگھ، ٹوگرو اور اسی قسم کے ناموں سے وہ موسوم ہوتے تھے۔ ان کے سروں پر چوٹیاں تھیں۔ ان کے ہاں مورتیاں پوجی جاتی تھیں۔ اپنی حاجات کے لیے وہ انہی دیویوں کی طرف رجوع کرتے تھے جن کی پوجا قدیم زمانے میں ان کے اسلاف کیا کرتے تھے۔ اسلام سے وہ اس قدر ناواقف تھے کہ عام دیہاتی باشندوں کو کلمہ تک یاد نہ تھا، حتیٰ کہ نماز کی صورت تک سے وہ ناآشنا تھے۔ کبھی کوئی مسلمان اتفاق سے ان کے علاقہ میں پہونچ گیا اور اس نے نماز پڑھی تو گاؤں کے عورت مرد بچے سب اس کے گرد یہ دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے کہ یہ شخص کیا حرکتیں کر رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں درد ہے یا اسے جنون ہو گیا ہے کہ بار بار اٹھتا بیٹھتا اور جھکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے اندر جاہلیت کی تمام وحشیانہ عادتیں پائی جاتی تھیں۔ گندی اور ناصاف زندگی، طہارت کے ابتدائی اصولوں تک سے ناواقفی، عورت اور مرد سب نیم برہنہ اور شرم و حیا سے عاری، چوری، رہزنی، ڈکیتی اور دوسرے مجرمانہ افعال کا ارتکاب عام طور پر پھیلا ہوا۔ کسی مسافر کا بخیریت ان کے علاقہ سے گزر جانا مشکل۔ پھر ان کے قبائل اور بطون میں چلتی چھوٹی چھوٹی جاہلانہ باتوں پر اسی قسم کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں جیسی عرب جاہلیت کے حالات میں آپ پڑھتے ہیں۔

ان کی آبادی مختلف حلقوں میں بٹی ہوئی تھی اور بسا اوقات دو یا چند حلقوں میں کسی عورت یا کسی جانور یا کسی اور چیز پر ایسی عداوتیں برپا ہو جاتی تھیں جن کا سلسلہ مدتوں چلتا رہتا تھا۔ یوں اس جفاکش، بہادر اور طاقتور قوم کی ساری پیدائشی قوتیں ضائع ہو رہی تھیں اور وہ نہ صرف اپنے لیے ترقی و فلاح کا کوئی راستہ نہ پاتی تھی بلکہ اپنے ہمسایوں کے لیے

بھی سبب اضطراب بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ جن لوگوں کو اس علاقہ کے انتظام کا تجربہ ہے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت اور الور و بھرت پور کی ریاستیں وہاں امن قائم کرنے اور بہتر تمدنی حالات پیدا کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

ان حالات میں جناب مولانا محمد الیاس صاحب نے وہاں کام شروع کیا اور دس بارہ سال کی مختصر مدت میں اس قوم کے بیشتر حصہ کی کایا پلٹ دی۔ اب اس علاقہ میں قریباً ڈھائی سو مدرسے قائم ہیں جہاں دیہات کے لڑکے آکر اپنے دین سے ابتدائی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ اعلیٰ درجہ کی دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے دہلی سے قریب انہی حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی بستی میں مدرسہ قائم ہے جنکی بدولت ابتداءً اس قوم کو اسلام کی نعمت میسر ہوئی تھی۔ اس مدرسہ میں نہ صرف علوم دینیہ کی تکمیل کرائی جاتی ہے بلکہ طلبہ کو خالص دینی تربیت بھی دی جاتی ہے، اور تبلیغ و اصلاح کی عملی مشق کرانے کے لیے ان سے آس پاس کے دیہات میں عملی کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی برکت سے خود میو قوم میں علماء اور مبلغین کی ایک معتدبہ جماعت پیدا ہو گئی ہے جو ان شاء اللہ اس قوم کو دین کے راستہ پر قائم رکھنے کی ضامن ہو گی۔ مولانائے محترم نے خود اس قوم کے مبلغوں سے اسکی اصلاح کا کام لیا اور ان کی باہم کوششوں کا نتیجہ جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں یہ ہے کہ بعض علاقوں میں گاؤں کے گاؤں ایسے ہیں جہاں ایک بچہ بھی آپ کو بے نمازی نہ ملے گا۔ دیہات کی وہ مسجدیں جہاں یہ لوگ اپنے مویشی باندھتے تھے، آج وہاں پانچوں وقت اذان اور جماعت ہوتی ہے۔ آپ کسی راہ چلتے دیہاتی کو روک کر اس کا امتحان لیں۔ وہ آپ کو صحیح تلفظ کے ساتھ کلمہ سنائے گا۔ اسلام کی تعلیم کا سیدھا سادھا لب لباب، جو ایک بدوی کو معلوم ہونا چاہیے، آپ کے سامنے بیان کرے گا اور آپ کو بتائے گا کہ اسلام کے ارکان کیا ہیں۔ اب آپ وہاں کسی مسلمان مرد عورت یا بچہ کو ہندوانہ لباس میں نہ پائیں گے، نہ اس کے جسم کو بے ستر دیکھیں گے، نہ اس کے گھر کو، نہ اس کے لباس کو نجاستوں میں آلودہ پائیں گے۔ ان کی عادات و خصائل اور ان کے اخلاق میں بھی اس مذہبی تعلیم و تبلیغ کی وجہ سے نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ اب وہ دستوری اور مہذب طرز زندگی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

جرائم میں حیرت انگیز کمی ہو گئی ہے۔ لڑائیاں، فسادات اور مقدمات بہت کم ہو گئے ہیں۔ ان کا علاقہ اب ایک پرامن علاقہ ہے جس کا اعتراف خود وہاں کے حکام کر رہے ہیں۔ ان کی معاشرت، ان کے لین دین، ان کے برتاؤ غرض ہر چیز میں عظیم تغیر ہو گیا ہے جس کی وجہ سے گرد و پیش کی آبادی پر ان کا نہایت اچھا اخلاقی اثر مرتب ہو رہا ہے۔ اب وہ ذلت اور بے اعتباری کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے، بلکہ ان کی عزت قائم ہوتی جا رہی ہے، اور ان کے کیرکٹر پر اعتماد کیا جانے لگا ہے۔

مولانا نے عام دیہاتیوں کے اندر تبلیغ و اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایسی اسپرٹ پیدا کر دی ہے کہ جو لوگ کل تک خود گمراہ تھے، وہ اب دوسروں کو راہ راست بتاتے پھرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے کاموں سے فرصت پانے کے بعد مختلف قریوں سے ان دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ تبلیغ کے لیے نکلتے ہیں۔ گاؤں گاؤں پہنچ کر لوگوں کو خیر و صلاح کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان کا رخت سفر اور زاد راہ ان کے کندھوں پر ہوتا ہے۔ کسی پر اپنا بار نہیں ڈالتے۔ نہ کسی سے اپنے لیے کچھ طلب کرتے ہیں۔ محض اللہ کی خوشنودی ان کے مد نظر ہوتی ہے، اور بے غرضانہ کام کرتے ہیں، اس لیے جہاں جاتے ہیں دیہات اور قصبات کی آبادیوں پر ان کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا بسا اوقات یہ لوگ پیدل گشت کرتے ہوئے دو دو سو میل تک چلے جاتے ہیں اور جن جن بستیوں پر سے ان کا گزر ہوتا ہے وہ مذہبی بیداری اور کلمہ و نماز کے نور سے منور ہو جاتی ہیں۔ خود مجھ کو بھی ان میں سے بعض بدوی مبلغین سے بات کرنے کا اتفاق ہوا، اور ان کی سیدھی سادی زبانوں سے جب میں نے ان کے مقاصد اور ارادے سنے تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ آغاز اسلام میں عرب کے بدوؤں کو جس روح نے صراط مستقیم کی تبلیغ کے لیے اٹھایا تھا وہی روح ان لوگوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ ایک جاہل کسان سے میں نے پوچھا کہ تم دورے کیوں کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ :-

"ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسول کی، اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ بتایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نعمت پہونچائیں، جو ہمیں ملی ہے۔"

یہ الفاظ سنکر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہی جذبہ تو تھا جس سے مخمور ہو کر صحابہ کرام اٹھے تھے اور اس طرح اٹھے تھے کہ انھیں اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔

اس دینی اصلاح نے سواتی قوم کے اس قبائلی انتشار کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے جس نے اب تک ان کی قوتوں کو پراگندہ کر رکھا تھا۔ دیہات میں وقتاً فوقتاً جلسے ہوتے رہتے ہیں جن میں بیس بیس پچیس پچیس گوں سے لوگ شریک ہونے کے لیے آتے ہیں۔ آٹھ آٹھ دس دس ہزار کا مجمع ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ بیٹھ کر دین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور وہیں ان کے آپس کے جھگڑے بھی چکائے جاتے ہیں۔ پھر دیہات سے جو تبلیغی جماعتیں نکلتی ہیں وہ نہ صرف دین کی تعلیمات پھیلاتی ہیں، بلکہ ساتھ ہی خود بخود باہمی اخوت و محبت کے تعلقات بھی قائم کر لیتی ہیں۔ اس طرح قبائلی تفرقہ کی جگہ رفتہ رفتہ قومی وحدت پیدا ہو رہی ہے اور ایک ایسی تنظیمی ہیئت وجود میں آتی جارہی ہے جس سے آگے چل کر بہت سے کام لیے جا سکتے ہیں۔ تنظیم کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ کثیر التعداد افراد ایک آواز پر مجتمع ہوں اور ایک آواز پر حرکت کرنے لگیں۔ یہی چیز وہاں پیدا ہو رہی ہے اور بڑی حد تک پیدا ہو چکی ہے۔

یہ قابل قدر نتائج جو گنتی کے چند برسوں میں برآمد ہوئے ہیں، محض ایک مخلص آدمی کی محنت و کاوش کا ثمرہ ہیں۔ وہاں نہ کوئی انجمن ہے۔ نہ چندہ ہے۔ نہ اس تحریک کا کوئی جداگانہ نام ہے، نہ اس کے ممبر بھرتی کیے جاتے ہیں۔ نہ کوئی امیر و رئیس پشت پر ہے۔ نہ کوئی اخبار نکلتا ہے۔ نہ قواعد پریڈ اور یونی فارم اور باجوں اور جھنڈوں کے نمائشی مظاہر ہوتے ہیں۔ نہ اپنے کارناموں کا اشتہار دیا جاتا ہے۔ خاموشی کے ساتھ ایک سیدھا سا مولوی مسجد میں بیٹھا ہوا کام کر رہا ہے۔ اس غریب کو نمائش اور پروپیگنڈہ کے جدید مغربی طریقے بالکل نہیں آتے۔ نہ اس نے آج تک اس کی ضرورت ہی محسوس کی کہ اس کے کاموں کا ڈھول دنیا میں پیٹا جائے۔ ایک خالص دینی جذبہ ہے جو اس سے یہ کام لے رہا ہے، اور ایک دھن ہے جس میں وہ رات دن لگا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اکیلے آدمی نے جو ٹھوس کام کیا ہے وہ ہماری ان بڑی بڑی انجمنوں اور ان بلند بانگ تحریکوں سے آج تک بن نہ آیا جن کے نام آپ رات دن اخباروں میں سنتے رہتے ہیں۔ حقیقۃً اس نوعیت کی تحریک ہندوستان کی

اسلامی تاریخ میں یا تو حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھائی تھی یا حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا احیا کیا، یا اب مولانا محمد الیاس صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اسے تازہ کرنے کی توفیق بخشی ہے۔

میرا مقصد اس تحریک کے حالات بیان کرنے سے یہ نہیں ہے کہ جو اشتہار اب تک نہ ہوا وہ اب ہو جائے بلکہ میں اس ذریعہ سے ان لوگوں کو جو نمائش کے طالب نہیں ہیں اور دین و ملت کی کوئی حقیقی خدمت انجام دینے کے خواہشمند ہیں، چند اہم امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

(۱) اس وقت ہندوستان کے مسلمان عام طور پر جس حالت میں مبتلا ہیں وہ اسکی متقاضی ہے کہ ان کو از سر نو اسلام کی طرف دعوت دی جائے، اور پھر سے اس طرح مسلمان بنایا جائے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب کو بنایا تھا۔ ان کا اخلاقی تنزل، ان کی دینی سرد مہری، ان کی احکام اسلام سے غفلت، ان کی قوتوں کا انتشار، ان کے خیالات کی پراگندگی، ان کا مختلف راستوں پر بھٹکنا اور رہبر و رہزن میں امتیاز کیے بغیر ہر پکارنے والے کی آواز پر دوڑ چلنا، یہ سب نتائج ہیں اس ایک چیز کے کہ یہ لا الٰہ الا اللہ کے مرکز سے ہٹ گئے ہیں۔ ہماری بنیادی غلطی، جس کی وجہ سے ہماری تمام مفید تحریکیں ناکام ہو رہی ہیں یہی ہے کہ لفظ "مسلمان" جو ان کے لیے بولا جاتا ہے، اس سے ہم دھوکا کھاتے ہیں، اور ان کو واقعی و حقیقی مسلمان سمجھکر ان سے توقع رکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی طرح کام کریں گے۔ ہم ان کے سامنے خدا و رسول کے احکام بیان کر کے امید رکھتے ہیں کہ یہ اس طرح ان کے آگے سر جھکائیں گے جس طرح ایک مسلمان کو جھکانا چاہیئے، حالانکہ درحقیقت یہ احکام کے مخاطب نہیں ہیں بلکہ کلمہ طیبہ کے مخاطب ہیں۔ جبکہ ان کے دلوں میں کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہی نہیں اترا ہے پھر ان سے احکام کی وہ اطاعت، اور وہ مسلمانہ روش کیونکر ظاہر ہو سکتی ہے جو شخص اس کلمہ پر ایمان لانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مولانا محمد الیاس صاحب کی کامیابی کا اولین سبب یہی ہے کہ انھوں نے کلمہ طیبہ کی تبلیغ سے کام کی ابتدا کی، پھر جو لوگ اس پر ایمان لائے وہ ہر امر حکم کی تعمیل کرتے چلے گئے جو ان کو خدا اور رسول کی طرف سے سنایا گیا۔ وہ لوگ حقیقت میں تو مسلم

ہیں اور یہ نومسلم ہی کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جان بوجھکر بالارادہ جس چیز پر ایمان لاتا ہے اس کے مقتضیات کو بطوع و رغبت پورا کرتا ہے۔ اب جو لوگ دین کا احیا چاہتے ہیں انکے لیے اس کے سوا کوئی راہِ عمل نہیں ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان فرض کر کے آگے کی منزلوں پر پیشقدمی کرنے کا طریقہ چھوڑ دیں، اور ان میں از سرِ نو پہلے قدم سے دین کی تبلیغ شروع کریں۔

(۲) موجودہ حالات اس کے لیے سازگار نہیں ہیں، کہ کوئی آل انڈیا نظام بنا کر کام کیا جائے۔ بر دست یہی مناسب ہے کہ جو جہاں بیٹھا ہے وہیں اپنے اطراف و اکناف یا اپنے قبیلہ کے لوگوں کو مسلمان بنانے کا کام شروع کرے اور اپنے اندر جتنی قوت و استعداد پاتا ہو اسی کے لحاظ سے اپنے کام کا ایک دائرہ معین کرے۔ اپنی استطاعت سے زیادہ پھیل کر کام کرنے کی کوشش کرنا آدمی کی قوتوں کو منتشر کر دیتا ہے، اور پورے کی فکر میں آدھا بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا مخلص کارکنوں کو جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے حلقے بنا کر کام کرنا چاہیے۔ اگر حقیقت میں خلوص کارفرما ہوگا اور ذاتی خواہشات کا غلبہ نہ ہوگا تو بعد کو یہ مختلف حلقے بڑی آسانی کے ساتھ ایک نظام میں منسلک ہو سکیں گے۔ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے پر اصرار وہیں ہوتا ہے جہاں نفسانیت کی کھوٹ موجود ہوتی ہے۔

(۳) انجمن بازی کی ضرورت نہیں ہے کوئی علاحدہ نام رکھ کر کام کرنا بجائے مفید ہونے کے مضر ہوتا ہے، کیونکہ اس سے غیر شعوری طور پر لوگوں میں یہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام میں نہیں بلکہ فلاں نام کی جماعت میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ سیدھے سادے طور پر اسلام —— اسی پرانی اور اصلی جماعت —— ہی کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے اور جب وہ اس میں داخل ہوں تو انھیں بتا دیا جائے کہ تم میں اور عام مسلمانوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ تم شعوری مسلمان ہو، اور وہ ابھی تک بے شعور مسلمان ہیں، تمھارا فرض یہ ہے کہ ان کو بھی شعوری اسلام کی نعمت میں شریک کرو تاکہ تمھاری جماعت وسیع ہو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ اس طرح سے ایک جماعت میں شریک ہوتے جائیں گے ان کے اندر آپ سے آپ ایک نظمی ہئیت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ اور قدرتی طور پر ان کا داعیِ اول ہی ان کا لیڈر ہوگا۔ اور وہاں ایک باضابطہ کمیٹی سے زیادہ

اچھی عملی تنظیم پائی جائے گی، بشرطیکہ لیڈر خود اپنی امارت قائم کرنے کا خواہشمند نہ ہو بلکہ امارت کا نشوونما اس طور پر ہو جیسے بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے۔

(۴) علی ہذا یہ مناسب نہیں کہ نمائشی کام کے ان طریقوں کی پیروی کی جائے جو آج کل کثرت سے رائج ہو رہے ہیں اور جنھوں نے عموماً دماغوں کو مسحور کر رکھا ہے۔ لوگ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جھنڈے، نعرے، وردیاں، پریڈ، سڑکوں پر مارچ کرنا اور مصنوعی جنگیں کرنا جن کا مجموعی نام عسکری تنظیم رکھا گیا ہے، کامیابی کے لیے ضروری ہیں، کیونکہ یہی چیزیں عوام کو کھینچتی ہیں اور انہی کے لاگ سے ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں میں یہ خیال بھی پیدا ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی تحریک کو چلائے اس کے لیے ایک اخبار بھی ضروری ہے جس کے ذریعہ سے وہ باہر کی دنیا کو ہمیشہ اپنے کارناموں کی رپورٹیں پہنچاتا رہے، کیونکہ اگر دنیا کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ آپ نے اب تک اتنے ہزار پمفلٹ اتنی زبانوں میں شائع کیے ہیں، یا یہ کہ فلاں جگہ کسی بڑھیا کا گھر جل رہا تھا اور آپ کے خادمانِ خلق نے وہاں پہونچکر اس پر اتنی بالٹیاں پانی کی ڈالیں، یا یہ کہ آپ کے متبعین کی تعداد کس رفتار سے بڑھ رہی ہے اور کہاں کہاں آپ کے کارکن کیا کیا خدمات انجام دے رہے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کی ساری محنتیں رائے گاں ہی گئیں۔ آج کل بعض تحریکوں نے کچھ ایسا جادو لوگوں کے دماغوں پر کر دیا ہے کہ بعض مخلص آدمی بھی جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ان کا ذہن خواہ مخواہ اسی طرز کی کارروائیوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ لیکن میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ اہلِ اخلاص کا یہ طریقِ کار کبھی نہیں رہا، اور نہ اس طرز پر کوئی ٹھوس کام دنیا میں ہو سکتا ہے۔ ایک لمبی نوک دار ٹوپی پہن کر بازار میں کھڑے ہو جائیے اور گھنٹی بجائیے آن کی آن میں بہت سے آدمی آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ مگر کیا اس طریقہ سے جمع ہونے والی بھیڑ سے آپ اس کے سوا اور کوئی کام بھی لے سکتے ہیں کہ بس اپنی چند دوائیں بیچ لیں۔ اس مثال سے سمجھ لیجیے کہ ظاہر فریب تدبیروں سے تماشا پسند لوگوں کا جو ہجوم برپا ہوتا ہے وہ کوئی جانکنا طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے لیے تو صحیح طریقہ وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام اختیار کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ ایک شخص خالص خدا کی خوشنودی کے لیے تپا مار کر ایک جگہ

بیٹھے، خاموشی کے ساتھ دعوت و اصلاح کا کام کرے رفتہ رفتہ لوگوں کے دل اور ان کی زندگیاں بدلے، اور برسوں کی لگاتار محنت سے مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرے جو تعداد کے اعتبار سے چاہے مٹھی بھر ہی ہو، مگر ایمان اور عمل صالح کی دولت سے بہرہ ور ہو۔ ایسے آدمیوں میں عقیدہ کی جو حرارت اور کیرکٹر کی جو صلاحیت ہوگی، اور احکام شرعیہ کی پابندی سے ان میں منظم اور منضبط طریقہ سے کام کرنے کی جو مستقل عادات پیدا ہوں گی، وہی درحقیقت عسکریت کی اصلی روح ہیں۔ اور یہی عسکریت ہم کو مطلوب ہے۔

(۵) جہاں تک عوام میں کام کرنے کا تعلق ہے۔ میرے نزدیک اس کے لیے وہ طریق عمل سب سے بہتر ہے اور انبیاء کے طریق عمل سے اشبہ ہے جس سے مولانا محمد الیاس صاحب نے کام لیا ہے۔ جو لوگ اس طریقہ پر کام کرنا چاہتے ہوں، ان کو میں مشورہ دوں گا کہ مولانا کے پاس جاکر ان کے کام کا ڈھنگ دیکھیں، ان کے مبلغوں کے ساتھ تعاون کرکے عملی سبق حاصل کریں اور پھر اپنے اپنے علاقوں میں اسی طرز پر دعوت و اصلاح شروع کردیں۔ اس طرز عمل کے متعلق جو بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس میں ابتداءً بڑے صبر کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ یہاں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ بسا اوقات چند کام کے آدمی پیدا کرنے میں برسوں بیت جاتے ہیں، اور بارہا یہ خیال کرکے آدمی کا دل ٹوٹنے لگتا ہے کہ اس کا مشن ناکام رہا۔ ان سختیوں سے گزرنے کے بعد کہیں کامیابیوں کا ظہور ہوتا ہے۔

(۶) جو لوگ عوام میں کام کرنا چاہیں ان کے لیے دیہی علاقے بہ نسبت شہروں کے زیادہ بہتر ہیں۔ ہماری شہری آبادیوں کا مزاج ان ہنگامی تحریکوں نے بہت بگاڑ دیا ہے جو آجکل وباؤں کی طرح پھیل رہی ہیں۔ ان تحریکوں کی وجہ سے لوگ نمائش، ریا اور ہنگامہ کے خوگر ہو گئے ہیں۔ اور کسی ایسی تحریک کی طرف بمشکل راغب ہوتے ہیں جو ان کے ظاہر کی بہ نسبت ان کے باطن کی طرف زیادہ توجہ کرنے والی ہو، اور جو انھیں اندر سے بدل کر ایک مضبوط سیرت کی تخلیق کرنا چاہتی ہو۔ لہٰذا انسب یہ ہے کہ شہروں کو سردست ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور دیہات کی آبادیوں کو درست کیا جائے جہاں ابھی تک سادہ فطرت رکھنے والے اثر پذیر لوگ پائے جاتے ہیں۔ تاہم جن لوگوں کو اپنے لیے شہروں میں کامیابی

کا موقع نظر آتا ہو وہ اس سے فائدہ اُٹھانے میں تامل کبھی نہ کریں۔

(۲) عوام میں کام کرنے والوں کو یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام کا پیغام ان لوگوں تک محدود نہیں ہے جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ سارے انسانوں کے لیے عام ہے لہٰذا انھیں مسلم اور غیر مسلم سب کے پاس اس پیغام کو لیکر پہونچنا چاہیے۔ لیکن غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانے کے لیے اتنی باتیں ضروری ہیں۔

اولاً ہمیں ان موانع کو دور کرنا چاہیے جن کی وجہ سے غیر مسلموں میں اسلام کے خلاف شدید تعصبات پیدا ہو گئے ہیں۔ انگریزی حکومت کے اثرات سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو سیاسی، معاشی، اور معاشرتی رقابتیں پیدا ہو گئی ہیں، ان کا اثر دیہات کی زندگی تک گہرا اثر کر گیا ہے، اور آئے دن کے فسادات اور کشمکشوں نے ایسی منافرت دونوں گروہوں کے درمیان پیدا کر دی ہے کہ یہ دو متقابل کیمپ بن گئے ہیں۔ ان حالات میں عام غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہونچانا مشکل ہے، کیونکہ ان کے دل کے دروازے اس پیغام کے لیے مقفل ہو چکے ہیں۔ اب جو لوگ تبلیغ حق کا فرض انجام دینا چاہتے ہوں ان کو سب سے پہلے اس قفل کی کنجی ڈھونڈنی چاہیے۔ اور وہ کنجی یہی ہے کہ ان رقابتوں، عداوتوں اور کشیدگیوں کو کم کیا جائے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ ذہنیت پیدا کرنی چاہیے کہ ان کی تنظیم و اصلاح کا مقصد غیر مسلم ہمسایوں کے مقابلہ میں قومی مسابقت کے لیے تیاری کرنا نہیں ہے، بلکہ خود مسلمان بننا اور دوسروں تک اسلام کی نعمت کو پہونچانا ہے۔ ہر مسلمان میں انصاف پسندی، فیاضی، ہمدردی، اور شفقت کے جذبات پیدا ہونے چاہئیں اور ایسے غیر مسلموں کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ ہمارے بھائی ہیں جو روحانی اور اخلاقی بیماری میں مبتلا ہیں، اور ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ انھیں بیمار رہنے دیں اور ان سے پرہیز کریں، بلکہ یہ ہے کہ انھیں بیماری سے بچا کر تندرستوں میں شامل کریں۔

ثانیاً عام مسلمانوں کو اپنے معاملات اور اپنے طرز زندگی کے اعتبار سے اتنا بلند ہونا چاہیے کہ محض ان کو دیکھ کر ہی ہر وہ شخص ان سے متاثر ہو جائے جس کی فطرت میں نیکی، سچائی، راستبازی، انصاف، حسن اخلاق، صفائی، ستھرائی اور پاکیزہ طرز زندگی کی قدر پہچاننے کی

کی کچھ بھی استعداد موجود ہو۔ اگر عامۂ مسلمین میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں اور غیر مسلم باشندے اپنے گرد و پیش کی مسلمان آبادی کو اخلاقی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں برتر پانے لگیں، تو یقین جانیے کہ کسی کو ان سے یہ کہنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے گی کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ ان میں جتنے راستی پسند لوگ موجود ہیں (اور کون سی قوم ایسی ہے جس میں ایسے لوگ نہیں ہوتے) وہ خود بخود اسی جماعت میں شامل ہونے کی خواہش کریں گے جس کے اصول زندگی انسان کو اتنا بلند و برتر بنا دیتے ہوں۔ لہٰذا عام مسلمانوں میں یہ ذہنیت پیدا کرنی چاہیے کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو اسلام کا نمائندہ سمجھیں، اور زندگی کے ہر معاملہ میں یہ سمجھتے ہوئے کام کریں کہ ان کی حرکت سے اسلام کے برحق ہونے یا نہ ہونے کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے۔

ثالثاً عام مسلمانوں میں ہندوانہ اثرات کے تحت اونچ نیچ اور چھوت چھات کے جو خیالات پیدا ہو گئے ہیں ان کی بیخ کنی کرنی چاہیے، اور انھیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہیے کہ ہر غیر مسلم کو خواہ وہ کسی طبقہ کا ہو، بالکل مساویانہ حیثیت سے اپنے نظام معاشرت میں لے لیں اور کسی حیثیت سے اس کے ساتھ امتیاز نہ برتیں، حتیٰ کہ اس سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنے میں بھی تامل نہ کریں۔

(۸) یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بس مذہبی اور اخلاقی حالت کی اصلاح، اور اسلامی نظام جماعت کا قیام ہی وہ آخری منزل ہے جس پر پہونچ کر ہمارا کام ختم ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ پہلی منزل ہے جسے طے کرنے کے بعد آگے بڑھنے کے لیے راستہ کھلتا ہے۔ کلمۂ طیبہ پر ایمان، اور اس مرکز پر منتشر قوموں کا مجتمع ہونا، اور احکام شریعت کی پابندی سے لوگوں کے اندر انضباط اور منظم عادات و خصائل کا پیدا ہو جانا تو دراصل وہ چیز ہے جس سے زمین ہموار ہوتی ہے تاکہ اس پر عمارت تیار کی جا سکے۔ جہاں یہ زمین ہموار ہو چلی ہے جیسے میوات کے علاقہ میں اس وقت ہو چکی ہے۔ وہاں ان لوگوں کے لیے کام کا موقع ہے۔ جنھوں نے تنظیم شئون انسانی کے جدید طریقوں کی تعلیم حاصل کی ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہاں جا کر مذہبی مبلغین کے ساتھ تعاون کریں۔ اس علاقہ میں علم کی روشنی پھیلائیں۔ وہاں کے عوام میں سیاسی بیداری اور شعور پیدا کریں۔ ان کی معاشی حالت درست کرنے کی کوشش

کریں اور اسلامی اصول پر مالیات کا ایک نیا نظام تعمیر کریں۔ غرض مختلف پہلوؤں سے اس علاقہ کے لوگوں کو ترقی کے راستہ پر لگائیں، اور ان کو ایک ایسی مضبوط اور منظم حالت تک پہونچا کر دم لیں۔ جن کا طبعی نتیجہ یہ ہو کہ خدا اپنی خلافت سے ان کو سرفراز فرمائے اور وہ زمین کے صالح وارث (نہ کہ غاصب متملک) بن جائیں۔ (ترجمان القرآن، ماہ شعبان ۱۳۹۹ھ)

چندہ سالانہ
ہندوستان سے ۱۵/-
پاکستان سے ۳۰/-
بنگلادیش سے ۱۶/-
فی شمارہ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح یہ ہے
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

جلد (۴۷) | بابت ماہ نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ و محرم الحرام ۱۴۰۰ھ | شمارہ (۱۱-۱۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی روانہ ہوگا۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۵ تاریخ تک آجانا چاہیے اس کے بعد رسالہ کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ پچیس ۲۵ روپے ہندوستانی سکہ میں بینک کے ذریعہ دفتر الفرقان لکھنؤ روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں مبلغ تیس ۳۰ روپے ناظم دفتر اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

چودھویں صدی کا اختتام :-

اتفاق کی بات ہے کہ آج جبکہ نگاہِ اولیں کی یہ سطریں لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیا ہے تو ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ کی ۳۰ تاریخ ہے۔ اب کل سے اس صدی کا آخری سال ۱۴۰۰ھ شروع ہے اور اس کے ختم پر ان شاء اللہ چودھویں صدی کا خاتمہ ہو کر پندرھویں صدی شروع ہو جائے گی۔

اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں سنا کرتے تھے کہ یہ چودھویں صدی دنیا کی آخری صدی ہے، بس اسی صدی میں قیامت آجائیگی — بیچارے بہت سے عوام یہ باتیں اس طرح کرتے تھے کہ گویا یہ مسئلہ دینی اور اعتقادی حقیقتیں ہیں — جب اللہ تعالیٰ نے کچھ دینی علم و شعور نصیب فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہ سب جاہلوں کی خرافات ہیں — قرآن پاک میں جا بجا صراحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے کہ یہ بات کہ قیامت کب آئیگی، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے علم میں نہیں، انبیاء علیہم السلام اور فرشتوں کو بھی اس کا علم عطا نہیں فرمایا گیا ہے، بس عین وقت ہی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ظہور ہو گا (قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ)

"الفرقان" کے ۴۷ سال

الحمد للہ، اس شمارہ پر الفرقان کے ۴۷ سال پورے ہو گئے — اس مدت میں اس کے ذریعہ دین کی جو خدمت ہوئی ہو اللہ تعالیٰ اس کو محض اپنے کرم سے قبول فرمائے اور جو تقصیرات ہوئیں اُن کی تلافی کی توفیق دے اور معاف فرمائے۔

قریباً نصف صدی کی اس مدت میں راقم سطور نے الفرقان کے ہزارہا صفحات میں یا اس کے علاوہ جو کچھ لکھا اُس میں یقیناً بہت سی غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی — اس سلسلہ میں ایک اصولی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ اگر کسی وقت میں نے کسی مسئلہ اور کسی معاملہ میں ایک رائے ظاہر کی اور اس کے بعد کسی زمانہ میں اُس سے مختلف رائے ظاہر کی تو بعد والی تحریر کو پہلی تحریر کا ناسخ سمجھنا چاہیئے۔

اس کے علاوہ اہل علم ناظرین کرام سے عاجزانہ استدعا ہے کہ اُن کو جہاں کہیں میری کسی تحریر میں کوئی غلطی محسوس ہوئی ہو وہ مجھے اُس سے مطلع فرمائیں، یہ اُن کا مجھ پر عظیم احسان ہو گا۔ تاکہ میں اس پر غور کر کے اس سے رجوع اور اس کی تصحیح کرسکوں۔

مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت...

جن حضرات کی نظر سے الفرقان گزرتا ہے اُن کے علم میں ہے کہ اگست کے شمارہ میں (جو وسط رمضان میں شائع ہوا تھا) اعلان کیا گیا تھا کہ اس کے بعد اب ستمبر و اکتوبر کا مشترک شمارہ انشاء اللہ اکتوبر میں شائع ہوگا ــــــ اس میں خود اس عاجز مدیر الفرقان کا ایک ہی مضمون آنا تھا، جس میں مرحوم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ اپنی رفاقت کی سرگزشت پوری تفصیل سے لکھی گئی تھی اور ان کے بعض افکار و نظریات سے اختلاف اور ان کے بارہ میں اپنا حالیہ موقف صراحت اور وضاحت کے ساتھ حوالۂ قلم کیا گیا تھا ــــــ اور اپنے قدیم تعلق کی بناء پر نیز یہ سمجھتے ہوئے کہ بظاہر میری اور اُن کی بھی عمر کا یہ آخری دور ہے اُن کی خدمت میں کچھ مخلصانہ گزارشات کی تھیں۔ مجھے توقع تھی کہ وہ میری ان معروضات پر غور فرمائیں گے۔

ستمبر، اکتوبر کے اُس مشترک شمارہ کے لیے اِس مضمون کی کتابت بھی ہو چکی تھی، صرف طباعت کا مرحلہ باقی تھا، کاپیاں پریس جانے والی تھیں کہ ۲۳ ستمبر کو اچانک اطلاع ملی کہ مولانا مودودی امریکہ میں (جہاں وہ علاج کے لیے گئے ہوئے تھے) انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ــــــ

اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وتقبل حسناتہ وتجاوز عن سیاٰتنا وسیاتہ۔

اس اطلاع کے بعد اُس مضمون کی اشاعت راقم سطور نے اُس وقت ملتوی کر دینا ضروری سمجھا اور صرف ستمبر کا شمارہ کسی طرح تیار کرا کے اوائل اکتوبر میں شائع کرا دیا گیا ــــــ اُسی میں بسلسلۂ وفیات مولانا مرحوم کے سانحۂ رحلت کے تذکرہ میں اُن کے ساتھ اپنی رفاقت و تعلق کے مختلف ادوار کا بھی کچھ اجمالی ذکر آ گیا تھا اور مولانا سے متعلق اپنے کچھ احساسات و تاثرات بھی لکھے گئے تھے (جو ناظرین کرام کی نظر سے گزر چکے ہیں) ــــــ اس کے بعد اکتوبر کا شمارہ شروع نومبر میں ناظرین کو ملا ہوگا، اُس میں اطلاع دی گئی تھی کہ اب اس کے بعد نومبر دسمبر کا مشترک شمارہ انشاء اللہ دسمبر میں شائع ہوگا اور اس میں اُس مضمون کا ایک حصہ ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے جو مولانا مودودی صاحب مرحوم سے متعلق ستمبر اکتوبر کے مشترک شمارے میں شائع ہونے والا تھا۔ اور اُن کے حادثۂ رحلت کی اطلاع ملنے پر اُس وقت اُس کی اشاعت ملتوی کر دی گئی تھی ــــــ

نومبر دسمبر کا دو مشترک شمارہ یہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں حسب وعدہ اُس مضمون کا ایک حصّہ شائع کیا جا رہا ہے ــــــ

اس مضمون کی مخصوص نوعیت کے پیش نظر مختلف حضرات نے مشورہ دیا کہ اس کو مستقل کتابی شکل میں شائع ہونا چاہیے' ــــــ چنانچہ یہی طے کر لیا گیا ــــــ اب انشاء اللہ پورا مضمون کتابی شکل میں شائع ہوگا (ممکن ہے کہ اس کتابی اڈیشن میں موجودہ مضمون پر کچھ اضافہ بھی مفید سمجھا جائے) ــــــ کوشش کی جائے گی کہ اس کی اشاعت میں زیادہ دیر نہ ہو۔

چونکہ الفرقان میں اس کا سلسلہ ذکر آتا رہا ہے اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اُس کا ایک حصہ الفرقان میں بھی شائع کر دیا جائے ــــــ ناظرین کرام اس کے مطالعہ کے وقت یہ بات پیش نظر رکھیں کہ یہ مولانا مودودی مرحوم کی حیات میں اور اس امید پر لکھا گیا تھا کہ وہ اس کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور اُس کی یہ کتابت بھی اُن کی حیات ہی میں ہوئی تھی ــــــ لیکن اشاعت اُن کی حیات میں مقدر نہ تھی۔ ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لم یکن۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کی کتابت ہو جانے کے باوجود مولانا مودودی کے انتقال کے بعد اس کی اشاعت کے بارہ میں مجھے بہت تامل رہا ــــــ ایک طویل زمانہ تک اُن کے ساتھ جیسا گہرا ذہنی اور قلبی تعلق رہا' اس کی وجہ سے طبیعت کو گوارا نہیں تھا کہ اب اس کو شائع کیا جائے۔ مسلسل سوچتا رہا اور دعا بھی کی کہ عند اللہ جس فیصلہ میں خیر ہو اللہ تعالیٰ اسی کی توفیق عطا فرمائے۔ ــــــ آخر میں یہی طے ہوا کہ طبیعت کی ناگواری کو نظر انداز کر کے اس کو اسی طرح شائع ہونا چاہیے جس طرح لکھا گیا تھا' کیونکہ یہ میری' مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تاریخ کا ایک اہم حصّہ ہے جو ان تفصیلات کے ساتھ کہیں محفوظ نہیں ہے اور ایک طرح کی "شہادت" ہے۔

میری اس سرگزشت کے سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب سے متعلق بعض ایسی ذاتی و شخصی باتوں کا ذکر آیا ہے جن کا اس طرح صراحت کے ساتھ تحریر میں آنا اُن کے بہت سے محبین و متبعین کے لیے غالباً دکھ کا باعث ہوگا ــــــ اُن کی خدمت میں بطور معذرت گزارش ہے کہ خود مجھے ان باتوں کے ذکر سے ایک گونہ دکھ اور قلبی اذیت ہے اور میں نے بہت غور و تامل کے

بعد ان واقعات کو تحریر میں محفوظ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھ کر طبعی کراہت اور ناگواری کے ساتھ اُن کو سپردِ قلم کیا ہے کیونکہ یہی میری اس سرگزشت کے وہ اہم اجزاء ہیں جو میرے بہت سے اہم فیصلوں کی بنیاد ہیں (پھر یہ ایسے واقعات بھی نہیں ہیں جو اب تک پردۂ راز میں تھے، جو واقعہ جس دور کا ہے اس دور کے مولانا کے جاننے والے اُس واقعہ سے عموماً واقف ہیں۔)

اس کے علاوہ میں نے ان واقعات کا ذکر اس لیے بھی ضروری سمجھا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کل کے مولانا مودودی صاحب کے اکثر محبین (جن کا علم و دین کا سرمایہ صرف مولانا کی تصانیف ہیں وہ) ان کو صرف ایک ممتاز عالم اور مصنف ہی نہیں بلکہ اس دور کا مجدد بلکہ امتِ محمدیہ کا مجددِ اعظم یقین کرتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ امت کے اگلے مجددین مثلاً امام غزالی، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہیدؒ وغیرہ کے تجدیدی کام میں بہت سی غلطیاں اور خامیاں تھیں، دین کی صحیح حقیقت اور روح کو مولانا مودودی صاحب ہی نے سمجھا اور امت کے سامنے پیش کیا ہے ——— اور انھوں نے اب سے قریباً نصف صدی پہلے اسی کارِ تجدید کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے حیدرآباد سے "ترجمان القرآن" جاری کیا تھا، گویا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی وقت سے اس "منصبِ تجدیدِ دین" پر فائز تھے۔

ظاہر ہے کہ مولانا مودودی کے بارہ میں یہ بے جا غلو بجائے خود بھی گمراہی ہے اور بہت سی گمراہیوں کا سبب بن سکتا ہے۔

الغرض اس عاجز نے اس غلو کی اصلاح کے لیے بھی ان واقعات کا صراحت اور صفائی کے ساتھ ذکر ضروری سمجھا ——— اسی کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قریباً یہ سب ہی چیزیں جو کسی زمانہ میں تھیں خود راقم سطور کے علم میں ہے کہ بعد میں وہ باقی نہیں رہیں اور مولانا مرحوم نے ان کی اصلاح فرمائی تھی، اس لیے "التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ" کے خداوندی قانونِ رحمت کے مطابق انشاء اللہ وہ سب کالعدم ہیں اور اب کسی کے لیے اس کا جواز نہیں ہے کہ وہ اِن چیزوں کی بنیاد پر مولانا مرحوم پر اعتراض و تنقید کرے ——— خاصکر اب جبکہ وہ ہماری اس دنیا سے منتقل ہو کر اپنے ربِ رؤف و رحیم کے حضور پہنچ چکے جہاں ہم کو بھی حاضر ہونا ہے تو اب اُن کا حق یہی ہے کہ ہم اُن کے لیے مغفرت و رحمت کی اپنے اور اُن کے ربِ کریم سے استدعا کریں۔ ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا ربنا انک رءوف رحیم۔

إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ

مولانا مودودی کے ساتھ

میری رفاقت کی سرگزشت

اور اب میرا موقف

محمد منظور نعمانی

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ،
أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰاهُمُ اللّٰهُ وَأُولٰئِكَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ

تقریب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللہُ
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ
وَمَنْ وَّالَاہُ

صدیق محترم مولانا علی میاں کی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کی اشاعت اور "الفرقان" میں اس کے بارہ میں اظہار رائے کے بعد بعض حضرات کی طرف سے یہ سوال کیا گیا کہ مولانا علی میاں نے اپنی کتاب میں مولانا مودودی کی جن تحریروں کو قابل اعتراض اور خطرناک بتلایا ہے اور "الفرقان" میں اس کی پوری تائید کی گئی ہے ان میں زیادہ تر تحریریں "جماعت اسلامی" کے قیام سے بھی پہلے کی یا اس کے بالکل ابتدائی دور کی ہیں۔ یہ تحریریں اس وقت آپ حضرات کی نظر سے ضرور گزری ہوں گی، خاصکر "تجدید و احیاء دین" تو سب سے پہلے "الفرقان" کے "شاہ ولی اللہ نمبر" میں شائع ہوئی تھی ـــــــ اس وقت آپ لوگوں نے اِن تحریروں میں وہ خطرناکی کیوں محسوس نہیں کی جو اب آپ محسوس کر رہے ہیں؟ اِن تحریروں کی اشاعت کے بعد بلکہ گویا انہی کی بنیاد پر "جماعت اسلامی" قائم ہوئی تھی اور آپ نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اس میں شرکت کی اور مولانا مودودی صاحب کو امیر مان کر سمع و طاعت کا عہد کیا۔ حالانکہ اس وقت بھی آپ عالم دین تھے، اس وقت آپ کو وہ سب کچھ کیوں نظر نہیں آیا جو آج نظر آرہا ہے؟ ـــــــ

یہ سوال معقول ہے اور اس نے ضرورت محسوس کرائی کہ اس سلسلہ کی اپنی سرگزشت تفصیل سے سپرد قرطاس و قلم کر دی جائے، جو غلطیاں ہوئیں صفائی سے اُن کا اعتراف کیا جائے اور ان کا سبب اور پورا پس منظر بھی لکھ دیا جائے۔

علاوہ ازیں گزشتہ ۸-۱۰ مہینوں سے مولانا علی میاں صاحب کی اسی کتاب (عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح) سے متعلق، اور پھر اس کے بعد جون و جولائی کے الفرقان کے شماروں میں شائع

ہونے والے مولانا محمد عارف سنبھلی کے مضمون (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ——— میرا مطالعہ) کے تعلق سے "جماعت اسلامی" کے پرجوش مجاہدین کے جو عتاب نامے بکثرت آئے انھوں نے بھی اس کی ضرورت محسوس کرائی کہ اپنی یہ سرگزشت پوری تفصیل سے لکھ دی جائے ——— ان خطوط سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اب "جماعت" سے تعلق رکھنے والوں میں بڑی تعداد غالباً اُن نئے حضرات کی ہے جو مولانا مودودی کے ابتدائی دور، جماعت اسلامی کے آغاز اور مولانا موصوف اور جماعت اسلامی کے ساتھ اس حقیر کے تعلق کی تاریخ سے بالکل ہی ناواقف ہیں ———

امید ہے کہ اس سرگزشت سے جو اس وقت سپرد قرطاس وقلم کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے وہ بہت کچھ معلوم ہو جائے گا جو ان نووارد حضرات کے علم میں نہیں ہے اور جس سے ان کو واقف ہونے کی ضرورت ہے یہ بھی امید ہے کہ ان حضرات میں سے جن کا قلب سلیم ہوگا اس کے مطالعہ سے انشاءاللہ ان کے غلو کی کچھ اصلاح ہو جائے گی۔

اب سے ۲۲ سال پہلے (۱۳۷۵ھ میں) الفرقان ہی میں اس سلسلہ کی میری سرگزشت شائع ہوئی تھی[1] لیکن اس وقت بعض تفصیلات کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا، نیز اُس کا وہ پس منظر بھی نہیں لکھا جس کا تعلق میری طالب علمی کے دور اور "تحریک خلافت" سے ہے ——— اس وقت سلسلہ کلام وہیں سے شروع کرنے کا ارادہ ہے ——— اس طرح "آپ بیتی" کا ایک باب بھی تحریر ہو جائے گا جو ناظرین کے لیے سبق آموز بھی ہوگا اور انشاءاللہ دلچسپ بھی۔

بعد کے واقعات و تجربات کی روشنی میں اس عاجز کا اب جو موقف ہے اور مولانا مودودی صاحب کے جن بعض افکار و نظریات کے متعلق میرا احساس ہے کہ اُن میں اُن سے سنگین غلطی ہوئی ہے اور وہ امت میں فتنہ اور ضلال کا سبب بن سکتے ہیں، ارادہ کیا ہے کہ اسی موقع پر اُن کے بارہ میں اپنی معروضات صراحت اور صفائی کے ساتھ خود مولانا موصوف اور ان کی جماعت کے اہل علم و دانش کی خدمت میں اور عام مسلمانوں کے سامنے پیش کروں ——— اللہ تعالیٰ نفس و شیطان کے شرور سے قلب و قلم کی حفاظت فرمائے!

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ

[1] ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۶ء) میں میں نے یہ سرگزشت اس حالت میں کہ میں مریض اور صاحب فراش تھا املا کے طور پر صرف یادداشت سے لکھائی تھی اس وقت بفضلہ تعالیٰ میں اس حال میں ہوں کہ اس سرگزشت کی جو باتیں الفرقان یا ترجمان القرآن میں شائع ہوئی تھیں اُن کے فائلوں کی ورق گردانی کر کے میں نے ان کا مطالعہ کر لیا ہے۔ — نعمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحریک خلافت اور اس کے اثرات

یورپ کی پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء پر ختم ہوئی تھی، یاد ہے کہ اس کے خاتمہ تک ملک کی فضا ایسی تھی کہ عام آدمی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہاں انگریزوں کی حکومت نہیں رہے گی، یا اس کے خلاف کوئی تحریک ہی اُٹھ سکے گی ـــــ پھر اس جنگ ہی کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا ہوئے جو ہندوستان میں "تحریک خلافت" برپا ہونے کا سبب بنے جس نے چند ہی مہینوں میں ہندوستان میں اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں میں وہ انقلاب برپا کر دیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ـــــ خلافت کی تحریک اور آزادی ہند کی تحریک، دونوں ساتھ چل رہی تھیں، قیادت بھی دونوں کی مشترک تھی، مولانا محمد علی شوکت علی جس طرح تحریک خلافت کے قائد و علمبردار تھے اسی طرح تحریک آزادی کے بھی، اور گاندھی جی جس طرح تحریک آزادی ہند کے لیڈر تھے اسی طرح تحریک خلافت کے بھی۔ پروگرام بھی دونوں تحریکوں کا ایک ہی تھا جس کا اہم نکتہ تھا انگریزی سرکار اور اُس سے تعلق رکھنے والے اداروں سے عدم تعاون اور تا امکان انگریزی مصنوعات کا بھی بائیکاٹ" ـــــ ہندو اور مسلمان دونوں پورے اشتراک بلکہ اتحاد کے ساتھ تحریک چلا رہے تھے لیکن مسلمانوں کے جذباتی مزاج، بے پناہ جوش و خروش اور مسئلہ خلافت کی خاص مذہبی نوعیت نے تحریک پر اسلامی رنگ غالب کر دیا تھا ـــــ اللہ اکبر ـــــ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک نعرہ تھا۔ حد یہ تھی کہ بہت سے ہندو لیڈر جس طرح آزادی ہند کے موضوع پر تقریر کرتے تھے اسی طرح خلافت کے مسئلہ پر بھی (جو مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ تھا) بالکل مسلمانوں کے انداز میں (بلکہ ایک حد تک مولویانہ انداز میں) تقریریں کرتے تھے۔ ہمارے ضلع مراد آباد میں میرے وطن سنبھل سے

بالکل قریب ایک چھوٹا سا قصبہ بسڑسی ہے وہاں کے ماسٹر چندو لال (جنھوں نے تحریک ہی کی وجہ سے اسکول کی ملازمت سے استعفا دیا تھا) بڑے اچھے مقرر تھے، اُن کی تقریروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "اَخْرِجُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارىٰ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ"[1] بالکل صحیح الفاظ میں اور صحیح اعراب کے ساتھ اُن کی زبان سے بار بار سننا اچھی طرح یاد ہے ـــــــ الغرض اُس وقت ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جو تحریک مشترکہ طور پر چل رہی تھی اُس پر اسلامی رنگ ایسا غالب تھا جس کا وہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے جنھوں نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ـــــــ

[یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑی کمی اور بڑی افسوسناک بات تھی کہ ایسی عظیم اور عدیم النظیر تحریک کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، بزرگ خادم قوم و ملت اور مشہور صاحب قلم ہمارے محترم قاضی محمد عدیل عباسی (ایڈووکیٹ، بستی) کو انھوں نے ابھی حال میں جبکہ اس تحریک پر ساٹھ برس گزرنے والے ہیں بڑی محنت اور دیدہ وری سے اس کی تاریخ مرتب کی، وہ خود ان لوگوں میں سے ہیں جو تحریک کے میدان میں تھے اور اُس زمانہ کی جیل کا عذاب بھی چکھا تھا۔ اگر اللہ نے اُن سے یہ کام نہ لیا ہوتا تو بظاہر یہ ضروری کام رہ ہی جاتا ـــــــ بلاشبہ اپنے موضوع پر یہ اچھی کامیاب تصنیف ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اُس کے مطالعہ سے بھی کوئی اُس فضا اور اُس صورت حال کا اندازہ نہیں کر سکتا جو تحریک خلافت نے اس ملک میں پیدا کر دی تھی۔]

[1] .... یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وصیت کے الفاظ ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر کر دیا جائے ـــ اُس کے حدود میں اُن کو رہنے بسنے کی اجازت نہ دی جائے ـــــ خلافت کی تحریک جن بنیادوں پر برپا ہوئی تھی اُن میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت بھی تھی۔ تحریک خلافت کے سلسلہ کی تقریروں میں یہ حدیث اس کثرت سے دہرائی جاتی تھی کہ عوام بلکہ بہت سے ہندو بھائیوں کی زبان پر بھی چڑھ گئی تھی۔

جو دو تین سال "تحریک خلافت" کے خاص عروج و شباب کے تھے (قریباً ۲۳-۲۲-۱۹۲۱ء) اُس زمانہ میں میرا قیام ایک طالب علم کی حیثیت سے ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو میں تھا۔ میرے خاص استاذ و مربی حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ (جن سے کچھ قرابت کا بھی تعلق تھا) مئو کی مشہور دینی درسگاہ "دارالعلوم" میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ مجھے تعلیم و تربیت کے لیے اُن کے سپرد کر دیا گیا تھا، اس وجہ سے اس زمانہ میں میرا قیام مئو میں تھا ——— یوں تو ملک کے سب ہی حصوں میں تحریک خلافت کا زور شور تھا لیکن مئو کا جو حال تھا وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے بڑے یا چھوٹے شہر کا رہا ہو ——— معلوم ہوتا تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو گئی ہے ——— چونکہ تحریک کے پروگرام میں سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا اس لیے خلافت کمیٹی نے اپنی عدالتیں بھی قائم کی تھیں۔ یاد آتا ہے کہ مئو کے معمر بزرگ شاہی جامع مسجد کے امام مولانا بشیر اللہ صاحب اور دارالعلوم دیوبند کے ایک ممتاز فاضل مولانا محمد ضمیر صاحب اور مولانا عبداللہ شائق مرحوم (جو ایک بہت تیز اور ذی استعداد الحدیث عالم تھے) اس عدالت کے قاضی (جج) تھے ——— ہر قسم کے مقدمات اور نزاعات مسلمانوں کے بھی اور غیر مسلموں کے بھی اسی عدالت میں آتے تھے اور اُن کے فیصلے کیے جاتے تھے اور فریقین بلا چون و چرا ان فیصلوں کو مانتے تھے ——— مسلمانوں میں بعض آوارہ مزاج لوگ تاڑی پیتے تھے (جو ایک طرح کی شراب ہے) خلافت کے رضا کار ——— جو پولیس والی خدمات بھی انجام دیتے تھے ——— اُن کو پکڑ لاتے اور عدالت کے حکم سے اُن کے کوڑے لگائے جاتے اور کوئی سرکشی اور سرتابی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا ——— مئو میں سرکاری تھانہ اور اسی طرح کے دوسرے سرکاری ادارے اور محکمے موجود تھے لیکن اُس عرصہ میں اُن لوگوں کے لیے گویا کوئی کام نہیں تھا ——— عوام کے اخلاق و کردار پر بھی غیر معمولی اثر پڑا تھا، جرائم اور لڑائی جھگڑے بڑی حد تک ختم ہو گئے تھے، کم از کم مئو کا تو یہی حال تھا کہ وہ حقیقی معنی میں دارالامن بلکہ ایک طرح کا "دارالاسلام" بن گیا تھا۔

یہ فضا جیسا کہ عرض کیا گیا قریباً دو تین سال قائم رہی، اُس کے بعد جب ۱۹۲۳ء

میں مصطفیٰ کمال پاشا نے الغاءِ خلافت کا فیصلہ کر دیا تو تحریک کی بنیاد ہی ختم ہو گئی ۔۔۔
اسی زمانہ میں ملک میں بھی کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جن کے نتیجہ میں اس فضا کا خاتمہ ہو گیا، لیکن اس "تحریکِ خلافت" نے بعض بہت غیر معمولی اثرات چھوڑے ۔ اُن میں سے ایک یہ کہ عوام تک کے قلوب میں انگریزی حکومت کی مخالفت بلکہ دشمنی رچ بس گئی اور اس کا خوف دلوں سے بالکل نکل گیا اور ہم جیسے لوگ بھی "اپنی حکومت" اور کم از کم اُس فضا کا خواب دیکھنے لگے جو تحریکِ خلافت میں قائم ہو گئی تھی اور راقم سطور نے مئو میں دیکھی تھی۔

دار العلوم دیوبند کی طالب علمی اور اس کے بعد جمعیۃ العلماء سے وابستگی

جیسا کہ اوپر عرض کیا یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا اس کے بعد تعلیم کے آخری دور میں دو سال میرا قیام دار العلوم دیوبند میں رہا، (واضح رہے کہ یہ اب سے قریباً ۶۰ سال پہلے کا "دار العلوم دیوبند" تھا جبکہ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر ۳-۴ سال ہی گزرے تھے) تحریکِ خلافت نے جو جذبات پیدا کیے تھے یہاں کی فضا نے اُن کی آبیاری کی اور ان کو اور مشتعل اور مستحکم کیا ــــــــ "خلافت تحریک" ختم ہو چکی تھی، اِن جذبات کو کسی درجہ میں غذا دینے والی مسلمانوں کی جماعت "جمعیۃ العلمائے ہند" ہی میدان میں رہ گئی تھی، اور "دار العلوم" میں تعلیم پائے ہوئے ہم جیسے لوگ اپنے اکابر کے تعلق سے اس کو اپنی جماعت سمجھتے اور اسی سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے، راقم سطور کی بھی اُسی سے وابستگی رہی۔

اُس وقت کی جمعیۃ العلماء

اُس وقت وہ حقیقی معنی میں "جمعیۃ العلماء" تھی، یعنی صرف علماء ہی اس کے ذمہ دار ارکان اور عہدہ دار ہو سکتے تھے سیاسی پارٹیوں کی طرح کی عام ممبر سازی اور الکشن کا طریقہ اُس وقت تک (بلکہ اس کے بہت بعد تک بھی) نہیں اپنایا گیا تھا۔

اگرچہ ہماری جماعت دیوبند کے علاوہ دوسرے طبقوں اور حلقوں کے علماء کرام (حضرات علماء اہلحدیث، علماء فرنگی محل، علماء بدایوں مولانا نثار احمد کانپوری، مولانا فاخر الہ آبادی مولانا آزاد سبحانی (مولانا احمد رضا خانصاحب بریلویؒ کے خلفاء میں سے) مولانا مختار احمد میرٹھی، اُن کے

لے (حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بھائی مولانا نذیر احمد خجندی مولانا عبدالعلیم میرٹھی (پاکستان کے مولانا نورانی میاں کے والد ماجد مرحوم) وغیرہ بھی اُس وقت اچھی خاصی تعداد میں "جمعیۃ" میں شامل تھے اور وہ حضرات جمعیۃ کے ذمہ دارانہ عہدوں پر تھے، لیکن ارکان اور کارکنوں میں غالب اکثریت جماعتِ دیوبند ہی کے علماء کی تھی ـــــــ اُسی دور کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ کسی موقع پر مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم نے (جو مسلکاً بدایونی حنفی تھے) مولانا ابوالکلام آزاد سے (جو سلفی المسلک تھے) بطور شکایت کے کہا کہ ہماری "جمعیۃ" کا نام تو "جمعیۃ العلمائے ہند" ہے، لیکن واقعہ میں یہ "جمعیۃ العلمائے دیوبند" بنتی جارہی ہے ـــــ تو مولانا آزاد نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ میرے بھائی! ہندوستان میں جب بھی جمعیۃ العلماء بنے گی تو اس کی ہئیت ترکیبی یہی ہوگی، کیونکہ علماء تیار کرنے کا کام یہاں دیوبند ہی نے کیا ہے تو جب علماء کو جمع کیا جائے گا تو انھیں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اگر یہ کام ہم نے آپ نے کیا ہوتا تو ہماری تعداد زیادہ ہوتی۔

آزادی کی جدوجہد میں کانگرس کے ساتھ اشتراکِ عمل

ملک کی آزادی کی جدوجہد میں "انڈین نیشنل کانگرس" کے ساتھ اشتراکِ عمل کا جو اصول تحریک خلافت کے دور میں اپنایا گیا تھا، "جمعیۃ العلماء" بعد میں بھی اُس پر برابر قائم رہی اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اس نے اِس کو ضروری اور ناگزیر سمجھا ـــــــ

آزادی کے بارہ میں جمعیۃ کا خاص تصور

لیکن یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ ملک کی آزادی کے بارہ میں "جمعیۃ العلماء" کا ایک خاص تصور تھا، جو اُس دور کے "جمعیۃ" کے اجلاسوں کے خطباتِ صدارت کے اوراق میں محفوظ ہے اور آج بھی دیکھا جاسکتا ہے (خاص کر حضرت مولانا محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار کے اجلاس مراد آباد کے خطبۂ صدارت میں اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے اجلاس کلکتہ کے خطبۂ صدارت

لے (حاشیہ صفحہ گذشتہ) مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی تحریک خلافت کے سخت مخالف تھے انھوں نے اس سلسلہ میں حسب عادت متعدد رسالے بھی لکھے تھے، لیکن مولانا نجم احمد میرٹھی وغیرہ اُن کے بعض خلفاء نے اس مسئلہ میں ان سے گویا بغاوت کردی تھی۔ ۱۲

اور حضرت مولانا محمد انور شاہ کے اجلاس پشاور کے خطبۂ صدارت میں) اور جمعیۃ کے اجلاسوں کی تجاویز میں ـــــــ مجھے یاد ہے کہ اُس زمانہ کے جمعیۃ العلماء کے دستور میں "مقصد و نصب العین" کے تحت غالباً پہلی ہی دفعہ کے الفاظ یہ تھے

"شرعی نصب العین کے مطابق ہندوستان کی مکمل آزادی"

بہرحال ملک کی آزادی کے بارہ میں جمعیۃ العلماء کا ایک خاص تصور تھا اور اسی تصوّر کی بنا پر اُس کے اکابر و رہنما آزادی کی جدوجہد کو اپنے لیے جہاد فی سبیل اللہ سمجھتے تھے اور اسی نیت سے اس کے راستہ میں قربانیاں دیتے تھے۔

شدھی سنگٹھن کی تحریک کا دور تحریک خلافت کے اضمحلال اور پھر خاتمہ کے بعد کئی برس تک بعض ایسے اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کا محاذ ٹھنڈا رہا تھا ـــــــ اسی زمانہ میں آریہ سماجیوں کی اُٹھائی ہوئی شدھی سنگٹھن تحریک کے نتیجہ میں ہندو مسلم اتحاد بھی درہم برہم ہوگیا اور دین کی فکر رکھنے والے مسلمانوں کو دین کی حفاظت کے لیے اس تحریک کے جوابی اقدامات کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اس دور میں جمعیۃ العلماء کی بھی مساعی زیادہ تر اسی شعبہ کی طرف مصروف رہیں۔ اسی زمانہ میں "جمعیۃ العلماء" نے اپنا اخبار "الجمعیۃ" نکالنے کا فیصلہ کیا، مولانا مودودی اس کے اڈیٹر تھے، میں نے سب سے پہلے ان کا نام "الجمعیۃ" ہی پر دیکھا تھا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے اُس زمانہ میں انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کا محاذ ٹھنڈا تھا، کانگریس کی طرف سے بھی کوئی تحریک جاری نہیں تھی۔

۱۹۳۰ء سے جنگ آزادی کا پھر آغاز ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے انگریزی حکومت کے خلاف پھر آزادی کی جنگ شروع کی جمعیۃ العلماء نے بھی اپنے امروہہ کے اجلاس میں اس جنگ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کا فیصلہ کیا اور وہ پھر کانگریس کے ساتھ جنگ کے میدان میں آگئی۔

اس دور میں میرا حال اور مشاغل عرض کیا جاچکا ہے کہ راقم سطور بھی جمعیۃ العلماء سے وابستہ تھا ـــــــ میری یہ وابستگی اگرچہ ذہنی اور

لے "الجمعیۃ" کا اجراء غالباً ۱۹۲۵ء میں ہوا، اس سے پہلے جمعیۃ کے اکابر نے ایک اخبار "مسلم" کے نام سے بھی نکالا تھا۔ غالباً ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک جاری رہا، اس کے اڈیٹر بھی مولانا مودودی ہی تھے۔ ۱۲۔

فکری لحاظ سے بہت عمیق اور راسخ تھی، اور میں ملک کی آزادی کے سلسلہ میں اس کی جدوجہد اور قربانیوں کو پورے یقین و اطمینان کے ساتھ "فی سبیل اللہ" ہی جانتا اور سمجھتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُس کی اِس سیاسی جدوجہد میں میرا عملی حصہ بس برائے نام ہی رہا — اُس دور میں تعلیم و تدریس میرا خاص مشغلہ تھا، اُس کے علاوہ آریہ سماجیوں کی برپا کی ہوئی "شدھی" کی تحریک نے (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) اس زمانہ میں آریہ سماج اور مسلمانوں کے درمیان مناظرہ مباحثہ کا میدان گرم کر دیا تھا — اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میدان میں اسلام کی وکالت و حمایت کی کچھ صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ اس لیے میں اس میں بھی حصہ لیتا تھا — قادیانی فتنہ اور قادیانی مبلغین کی سرگرمیاں بھی اس زمانہ میں عروج پر تھیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے مقابلے اور اُن کے فتنہ سے امت کی حفاظت کی خدمت کی توفیق بھی اس عاجز کو عطا فرمائی تھی۔

نیز قریباً اُسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نجد کی "وہابی حکومت" کے اُس وقت کے فرمانروا سلطان عبدالعزیز بن سعود نے، شریف حسین کو (جس نے جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کی مدد سے سلطنت عثمانیہ ترکی اور خلیفۃ المسلمین سے بغاوت کر کے حجاز مقدس پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی) حرمین شریفین اور پورے علاقۂ حجاز سے بیدخل کر کے وہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور اپنے مسلک کے مطابق حکومتی طاقت سے وہاں دینی اصلاحات بھی نافذ کیں، اس سلسلہ میں انھوں نے وہ قُبّے بھی "تڑوا" ڈالے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے، مکہ مکرمہ کے قبرستان "جنۃ المعلاۃ" اور مدینہ منورہ کی جنۃ البقیع وغیرہ میں بعض اہل بیت نبوی اور صحابہ کرام کی قبروں پر کسی زمانہ میں بنائے گئے تھے — اس واقعہ پر ہندوستان کے مختلف حلقوں کے قبوریین و مبتدعین اور شیعہ حضرات نے متحدہ محاذ بنا کر "وہابیوں" اور "وہابیت" کے خلاف زبان و قلم کی ایک طوفانی جنگ برپا کر دی۔ اور یہاں حملوں کا خاص نشانہ شاہ اسماعیل شہید اور ان کی دعوت توحید و سنت کی علمبردار جماعت دیوبند کے اکابر کو بنایا گیا، اور تکفیر و تفریق اور فساد انگیزی کا وہ فتنہ جو مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے برپا کیا تھا اور جو تحریک خلافت میں بالکل دفن ہو گیا تھا

پھر زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس میدان میں بھی یہاں مناظروں، مباحثوں کا بازار گرم ہو گیا
راقم سطور نے اللہ کی توفیق سے اس میدان میں بھی مسلک حق و اہل حق کی حمایت و وکالت میں
حصہ لیا ــــــ الغرض ایک طویل زمانہ تک تعلیم و تدریس کے ساتھ اسلام کی وکالت اور
دین حق و اہل حق پر ہونے والے حملوں کی مدافعت بھی اس عاجز کا خاص مشغلہ رہا، اللہ تعالیٰ
اپنے کرم سے اس کو بھی قبول فرمائے اور اس سلسلہ کی تقصیرات معاف فرمائے۔

مولانا مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" کا آغاز

غالباً ۱۹۳۳ء شروع ہو چکا تھا حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی (علیہ الرحمہ) نے ایک ادارہ لکھنؤ میں "دار المبلغین" کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ دار العلوم دیوبند جیسے دینی مدارس کے باصلاحیت فارغ التحصیل فضلا کو وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی دعوت و تبلیغ اور بیرونی حملوں اور اندرونی فتنوں سے اس کی حفاظت و مدافعت اور اس کے لیے تحریر و تقریر اور مناظرہ مباحثہ کی تربیت دی جائے ــــــ

حضرت مولانا مرحوم نے اس خدمت کے لیے مجھے بھی طلب فرمایا، اور اسی سلسلہ سے اس دور میں چند مہینے میرا قیام لکھنؤ میں رہا ــــــ اس وقت مولانا کا ماہنامہ "النجم" جاری تھا۔ اس کے دفتر میں حیدرآباد (دکن) سے ایک نیا رسالہ "ترجمان القرآن"[1] آنا شروع ہوا جس کے اڈیٹر کی حیثیت سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا نام ہوتا تھا ــــــ مولانا لکھنوی مرحوم کے صاحبزادے مولوی عبد المومن فاروقی مرحوم نے جو خود بھی نوجوان صاحب قلم تھے اس کا ایک شمارہ دیکھنے کے لیے مجھے دیا، میں نے محسوس کیا کہ اس کے اڈیٹر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالیٰ نے دینی مسائل و حقائق کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سمجھانے کی غیر معمولی صلاحیت اور قدرت عطا فرمائی ہے، اس کے بعد سے میں "ترجمان القرآن" کے

---

[1] رسالہ "ترجمان القرآن" دراصل ایک دوسرے صاحب نے جو غالباً ابو محمد مصلح کے نام سے معروف تھے حیدرآباد سے جاری کیا تھا، لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا، تو انہوں نے کسی معاملہ اور معاہدہ کے ساتھ وہ مولانا مودودی کے سپرد کر دیا جن کا قیام اس زمانہ میں حیدرآباد ہی تھا، مولانا مودودی کی ادارت میں وہ شروع ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں نکلنا شروع ہوا تھا۔

ہر شمارہ کا منتظر رہنے لگا ـــــ جب وہ آتا تو مولوی عبدالمومن مرحوم مجھے پہنچاتے اور میں بڑے ذوق شوق اور اہتمام سے اُس کا مطالعہ کرتا۔

بریلی سے الفرقان کا اجراء

لکھنؤ کے اپنے اس قیام ہی کے زمانہ میں میں نے "الفرقان" جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور محرم ۱۳۵۳ھ (مارچ ۱۹۳۴ء) سے بریلی سے اُس کا اجرا ہوا ـــــ اور اب "ترجمان القرآن" اُس کے تبادلہ میں میرے پاس براہ راست آنے لگا، وہ مجھے اتنا عزیز تھا اور میں اس کا ایسا عاشق تھا کہ اُس سے پہلے پورے ایک سال کے شمارے (جو میں نے لکھنؤ میں دیکھے تھے اور میرے پاس نہیں تھے) وہ بھی میں نے "دفتر ترجمان القرآن، حیدر آباد" سے بقیمت منگوا لیے اور اس کا پورا فائل اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھا ـــــ واقعہ یہ ہے کہ ترجمان القرآن کے مطالعہ سے قلب میں مولانا مودودی صاحب کی وقعت اور ان کے ساتھ محبت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، میں اُن کو اس دور میں "متکلم اسلام" لکھتا تھا اور نجی طور پر اور الفرقان کے ذریعہ بھی "ترجمان القرآن" کے مطالعہ کی لوگوں کو ترغیب و دعوت دیتا تھا ـــــ اُس وقت "ترجمان القرآن" خالص علمی اور دینی رسالہ تھا جس میں ملک کی سیاسی تحریکات اور پولٹیکل معاملات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا، "حکومت الٰہیہ" "اقامت دین" "اسلامی نظام" یا کسی جماعت کی تشکیل و تنظیم جیسے مسائل کا بھی جہاں تک یاد ہے کوئی ذکر اُس دور میں "ترجمان القرآن" کے صفحات میں نہیں ہوتا تھا۔ ـــــ یہاں تک کہ "ترجمان القرآن" کے اجرا کے چوتھے سال ۱۹۳۷ء میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر ہندوستان میں پہلا جنرل الکشن ہوا (اُس وقت "جداگانہ انتخاب" کا طریقہ رائج تھا یعنی مسلمان نمائندوں کو صرف مسلمان منتخب کرتے تھے اور ہندو نمائندوں کو ہندو۔) اس الکشن کے نتیجہ میں ملک کے سات صوبوں میں کانگرس کو مطلق اکثریت حاصل ہو گئی اور ان صوبوں میں بلا شرکت غیرے اُس کی گورنمنٹیں قائم ہو گئیں، جن میں مسلم اکثریت کا ایک صوبہ سرحد بھی شامل تھا۔ باقی صوبوں میں بعض دوسری پارٹیوں کی شرکت

ـــــــــــــــ

[1] واضح رہے کہ کانگرس اپنے دستور اور تعامل کے مطابق ہندوستان کے سب فرقوں کی مشترک جماعت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ جیسے اکابر علماء نہ صرف اس میں شریک بلکہ اُس کے عہدہ دار تھے۔

گورنمنٹیں قائم ہو رہیں۔ یہ صوبائی گورنمنٹیں قانونی حیثیت سے زیر سایہ برطانیہ ہونے کے باوجود بڑی حد تک خود مختار تھیں۔

اس مرحلہ پر ہم جیسوں کے لیے دو حقیقتیں بالکل کھل کر سامنے آگئیں ——— ایک یہ کہ انگریزی اقتدار سے ملک کے بالکل آزاد ہو جانے کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے ——— دوسرے یہ کہ انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت میں آزادی کی تحریک جس طرح چل رہی ہے اُس کے نتیجہ میں جو آزادی حاصل ہوگی اور جو جمہوری قومی حکومت قائم ہوگی وہ ہم مسلمانوں کی آرزوؤں اور امیدوں کے مطابق نہ ہوگی بلکہ اس میں اُن کی تہذیب اور ان کے ملی تشخص کے لیے نئے نئے خطرات پیدا ہو جائیں گے۔

۳۶ء کے الکشن کے بعد ملکی سیاست پر مولانا مودودی کے مضامین

مولانا مودودی نے اُس وقت "ترجمان القرآن" میں اس موضوع پر لکھنا شروع کیا ——— یہ واقعہ ہے کہ وہ قلم کے بادشاہ ہیں ——— اُن کے یہ مضامین جن میں ہندوستان میں آنے والے انقلاب کی تصویر کشی اور مسلمانوں کے متعلق خطرات کی نشان دہی کی گئی تھی، قوتِ استدلال کے لحاظ سے بہت ہی محکم اور بڑے موثر تھے۔ راقم سطور بھی ان سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، دوسرے بہت سے مسلم اخبارات وجرائد نے بھی اپنے صفحات میں ان مضامین کو شائع کیا، یہاں تک کہ "جمعیۃ العلماء" کے اخبار "الجمعیۃ" میں بھی اُس کی پہلی دو تین قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ الفرقان میں بھی یہ مضامین برابر نقل ہوتے رہے اور یہ عاجز اُن کی تائید میں خود بھی برابر لکھتا رہا۔[1]

مولانا مودودی سے ذاتی ربط و تعلق

اسی زمانہ میں مولانا مودودی سے تعلقات بڑھے اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا ——— پھر ایک مرحلہ آیا جب ہمارے درمیان خط و کتابت سے یہ طے ہوا کہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں جو نظریات ترجمان القرآن اور الفرقان میں پیش کیے جا رہے ہیں ان کو ایک تحریک بنا کر آگے بڑھانے کے لیے عملی جدوجہد کا کوئی لائحہ اور منصوبہ بنایا جائے، مولانا مودودی نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ اب وہ اس کا عزم کر چکے ہیں اور اس کام کے لیے ریاستی علاقہ

---

[1] اس سلسلہ مضامین میں ایک مرحلہ پر مولانا مودودی نے "اعلاء کلمۃ اللہ" کو مسلمانوں کا واحد نصب العین قرار دے کر اس کے لیے مولانا آزاد مرحوم کی "حزب اللہ" کی تنظیم کے طرز پر مسلمانوں کی ایک جماعت بنانے کی اسکیم بھی پیش کی تھی۔ ۱۲۔

(حیدر آباد) چونکہ مناسب نہیں ہے اس لیے پنجاب میں ایک مقام کو اپنی سکونت اور اس کام کے مرکز کے لیے وہ تجویز کر چکے ہیں اور وہاں منتقل ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ میں فلاں تاریخ کو دہلی پہونچ رہا ہوں، اور میرا قیام محلہ چوڑی والان شمسی کالج میں ہوگا (یہ مولانا کا سسرالی مکان تھا)۔

ابھی تک سارا تعلق غائبانہ تھا، ملاقات کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں نے ان سے ملاقات اور مستقبل کے منصوبہ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرنے کے لیے دہلی کا سفر کیا ——

مودودی صاحب سے پہلی ملاقات

میں یہ بات کچھ ہی دن پہلے سن چکا تھا کہ مولانا مودودی کے ایمان افروز مضامین سے ان کے طرز زندگی کے بارے میں جو اندازہ کوئی لگا سکتا ہے ان کا طرز زندگی اس سے بہت مختلف ہے یعنی جس اسلامی زندگی کے وہ پرزور داعی ہیں خود اُن کی وہ زندگی نہیں ہے —— جن صاحب نے مجھے یہ بات بتلائی تھی وہ مولانا کے ملنے والوں میں سے تھے اور "ترجمان القرآن" کے مضامین سے متاثر اور ان کے قدردان تھے، انھوں نے بتلایا تھا کہ مودودی صاحب "محلوق اللحیہ" رہتے ہیں[1] —— مجھے یاد ہے کہ یہ سنکر مجھے حیرت و استعجاب کے ساتھ بڑا رنج اور تاسف ہوا تھا —— لیکن دہلی کی اس ملاقات سے چند ہی روز پہلے حیدر آباد ہی سے ایک بڑے قابل اعتماد ذریعہ سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب ان کی زندگی کے طرز میں ہم جیسوں کے لیے خوشگن تبدیلی شروع ہو گئی ہے اور اس اطلاع سے فی الجملہ اطمینان تھا —— بہرحال میں مولانا سے ملنے کے لیے دہلی پہنچا —— چوڑی والان میں "شمسی کالج" پہنچکر ملاقات کی —— واقعہ یہ ہے اُس وقت پہلی دفعہ مولانا کو دیکھکر طبیعت کو ایک دھکا سا لگا، کیونکہ اب بھی مولانا کی ہیئت اُس سے بہت مختلف تھی جو ہونی چاہیے تھی اور ان کی ایمان افروز تحریروں سے جس کی توقع تھی، وہ اُس وقت محلوق اللحیہ تو نہیں تھے لیکن اس لحاظ سے اُن میں بہت ہی کم تبدیلی آئی تھی —— مگر چونکہ مولانا کے مضامین سے میں بہت متاثر تھا اور ان کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا اس لیے دل کو سمجھایا کہ عملی زندگی کی اصلاح کا ابھی آغاز ہوا ہے، انشاء اللہ آئندہ یہ حالت نہیں رہے گی۔ اور مولانا کی تحریر اور زندگی میں جو مطابقت

---

[1] یہ واقعہ ۱۹۳۷ء کا ہے جبکہ "ترجمان القرآن" ۴-۵ سال پہلے سے جاری تھا اور اس کے ایمان افروز مضامین نے ہم جیسوں کو ان کا گرویدہ اور نادیدہ عاشق بنا دیا تھا۔۱۲

ہونی چاہیے وہ انشاء اللہ ہو جائیگی ——— آئندہ کے کام کے بارہ میں اسی ملاقات میں کسی قدر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

مولانا کی حیدرآباد سے دارالاسلام منتقلی اس کے کئی مہینے بعد وہ وقت آیا کہ مولانا حیدرآباد سے منتقل ہو کر پٹھان کوٹ کے قریب "دارالاسلام" نامی اس نوتعمیر بستی میں آگئے جس کو وہاں کے ایک مخلص صاحبِ خیر چودھری نیاز علی خاں صاحب نے اسی نیت سے بنایا اور وقف کیا تھا کہ اللہ کے کچھ بندے یہاں قیام کر کے دین کی کوئی ٹھوس خدمت انجام دیں[1]۔

کچھ عرصہ کے بعد مولانا مودودی صاحب نے اپنی تحریک دارالاسلام اور اپنے کام کا خاکہ "ترجمان القرآن" میں شائع کیا اور اپنے ہم خیال دوستوں کو دعوت دی کہ وہ فلاں تاریخ کو دارالاسلام میں جمع ہوں، اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ایک جماعت یا ادارہ کی باقاعدہ تنظیم و تشکیل ہو جائے۔

"دارالاسلام" اور اس کے بانی چودھری نیاز علی خاں مرحوم

[1] یہ "دارالاسلام" کوئی بسی بسائی بستی اور آبادی نہیں تھی، اس کی حقیقت بس یہ تھی کہ پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور کے قریب ایک مختصر سی بستی جمالپور کے رہنے والے چودھری نیاز علی خاں صاحب اور ان کے بھائی چودھری عبدالرحمٰن خاں نے (جو دونوں بہت نیک دل اور باتوفیق تھے اور اللہ تعالیٰ نے دنیوی دولت سے بھی خوب نوازا تھا) ہمارے اکابر میں سے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ سے عقیدت و نیازمندی کا خاص تعلق رکھتے تھے ——— ان دونوں بھائیوں نے) جمالپور کے قریب ہی اپنی جائداد کا ایک وسیع قطعہ وقف کر کے اس میں دو رہائشی مکان اور چند کوارٹر اور ایک مسجد بنوا دی تھی اور اس سب کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا، اور چاہتے تھے کہ یہاں کوئی اچھا دینی کام ہو۔ مکانات و مسجد کے اس مجموعہ کا نام ہی "دارالاسلام" تھا۔ چودھری نیاز علی خاں صاحب رسالہ "ترجمان القرآن" کے مطالعہ ہی سے مولانا مودودی صاحب سے واقف اور ان کے قدردان تھے، اسی لیے انھوں نے ان کو حیدرآباد سے وہاں آکر قیام کرنے اور وہیں سے کام کرنے کی دعوت دی تھی، اس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے مشورہ کو بھی خاص دخل تھا۔

"دارالاسلام" کے بانی چودھری نیاز علی خاں صاحب کا جب ذکر آگیا تو جی چاہتا ہے کہ ان کا کچھ مزید تعارف کرا دیا جائے۔ چودھری صاحب ایک بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ ریٹائرڈ ایک بڑے سرکاری افسر بھی تھے۔ ان کے دل میں دین کی خدمت کی بھی تڑپ تھی ——— ملک کی تقسیم کے بعد جب پورے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

تحریک دارالاسلام کے سلسلہ میں پہلا اجتماع
میری مایوسی اور معذرت

اس وقت اس عاجز کو مولانا کے بنائے ہوئے کام کے خاکہ سے اصولی درجہ میں پورا اتفاق تھا ــــــ بہرحال مقررہ تاریخ پر یہ عاجز بھی دارالاسلام پہنچا ــــــ توقع یہ تھی کہ مولانا مودودی صاحب میں تبدیلی کا جو عمل شروع ہوا تھا اب تک اس نے کافی منزلیں طے کرلی ہوں گی اور مولانا بہت بدل گئے ہوں گے، لیکن وہاں پہنچکر جب ایک دو دن مولانا کے ساتھ رہنا ہوا تو بڑے رنج کے ساتھ مایوسی ہوئی اور اندازہ ہوا کہ ابھی انھوں نے اپنے کو بدلنے کا پورا ارادہ ہی نہیں کیا ہے۔

دارالاسلام کے بانی چودھری نیاز علی خاں صاحب اس عاجز کے بارہ میں کچھ غائبانہ واقفیت رکھتے تھے، اسی موقع پر ان سے پہلی ملاقات ہوئی، انھوں نے بھی مولانا کے بارہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے تخلیہ کا فیصلہ ہوگیا تو چودھری صاحب بھی پاکستان منتقل ہوگئے، وہاں بھی انھوں نے "جوہر آباد" میں "دارالاسلام" ہی کے طرز کی ایک بستی بنائی۔ راقم سطور محمد منظور نعمانی اور رفیق محترم مولانا علی میاں کو برابر خطوط لکھتے رہے کہ آپ دونوں کی یہاں ضرورت ہے اور یہاں کام کا میدان ہے، میں نے آپ کے لیے پورے انتظامات کرلیے ہیں۔ (یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کے مسلمان برابر پاکستان جارہے تھے) آخر میں چودھری صاحب نے دستی خط دیکر ایک آدمی بھیجا اور تفصیل سے لکھا کہ آپ لوگوں کے لیے یہاں یہ یہ انتظامات کرلیے گئے ہیں، آپ دونوں مع اہل و عیال کے چلے آئیں ــــــ اس آخری دستی خط کے جواب میں اس عاجز نے چودھری صاحب کے اخلاص کا اعتراف اور حسن ظن اور عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ ہم نے متوکلاً علی اللہ طے کرلیا ہے کہ جب تک ہندوستان میں کچھ بھی مسلمان ہیں ہم ان کی خدمت کے لیے یہیں رہیں گے۔ چودھری صاحب کی عمر تقسیم کے وقت اسّی سے متجاوز رہی ہوگی لیکن ہمت کے جوان تھے، پاکستان پہنچنے کے بعد بھی مدت تک حیات رہے اور دین کی فکر اور خدمت کی دھن ان کے ساتھ رہی ــــــ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے ــــــ نعمانی

میں فکرمندی کے ساتھ اسی احساس و تاثر کا ذکر کیا جو میرا تھا (چودھری صاحب خود متشرع اور خوش اوقات تھے)

مولانا مودودی کی دعوت پر باہر سے آنے والوں میں میرے علاوہ چند حضرات اور بھی تھے (ان سب کی تعداد دس سے کم ہی رہی ہو گی[1]) اگلے دن جب وہ وقت آیا کہ سب ایک جگہ بیٹھ کر جماعت یا ادارہ کی تشکیل کریں تو میں نے ذرا دیر پہلے تنہائی میں مولانا سے کہا کہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں آیا تو اسی ارادہ سے تھا کہ اس کام میں آپ کا رفیق بنوں گا لیکن یہاں آکر مجھ میں تذبذب پیدا ہو گیا ہے اور میں نے مناسب سمجھا کہ میں پہلے ہی آپ کو بتلا دوں کہ اس وقت جو ادارہ یا جماعت بنے گی میں اس میں باضابطہ شرکت نہیں کر سکوں گا، لیکن آپ کے مقصد اور آپ کی دعوت سے مجھے اتفاق اور ہمدردی ہے۔

مودودی صاحب بڑے ذہین آدمی ہیں، انھوں نے سمجھ لیا کہ کیا چیز میرے لیے رکاوٹ بنی ہے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کے اس تذبذب اور تردد کی وجہ سمجھتا ہوں، اصل بات یہ ہے کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے کہ میں کس دنیا کا آدمی تھا اور کہاں سے چلکر آرہا ہوں، آپ چاہتے ہیں کہ میں ایک دم بدل جاؤں۔ آپ جو کچھ چاہتے ہیں انشاء اللہ رفتہ رفتہ وہ ہو جائے گا، اس لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی رائے پر نظر ثانی کریں، آپ کے انکار کر دینے سے اور بعضوں پر بھی اثر پڑے گا — میں نے عرض کیا کہ شرکت کے فیصلہ کے لیے جس قلبی اطمینان کی ضرورت ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے اندر وہ اطمینان نہیں پاتا۔ اس لیے مجبور ہوں، حالانکہ مجھے اپنے شریک نہ ہونے سے دکھ اور افسوس ہے۔ اگر آئندہ اللہ نے مجھے اطمینان نصیب فرما دیا تو میں انشاء اللہ آپ کے ساتھ باضابطہ بھی شریک ہو جاؤں گا، لیکن ضابطہ کی شرکت کے بغیر تعاون یوں بھی کروں گا — اور دوسروں پر اثر پڑنے کی مشکل کا یہ حل ہو سکتا ہے کہ میں مجلس میں اپنے اس تذبذب یا انکار کا پہلے اظہار نہ کروں

---

[1] یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت ہندوستان یا پاکستان میں "جماعت اسلامی" میں جو سرکردہ حضرات ہیں جہاں تک خیال ہے اُن میں سے کوئی بھی مولانا مودودی کے دار الاسلام میں بلائے ہوئے اس پہلے مختصر اجتماع میں شریک نہیں تھا، ممکن ہے یہ حضرات اُس وقت تک مولانا مودودی سے واقف بھی نہ ہوئے ہوں ——— واللہ اعلم

بلکہ خاموش رہوں ——— چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا۔ دوسرے حضرات جب مجلس میں اپنی رائے ظاہر کر چکے، ادارہ کی رکنیت قبول کرنے والے اپنی منظوری دے چکے اور معذرت کرنے والے معذرت کر چکے تو سب سے آخر میں میں نے اپنے متعلق بتایا کہ میں اس وقت رکنیت کا فیصلہ نہیں کر سکا ہوں، ابھی مزید غور کروں گا۔

یہاں میں یہ واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میرے توقف یا انکار کی وجہ میرا یہ خیال تھا کہ اتنے اونچے دعووں کے ساتھ، جو دینی جماعت یا ادارہ بنے اور اتنے اعلیٰ نصب العین کا دنیا کے سامنے اعلان کرے (جس کا تحریک کے خاکہ میں ذکر کیا گیا تھا) اگر اس کے قائد کی زندگی اس دعوت سے ضروری درجہ کی بھی مطابقت نہ رکھتی ہو تو اولاً تو وہ چلے گی نہیں، اور قلم کی طاقت کے بل پر کچھ چلی بھی تو اس کے ذریعے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی حالانکہ اس راہ کا بنیادی کام یہی ہے کہ مسلمانوں میں از سر نو ایمانی روح پھونکی جائے اور ان کی زندگی میں دینی انقلاب برپا کیا جائے جیسا کہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ اور اُن کے رفقاء نے کیا تھا۔

یہ ادارہ جو "دارالاسلام" کے احاطہ میں بیٹھ کر بنایا گیا تھا اس کا نام "ادارۂ دارالاسلام" تھا۔ مولانا مودودی اس کے صدر یا امیر تھے اور اُن کے علاوہ صرف چار حضرات رکن بنے تھے۔[۱]

چند ہی مہینوں کے بعد مولانا نے دارالاسلام سے لاہور منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ کا اصلی سبب، جیسا کہ اُس وقت مجھے معلوم ہوا تھا مولانا مودودی کے بارے میں بانیٔ دارالاسلام چودھری نیاز علی خاں صاحب اور چودھری عبدالرحمٰن صاحب کے کچھ اسی قسم کے احساسات تھے جو میرے لیے "ادارۂ دارالاسلام" کی شرکت کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بہرحال مولانا لاہور منتقل ہو گئے اور ترجمان القرآن وہیں سے شائع ہونے لگا ——— کچھ عرصہ کے بعد مولانا نے غالباً دینیات کے پروفیسر یا لیکچرر کی حیثیت سے لاہور کے اسلامیہ کالج سے بھی تعلق قائم کر لیا۔ اس تمام عرصہ میں مولانا سے میرا ذاتی تعلق علیٰ حالہ رہا۔ اور

---

[۱] ان میں رسالہ ترجمان القرآن کے باتنخواہ منیجر بھی تھے جو سب سے زیادہ جوشیلی اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے تھے، بعد میں بہت غلط آدمی ثابت

اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خط و کتابت بھی جاری رہی ـــــ مجھے یاد آتا ہے ایک خط میں مولانا نے مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ کالج سے تعلق انھوں نے کس وجہ سے قائم کرنے کا فیصلہ کیا ـــــ جہاں تک اب یاد ہے کالج سے مولانا کا یہ تعلق تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ختم ہو گیا تھا جس کی تفصیل میرے علم میں نہیں ـــــ

"ادارۂ دار الاسلام" کا ذکر کچھ عرصہ کے بعد ترجمان میں بھی آنا بند ہو گیا، پھر یا تو خود مولانا کے کسی خط سے یا کسی اور ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ مولانا اس کام کے آگے بڑھنے سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب اس کی دعوت کا سلسلہ جاری نہیں ہے۔

خود میرا حال اس عرصہ میں یہ رہا کہ "ادارۂ دار الاسلام" کی تشکیل کے وقت دو، تین دن مولانا کے ساتھ رہ کر ان کے بارہ میں تو ذہن نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اچھا سوچنے اور بہترین لکھنے والا تو بنایا ہے لیکن دینی انقلاب کی مقدس مہم کے چلانے کے لیے جو صفات اور جو زندگی چاہیے اس سے مولانا بہت دور ہیں اور بظاہر ان صفات اور اس کی زندگی کے حاصل کرنے کا ان میں کوئی خاص داعیہ اور ارادہ بھی نہیں ہے، اس لیے مولانا کی طرف سے تو میں اس معاملہ میں بالکل مایوس ہو گیا، لیکن ان کی تحریروں اور اپنے غور و فکر سے اس وقت جس قسم کی دینی جد و جہد کو میں نے ضروری سمجھ لیا تھا میں محسوس کرتا تھا کہ اس کا تقاضا روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

لیکن خود اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا اپنے نزدیک پورا دیانتدارانہ جائزہ لے کر میں اپنے بارہ میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس قسم کے کسی کام میں خود قائد اور علمبردار بننے کے لائق نہیں ہوں، ہاں اگر کہیں ایسا کام شروع ہو تو انشاء اللہ میں اس کا ساتھ دینے والا ایک سپاہی بن سکتا ہوں، اس لیے میں چاہتا تھا کہ اللہ کا کوئی بندہ یا کچھ بندے جو اہل ہوں وہ اس طرح کا کوئی کام کریں تو میں ان کے ساتھ لگ جاؤں

یہی زمانہ تھا کہ مولانا علی میاں کی "سیرت سید احمد شہید" پہلی دفعہ چھپی۔ انھوں نے ازراہ عنایت اس کا ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا۔ خوب یاد ہے کہ اسے پڑھ کر اندر اک آگ سی بھڑک گئی ـــــ میں نے اسی وقت مولانا علی میاں کو لکھنؤ کے پتہ پر خط لکھا ـــــ جہاں تک

اب یاد ہے اس میں کتاب سے متعلق اپنا تاثر ظاہر کیا تھا اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ مجھے صفائی سے بتلایئے کہ آپ نے بس یہ کتاب ہی لکھنے کا ارادہ کیا تھا جو لکھی گئی، یا وہ کام بھی کرنے کا ارادہ ہے جس کا یہ کتاب تقاضا کرتی ہے؟ ——— اگر یہ دوسری بات ہے تو میں آپ سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو کوئی مجبوری نہ ہو تو قریبی فرصت میں یہاں بریلی ایک دو دن کے لیے تشریف لے آئیں، اور اگر آپ کسی وجہ سے اس وقت نہ آسکتے ہوں تو مجھے جو ایسی مطلع فرما دیں میں انشاء اللہ خود آجاؤں گا۔

اس خط کا جواب مجھے مولانا نے اپنے وطن رائے بریلی سے دیا اور لکھا کہ میں اس وقت یہاں گھر پر مقیم ہوں اور فلاں وجہ سے اس وقت سفر سے معذور ہوں، آپ خود ہی یہاں آجائیں ——— میں ممکنہ عجلت سے روانہ ہو گیا اور رائے بریلی پہنچ گیا۔

یہاں اس کا ذکر کر دینا مناسب ہو گا کہ مولانا علی میاں بھی مولانا مودودی کے "ترجمان القرآن" کے مضامین سے میری ہی طرح متاثر تھے اور اس لحاظ سے ہم دونوں کے خیالات اور جذبات میں پوری ہم آہنگی تھی ——— رائے بریلی پہنچکر تفصیل سے گفتگو ہوئی، مولانا مودودی کا اور اُن کے مضامین کا جو انھوں نے "آنے والے انقلاب" کے متعلق لکھے تھے اور جنھوں نے ہم دونوں کو بہت متاثر کیا تھا خاص طور سے ذکر رہا۔ غالباً اسی ملاقات اور صحبت میں میں نے "ادارۂ دارالاسلام" کی تاسیس کے سلسلہ میں اپنے پٹھان کوٹ کے سفر اور مولانا مودودی صاحب سے متعلق اپنے اندازہ اور احساسات کا بھی ذکر کیا۔

بہر حال ہم دونوں اس پر متفق ہو گئے کہ اس وقت کے خاص حالات کے مطابق دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جو کچھ ہو سکے وہ ہم کو کرنا چاہیے اور بنام خدا اس کا آغاز کر دینا چاہیے۔ ——— ابتدائی کام اور اس کے طریقہ کار کے بارہ میں بھی کچھ اصولی باتیں ہوئیں ——— پہلا مرحلہ یہ تھا کہ ہم خیال مخلصین کی ایک جماعت بنے، میں نے مولانا علی میاں سے کہا کہ پہلے ہمیں ایک ایسی شخصیت تلاش کر لینا چاہیے جو اپنے کو پوری طرح اس کام کے لیے وقف کر دے، اس کی حیثیت امیر کی ہو اور اس میں دو چیزیں کم از کم

بقدر ضرورت موجود ہوں جو ایسی جماعت کے امیر میں ہونی چاہئیں۔ مولانا علی میاں سے میں نے کہا کہ اپنے متعلق میں پہلے ہی عرض کیے دیتا ہوں کہ اپنے کو خوب جانچ تول کے میں اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں ——— اب آپ اپنے بارہ میں صاف طور سے بتائیں کہ آپ یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں؟ ——— مولانا نے بھی اس سے معذوری ظاہر کی اور اس کی وجوہات بتلائیں ——— اسی گفتگو میں بعض اور ایسے حضرات کا بھی ذکر آیا جن سے اس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ——— پھر ہم دونوں نے اس سلسلہ میں متعدد سفر بھی کیے۔ لیکن اُس وقت کے اپنے خیالات و جذبات کے مطابق کوئی اجتماعی کام شروع نہیں کیا جا سکا ——— یہاں یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ میں اس وقت تک حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تبلیغی کام سے واقف نہیں تھا، اگر واقف ہوتا تو ممکن تھا کہ اُس سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کر لیتا۔

یہ واقعات جن کا اوپر کی سطروں میں ذکر آیا غالباً ۳۸ء اور ۳۹ء کے ہیں ———
اس زمانہ میں باشعور مسلمانوں کے جذبات میں عام طور سے ایک تلاطم برپا تھا اور ایسے کسی کام کے لیے زمین خاصی تیار تھی اس لیے اس وقت طبیعت اس کے لیے سخت بے چین تھی کہ ایسا کوئی کام شروع ہو ——— اور در اصل دل کی زمین میں اس کا تخم تحریک خلافت کے زمانہ میں پڑ چکا تھا۔

دوسری جنگ عظیم پھر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی تو اس وقت یہ بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ کیونکہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ جنگ دنیا کے اور قوموں کے نقشوں میں غالباً بڑی بڑی تبدیلیوں کا ذریعہ بنے گی۔

جنگ شروع ہو جانے کے بعد سے مولانا مودودی نے "ترجمان القرآن" میں جو مضامین مسلسل ہندوستانی تحریکات اور مسلمانوں کے نصب العین کے متعلق لکھے انھوں نے اس داعیہ کو اور بھی تیز کیا اور اس بے چینی کو اور آگے بڑھایا، پھر ان مضامین ہی کی آخری قسطوں سے معلوم ہوا کہ مولانا اب پھر کوئی جماعت اس کام کے لیے بنانا چاہتے ہیں، جس کی وہ دعوت

دے رہے ہیں۔ —— اس سلسلہ میں اُن کا ایک اہم مضمون جماعت کی تاسیس سے کچھ ہی پہلے "ترجمان القرآن" سے نقل ہو کر رجب ۱۳۵۹ھ کے الفرقان میں بھی شائع کیا گیا تھا، اس کا عنوان تھا —— "دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور ہمارا فرض کیا ہے" —— یہ مضمون گویا جماعت اسلامی کی تاسیس کی تمہید تھا —— تقریباً اُسی زمانہ میں اس عاجز نے بمبئی کے دوستوں کی دعوت پر وہاں کا سفر کیا تھا اور وہاں مسلسل ۸-۱۰ تقریریں کی تھیں، ان تقریروں کا موضوع اور مرکزی نقطہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور اسلامی انقلاب کے لیے ایک منظم تحریک کی دعوت تھی —— مجھے اعتراف ہے کہ اُس زمانہ میں مولانا مودودی سے بس اتنا متاثر تھا کہ انہی کی اصطلاحوں اور انہی کی زبان میں بولتا تھا۔ مثلاً اسلام کو ایک "انقلابی تحریک" کہتا تھا —— بمبئی کی میری تقریریں مرتب ہو کر پہلے الفرقان میں اور پھر "خطبات بمبئی" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئی تھیں —— ان تقریروں کو بھی میری طرف سے جماعت اسلامی کی تمہید کہا جاسکتا ہے —— میرا حال اس زمانہ میں یہ تھا کہ مودودی صاحب کی صرف تعبیرات ہی کو نہیں بلکہ ان کے خاص افکار و نظریات کو بھی میرا ذہن اکثر بغیر کسی تنقید کے اپنا لیتا تھا، اُسی دور میں الفرقان کا "شاہ ولی اللہ نمبر" شائع ہوا تھا، مولانا مودودی صاحب نے میری فرمائش پر اسی کے لیے وہ مضمون یا مقالہ لکھا تھا جو بعد میں رسالہ "تجدید و احیائے دین" کے نام سے الگ بھی شائع ہوا اور جماعت اسلامی کے بنیادی لٹریچر میں شامل ہے —— اگرچہ اُس وقت بھی میرے ذہن نے اس کی بعض باتوں کو قبول نہیں کیا تھا، لیکن جہاں تک اب یاد ہے میں اس کو اُس وقت مجموعی حیثیت سے ایک بصیرت افروز تحقیقی مقالہ سمجھتا تھا، اور عام اشاعت کی نیت سے اس کو "شاہ ولی اللہ نمبر" سے الگ مستقل رسالہ کی شکل میں بھی چھپوایا تھا۔

انھیں دنوں میں میرا لاہور کا ایک سفر ہوا، بعض دوست جو میری ہی طرح مولانا مودودی سے خاص تعلق رکھتے تھے اور ان کے مضامین اور ان کی دعوت سے کافی متاثر اور دینی دعوت کا کام شروع ہونے کے لیے بے چین تھے۔ مولانا کے قریب لاہور ہی میں انھوں نے قیام اختیار کر لیا تھا، انھیں یہ بات کسی درجہ میں معلوم تھی کہ میں مولانا مودودی سے ذاتی دوستانہ

تعلق رکھنے اور ان کی دعوت اور ان کے اُس وقت کے موقف سے اصولی طور پر متفق ہونے کے باوجود موصوف میں کوئی کمی محسوس کرنے کی وجہ سے "ادارۂ دار الاسلام" کی تشکیل کے وقت اس کی رکنیت قبول نہیں کر سکا تھا ——— بہرحال جب میں لاہور پہنچا تو ان دوستوں نے مجھ سے باتیں کیں اور اس سلسلہ گفتگو میں مجھے یہ بھی بتایا کہ مولانا کی زندگی میں اب کافی تبدیلی آگئی ہے اور ہمارے نزدیک اب جماعت بنا کر کام شروع کر دینے کا وقت آگیا ہے۔

میں جیسا کہ اوپر تفصیل سے لکھ چکا ہوں، قریباً دو سال سے اس بے چینی میں مبتلا تھا اور مختلف کوششوں کے باوجود ایسا دینی کام جیسا کہ میں اُس وقت چاہتا تھا کہیں شروع نہیں ہو سکا تھا اس لیے میں پھر کچھ آمادہ ہو گیا، پھر بھی میں نے مزید اطمینان کے لیے مولانا مودودی سے کچھ باتیں کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ جب اُن سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے آپ ہی کے متعلق تنہائی میں کچھ باتیں کروں گا۔ وہ اس کے لیے بخوشی تیار ہو گئے۔ میں نے اُن سے صاف کہا، آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی رائے سے بہت بڑی حد تک اتفاق اور آپ کے ساتھ گہری ذاتی محبت اور تعلق کے باوجود میں ادارۂ دار الاسلام کی تشکیل کے وقت رُکن بننے سے کیوں رُک گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ تو صحیح ہے کہ ہم میں سے معصوم کوئی بھی نہیں ہے۔ اور کسی دینی کام کے لیے کسی معصوم یا کامل ترین شخصیت کا انتظار کرنا غلط ہے۔ لیکن مجھے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے جس قسم کا کام ہم آپ شروع کرنا چاہتے ہیں اس کے قائد کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی زندگی اس کی دعوت سے مطابقت رکھتی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو دعوت کے ساتھ نہ تو اللہ کی نصرت ہوگی اور نہ لوگ اس سے متاثر ہوں گے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اس پورے عرصہ میں اس قسم کے کام کے لیے میں بے چین رہا ہوں اور آپ سے مایوس ہونے کے بعد میں نے اس کے لیے مختلف کوششیں کیں، لیکن کوئی کام شروع نہیں ہو سکا۔ اب مجھے ترجمان القرآن سے بھی معلوم ہوا تھا، اور یہاں رہنے والے میرے آپ کے دوستوں نے بھی بتایا ہے کہ اب پھر اس مقصد اور اس دعوت کے لیے جماعت بنانے کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔ میں اپنے بارے کیا

فیصلہ کرنے کے لیے آپ کے متعلق کچھ معلومات خود آپ سے ہی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا آپ یہ کیوں فرض کرتے ہیں کہ جماعت کا قائد میں ہی بنوں گا۔ آپ کسی ایسے کو سوچیے جو آپ کے نزدیک اہل ہو۔ میں کہتا ہوں کہ آپ ہی اس ذمہ داری کو کیوں نہ قبول کریں۔ میں نے کہا جہاں تک میری ذات کا سوال ہے میں اپنے آپ کو خوب تول کر یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں ایسی کسی جماعت کی قیادت کا ذمہ دار بننے کے لائق نہیں ہوں، اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک میں میدان میں خود کود چکا ہوتا۔ اس لیے اس امکان پر بحث نہ کیجیے، کوئی اور آدمی بھی میری نظر میں نہیں ہے۔ بلکہ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ گذشتہ دو برسوں میں میں نے اس کی کوشش کی کہ کوئی اللہ کا بندہ جو اس کا اہل ہو وہ کھڑا ہو جائے لیکن میں ناکامیاب رہا۔ اس لیے ہوگا یہی کہ اگر آپ کوئی جماعت بنائیں گے تو اس کے قائد یا امیر آپ ہی ہوں گے۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کے بارے میں خود آپ سے کچھ صاف صاف باتیں کر لوں۔

اس کے بعد میں نے مولانا سے چند سوالات کیے ان میں کے جو یاد ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ میں نے پوچھا مجھے صفائی سے بتائیے کہ احکام شریعت کے بارے میں اس وقت آپ کا طرزِ عمل کیا ہے؟

انھوں نے بتایا میں اپنے امکان کی حد تک احکام شریعت کی پابندی کرتا ہوں اور کرنا چاہتا ہوں۔

۲۔ پھر میں نے اُن سے کہا یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ تقلید شخصی کو ضروری نہیں سمجھتے لیکن میرا خیال ہے کہ فتنوں کے اس زمانہ میں یہ آپ بھی ضروری سمجھتے ہوں گے کہ جس مسئلہ پر ائمہ اربعہ متفق ہوں اس کے خلاف نہ کیا جائے؟

انھوں نے کہا کہ ہاں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں اور اس سے خروج کو جائز نہیں سمجھتا۔

۳۔ (اُس زمانہ تک بھی مولانا کی داڑھی بہت مختصر سی تھی۔ اور سر پر انگریزی وضع کے بال بھی رہتے تھے) میں نے دوستانہ بے تکلفی کے ساتھ ان کی داڑھی کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا کہ ایسی ڈاڑھی رکھنا آپ کے نزدیک جائز ہے؟۔ مولانا نے فرمایا۔ ہاں میں حرام

یا ناجائز نہیں سمجھتا۔ البتہ خلاف اولیٰ سمجھتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ داڑھی اتنی ہونی ضروری ہے کہ دور سے نظر آئے۔ اور بقدر یک مشت سنت ہے۔

میں نے عرض کیا کہ کتب فقہ میں تو بقدر یک مشت کو واجب لکھا ہے۔ اور جو لوگ اس سے چھوٹی رکھتے اور کترواتے ہیں ان کے اس طرز عمل کو ناجائز کہا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے۔ میں نے اُس وقت فتح القدیر اور در مختار وغیرہ کی یہ عبارت جو اُس وقت بھی زبانی یاد تھی پڑھ کر سُنائی " واما ما یفعلہ بعض المغاربۃ و مخنثۃ الرجال من قصھا وھی دون القبضۃ فلم یبحہ احد"[1]

مولانا نے فرمایا " لیکن فقہ حنبلی کی کتاب "مُغنی" میں تصریح ہے کہ اس سے کم رکھنا بھی جائز ہے " میں نے عرض کیا میں نے مغنی نہیں دیکھی اس لیے اُس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ایک اُصولی بات یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر عام فقہا و مجتہدین ایک فعل کو ناجائز کہتے ہوں۔ اور کسی کتاب میں کوئی قول اس کے جواز کا بھی ہو اور اُس کے کرنے میں کوئی شرعی مصلحت بھی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ تقویٰ اور احتیاط کا تقاضا یہی ہوگا کہ اس سے بچا جائے ——— علاوہ ازیں صحاح کی جن حدیثوں میں داڑھی رکھنے کا حکم بصیغۂ امر دیا گیا ہے اُن میں دو لفظ آتے ہیں ایک " اَعْفُوا اللُّحیٰ" اور دوسرا " اَرْخُوا اللُّحیٰ" " اَعْفُوا " اور " اَرْخُوا " کے جو مصدر ہیں یعنی " اِعفا " اور " ارخاء " عربی لغت کی رو سے یہ فی الجملہ درازی اور بڑھوتری کو چاہتے ہیں، فقہا نے غالباً صحابہ کے طرز عمل سے یہ سمجھا ہے کہ اگر قریباً ایک مشت داڑھی رکھی جائے تو ان لفظوں کا مطالبہ پورا ہو جائے گا۔ پس فقہ کی تصریحات سے تھوڑی دیر کے لیے صرف نظر کر کے بھی اگر آپ غور فرمائیں تو اتنا آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ صرف اتنی داڑھی رکھنے سے جو بقول آپ کے بس دور سے نظر آئے ان لفظوں کا مطالبہ پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ ان الفاظ کا صاف تقاضہ یہ ہے کہ داڑھی کو کچھ لمبا، بڑھا ہوا اور

---

[1] مطلب یہ ہے کہ بعض اہل مغرب اور مخنث لوگوں کا یہ طرز عمل کہ داڑھی ایک مشت سے کم رکھتے اور کترواتے ہیں۔ یہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔ (یہاں اہل مغرب سے مراد مراکش، تونس وغیرہ مغربی عرب ملکوں کے لوگ ہیں)

لٹکا ہوا ہونا چاہیے اور آپ کی موجودہ ڈاڑھی بہت چھوٹی ہے۔ اس لیے میرے نزدیک حدیث کی رو سے بھی اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مجھے یاد ہے، مولانا نے میری یہ بات سن کر کچھ دیر خاموشی سے غور کرنے کے بعد فرمایا۔ میں نے اس مسئلہ پر اس طرح اور اس پہلو سے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ آپ کی بات صحیح ہے اور مجھے اس کی اصلاح کر لینی چاہیے۔

اس کے بعد میں نے مولانا کے بالوں کی طرف اشارہ کر کے اسی دوستانہ انداز میں کہا کہ کیا اس طرح کے بال رکھنے میں آپ کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے؟ —— مولانا نے فرمایا کیا یہ آپ کے نزدیک "قَزَع" ہے جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے، میں نے کہا میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ "قزع" ہے لیکن یہ کہتا ہوں کہ اس طرح کے بال رکھنا صالحین کے طریقے کے خلاف اور غیر صالحین کا طریقہ ہے، اور خاص کر جو لوگ دین اور شریعت کی پابندی کے داعی ہوں ان کے لیے ایسی چیزوں کی بالکل گنجائش نہیں ہے —— اس پر بھی مولانا نے فرمایا کہ یہ بات بھی آپ کی ٹھیک ہے میں اس کی بھی اصلاح کر لوں گا [1] ——

اس صحبت میں مولانا سے میں نے ان کے ذاتی حالات سے متعلق بعض اور باتیں بھی دریافت کیں اور انھوں نے بے تکلف جواب دیا۔

---

[1] یہاں افسوس کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار بھی اب ضروری ہو گیا ہے کہ اس گفتگو کے بعد بھی کم از کم ۴۔۵ مہینے تک (جب تک کہ "جماعت اسلامی" کا دوسرا شاورتی اجلاس لاہور ہی میں ہوا جس کا ذکر آگے آرہا ہے) مولانا نے دونوں چیزوں (ڈاڑھی اور سر کے بالوں) میں سے کسی کی بھی اصلاح نہیں فرمائی، قریب قریب وہی حال رہا جو میری اس گفتگو کے وقت تھا، چنانچہ اجلاس کے موقع پر میں نے مولانا امین احسن صاحب کو متوجہ کیا کہ وہ ان امور کے بارہ میں گفتگو کریں، مولانا موصوف نے گفتگو کی جس کا ذکر آگے آرہا ہے —— اور خدا کا شکر ہے کہ بالآخر مولانا مودودی صاحب نے ان دونوں چیزوں کی اصلاح فرمالی —

یہاں یہ بات بھی رنج اور دکھ کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ اب سے ۲۴ سال پہلے جب الفرقان میں اپنی اس سرگزشت کے ضمن میں راقم سطور نے مولانا مودودی صاحب کے ساتھ اپنی اس گفتگو کا ذکر کیا تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ساری گفتگو نہایت دوستانہ اور مخلصانہ فضا میں ہوئی۔

اس کے بعد میں نے اپنا اطمینان ظاہر کر کے مولانا سے کہا کہ اب آپ کوئی تاریخ مقرر کر کے جماعت کی تشکیل کے لیے ہم خیالوں کو دعوت دیجیے! ـــــ یاد آتا ہے کہ غالباً اُس وقت میرے مشورہ ہی سے تاریخ مقرر ہوئی اور دعوت دی گئی۔

مقررہ تاریخ پر ہم خیال حضرات اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے اور "جماعت اسلامی" کی تشکیل عمل میں آئی (یہ شعبان ۶۰ھ (اگست ۱۹۴۱ء) کا مہینہ تھا) یہ ناچیز اس وقت پورے اطمینان کے ساتھ اس میں شریک ہوا تھا اور جماعت کی امارت کے لیے مولانا مودودی صاحب کا نام میں نے ہی پیش کیا تھا اور اس موقع پر یہ وضاحت کی تھی کہ جماعت کے امیر میں جو صفات ہونی چاہئیں خدا کے فضل سے وہ سب ان میں موجود ہیں اور اس لحاظ سے جماعت کے تمام موجودہ ارکان میں وہ مجموعی حیثیت سے فائق و ممتاز ہیں، ان کی علمی اور فکری بلندی کا تو میں پہلے ہی قائل تھا ـــــ تقویٰ کہیے یا اتباع شریعت، اس بارہ میں اُن کی اس گفتگو سے میں نے اپنے دل کو مطمئن کر لیا تھا جو چند روز پہلے ہوئی تھی (جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے) ـــــ اس تاسیسی اجتماع میں میرا جو حصہ رہا اُس کا ذکر غالباً اجتماع کی روداد میں بھی کیا گیا تھا، یاد آتا ہے کہ یہ اجتماع میری دعا پر ختم ہوا تھا۔ اور میں صرف رکن نہیں تھا بلکہ مجھے نائب امیر بھی بنایا گیا تھا[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو "جماعت اسلامی" کے مجاہدین قلم نے اس "گستاخی" اور "جہالت" پر میری خوب خبر لی تھی کہ اقامت دین کی مقدس تحریک کے سلسلہ میں میں نے ڈاڑھی کی مقدار اور انگریزی فیشن کے بالوں جیسے مسائل اٹھائے تھے ـــــ اس کے بارے میں جو کچھ ان مجاہدین سے اور جماعت کے ذمہ داروں سے عرض کرنا مناسب سمجھا گیا تھا عرض کر دیا گیا تھا، لیکن اس وقت اس سلسلہ میں یہ مزید عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ ظلوم و جہول اپنے رب کریم کے اس کرم و احسان کا دل و زبان اور قلم سے شکر گزار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کے اس رو یہ ہی کو مولانا کی ڈاڑھی اور بالوں کی اصلاح کا ذریعہ بنا دیا اور الحمد للہ بالآخر مولانا کی ڈاڑھی ہندوستان و پاکستان کے علماء کی سی خوبصورت، مولویانہ ڈاڑھی ہو گئی اور بالوں کی بھی اصلاح ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے تمام محبین و متبعین کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[1] میرے علاوہ مختلف علاقوں کے تین حضرات اور بھی نائب امیر بنائے گئے تھے، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مولانا جعفر ندوی پھلواروی، مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری مدراسی۔

اجتماع سے واپس آکر الفرقان کے شوال کے شمارہ میں میں نے ـــــ "ایک دینی تحریک کا تعارف" کے زیرِ عنوان ایک طویل مضمون لکھا جس میں پوری تفصیل سے اس اجتماع اور جماعت اسلامی کی تاسیس و تشکیل کا تذکرہ کیا اور اس کے مقصد و نصب العین اور دعوت و طریق کار کی وضاحت کی ـــــ اس مضمون میں میں نے جماعت کا دستور بھی پورا لفظ بہ لفظ شامل کیا تھا، بعض خاص نکات اور خاص کر امیر کی حیثیت سے متعلق مولانا مودودی صاحب کی تقریروں کے طویل طویل اقتباسات بھی نقل کیے تھے ـــــ آخر میں "بعض شکوک و شبہات اور ان کے جوابات" ـــ کے عنوان سے راقم سطور نے ایک مستقل مضمون لکھا تھا جس میں جماعت اور مولانا مودودی صاحب کی ذات سے متعلق ان تمام اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جواب دیا گیا تھا جو اس وقت تک سامنے آئے تھے یا جن کا اندیشہ تھا ـــــ اپنے نزدیک اس عاجز نے اپنے اس مضمون میں انتہائی دلسوزی و درد مندی کے ساتھ پوری قوت و اعتماد کے ساتھ عام مسلمانوں اور بالخصوص خواص امت کو جماعت میں شرکت یا کم از کم تعاون کی دعوت دی تھی ـــــ یہ مضمون (ایک دینی تحریک کا تعارف) "الفرقان" کے ۳۵ صفحات پر آیا تھا۔ اور الفرقان ہی کے حوالہ سے اُس کو مولانا مودودی صاحب نے "ترجمان القرآن" میں بھی شائع کیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ "جماعت اسلامی" کی ایسی مکمل اتنی مدلل دعوت کی وضاحت اُس وقت تک خود مولانا مودودی صاحب کے قلم سے "ترجمان القرآن" میں بھی نہیں آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس زمانہ میں جماعت کی دعوت و وکالت کے جذبہ سے سرشار تھا، جہاں جانا ہوتا اور جس مجلس میں بات کرنے کا اتفاق ہوتا اکثر یہی میری گفتگو کا موضوع ہوتا، حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میرے بعض دینی اکابر کو میرا یہ اقدام ناپسند ہے لیکن میں اپنے اقدام کو بالکل صحیح اور اپنے ان اکابر کو یہ خیال کر کے معذور سمجھتا تھا کہ اُن کے سامنے وہ صورتِ حال، اور وہ پوری بات نہیں ہے جو میرے سامنے آگئی ہے۔

پھر شوال کے اس شمارہ کے بعد ذیقعدہ و ذی الحجہ کے مشترک شمارہ میں بھی جماعت سے متعلق کیے جانے والے سوالات اور شکوک و شبہات کے جواب ہی میں ایک اور مستقل مضمون

لکھا اس کا عنوان تھا — "کچھ جماعت اسلامی سے متعلق" یہ ۱۱ صفحے کا مضمون تھا — بہرحال جماعت کی تاسیس کے بعد سے "الفرقان" مولانا مودودی صاحب کے "ترجمان القرآن" ہی کی طرح "جماعت اسلامی" کا آرگن ہو گیا، اُس وقت الحمد کی یہی دعوت تھی اور یہی اس عاجز کی زندگی کا موضوع —

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جماعت کی تاسیس کے کئی مہینے بعد مولانا نے مجھے ایک خط کے ذریعہ یہ خوشخبری سنائی کہ مولانا محمد علی کاندھلوی صاحب[1] نے بھی "جماعت" کی رکنیت قبول کر لی ہے اور بڑے جذبہ سے آئے ہیں، راقم سطور کو اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ مولانا موصوف ہمارے حلقہ (جماعت دیوبند) کے ایک معروف عالم دین تھے اور اس دور میں اس عاجز کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ہماری جماعت، "جماعت اسلامی" کی دعوت کو اپنا لے — لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا مودودی صاحب کی تحریریں پڑھ کر اُن کے ذہن میں کچھ اعتراضات اور خدشات پیدا ہونے لگے، اس سلسلہ میں انھوں نے مولانا مودودی صاحب سے خط و کتابت کی، مجھے بھی کئی صفحے کا ایک طویل خط لکھا، میں نے پوری تفصیل سے اس کا جواب دیا اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، میرا یہ خط بھی "جماعت اسلامی" کی وکالت و مدافعت کے سلسلہ کی اہم تحریروں میں سے ہے یہ جمادی الاخری ۱۳۶۱ھ کے الفرقان میں شائع ہوا تھا ۱۵ صفحات پر تھا۔ اس کو مولانا مودودی صاحب نے الفرقان کے حوالہ سے "ترجمان القرآن" میں بھی شائع کیا تھا — اس کا عنوان تھا — "جماعت اسلامی کی حقیقت اور ہمارے کام کی نوعیت — بعض شبہات کا جواب" اس وقت میرا خیال تھا کہ یہ مضمون لکھ کر میں نے "جماعت اسلامی" کے معترضین پر حجت تمام کر دی ہے۔

جماعت کے ابتدائی دور میں جماعت کی دعوت سے متعلق مولانا مودودی صاحب کی ہر اہم تحریر بالالتزام "الفرقان" میں شائع کی جاتی تھی، اُن کا مشہور مقالہ "اسلامی حکومت کیونکر قائم ہوتی ہے" اور دوسرا مقالہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" یہ دونوں بھی

---

[1] یہ مولانا کاندھلوی ایک صاحب مطالعہ اور صاحب نظر عالم دین تھے، سیالکوٹ میں قیام تھا ملک کی تقسیم کے بعد بھی وہیں رہے۔

الفرقان میں شائع کیے گئے، اور ان کو میں نے الگ مقالہ کی شکل میں بھی چھپوایا تاکہ حسب موقع لوگوں کو مفت بھی دیا جا سکے ــــــ جیسا کہ عرض کیا گیا اس دور میں "الفرقان" جماعت اسلامی کا آرگن تھا اور اسی کی دعوت و کالت ہی اس عاجز کی زندگی کا موضوع تھا ــــــ

اور ارشاد نبوی "لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ" کے مطابق جی چاہتا تھا کہ اللہ و رسول پر ایمان رکھنے والے سارے ہی بندوں کا یہی حال ہو جائے۔

اس واقعہ کے اظہار میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ اس وقت یہ اظہار غالباً مناسب ہی ہوگا کہ اس وقت جماعت میں مولانا مودودی کے بعد اس ناچیز ہی کو سمجھا جاتا تھا۔ خود مولانا بھی میرے ساتھ خصوصی اکرام کا معاملہ فرماتے تھے جس کا مجھے ممنون ہونا چاہیے۔

جماعت کی تاسیس کے بعد میرا لکھنؤ وغیرہ کا سفر، مولانا علی میاں کی جماعت میں شرکت اور مولانا امین احسن صاحب سے ملاقات

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ میرا جو ربط اور تعلق تھا اور خیالات و جذبات میں جو ہم آہنگی تھی اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ وہ لاہور کے اس اجتماع میں شریک نہیں ہوئے تھے جس میں "جماعت اسلامی" کی تشکیل ہوئی تھی، لیکن اس اجتماع کی اور تشکیل کے سلسلہ کی ساری تفصیلات مولانا موصوف کو بعض ان رفقائے جماعت سے معلوم ہو چکی تھیں جو لکھنؤ سے لاہور پہنچ کر اس تاسیسی اجتماع میں شریک ہوئے تھے۔ نیز اس سلسلہ میں میری ان کی خط و کتابت برابر ہوتی رہی تھی ــــــ بہر حال انھوں نے جماعت میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور مجھے اس کی اطلاع دیدی تھی۔ میں نے ایک سفر لکھنؤ کا کیا، جن حضرات کے ذہن "ترجمان" کے مطالعہ سے "جماعت اسلامی" کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے ان کا ایک مختصر سا اجتماع ایک رفیق کے مکان پر ہوا۔ میں نے تفصیل سے دعوت کا تذکرہ کیا اور لاہور کے تاسیسی اجتماع کی کارروائی اور اس کے بارہ میں اپنے تاثرات ذکر کیے اور پھر جماعت میں شرکت کے شرائط وغیرہ بیان کیے۔ مولانا علی میاں اور چند اور دوستوں نے اسی اجتماع میں کلمۂ شہادت کے اعادہ کے ساتھ باقاعدہ جماعت کی رکنیت قبول کی۔[1]

[1] جماعت کی رکنیت قبول کرتے وقت کلمۂ شہادت کے اعادہ کا معمول تھا جس طرح مشائخ سلوک کے ہاں بیعت کے

اسی زمانہ میں میں نے ایک سفر اعظم گڈھ کا بھی کیا۔ اب یاد نہیں رہا۔ شاہ گنج اور اعظم گڈھ کے درمیان کس اسٹیشن پر ادھر سے جانے والی اور ادھر سے آنے والی ٹرینیں کسی سبب سے کچھ دیر کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے دیکھا کہ اعظم گڈھ سے آنے والی ٹرین کے (اس وقت کے) سکنڈ کلاس میں مولانا سید سلیمان ندوی تشریف فرما ہیں، جلدی سے اپنی ٹرین سے اتر کے ملاقات کے لیے ان کے پاس پہونچا، سلام اور مزاج پرسی کے بعد سید صاحب نے پہلی بات یہ فرمائی کہ "جماعت اسلامی میں مودودی صاحب کے ساتھ آپ بھی شریک ہیں؟ کیا آپ ان کے بارے میں بالکل مطمئن ہیں؟" میں نے عرض کیا کہ ہاں میں تو اطمینان کر کے ہی شریک ہوا ہوں، فرمایا "خیر خدا کرے آپ کا اطمینان درست ہو مجھے تو ان کی تحریروں میں تجدد کی بو آتی ہے، ایسے لوگ دین کے معاملے میں بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔" اس کے بعد سید صاحب کی ٹرین روانہ ہونے لگی اور میں آکر اپنی ٹرین میں بیٹھ گیا۔

اسی سفر میں میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر پہونچکر مولانا امین احسن صاحب اصلاحی سے ملا۔ مولانا سے میرا کوئی خاص تعلق یا تعارف اس وقت تک غالباً نہیں تھا۔ شاید ایک دو دفعہ ملاقات کی نوبت آئی ہو اور کبھی کبھار انھوں نے یا میں نے کسی ضرورت سے خط لکھا ہو، لیکن معلوم نہیں کیوں، وہ میرے ساتھ خاص محبت اور اعتماد کا اظہار فرماتے تھے ——

یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ جس زمانہ میں مولانا مودودی کا قلم بڑی تیزی اور بڑی طاقت کے ساتھ جنگ آزادی میں کانگریس کا ساتھ دینے والے مسلمان حلقوں کے خلاف چل رہا تھا (جس کی زد خاص طور سے "جمعیۃ العلماء" پر پڑتی تھی) جس سے اس زمانہ تک میرا بھی تعلق تھا۔ تو مولانا امین احسن، مولانا مودودی کی تحریروں کا جواب لکھنے والوں میں تھے بلکہ جہاں تک مجھے یاد ہے سچی بات یہ ہے کہ ان دنوں میں صرف انہی کی تحریریں ایسی ہوتی تھیں جن کو کسی درجہ میں مولانا مودودی کی تحریروں کا جواب کہا جاسکتا تھا۔ لیکن ۳۹ء میں جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد مولانا مودودی نے جب مسلمانوں کے دوسرے گروہ (مسلم لیگ وغیرہ) کے رد میں بھی اسی قسم کی سخت تنقید شروع کی اور یہ ظاہر کر دیا کہ ان کی اصل دعوت لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا" کی ہے اور ان کا موقف مسلم قومیت کے پرستاروں سے بھی

اتنا ہی الگ ہے جتنا کہ نظریہ وطنیت کے پرستاروں سے، تو مولانا امین احسن کی رائے مولانا مودودی کے ساتھ ہوگئی اور جب جماعت اسلامی کی تاسیس عمل میں آئی تو چند روز کے بعد انھوں نے بھی اس کی رکنیت قبول کرلی ــــ میں جب سرائے میر پہونچا ہوں تو مولانا امین احسن جماعت کے رکن بن چکے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے مجھ سے کہا کہ بھئی! صاف بات یہ ہے کہ میں مودودی صاحب کو نہیں جانتا، تمھیں جانتا ہوں، اگر مودودی صاحب کل کو کسی غلط راستہ پر چل پڑے تو میں تو خدا کے سامنے تمھیں پکڑ کے پیش کردوں گا کہ ان سے پوچھیے۔ میرے ذمہ دار یہی ہیں ــــ لیکن یہ گفتگو کچھ اس طرح تھی کہ میں نے اس کو ایک طرح کا مزاح ہی سمجھا۔ البتہ میں نے اس موقع پر انھیں یہ بتادینا ضروری سمجھا کہ مودودی صاحب کے بارے میں میرا خیال اور اندازہ کیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اس وقت میں نے ان سے کہا تھا کہ اصل بات یہ ہے کہ اس دعوت اور اس کام کے لیے جیسا قائد چاہیے مودودی صاحب ویسے تو ہیں نہیں، لیکن اگر ان کے ساتھ دو چار آدمی اور ایسے مل جائیں جو ان کسروں کو کچھ پورا کریں جو اُن میں ہیں تو انشاء اللہ کام کچھ چل جائے گا۔

پھر تاسیسی اجتماع کے قریباً چھ مہینے کے بعد جماعت اسلامی کے اہل حل وعقد کی مجلس شوریٰ کا لاہور میں اجتماع ہوا۔ میں اس وقت آنکھوں کی سخت تکلیف میں مبتلا تھا (آنکھوں میں زخم ہوگئے تھے اور پٹی بندھی رہتی تھی) گھر والے کسی طرح اس کے روادار نہیں تھے کہ میں اس حالت میں سفر کروں۔ لیکن اسی حال میں میں نے بریلی سے لاہور تک کا سفر کیا اور اجتماع میں شرکت کی ــــ مولانا امین احسن اور مولانا علی میاں بھی اس میں شریک ہوئے اور جماعت کے کسی اجتماع میں ان دونوں حضرات کی یہ پہلی شرکت تھی۔

مودودی صاحب کی ظاہری ہیئت کے اُن پہلوؤں میں جن کی اصلاح کا انھوں نے وعدہ کیا تھا خاطر خواہ تبدیلی نہ دیکھ کر مجھے سخت افسوس اور دکھ ہوا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس سلسلہ میں اب میں خود ان سے کچھ نہ کہوں اس لیے میں نے تنہائی میں مولانا امین احسن صاحب سے کہا کہ آپ ان چیزوں کی طرف اپنی طرف سے مولانا کو توجہ دلائیں تاکہ مولانا کو یہ محسوس ہو کہ صرف میں ہی ان اصلاحات کو ضروری نہیں سمجھتا ہوں بلکہ مولانا اصلاحی

جیسے قریب قریب انھیں کے طرز کے روشن خیال عالم بھی اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ لاہور سے رخصت ہوتے وقت مولانا امین احسن صاحب نے میری موجودگی ہی میں مولانا مودودی اور ان رفیقوں سے جو وہاں مستقل ان کے ساتھ رہتے تھے بات کی اور کہا کہ میں بہت صفائی کے ساتھ یہ بات ظاہر کر دینا امانت اور دیانت کا تقاضا سمجھتا ہوں کہ یہاں آنے سے پہلے میں جتنا متاثر تھا یہاں آکر اس میں کچھ کمی آئی ہے۔ آپ حضرات اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کریں کہ آپ ہی اس دیگ کے وہ چاول ہیں جنھیں دیکھ کر کوئی شخص دیگ کے متعلق رائے قائم کرے گا۔[1] اس لیے جماعت کی خیر خواہی کا بھی یہ فرض ہے کہ آپ حضرات اپنے آپ کو ایسا بنائیں کہ یہاں آکر آپ سے ملنے والا آدمی آپ کو اسلام کا اور اسلامی دعوت کا نمونہ دیکھے۔ میں تعین کے ساتھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ آپ کے کون کون سے پہلو زیادہ قابل اصلاح ہیں، آپ خود ہی سوچیں اور اپنا فرض ادا کریں۔

مولانا مودودی نے جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے جواب میں فرمایا تھا، ہاں مجھے احساس ہے کہ مجھے اپنے آپ کو بہت بدلنے کی ضرورت ہے لیکن میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ باہر کی تبدیلی اندر کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اور اس کے تقاضے سے ہو۔

جماعت اسلامی کی اسی مجلس شوریٰ میں دستور پر نظر ثانی بھی کی گئی۔ اور یہ کام ہم تین کے سپرد کیا گیا، ایک یہ عاجز، ایک مولانا اصلاحی، ایک مولانا ابوالحسن علی ندوی، شاید ان دونوں حضرات کو بھی یاد ہو کہ جو بھی چھوٹی بڑی ترمیمیں اس وقت اس میں کی گئیں وہ سب میں نے کی تھیں۔ اور ان دونوں دوستوں نے ان سے اتفاق کیا تھا۔ بعض اور معمولی معمولی ترمیمیں جن کے لیے میری رائے تھی ان کو ان دوستوں نے ضروری نہیں سمجھا اور میں نے بھی ان پر اصرار نہیں کیا۔

اسی مجلس شوریٰ میں غالباً میری اور مستری محمد صدیق صاحب[2] مرحوم کی تجویز بلکہ اصرار پر

---

[1] مولانا امین احسن کے یہ خط کشیدہ الفاظ مجھے کچھ اس طرح یاد رہ گئے ہیں کہ مجھے امید ہے کہ ان میں کوئی لفظ بھی میرا نہ ہوگا۔

[2] یہ مستری محمد صدیق صاحب "جماعت اسلامی" میں ایک مثالی درویش قسم کے بزرگ تھے، غالباً جماعت کے ارکان میں سب سے معمر بھی تھے، اصطلاحی عالم دین نہیں تھے، مگر قرآن مجید سے ان کو عشق تھا، (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ طے ہوا کہ جماعت کا مرکز لاہور نہ رہے بلکہ ہم کسی جگہ اپنی ایک ایسی نوآبادی قائم کریں جس کو اپنے نظریات کے مطابق تا امکان ایک مثالی دینی بستی بنا سکیں اور جماعت کے جو ارکان منتقل ہو سکتے ہوں وہ وہیں منتقل ہو جائیں۔ خود میں نے بھی اپنے متعلق یہی فیصلہ کیا کہ میں وہیں منتقل ہو جاؤں گا۔ بعض اہم مصالح کے پیش نظر سیالکوٹ کا علاقہ اس کے لیے زیادہ مناسب سمجھا گیا ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ اس علاقہ میں جگہ کا انتظام اگر جلدی نہ ہو سکے تو پھر عارضی طور پر "دارالاسلام" کو مستقر بنانے کے لیے چودھری نیاز علی خاں صاحب سے بات کی جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بہت غور اور تدبر و تفکر کے ساتھ تلاوت کرتے تھے، نماز اتنی اچھی پڑھتے تھے کہ ایسی نماز پڑھنے والے اس عاجز نے اپنی عمر میں چند ہی دیکھے ہیں۔ اللہ کے کلمہ کی سربلندی اور اس راہ میں جانبازی اُن کی سب سے بڑی تمنا تھی۔

تحریک خلافت کے آغاز میں بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جو ایک جماعت "حزب اللہ" کی تشکیل کی تھی جس کے لیے وہ لوگوں سے بیعت لیتے تھے، ان مستری صاحب نے اپنی جوانی میں اس دعوت پر بھی لبیک کہہ کے مولانا آزاد کے ہاتھ پر بھی بیعت کی تھی ــــ مولانا آزاد نے تو یا یوں ہی ہو کر یا کچھ سوچ سمجھ کے اس تحریک کو ختم کر دیا لیکن مستری صاحب کے دل میں وہی جذبہ پُر جوش رہا، اسی وجہ سے انھوں نے مولانا مودودی کے مضامین سے متاثر ہو کر ان کی دعوت پر بھی لبیک کہا، وہ جماعت کے صرف رکن نہیں بلکہ گویا اس کے بانیوں میں تھے۔ "جماعت اسلامی" کا مرکز جب لاہور سے "دارالاسلام" منتقل ہوا تو وہ بھی وہیں آ گئے۔ ــــ پھر "جماعت" سے جب اس عاجز نے تعلق ختم کر دیا (جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) تو کچھ مدت کے بعد مستری صاحب نے بھی علاحدگی اختیار کر لی جس کی تفصیل راقم سطور کے علم میں نہیں ــــ آخر میں انھوں نے اپنے قدیمی مسکن "سلطان پور لودی" (ریاست کپور تھلہ، پنجاب) کے قبرستان میں جھونپڑا ڈال کر رہائش اختیار کر لی تھی، ملک کی تقسیم کے سلسلہ میں جو خونی ہنگامے ہوئے اس میں کسی ظالم نے ان کو گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا ــــ اور اس طرح وہ اپنی مراد کو پہنچ گئے ــــ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور درجے بلند فرمائے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

چودھری صاحب موصوف سے اس عاجز کے اور مستری صاحب مرحوم کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس لیے ہم دونوں کو پوری امید تھی کہ جب ہم کہیں گے تو چودھری صاحب بخوشی اس کے لیے تیار ہو جائیں گے، پھر ایسا ہی ہوا کہ سیالکوٹ کے علاقہ میں جو جگہ زیرِ غور تھی یا تو وہ حاصل نہ ہو سکی یا کسی وجہ سے اس کا خیال چھوڑ دیا گیا، بہرحال جب چودھری صاحب سے "دار الاسلام" کے لیے مراسلت کی گئی تو وہ آمادہ ہو گئے۔

غالباً جمادی الاخریٰ یا رجب ۱۳۶۱ھ کا مہینہ تھا جب مولانا مودودی مع اپنے دفتر کے لاہور سے پھر "دار الاسلام" آ گئے۔ اور "دار الاسلام" جماعت کا مرکز بن گیا۔ مستری صاحب مرحوم بھی وہیں آ کر مقیم ہو گئے۔ دو تین دوست اور بھی آ گئے۔ مجھے منتقلی کے انتظامات میں کچھ دیر لگی۔ اس لیے میں غالباً دو تین ہفتے بعد پہونچ سکا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے اس سفر کو ایک طرح کا سفرِ ہجرت سمجھتا تھا۔ اور مجھے اللہ کی اس توفیق پر خاص مسرت تھی۔

میرے قیام کو ایک ہی ہفتہ گذرا ہوگا کہ میرے سامنے بعض چیزیں ایسی آئیں جن سے معلوم ہوا کہ احکامِ شریعت کی جس درجہ کی پابندی یا کہنا چاہیے کہ جس درجہ کا عملی تقویٰ جماعت کے ہر رکن کے لیے شرط لازم قرار دیا گیا ہے۔ خود مولانا مودودی نے اپنے کو ابھی تک اس کا کبھی پابند نہیں بنایا ہے اور یہ کہ جماعت کی تاسیس سے چند روز پہلے والی تنہائی کی گفتگو سے تقویٰ اور شریعت کی پابندی کے بارے میں مولانا کا جو حال میں نے سمجھا تھا۔ واقعہ میں ان کا حال وہ نہیں ہے، بلکہ اس بارے میں ان میں اس قدر تہاون اور اتنی سہل انگاری ہے جو مقامِ تقویٰ کے بالکل منافی ہے ——— یہ معلوم کر کے دل کو سخت دھکا لگا اور میں بار بار غور کر کے اس معاملہ میں نہ تو کسی طرح ان کو معذور سمجھ سکا اور نہ اُن کے رویہ کی کوئی تاویل ہی کر سکا۔[۱]

---

[۱] اب سے ۱۴ سال پہلے رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کے الفرقان میں جب راقم سطور نے اپنی یہ سرگزشت لکھی تھی تو یہ بات اسی طرح بلکہ انہی الفاظ میں ادا کی گئی تھی ——— اس سے زیادہ صراحت اور وضاحت مناسب نہیں سمجھی گئی تھی، اُس وقت مولانا مودودی صاحب کے بعض فدائیوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا اُس کا تقاضا تھا کہ خواہ دل پر اور طبیعت پر جبر کرنا پڑے وہ اصل واقعہ لکھ دیا جائے جو میرے لیے (باقی اگلے صفحہ پر)

اب میرے سامنے ایک سخت مشکل اور الجھن آگئی۔ اور وہ یہ کہ جماعت کی تاسیس کے وقت مولانا مودودی کی امارت کی تحریک خود میں نے پیش کی تھی اور سب کے سامنے میں نے اپنے اس اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ مولانا موصوف اپنے علم و عمل اور اپنی فکری صلاحیتوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس احساس اور تاثر کا خاص سبب بنا تھا، چنانچہ دلی تکلیف کے ساتھ اب حوالہ قلم کر رہا ہوں۔

——— (یہ بھی واضح رہے کہ یہ واقعہ کوئی راز نہیں ہے جس کا افشا کیا جا رہا ہو۔ اس دور میں دارالاسلام میں جتنے حضرات مقیم تھے سب کے علم میں ہے۔) جس دن راقم سطور "دارالاسلام" پہنچا تھا اس کے اگلے ہی دن کسی نماز کے بعد مسجد ہی میں مولانا مودودی صاحب نے موجودہ رفقا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کسی اسلامی بستی کے لیے ایک "محتسب" بھی ضروری ہے اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ ذمہ داری آپ لیں! ——— میں نے کہا کہ ابھی ہم چند ہی آدمی ہیں ایسے میں کسی محتسب کی کیا ضرورت ہے ——— مولانا نے فرمایا کہ اس کی بنیاد ابھی سے پڑنی چاہیے، ——— بہرحال مجھے "محتسب" بنا دیا گیا اور یہ بات بھی اسی مجلس میں ذکر میں آگئی کہ میری یہ ذمہ داری ہے کہ اس پر نگاہ رکھوں کہ ہمارے اس دائرہ میں کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو۔

میرے قیام پر دو چار ہی روز گزرے تھے کہ غالباً کسی رفیق جماعت کے ذریعہ یہ بات میرے علم میں آئی کہ مولانا کا باورچی .... زنانخانہ میں کھانا پکاتا ہے اور گھر میں اس سے پردہ نہیں ہے۔ اور یہ کہ دارالاسلام کے مقیم رفقا پر اس کا اثر پڑ رہا ہے ——— پہلے تو میرا دل و دماغ اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا، میں سوچتا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے (مولانا کی کتاب "پردہ" اس سے بہت پہلے شائع ہو چکی تھی) لیکن بالآخر معلوم ہو گیا کہ واقعہ یہی ہے ——— اس واقعہ کے علم میں آنے نے مجھے ہلا کے اور جھنجھوڑ کے رکھ دیا، غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو گی کہ اب تک جس ماحول میں میری زندگی گزری تھی اس میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی بھی درجہ کے تقوے اور دیندارانہ زندگی کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

——— جماعت کے دستور میں "صف اول" کے ارکان کے بارہ میں لکھا ہوا تھا کہ

"ان لوگوں کے لیے احکام شرعیہ کی پابندی کے معاملہ میں کوئی رعایت نہ ہوگی، ان کو مسلمان کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہوگا اور ان کے لیے رخصت کے بجائے عزیمت کا طریقہ ہی قانون ہوگا۔

لحاظ سے جماعت کی امارت کے لیے موزوں ترین آدمی ہیں۔ اور ان شرطوں کے جامع ہیں جو دستور میں امیر کے لیے ضروری قرار دی گئی ہیں[1]۔ پھر اس کے بعد الفرقان کے صفحات پر بھی میں اپنے اسی علم و اطمینان کا برابر اظہار کرتا رہا۔ یہ گویا میری طرف سے مولانا کے بارے میں ایک شہادت تھی۔ جو میں نے اُس وقت کے اپنے معلومات کی بنا پر ادا کی تھی۔ اب دار الاسلام میں مولانا کے ساتھ چند روز قیام کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کا حال وہ نہیں ہے جو ان کے بتلانے سے میں نے سمجھا تھا اور جس کا میں نے بار بار اپنے زبان و قلم سے اظہار کیا ہے۔ اب میں محسوس کرتا تھا کہ اس نئے علم و انکشاف کے بعد بھی اسی طرح میرا رکن جماعت بنا رہنا ایک ایسی عملی شہادت ہے جس کا غلط اور خلاف واقع ہونا مجھے معلوم ہو چکا ہے، اور یہ ایک طرح کا نفاق ہے، لیکن چونکہ "جماعت اسلامی" میں شرکت بڑے بلند عزائم کے ساتھ کی تھی اور اس وقت اُس سے بڑی مقدس آرزوئیں وابستہ تھیں۔ اس لیے یہ شک بھی گزرتا تھا کہ ایسا تو نہیں کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں اس میں شیطانی فریب کا کوئی دخل ہو یا نفس امارہ کا دھوکا ہو۔ میں نے تنہائیوں میں گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر اس پر غور کیا اور میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ میرے سامنے اس وقت یہ مسئلہ نہیں تھا کہ مولانا مودودی امارت کے اہل نہیں ہیں لہٰذا انھیں امارت سے الگ ہو جانا چاہیے یا یہ کہ مولانا مودودی کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے جماعت کی شرکت و رکنیت اب جائز نہیں رہی ہے، بلکہ میرے سامنے اصل مسئلہ اُس وقت صرف اپنی ذات سے متعلق یہ تھا کہ میں مولانا کے بارہ میں بار بار ایک شہادت دے چکا ہوں اور اب مجھے معلوم ہوا کہ میری وہ شہادت صحیح اور واقع کے مطابق نہیں تھی ایسی حالت میں اگر میں بدستور جماعت کا رکن رہتا ہوں تو گویا اپنے عمل سے مسلسل وہ شہادت دیتا ہوں جو اب میرے علم میں سچی شہادت نہیں ہے، ——

[1] دستور میں امیر کے لیے جو صفات ضروری قرار دی گئی تھیں اُن میں "علم دین میں بصیرت" اور اصابت رائے سے بھی پہلے "تقوے" کا ذکر تھا۔

بس یہ تھی میری اصل مشکل جس کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آیا، اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی اس احساس میں شامل ہو گئی تھیں لیکن وہ اس درجہ کی نہیں تھیں۔

جماعت اسلامی کے دائرہ سے باہر جو اہل علم اور اصحاب بصیرت میرے اکابر یا احباب تھے ان کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ اگر ان سے مشورہ کروں تو جماعت کی اہمیت اور قدر و قیمت اور اس کے مقاصد کی بلندی سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح رائے نہیں قائم کر سکیں گے اس لیے میں نے اس معاملہ میں مشورہ حاصل کرنے کے لیے جماعت کے اندر ہی کے دو صاحب علم منتخب کیے، ایک مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ میں نے اس پیش آمدہ مشکل کے بارہ میں ایک مفصل خط لکھ کر رجسٹری سے مولانا امین احسن صاحب کے نام اس وقت کے ان کے مستقر مدرستہ الاصلاح سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) کے پتہ پر روانہ کیا اور اس میں ان سے اصرار کے ساتھ گذارش کی کہ آپ اس خط کے ملنے کے بعد جلد سے جلد مولانا علی میاں کے پاس جائیں اور دونوں صاحب غور و فکر کے بعد مجھے مشورہ دیں کہ اس صورت میں کیا میرے لیے شرعاً اس کی کوئی گنجائش ہے کہ میں خاموشی کے ساتھ اسی طرح جماعت میں رہوں اور میرے حق میں یہ معصیت نہ ہو، یا ایسی حالت میں میرے لیے یہ ضروری ہے کہ میں اپنی بے اطمینانی ظاہر کر کے جماعت سے بے تعلقی اختیار کر لوں۔ میں نے یہ خط رجسٹرڈ روانہ کیا تھا اور جواب بھی رجسٹرڈ مانگا تھا، امید تھی کہ ہفتہ تک اس کا جواب مجھے ضرور مل جائے گا، لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ دن مجھ پر کتنے سخت گذرے اور میں ان دنوں اور ان راتوں میں کتنا رویا، میں محسوس کرتا تھا کہ میں سخت آزمائش میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ میرے ایمان اور میری خدا پرستی کا امتحان ہے بعض وقت سوچتا تھا کہ جب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ مولانا مودودی کے بارہ میں میرا اظہار اطمینان اور میری شہادتیں صحیح اطلاع پر مبنی نہیں تھیں تو مجھے اپنے کو اس سلسلہ سے فوراً الگ کر کے شہادت کی ذمہ داری سے نکل آنا چاہیے۔ اور اس بارے میں طبیعت میں جو توقف اور تامل ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ لوگ "بے وقوف" نہ بنائیں۔

بعض وقت سوچتا تھا کہ اگر میں نے علاحدگی اختیار کی اور اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تو ایک ایسی اسلامی دعوت اور جماعت کو نقصان پہونچے گا جس کو میں مولانا مودودی کی ان کمزوریوں کے باوجود بھی اس وقت کی بہترین اسلامی دعوت اور جماعت سمجھتا ہوں اور جس کے نقصان کو دین کا نقصان سمجھتا ہوں۔

ان دنوں اور ان راتوں میں میں مسلسل دعا اور استخارہ بھی کرتا تھا۔ جب دس بارہ دن گزر گئے اور میرے خط کا کوئی جواب نہ آیا[1] تو میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں کے مقیم رفیقوں میں سے مستری صاحب سے اپنا راز کھول دوں اور ان ہی سے مشورہ لوں ــــــ میں ان کو مرد مومن اور مثالی درجہ کا مخلص و متقی جانتا تھا۔

الغرض میں نے مستری صاحب کے سامنے اپنی الجھن رکھی، معلوم ہوا کہ وہ خود اسی طرح کی کچھ اُلجھنوں میں ہیں۔ بہرحال اُن سے مشورہ کے بعد میں نے یہی طے کیا کہ میں اپنے دل کی پوری بات مودودی صاحب کو لکھ دوں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس زمانہ میں ارکانِ جماعت میں سے مولانا محمد جعفر صاحب پھلواروی کا قیام بھی وہیں تھا۔ یا تو مودودی صاحب کے نام خط لکھنے کے دوران یا خط لکھ لینے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی جعفر صاحب پر بھی اپنا راز ظاہر کر دوں اور مشورہ کروں۔ شاید ان کے ذہن میں کوئی دوسرا راستہ آئے۔ چنانچہ میں نے مولوی جعفر صاحب سے بات کی، معلوم ہوا کہ وہ بھی بہت بد دل اور مایوس ہو رہے ہیں۔

بہرحال ان کی رائے بھی یہی ہوئی کہ مودودی صاحب کو یہ پوری بات صفائی سے لکھ دینی چاہیے۔ بلکہ انھوں نے اصرار کیا کہ اس خط پر میں اپنی طرف سے بھی کچھ لکھوں گا۔ یاد آتا ہے کہ میں نے وہ خط کئی دن میں لکھ کر پورا کیا تھا۔ آخر میں مولوی جعفر صاحب نے بھی اس پر اپنی طرف سے ایک سطر لکھی جس کا حاصل غالباً یہ تھا کہ یہی احساسات کچھ میرے بھی ہیں۔ اور بالآخر

[1] جواب نہ آنے کا سبب بعد میں خود مولانا امین احسن صاحب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں اگست ۴۲ء کی کانگریس کی تحریک (کوئٹ انڈیا) نے مشرقی یوپی میں ریلوے کے نظام کو بھی درہم برہم کر دیا تھا، اعظم گڑھ کی طرف غالباً کئی ہفتے ٹرین نہیں چلی تھی، اس لیے وہ خط اُن کو ہفتوں کے بعد ملا۔

وہ خط میں نے بڑے رنج اور دُکھ کے ساتھ مودودی صاحب کو دے دیا۔

اب جہاں تک یاد ہے غالباً یہ خط میں نے عشاء کی نماز کے بعد اُن کو دیا تھا۔ خط بہت طویل تھا (جہاں تک یاد ہے قریباً دس بارہ صفحے کا تھا) صبح کو فجر کی نماز کے بعد ہی مولانا نے مجھے اس کا جواب ایک مفصل خط ہی کی شکل میں دیا، لیکن ان کے جواب نے میری اصل مشکل کو حل نہیں کیا اور نہ میری بے اطمینانی میں کوئی کمی ہوئی، بلکہ اُس خط سے میں نے صرف یہی اثر لیا کہ مولانا قلم کے بادشاہ ہیں۔ اور جو چیز بھی لکھنا چاہیں اس کو بڑے ہی اچھے اور مؤثر انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ اور یہ وہ بات تھی جس کا میں پہلے ہی سے قائل تھا۔ اس کے بعد میں نے خط کتابت کے اس سلسلہ کو آگے بڑھانا بے سود سمجھا اور تنہائی میں خود مولانا سے بات کی اور انھیں بتلایا کہ آپ کے جواب سے میری بے اطمینانی اور پریشانی ختم نہیں ہوئی ہے اور میری مشکل کا کوئی حل مجھے اُس سے معلوم نہیں ہوا ہے۔ میرے سامنے اصل اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے امارت کے لیے آپ کا نام خود پیش کر کے اور اس کے بعد اپنے مضامین میں آپ کے بارے میں اپنا اطمینان بار بار ظاہر کر کے خدا کی مخلوق کے سامنے ایک شہادت دی ہے اور اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری وہ شہادت صحیح نہیں بلکہ واقع کے خلاف تھی۔ بس ایسی حالت میں اگر میں اسی طرح جماعت کا رکن رہوں تو گویا اپنے عمل سے مسلسل اُس شہادت کا اعادہ کر رہا ہوں جس کا خلاف واقع ہونا معلوم ہو چکا ہے اور جھوٹی شہادت اکبر الکبائر ہے۔ میں بس اس کے مواخذہ سے بچنا چاہتا ہوں، لیکن میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی دین کا علم اور اس کی سمجھ دی ہے۔ اور مجھے آپ سے ذاتی تعلق بھی ہے اس لیے میں بے تکلف پھر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسی صورت ہو کہ میں جماعت سے بھی بدستور وابستہ رہوں اور اس "شہادتِ زور" کے گناہ سے بھی بچ جاؤں تو آپ مجھے بے تکلف بتائیں میری انتہائی خواہش یہی ہے کہ میں جماعت کے ساتھ اسی طرح وابستہ رہوں۔ بس اس کا اطمینان چاہتا ہوں کہ اللہ کے ہاں پکڑا نہ جاؤں گا ——— مولانا نے مجھ سے کچھ بات کی لیکن وہ میرے درد کی دوا نہ تھی۔ وہ میری اس مشکل کا کوئی حل نہ بتا سکے البتہ اُن کے گھر کے جس مسئلہ کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر تھا یعنی

باورچی کا زنانخانہ میں کھانا پکانا اور اُس سے پردہ نہ ہونا) اُس کے بارے میں کچھ گفتگو ہوئی۔ مولانا نے اُس کے کچھ وجوہ و اسباب مجھے بتائے لیکن اس گفتگو نے میرے اس احساس کو اور پختہ کر دیا کہ جماعت اسلامی کا رکن بننے کے لیے شریعت کی جس درجہ کی پابندی ضروری قرار دی گئی ہے۔ مولانا نے اپنے حق میں ابھی تک اس کا بھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔[1]

بہرحال اس گفتگو سے مایوسی اور بے اطمینانی میں کچھ اضافہ ہی ہوا اور میں نے اس وقت اپنے بارے میں وہی طے کیا۔ جو میں نے اپنے اُس خط میں بھی غالباً لکھ دیا تھا یعنی یہ کہ اس وقت میں "دارالاسلام" سے چلا جاؤں اور یہاں سے ہٹ کر اس مسئلہ پر غور کروں، اور مشوروں سے بھی مدد حاصل کروں۔

---

[1] اس گفتگو کی بھی کچھ تفصیل اپنے ذوق اور طبیعت پر جبر کر کے اب لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ کھانا پکانے کے لیے باورچی کی ضرورت ہے لیکن یہ تو ضروری نہیں ہے کہ وہ زنانخانہ ہی میں پکائے اور گھر میں اُس سے پردہ نہ کیا جائے۔ وہ مکان کے باہر کے حصہ میں پکا سکتا ہے ـــ مولانا نے یہ تو تسلیم کیا کہ یہ "منکر" ہے لیکن عذر یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ چور ہوتے ہیں اسلیے مجبوراً گھر میں آنکھوں کے سامنے پکوانا پڑتا ہے ـــ میں نے عرض کیا کہ یا تو چوری کا تھوڑا سا نقصان برداشت کیا جائے، یا پھر ایسا کیا جائے کہ بجائے موجودہ باورچی کے (جس کا نام غالباً اسمٰعیل تھا) نذیر سے کام لیا جائے، اُس کے بارہ میں تو چوری یا خیانت کا شبہہ نہیں ہو سکتا۔ (یہ نذیر غالباً ریاست کپور تھلہ کا ایک نوجوان تھا، نا تعلیم یافتہ یا بہت کم تعلیم یافتہ تھا، بہت نیک اور صالح تھا، جماعت سے متعلق تھا اور اسی لیے "دارالاسلام" آگیا تھا ـــ ہم لوگوں کا کھانا وہی پکاتا تھا) تو اسی نذیر کے بارہ میں میں نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ کھانا پکوانے کے لیے بجائے اسمٰعیل کے نذیر کو ملازم رکھ لیجیے! (اسمٰعیل ہم لوگوں کا کھانا پکایا کرے گا۔) مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ نذیر کو کھانا پکانا نہیں آتا۔ اُس سے کام نہیں چل سکتا ـــ (یہ واقعہ ہے کہ بیچارہ نذیر بہت اچھا کھانا پکانا نہیں جانتا تھا)۔

مولانا کے ساتھ اس گفتگو کا مجھ پر جو اثر پڑنا چاہیے تھا وہی پڑا اور یہ گفتگو ہی "اونٹ کی کمر کا آخری تنکا" ہو گئی۔

چنانچہ میں نے یہی کیا اور میں وہاں سے (دار الاسلام سے) اپنے اصلی وطن سنبھل چلا آیا یہ غالباً شعبان ۱۳۶۱ھ کی آخری تاریخ تھی۔ بجائے بریلی کے سنبھل مجھے اس لیے آنا پڑا کہ بریلی کا وہ مکان جس میں میں کرایہ پر رہتا تھا وہ میں نے خالی کر دیا تھا اور ایک دوسرے صاحب نے اس کو کرایہ پر لے لیا تھا نیز دار الاسلام روانہ ہوتے وقت رہائش کا ضروری سامان (اثاث البیت) بھی میں نے ختم کر دیا تھا۔ بعض چیزیں جو قابل فروخت تھیں وہ فروخت کر دی گئی تھیں، باقی چیزیں دوستوں یا ضرورت مندوں کو دیدی تھیں —— اہلیہ کو میں نے اپنے اصل وطن والدین کے پاس سنبھل بھیجدیا تھا اور اُن سے کہدیا تھا کہ دار الاسلام میں رہائش کے ضروری انتظامات کے بعد میں تم کو آکر لے جاؤں گا —— مولوی عتیق الرحمٰن سلمہٗ کی عمر اس وقت ۱۴-۱۵ سال رہی ہو گی، وہ بریلی کے مدرسہ "مصباح العلوم" میں کافیہ، مرقاۃ المنطق وغیرہ پڑھ رہے تھے، میں ان کو اپنے ساتھ ہی دار الاسلام لے گیا تھا تاکہ وہاں کے خاص دینی اور تحریکی ماحول میں اُن کا نشو و نما ہو اور مولانا مودودی اور دوسرے جماعتی رفقاء سے بھی مستفیض ہو سکیں۔ —— میں نے ارادہ کیا تھا کہ وہاں میں ان کو کتابی اسباق خود ہی پڑھاؤں گا، اس کے لیے وہ کتابیں جو ان کو پڑھنی تھیں ساتھ لے لی تھیں ان کتابوں میں مشہور درسی کتاب "شرح تہذیب المنطق" بھی تھی، وہ غالباً بھول سے ساتھ نہیں رکھی جا سکی —— دار الاسلام پہنچکر جب عتیق الرحمٰن سلمہ کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے مولانا مودودی صاحب سے ذکر کیا کہ کوئی لاہور یا امرتسر جانے والا ہو تو عتیق الرحمٰن کے لیے مجھے "شرح تہذیب" منگوانی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ تو میرے ہاں ہو گی —— مجھے یہ سنکر تعجب ہوا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ انھوں نے ہمارے مدرسوں کے طریقہ پر درس نظامی کے راستہ سے تعلیم حاصل نہیں کی ہے جس میں منطق کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں —— بہرحال مولانا اُٹھے اور انھوں نے گھر میں سے "شرح تہذیب" لاکر مجھ کو دی۔ میں نے پوچھا کیا شرح تہذیب آپ نے پڑھی تھی؟ انھوں نے بتلایا میرا قصہ یہ ہے کہ والد صاحب ریاست حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے، زندگی کے آخری دور میں اُن پر دینداری اور فکر آخرت کا غلبہ ہوا، میں اُنکی چھوٹی اولاد تھا، انھوں نے میرے بارہ میں طے کیا کہ وہ مجھے دینی تعلیم دلوائینگے اسکے لیے انھوں نے ایک مولوی صاحب کو با تنخواہ رکھا وہ مجھے گھر ہی پر پڑھاتے تھے، میں ابتدائی صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھ چکا تھا، شرح

تہذیب وغیرہ پڑھ رہا تھا کہ والد صاحب انتقال فرما گئے، پھر میرا وہ تعلیمی سلسلہ جاری نہیں رہ سکا ____ اسی سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب نے یہ بھی ذکر کیا کہ پھر جب میرا قیام دہلی میں رہا (یہ غالباً "الجمعیۃ" کی ادارت کا دور ہوگا) تو مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی اس زمانہ میں مدرسہ فتحپوری دہلی میں ترمذی شریف پڑھاتے تھے تو میں ترمذی شریف کے اُن کے سبق میں شرکت کرتا تھا ____ اس طرح ترمذی شریف میں نے اُن سے پڑھی ہے۔

دارالاسلام کے چند روزہ قیام میں مولوی عتیق الرحمٰن کی تعلیم اور اس کے ضمن میں خود مولانا مودودی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر تو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آگیا ورنہ میں عرض کر رہا تھا کہ میں مولانا مودودی صاحب سے وہ آخری گفتگو کرنے کے بعد جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے، دارالاسلام سے سنبھل چلا آیا ____ لیکن اس واقعہ سے مجھے اتنا سخت رنج اور صدمہ ہوا کہ شاید ہی عمر میں اس سے پہلے اتنا بڑا کوئی صدمہ ہوا ہو۔

اس رنج و صدمہ کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جماعت اسلامی میں شرکت اور پھر "دارالاسلام" کو ہجرت اُس وقت کے میرے خاص حالات میں میری زندگی کا بہت بڑا فیصلہ تھا جس کے بارے میں میرا یہ یقین تھا کہ میں نے اللہ کی رضا کے لیے یہ قدم اُٹھایا ہے۔ اور شاید یہی عمل میری نجات کا ذریعہ بن جائے۔ اور اب میں ایسی مشکل میں پھنس گیا تھا کہ یا تو جماعت سے بدستور تعلق قائم رکھتے ہوئے جھوٹی شہادت کا مجرم بنوں اور اپنے عمل سے مسلسل یہ جھوٹی شہادت ادا کرتا رہوں، یا جماعت سے الگ ہونے کا فیصلہ کروں، جو میرے لیے اس وقت نہایت مشکل اور طبعی طور پر نہایت تکلیف دہ فیصلہ تھا ____ دوسری وجہ اس رنج اور صدمہ کی یہ بھی تھی کہ مولانا مودودی سے میرا ایک گہرا ذاتی تعلق تھا اور میں بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ اس نے ایک طبعی محبت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یعنی ایک راہ کے رفیق یا رہنما ہونے کے علاوہ میرے لیے (وہ) ایک محبوب دوست بھی تھے۔ اس لیے میرے اُن کے درمیان اس طرح کی باتیں پیدا ہو جانا میرے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔

بہرحال ان دونوں وجوہ سے مجھے اس واقعہ سے سخت ترین صدمہ پہونچا اور عالم اسباب میں غالباً اسی صدمہ کا اثر تھا کہ دو ہی چار دن بعد میں بیمار پڑ گیا، بیماری برابر بڑھتی گئی اور

دو دن تو ایسے گذرے کہ تیمار داروں کو زیست کی امید بھی کم تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر زندگی عطا فرمائی۔

غالباً بعد رمضان مولانا نے خط کے ذریعہ مجھے اطلاع دی کہ ان نئے حالات کی وجہ سے جماعت کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہونا فوراً ضروری ہے اور اس میں تمہاری شرکت بھی ضروری ہے۔ میں نے لکھ دیا کہ میں ان دنوں اتنا سخت مریض رہا ہوں کہ سفر کے قابل نہیں ہوں۔ مولانا نے مجھے لکھا کہ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ پوری مجلس شوریٰ سنبھل آجائے اور وہیں اجلاس ہو۔ میں نے غالباً لکھا کہ اپنی وجہ سے میں سب حضرات کو اتنی زحمت دینا مناسب نہیں سمجھتا اس لیے آپ مجلس شوریٰ جہاں مناسب سمجھیں بلا لیجیے۔ اگر میں اس وقت تک سفر کے قابل ہو سکا تو انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا۔

بہر حال مجلس شوریٰ کا اجلاس دہلی میں بلایا گیا میں اس وقت مرض سے تو نجات پا چکا تھا لیکن ضعف اتنا تھا کہ یاد ہے کہ سنبھل سے دہلی تک کا پورا سفر میں نے لیٹے لیٹے کیا تھا۔ دہلی اسٹیشن پر جب میری ٹرین پہونچی تو چند احباب مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان میں ایک دوست "مجسم محبت" عبدالغنی بزشرقی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے ہی مجھے ٹرین سے اتارا اور قیام گاہ پر لے کر چلے۔ بزشرقی صاحب ارکان جماعت میں سے میرے بھی خاص دوست تھے اور مولانا مودودی کے بھی خاص الخاص قدردان اور مخلص تھے۔ ان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ خود ان کا اندازہ یہ ہے اور مودودی صاحب نے بھی انیز اپنا اندازہ یہی ظاہر کیا ہے کہ دراصل مجھے دارالاسلام کے بعض دوسرے مقیم رفقاء قمرالدین خاں صاحب وغیرہ نے بہکایا ہے۔ اور انھوں نے میرے اور مودودی صاحب کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اُن کے بہکانے میں آگیا ہوں[1]۔ میں نے انھیں بتایا کہ بھائی! یہ بات

---

[1] دارالاسلام کے مقیم رفقا میں سے مستری صاحب اور مولانا جعفر صاحب کے متعلق تو یہ ذکر پہلے آچکا ہے کہ وہ بھی غیر مطمئن اور دل برداشتہ تھے لیکن ان کے علاوہ جو اور رفیق وہاں رہتے تھے ان میں سے اکثر کا حال بھی یہی تھا، ان ہی میں سے ایک صاحب رفاہ بنارس کے، قمرالدین خاں صاحب ایم اے بھی تھے، یہ جماعت کے ناظم یا قیم بھی تھے۔ ۱۲

بالکل نہیں ہے۔ میرے جو خیالات اور احساسات ہیں۔ وہ خود میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں اور صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ مجھے اس صورت حال سے کتنا دکھ اور صدمہ ہوا ہے۔ شرقی صاحب نے مجھے مودودی صاحب کا یہ پیغام بھی پہونچایا کہ وہ غور کر کے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جماعت کی موجودہ دعلانی حیثیت ختم کر دی جائے۔ پوری جماعت کا کوئی ایک امیر نہ رہے، بلکہ جو لوگ ہماری دعوت سے متفق ہیں وہ اپنی مناسبت اور اعتماد کی بنا پر حلقے قائم کر لیں۔ اور ہر حلقہ اپنے میں سے جس کو مناسب سمجھے امیر بنالے اور جس کام کو حق سمجھ چکا ہے، بنام خدا اس کو کرے۔ میں نے کہا کہ میں ابھی تک بیمار رہا ہوں اس لیے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں دارالاسلام سے آنے کے وقت میں جہاں تھا وہیں ہوں، لیکن اگر مودودی صاحب کی یہی رائے ہوا اور جماعت اس کو بہتر سمجھے تو ایسا کر لیا جائے۔

یہ گفتگو میری اور شرقی صاحب کی تنہائی میں غالباً اسٹیشن سے قیام گاہ جاتے ہوئے ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ وقت آیا کہ مجلس شوریٰ باقاعدہ شروع ہوئی۔ اپنی سخت کمزوری کی وجہ سے میں نے عرض کر دیا تھا کہ مجھے صرف اس وقت بلوا لیا جائے۔ جب میری شرکت خاص طور سے ضروری ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، جب مجلس شوریٰ میں وہ مسئلہ آنے لگا جس کا مجھ سے تعلق تھا تو مجھے بلا لیا گیا اور میں مجلس میں شریک ہو گیا، جہاں تک اب یاد ہے پہلے مودودی صاحب نے اس کا اظہار کر کے کہ بعض ارکان کو موجودہ امارت پر پورا اطمینان نہیں ہے، اپنی طرف سے دو تین تجویزیں رکھیں۔ غالباً اُن میں سے ایک یہ تھی کہ مجلس اگر منظور کر لے تو وہ مستعفی ہو جائیں اور ان کی جگہ کوئی دوسرا امیر منتخب کر لیا جائے اور دوسری شاید یہ تھی کہ بجائے امیر کے دو چار ارکان کا ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ اور تیسری تجویز وہ تھی جس کا ذکر مجھ سے شرقی صاحب نے کیا تھا اور بتایا تھا کہ مودودی صاحب ایسا کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے نزدیک موجودہ صورت میں یہی سب سے بہتر حل ہے۔

بہرحال مودودی صاحب نے یہ سب تجویزیں مجلس کے سامنے رکھیں، لیکن اس طرح رکھیں کہ دوسروں کے دلوں کا تو مجھے علم نہیں۔ مگر کم از کم مجھے تو اُن کے طرز سے صاف محسوس ہو گیا کہ وہ ہر تجویز پیش کرنے کے ساتھ ارکان مجلس کے ذہنوں کو اس کے لیے تیار کرتے

جاتے ہیں کہ وہ اِن میں سے ہر تجویز کو جماعت اور اُس کے مقدس مقصد کے لیے مضر بلکہ مہلک سمجھیں اور اس لیے لا محالہ اسے رد کر دیں۔

خود میرا یہ حال تھا کہ چونکہ میں ابھی تک اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا اس لیے میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس مجلس میں خاموش رہوں گا، چنانچہ میں خاموش رہا، البتہ جب اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ کسی دوسرے کو امیر منتخب کر لیا جائے تو مجھ سے کہا گیا کہ تم اس ذمہ داری کو قبول کر لو۔ میں نے عرض کیا کہ میں اب سے بہت پہلے، جماعت اسلامی کی تاسیس سے بھی پہلے اپنے کو خوب ناپ تول کر یہ رائے قائم کر چکا ہوں کہ میں کسی جماعت کا امیر بننے کے لائق نہیں ہوں ——— یاد آتا ہے کہ مجلس کی وہ نشست ختم ہونے کے بعد نجی طور پر بھی مجھ سے اس بارے میں گفتگو کی گئی اور بعض مخلص احباب نے زیادہ اصرار کیا اور جب میں نے اپنے اسی عذر کا اعادہ کیا اور اپنے بارے میں پھر وہی بات کہی جو میں مجلس میں بھی کہہ چکا تھا تو انھوں نے فرمایا کہ ہماری سمجھ میں آپ کی یہ بات بالکل نہیں آتی کہ آپ امارت کے لائق نہیں ہیں۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ یہ حدیث تو آپ کے علم میں ہوگی، کہ حضرت ابوذر غفاری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا "اِنِّیْ اَرٰی فِیْکَ ضَعْفًا فَلَا تَوَلَّیَنَّ عَلٰی اثْنَیْنِ"[1] (او کما قال) ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر کی جس کمزوری کا ذکر فرمایا ہے اس سے آپ کی مراد جسمانی کمزوری تو تھی نہیں بلکہ کسی خاص صلاحیت کی کمی مراد تھی تو واقعہ یہی ہے کہ میں نے اپنے کو بار بار تول کر یہی رائے قائم کی ہے کہ مجھ میں بعض اُن صلاحیتوں کی کمی ہے جو اتنی بڑی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے میں اپنے متعلق یہی فیصلہ کیے ہوئے ہوں کہ امیر بننے کے لائق میں نہیں ہوں۔ اور مجھے اس بارے میں اطمینان ہے کہ اللہ کے نزدیک بھی اس فیصلہ پر میں معذور سمجھا جاؤں گا۔ بہرحال امارت سے متعلق اس خاص گفتگو کے علاوہ میں مجلس کی اس پوری کارروائی میں خاموش اور

---

[1] اے ابوذر میں تم میں کوئی خاص کمزوری دیکھتا ہوں اس لیے میری تاکید ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ تم دو آدمیوں کے بھی حاکم بنائے جاؤ۔ ۱۲ م

صرف سامع اور مشاہد رہا، اور اس کی وجہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہی تھی کہ میں اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر بات چلی تو ممکن ہے کسی منزل پر ان چیزوں کا تذکرہ صراحت کے ساتھ آجائے جن کی صراحت میں کسی حال میں مناسب نہیں سمجھتا تھا، حتیٰ کہ خود مولانا مودودی کو جو خط اس سلسلہ میں میں نے لکھا تھا اس میں بھی میں نے اُن چیزوں کی صراحت نہیں کی تھی بلکہ یاد آتا ہے کہ "تقوے کی محسوس کمی" جیسے مبہم الفاظ لکھ دیے تھے جن کا منشاء اور مصداق خود مولانا تو سمجھ سکتے تھے یا دارالاسلام میں ساتھ رہنے والے رفقاء شاید کچھ سمجھ سکتے تھے۔ لیکن دوسرے حضرات نہیں سمجھ سکتے تھے (بلکہ میں نے اس خط کے بارے میں بھی مولانا سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کو اپنے ہی تک رکھیں)

الغرض جماعت کی مجلس شوریٰ کے اس جلسہ میں جتنی دیر کے لیے میں شریک ہو سکا اس میں بھی صرف سامع اور مشاہد ہی رہا کیونکہ میں اس وقت تک اپنے بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا البتہ دارالاسلام کے مقیم رفقاء میں سے قمرالدین صاحب وغیرہ نے (جو مولانا مودودی کے حال اور طرزِ عمل سے جماعتی کام کے بارہ میں اپنی مایوسی، اور بے اطمینانی ظاہر کر چکے تھے) مولانا موصوف کی پیش کی ہوئی آخری تجویز سے اپنا اتفاق ظاہر کیا اور ایک حد تک اس کی کوشش کی کہ مجلس اس کو منظور کر لے، لیکن مجلس کی اکثریت نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اور فیصلہ یہی ہوا کہ جماعت کے نظام میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے اور جو لوگ اپنی بے اطمینانی کی وجہ سے اس نظام کے ساتھ رہنا پسند نہ کریں وہ چاہیں تو اپنے کو نظامِ جماعت سے الگ کر کے کام کریں۔

اس فیصلہ کے بعد قمرالدین صاحب مولانا جعفر صاحب اور غالباً ان کے ہم خیال اور بھی ایک دو ارکان نے جماعت سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور وہیں اس کا اظہار بھی کر دیا۔

یہ مسئلہ جب اس طرح ختم ہو گیا تو میں نے اپنی کمزوری کی وجہ سے مولانا مودودی اور دوسرے دوستوں سے عرض کیا کہ اب اگر میری کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو مجھے واپسی کی اجازت دیدی جائے۔ اُن حضرات نے اجازت دے دی اور میں سنبھل واپس آگیا

ور اپنے بارے میں یہی عرض کر آیا کہ اس وقت تک تو میں اسی جگہ ہوں جہاں رمضان سے
پہلے دارالاسلام میں تھا اور اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکا ہوں، البتہ اتنا میں
اب بھی عرض کرتا ہوں کہ خود میری انتہائی خواہش یہی ہے کہ میں اسی طرح جماعت
سے متعلق رہوں، اس بارے میں میرے لیے جو خاص مشکل اور الجھن پیش آگئی ہے اگر اس کا
کوئی حل میری سمجھ میں آگیا تو میں انشاء اللہ یہی فیصلہ کروں گا اور اطلاع دے دوں گا۔

بہر حال میں اُن حضرات سے اجازت لے کر چلا آیا۔ اور مجلس کی کارروائی اس کے
بعد بھی جاری رہی۔ چند روز بعد لکھنؤ سے مولانا علی میاں کا خط مجھے ملا۔ اس میں انھوں نے
دوسری باتوں کے ساتھ مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ تمہارے چلے جانے کے بعد مولانا مودودی صاحب
نے تمہارا وہ خط مجلس کو سنایا جو تم نے اُن کو لکھا تھا۔ اور اپنا جواب بھی سنایا ——— مولانا
علی میاں نے اپنے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگرچہ خود میں نے جماعت سے وابستہ رہی
رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔[1] لیکن تمہارا خط سُن کے دل میں تمہاری محبت اور وقعت اور زیادہ بڑھ گئی۔

مولانا علی میاں کے اس خط سے یہ معلوم کر کے کہ مولانا نے میرا خط میرے آنے کے بعد مجلس میں پیش
کیا مجھے افسوس اور دکھ ہوا۔ (اگر اُن کو مجلس میں اسکو پیش کرنا تھا تو میری موجودگی میں پیش کرنا چاہیے تھا۔)

کچھ عرصہ کے بعد جب بیماری کے اثرات ختم ہوئے اور تندرستی و توانائی کچھ لوٹ آئی
تو میں نے اپنے مسئلہ میں بعض ایسے حضرات سے مشورہ کرنے کے لیے جن کو میں اس کا اہل سمجھتا تھا مستقل
سفر کیا۔ اس مشورہ اور ذاتی غور و فکر کے بعد میری رائے یہ قائم ہوگئی کہ اس غلط شہادت کی ذمہ داری
سے نکلنے کے لیے میرے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی بے اطمینانی ظاہر کر کے میں جماعت سے ضابطہ کا
اپنا تعلق توڑ دوں، لیکن میں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ صراحت اور تفصیل سے میں ان باتوں کو
بھی بیان کروں جو میری بے اطمینانی اور آخر کار اس قطع تعلق کا باعث ہوئی ہیں۔ اس کے بعد
میں نے جماعت سے علاحدگی کا فیصلہ کر لیا اور دلی رنج و قلق کے ساتھ ایک خط کے ذریعہ اپنے اس فیصلہ کی

---

[1] یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد مولانا علی میاں نے اپنے کو جماعت اسلامی سے الگ کر لیا تھا۔
لیکن ان کی علاحدگی کا میرے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ مجھے ان کی علاحدگی کا علم بھی عرصہ کے بعد ہوا تھا۔ م

اطلاع میں نے مولانا مودودی صاحب کو دے دی[1] ——— اس وقت تک میرے اور مولانا موصوف کے درمیان جو بات چیت اور خط وکتابت اس سلسلہ میں ہوتی رہی اس میں پوری خوش گواری رہی، لیکن اس اطلاع کے بعد مولانا کا جو خط آیا اُس کا رنگ بالکل دوسرا تھا اور اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولانا کو یہ وہم ہوگیا کہ اب جب کہ میں نے جماعت سے علاحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے تو شاید میرا رویہ بھی بدل جائے گا اور جن باتوں کے اظہار سے ابتک میں بچتا رہا ہوں اب میں اُن کے برملا اظہار و اعلان پر آمادہ ہو جاؤں گا اور اُنکے بارہ میں خدا جانے کیا کیا کہوں گا اور لکھوں گا بہر حال جہاں تک میں سمجھ سکا اس موہوم خطرہ کے انسداد ہی کے لیے انھوں نے وہ خط مجھے اس انداز میں لکھا اور اس کے ذریعہ گویا مجھے خبردار کیا کہ اگر ضرورت اور مصلحت داعی ہو تو وہ کن حدود تک جا سکتے ہیں۔ اس خط سے مجھ پر یہ چیز اور بھی زیادہ واضح ہوگئی کہ مولانا میں سچی دینداری اور خدا ترسی کی کتنی کمی ہے، اور تقویٰ اور فکرِ آخرت کی نہایت موثر دعوت دینے کے باوجود ان صفات کے لحاظ سے خود ان کا حال اور مقام کیا ہے ——— اور اگر ضرورت پڑے تو وہ عام دنیا دار اور ناخدا ترس لیڈروں اور صحافیوں کی سطح پر بھی آسکتے ہیں ——— لیکن میں نے اس کو بھی اُن کی بس ایک افسوسناک "کمزوری" ہی سمجھا، اور اپنے لیے جس رویہ کا فیصلہ کیا تھا اسی پر قائم رہا اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس وقت میں اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا کہ میری کسی بات سے جماعت کی اصل دعوت کو نقصان پہنچے اور اُس کی ہوا خیزی ہو۔

اس کے بعد میں نے اپنی بے اطمینانی اور علاحدگی کے بارے میں "الفرقان" میں بھی ایک بہت مختصر نوٹ "اپنے متعلق ایک اطلاع" کے زیرِ عنوان لکھ دیا اور اسی کے ساتھ یہ بھی صاف ظاہر کردیا کہ جماعت کی اصل دعوت اور مقصد کے ساتھ مجھے اب بھی اتفاق ہے اور میری ہمدردیاں اس کے ساتھ باقی ہیں۔

الفرقان کا وہ نوٹ ذیل میں درج کیا جارہا ہے ناظرین کرام اس کو بھی پڑھ لیں۔

[1] یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دہلی کی اس مجلس شوریٰ کی روداد خود مولانا مودودی صاحب نے مرتب کر کے شائع کی تھی، افسوس ہے کہ اس میں انھوں نے ایک خاص سیاسی قسم کی مصلحت سے بالکل خلاف واقعہ یہ ظاہر کیا تھا کہ اس ناچیز نے بھی اسی مجلس شوریٰ میں قمرالدین خاں صاحب وغیرہ کے ساتھ ہی جماعت سے علاحدگی اختیار کرلی تھی۔ اصل واقعہ وہی ہے جو یہاں لکھا گیا ہے۔ ۱۲ م

اپنے متعلق ایک اطلاع

احباب کرام کو معلوم ہے کہ اب سے قریباً پونے دو سال پہلے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے زیر قیادت و امارت، جو ایک "جماعت" بنی تھی یہ عاجز "مدیر الفرقان" بھی اس میں شریک تھا، اور اس "جماعت" و "دعوت" کے تعارف اور مقاصد کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں "الفرقان" میں بھی کافی لکھا تھا، پھر یہ عاجز "جماعت" کے موجودہ مرکز و مستقر (بستی دارالاسلام) ہی میں چلا گیا تھا اور خیالات و عزائم اس سلسلہ میں اس سے کچھ آگے بھی تھے۔ بعض خاص احباب کو جن کا کچھ علم بھی ہے، لیکن کسی دوسرے سے شکوہ نہیں، اپنی ہی حرماں نصیبی کا گلہ مند ہوں کہ اس مرحلہ ہی میں بعض ایسے خلاف توقع امور سامنے آئے کہ جس اطمینان اور جن امیدوں اور جن اندازوں کی بنا پر میں نے اس نظام سے وابستگی اختیار کی تھی اور اپنے حق میں یہ فیصلہ کیا تھا ان میں میرے لیے فرق آگیا اور مجھے اپنے معاملہ پر نظر ثانی کرنا ناگزیر معلوم ہوا ——— پھر جتنا غور و فکر میرے لیے ممکن تھا میں نے اپنی دانست میں اس سے پورا کام لینے کے بعد اس نظام جماعت سے اپنے کو علاحدہ کر لینا ہی ضروری سمجھا اور بالآخر دلی رنج و قلق کے ساتھ اپنے کو الگ ہی کر لیا۔

غلط فہمی نہ ہو، میری یہ علاحدگی کسی اصولی اختلاف کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اس کا باعث دراصل کچھ شخصی قسم کی چیزیں ہوئی ہیں جن کے باوجود وابستہ رہنا میں نے اپنے لیے صحیح نہیں سمجھا اور ان کا کوئی اطمینان بخش اصلاحی حل بھی میں نہیں پا سکا۔ نیز میری یہ علاحدگی صرف اس مخصوص نظام جماعت سے ہے یعنی اب میں اس کا باضابطہ "رکن" نہیں رہا ہوں، مگر اس کے بنیادی مقصد اور اس کی اصل دعوت کو پہلے ہی کی طرح بالکل پہلے ہی کی طرح صحیح سمجھتا ہوں، اسی لیے اگرچہ جماعت کی باضابطہ شرکت اور اس کی ذمہ داریوں سے

میں سبکدوش ہو چکا ہوں لیکن پھر بھی اس کے اصل مقصد کے ساتھ میری وابستگی ویسی ہی ہے اور میں اللہ پاک سے اس راہ میں جد وجہد کی بیش از بیش توفیق مانگتا ہوں، نیز "باضابطہ تعلق" کے بغیر اگر مقصد میں میں کوئی مدد دے سکا تو انشاء اللہ تعالیٰ اب بھی بقدر امکان و وسعت "نصح دینی" اور "تعاون علی الخیر" سے دریغ نہ ہوگا۔

ان سطور کے لکھنے کی خاص غرض صرف ان حضرات کو اپنی اس علاحدگی کی اطلاع دینا ہے جو میری باضابطہ وابستگی اور سرگرم وابستگی سے تو واقف تھے لیکن میرے اس جدید فیصلہ کا ان کو علم نہیں ہے اور اس لیے وہ مجھے اس جماعت کا "ذمہ دار خادم" اور "باضابطہ رکن" سمجھ کر ہی معاملہ کرتے ہیں، حالانکہ میں اپنی اس حیثیت کو ختم کر کے اس سلسلہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں ــــــ بہر حال اس اعلان کی اصل غرض صرف اتنی ہی ہے، اس لیے میں نے ان امور کی تفصیل بلکہ ان کی طرف اشارہ بھی ضروری نہیں سمجھا جو میرے لیے فیصلہ کی اس تبدیلی کا باعث ہوئے ہیں۔

عام خیال کے مطابق اس سلسلہ کی تفصیلات کے اظہار کے لیے جو دواعی اور جو محرکات یا موجبات میرے لیے ہو سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض یقیناً کچھ اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ غالباً وہ سب ہی میرے سامنے ہیں۔ لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود میرا فیصلہ ابھی تک یہی ہے کہ خیر و مصلحت اپنی ذات کی نہیں بلکہ دین کی ان تفصیلات کے عدم اظہار ہی میں ہے۔ لہٰذا کوئی دوست مزید انکشاف کی امید میں اس بارہ میں مجھ سے نجی خط کتابت بھی نہ فرمائیں۔

والمسئول من اللہ تعالیٰ ان یوفقنا لما یحب ویرضیٰ ولا یخزینا فی الدنیا والآخرۃ

(الفرقان بابت ربیعین ۱۳۶۲ھ ص ۴)

یہاں تک جو کچھ قارئین کرام نے پڑھا وہ مولانا مودودی صاحب کے ساتھ اس عاجز کے ربط و تعلق اور پھر ۱۹۴۱ء میں "جماعت اسلامی" کی تاسیس و تشکیل میں سرگرم شرکت اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دلی رنج و افسوس کے ساتھ جماعت سے قطع تعلق کی روداد اور سرگذشت تھی ـــــ ظاہر ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں مختلف مرحلوں پر اپنے بارہ میں جو فیصلے اور اقدامات کیے اُن میں سے بہت سوں کو جماعت اسلامی کے مخالفین میری بہت بڑی غلطی سمجھیں گے، اور جماعت اسلامی کے حضرات ان کو ایمان و اسلام کا عین تقاضا ـــــ اور بعض دوسرے فیصلوں اور اقدامات کے بارہ میں دونوں فریقوں کی رائے اس کے بالکل برعکس ہو گی ـــــ لیکن میں نے واقع میں غلط کیا ہو یا صحیح، میری زندگی کے ان سالوں کی روداد اور سرگذشت بہر حال یہی ہے ـــــ مجھے خود اعتراف ہے کہ اس سلسلہ میں مجھ سے بڑی بڑی غلطیاں ہوئیں، لیکن اپنے رب کریم سے، جو علیم بما فی الصدور اور ارحم الراحمین ہے مجھے پوری امید ہے کہ وہ ان غلطیوں پر مجھ سے مواخذہ نہ فرمائے گا ـــــ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔

جماعت سے قطع تعلق کے بعد

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ساتھ اپنے تعلق اور پھر قطع تعلق کی جو سرگزشت گزشتہ صفحات میں ذکر کی گئی اُس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ قطع تعلق کے آخری فیصلہ تک بھی میں نے مودودی صاحب میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی تھی جس کو میں زیغ وضلال یا امت کے حق میں فتنہ سمجھتا ـــــ ہاں ایسی عملی کمزوریاں بار بار سامنے آئیں جو میرے نزدیک اُس اعلیٰ مقام سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں جس پر میں ان کو احیاء دین و اسلامی انقلاب کی دعوت کے علمبردار "جماعت اسلامی" کے امیر و مرشد عام اور اپنے ایک محبوب دینی دوست کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جیسا کہ معلوم ہو چکا یہ عملی کمزوریاں میرے لیے جماعت سے قطع تعلق کا اصل موجب نہیں بنیں۔ میں خود نہ اُس وقت ایسی عملی کمزوریوں سے پاک تھا نہ اِس وقت محفوظ ہوں۔ ظاہر و باطن کے بہت سے گناہوں میں اُس وقت بھی ملوث تھا اور آج بھی ملوث ہوں۔ ـــــ اگر میرے لیے "شہادت" کا وہ مسئلہ پیدا نہ ہو گیا ہوتا جس کا پچھلے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے تو صرف ان عملی کمزوریوں کی وجہ سے میں جماعت سے تعلق منقطع نہ کرتا جبکہ میں جماعت کی اصل دعوت کو اُس وقت بنیادی طور پر احیاء دین اور اسلامی انقلاب ہی کی دعوت سمجھتا تھا اور مودودی صاحب کی فکر و بصیرت کے بارہ میں جو غیر معمولی حسن ظن تھا وہ بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔

جماعت سے ضابطہ کا تعلق ختم کرنے کے بعد بھی میرے دل اور میرے عمل میں طویل مدت تک اُس کی خیر خواہی و ہمدردی رہی اور جماعت کے اکثر حضرات کا تعلق بھی میرے ساتھ اخلاص و محبت کا رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے ایک دو واقعے بھی ذکر کر دوں ـــــ جماعت سے قطع تعلق کے غالباً سال ڈیڑھ سال بعد کا واقعہ ہے، میں دہلی گیا ہوا تھا، جامع مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی، وہاں جماعت اسلامی کے چند اہم ارکان

سے جو قریباً سب ہی میرے دوست احباب تھے اتفاقاً ملاقات ہوگئی، ان میں بھائی عبدالعزیز شرقی صاحب بھی تھے جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، ان حضرات سے معلوم ہوا کہ یہاں دہلی میں اس وقت جماعت اسلامی یا اس کی مجلس شوریٰ کا جلسہ ہو رہا ہے، شرقی صاحب اور ان کے ساتھ دوسرے احباب بھی مصر ہوئے کہ میں ان کے ساتھ جلسہ گاہ چلوں، میرا چونکہ جماعت کے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رہا تھا اس لیے مجھے جانے میں تکلف تھا، میں نے معذرت کی تو شرقی صاحب نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور کہا کہ نہیں آپ کو چلنا ہوگا، بہرحال میں نے ان حضرات کی فرمائش کی تعمیل کی، جلسہ گاہ یا قیام گاہ پہنچا، مولانا مودودی صاحب اور سب حضرات سے ملاقات ہوئی، سب نے بڑی محبت اور مسرت کا اظہار کیا، ان میں کئی ایک حضرات نے اس پر بھی اصرار کیا کہ میں پھر "جماعت" میں واپس آجاؤں، جہاں تک یاد ہے اس اصرار میں سب سے زیادہ حصہ مرحوم ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب کا تھا، یہ حضرات اس اصرار میں بلاشبہ مخلص تھے، ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ میرے لیے "جماعت" سے قطع تعلق کا موجب کیا تھا، بہرحال میں نے مناسب انداز میں معذرت کردی۔

اس سلسلہ کا دوسرا قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ بہار کے کسی مقام پر (غالباً پٹنہ یا دربھنگہ) جماعت اسلامی کا کوئی اہم اجتماع تھا، مولانا مودودی صاحب اور جماعت کے دوسرے تمام اہم حضرات کو جس ٹرین سے سفر کرنا تھا وہ بریلی ہو کر جاتی تھی، جماعت کے مرکز دارالاسلام سے مجھے کسی نے اطلاع دی کہ ہماری ٹرین فلاں دن فلاں وقت بریلی اسٹیشن پہنچے گی، مقصد یہ تھا کہ میں ان حضرات سے اسٹیشن پر ملاقات کرلوں، چنانچہ مقررہ وقت پر میں اسٹیشن گیا، تھرڈ کلاس کے ایک پورے ڈبہ میں جماعت کے سب ہی اہم ارکان تھے، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مسعود عالم مرحوم، ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم وغیرہ۔ مولانا مودودی صاحب کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس وجہ سے وہ اکیلے سکنڈ کلاس میں تھے، سب حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں سے کئی ایک حضرات نے اصرار فرمایا کہ اسٹیشن کی یہ کھڑے کھڑے کی ملاقات کافی نہیں، آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں نے شاہجہانپور کا ٹکٹ منگوا لیا اور ان حضرات کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نماز مغرب کا وقت آگیا، سب حضرات نے

اصرار کیا کہ نماز میں پڑھاؤں؛ میں نے ہر چند معذرت کی اور اصرار کیا کہ آپ حضرات ہی میں سے کسی کو امامت کرنی چاہیے ـــــ لیکن ان سب حضرات نے مجبور کر دیا اور نماز مجھ ہی سے پڑھوائی" ـــــ

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت سے قطع تعلق کے بعد بھی جماعت کے ارباب حل و عقد کا میرے ساتھ اور میرا اُن حضرات کے ساتھ کیا تعلق رہا ـــــ قطع تعلق کے بعد طویل مدت تک میرا حال یہ رہا کہ اگر کوئی صاحب میرے سامنے جماعت اسلامی کے خلاف کوئی بات کہتے اور میں اُن سے گفتگو کرنا نامناسب نہ سمجھتا تو جماعت کی طرف سے مدافعت اور جواب دہی کرتا ـــــ اسی زمانہ میں میرے بعض محترم بزرگوں کی طرف سے مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے بارہ میں سخت رائے کا اظہار کیا گیا تو مجھے یاد ہے کہ میرے اندر اُس کے خلاف سخت برہمی پیدا ہوئی اور میں نے اپنے اُن محترم بزرگ کو ایسے انداز اور لب و لہجہ میں خط لکھا جس کی میرے اور اُن کے تعلق کی نوعیت میں قطعاً گنجائش نہیں تھی ـــــ مجھے ہمیشہ اپنی اس غلطی پر افسوس رہے گا۔

پھر ایک وقت آیا کہ میں نے محسوس کیا کہ جماعت اسلامی کے حلقہ میں یا کہنا چاہیے کہ مودودی صاحب کی تحریروں سے متاثر ہونے والوں میں یہ ذہنیت عام طور سے پیدا ہو رہی ہے کہ دین اور اس کے تقاضوں کو اگلوں نے صحیح نہیں سمجھا، اب بس مودودی صاحب نے صحیح سمجھا ہے ـــــ میں چونکہ اس ذہنیت کو اُس وقت بھی بہت بڑی گمراہی اور بڑی سے بڑی گمراہیوں کی جڑ بنیاد سمجھتا تھا اس لیے اس احساس کے بعد سے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے متعلق میری رائے اور رویہ میں فرق آگیا اور یہاں سے ذہن نے دوسری طرح سوچنا شروع کر دیا۔

پھر کچھ مدت کے بعد (۱۹۵۶ء کے اواخر میں) میرا پاکستان کا سفر ہوا، یہ وہ وقت تھا کہ وہاں کی جماعت اسلامی کے صف اول کے ارکان اور ممتاز عمائد کو مودودی صاحب سے سخت اختلاف ہو گیا تھا (اور یہ اختلاف خالص دینی بنیاد پر تھا)، اور بالآخر انھوں نے جماعت

سے علاحدگی اختیار کر لی تھی ——— یہ تھے غازی عبد الجبار صاحب، مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب (مدیر "المنبر لائل پور") اور مولانا عبد الغفار حسن صاحب (حال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) اور اسی سطح کے ان کے بعض اور رفقا ——— مولانا امین احسن اصلاحی بھی ان حضرات کے ہم خیال اور شریک حال تھے، لیکن انھوں نے اس وقت تک جماعت سے علاحدگی اختیار نہیں کی تھی، ——— بعد میں انھوں نے بھی جماعت سے تعلق منقطع کر لیا تھا۔[1]

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ حضرات "جماعت اسلامی" کی صف اول کے ارباب حل و عقد تھے اور میرے سب جانے پہچانے دوست احباب تھے، اور اس کے اظہار میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ کم از کم راقم سطور کے ذاتی علم و تجربہ میں یہ حضرات دیانت اور تقوے کے لحاظ سے مودودی صاحب سے زیادہ قابل اعتماد تھے (واللہ اعلم باحوال عبادہ) ———

ان حضرات سے ملاقات ہوئی تو اس اختلاف کی پوری تفصیل علم میں آئی۔ جو کچھ ان حضرات نے بتلایا بختصر الفاظ میں اس کا حاصل یہ تھا ——— کہ ہم لوگ کچھ عرصہ سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ مودودی صاحب راستہ بدل رہے ہیں، اُن کے سامنے اب مسئلہ صرف حصول اقتدار کا ہے اور اس مقصد کے لیے عام سیاسی پارٹیوں کی طرح جس وقت جو پالیسی وہ اختیار کرنا مناسب سمجھیں اختیار کرنے پر آمادہ ہیں چاہے وہ اسلامی اصول و تعلیمات کے کتنے ہی خلاف ہو، وہ اس کو اختیار کریں گے اور اسلام ہی کا نام لیکر اختیار کریں گے اور اس کے لیے اُن کو اگر ضرورت ہوگی تو اسلامی اصول و تعلیمات کی من مانی تشریح کریں گے؛ لیکن ہم لوگ اس کو سخت ضلال اور فتنہ سمجھتے ہیں، ہم نے کوشش کی کہ مودودی صاحب کو اور جماعت کو اس راستہ پر چلنے نہ دیں، مدت تک یہ کشمکش اندر ہی اندر چلتی رہی لیکن مودودی صاحب اس پالیسی سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور آج کل کے سیاستہ کاروں کی جیسی چالوں کے ذریعہ انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ہم لوگوں کو ہی جماعت سے الگ ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

---

[1] یہ صرف صف اوّل کے بلکہ صف اول میں بھی چوٹی کے چند حضرات کے نام یہاں لکھے گئے ہیں، ورنہ اس وقت جماعت سے قطع تعلق کرنے والوں کی تعداد ۵۰ کے قریب تھی، جیسا کہ حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب کے اخبار "المنبر لائل پور" سے معلوم ہوا تھا۔

راقم سطور نے اپنے امکان کی حد تک ان مختصر الفاظ میں اُن حضرات کے بیان کا حاصل اور خلاصہ عرض کر دیا ہے ـــــ ان واقعات کی تفصیل جو اُن حضرات سے معلوم ہوئی تھی بہت تطویل طلب اور ایک پورا دفتر ہے ـــــ اُسی زمانہ میں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنے اخبار "المنبر" میں ان واقعات کو خاصی تفصیل سے لکھا تھا (اس سلسلہ کے اُن کے بعض مضامین انہی دنوں الفرقان میں بھی شائع ہوئے تھے)۔ اُس کے بعد "جماعت اسلامی پاکستان" کے ایک بڑے پرجوش اور باصلاحیت رکن اور مولانا مودودی کے فدائی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے (جو مودودی صاحب کے ساتھ اسی اختلاف کی بناء پر جماعت سے الگ ہو گئے تھے) انہی واقعات سے متعلق قریباً ڈھائی سو صفحہ کی ایک پوری کتاب "تحریک جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے لکھی ـــــ اس میں "جماعت اسلامی" پاکستان کی اب سے ۲۴-۲۵ سال پہلے کی اُس اندرونی کش مکش اور اُس سلسلہ کے واقعات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے ـــــ لیکن حاصل اور خلاصہ اس کا بھی وہی ہے جو اوپر چند سطروں میں راقم سطور نے عرض کیا ہے۔ اس کے بعد انہی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اسی موضوع پر ایک اور رسالہ "نقض غزل" کے نام سے بھی لکھا ہے، ڈاکٹر صاحب کی یہ دونوں کتابیں قابل مطالعہ ہیں۔

الغرض پاکستان کے اس سفر میں ان حضرات کے ذریعہ جو کچھ علم میں آیا، خاصکر مودودی صاحب کے "دینی حکمت عملی" کے فلسفہ کی جو تفصیل معلوم ہوئی اور جماعت کے مزاج اور رخ کی تبدیلی کے بارہ میں جو کچھ ان حضرات سے سنا (جس کی بعد کے واقعات و تجربات نے بھی پوری تصدیق و توثیق کی) اُس نے دل و دماغ کی آنکھوں پر پڑا ہوا وہ پردہ پوری طرح اٹھا دیا جو قریباً ۱۵ سال سے مودودی صاحب کی دینی فہم و بصیرت کے بارہ میں حد سے بڑھے ہوئے حسن ظن اور ان کی اسلامی انقلاب کی دعوت کی کشش نے ڈال رکھا تھا۔

میری غلطی کی اصل بنیاد | اپنی اس سرگزشت کے سارے مرحلوں پر غور کر کے راقم سطور اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مودودی صاحب اور جماعت اسلامی سے تعلق کی غلطی میں کم از کم

میری ذات کی حد تک دو عامل خاص طور سے کارفرما رہے ہیں۔

اوّل:- "تحریک خلافت" اور بعض دوسرے تحریکات کی پیدا کی ہوئی "اسلامی انقلاب" کی آرزو اور اس کے لیے کچھ کرنے کا قلبی داعیہ، جس کو ۱۹۳۹ء میں شروع ہونے والی "دوسری جنگ عظیم" کے پیدا کیے ہوئے خاص حالات نے اُس کے کچھ امکانات دکھا کر تیز اور مشتعل کر دیا تھا۔

دوسرا:- "ترجمان القرآن" کے ابتدائی دور کے مطالعہ سے مولانا مودودی کے بارہ میں میرے قلب و ذہن کا غیر معمولی تاثر اور اُن کے ساتھ حد سے بڑھا ہوا وہ حسن ظن۔ جو شاید میری فطری اور طبعی کمزوریوں میں سے ہے۔ عربی کا ایک مشہور حکیمانہ مصرع ہے ــــ "عین الرضا عن کل عیب کلیلۃ" اور اسی کے ہم معنی مشہور عربی مقولہ ہے "حبّک الشیٔ یعمی ویصم" جن کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی چیز کی محبت آدمی کے قلب و ذہن پر چھا جاتی ہے تو آنکھ اور کان دل کے تابع ہو کر اس پسندیدہ اور مرغوب و محبوب چیز میں کوئی عیب اور خرابی دیکھنے اور سننے کے لائق نہیں رہتے۔

مودودی صاحب کے ساتھ "ترجمان القرآن" کے ذریعہ اب سے قریباً نصف صدی پہلے جس طرح ابتداءً تعلق قائم ہوا اور اس کے بعد قلب و ذہن جس طرح اُن سے متاثر اور اُن کے گرویدہ ہوتے گئے، اور پھر ۱۹۴۱ء میں احیاء دین اور اسلامی انقلاب کی اُن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جماعت اسلامی کی تاسیس کے وقت راقم سطور نے جس طرح سب سے پہلے اُس میں شرکت و رفاقت قبول کی اور سمع و طاعت فی المعروف کا عہد کیا، پھر جس جوش و جذبہ کے ساتھ الفرقان کے ذریعہ اور چل پھر کر بھی دوسروں کو اُس کی دعوت دی اور اُس کو گویا وظیفۂ حیات بنا لیا ــــ اور پھر جس مجبوری سے شدید رنج و قلق کے ساتھ جماعت سے علاحدگی اختیار کرنی پڑی ــــ ان سب مراحل کا ذکر تو پچھلے صفحات میں آچکا ہے ــــ واقعہ یہ ہے کہ اس پوری مدت میں (بلکہ اس کے بہت بعد تک بھی) اس عاجز کے قلب و ذہن پر مودودی صاحب اور "جماعت اسلامی" کی دعوت کے بارہ میں حسن ظن یا خوش فہمی کا ایسا غلبہ رہا کہ میری نگاہ نے اس طویل مدت میں ان کی تحریروں میں کوئی

ایسی چیز نہیں محسوس کی جس کو میں امت کے لیے گمراہ کن یا دین میں فتنہ سمجھتا اور اس کو کسی اچھے محل پر محمول نہ کر سکتا ـــــ یہ بات یاد ہے کہ ان کی بعض تحریروں میں بے اعتدالی اور خوارج کی سی شدت محسوس ہوتی تھی لیکن یہ خیال کر کے میں اپنے کو مطمئن کر لیتا تھا یا کم از کم اس کو نظر انداز کر دیتا تھا کہ یہ "دعوت" کی زبان ہے "فتوے" کی زبان نہیں ہے یاد آتا ہے مولانا مودودی نے اپنی ایسی تحریروں کے بارہ میں یہ بات خود لکھی بھی تھی۔

مودودی صاحب کے بعض نظریات جو اُمّت کے لیے فتنہ بن سکتے ہیں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں بعض ایسی چیزیں اُس وقت بھی موجود تھیں جو اُمّت کے لیے گمراہ کن اور فتنہ کا باعث بن سکتی ہیں مگر جیسا کہ عرض کیا اسلامی انقلاب کی دعوت سے مسحور اور مودودی صاحب کی محبت اور حسن ظن سے مغلوب ذہن نے اُس وقت اس کا ادراک نہیں کیا ـــ (وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ)

ان سب میں زیادہ سنگین اور خطرناک اس عاجز کے نزدیک اُن کا وہ نقطۂ نظر ہے جو قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں (الٰہ ـــ رب ـــ عبادت ـــ دین) کے بارہ میں اور اس کی بنیاد پر پورے قرآن اور اس کے پیغام کے فہم کے بارہ میں "دین کی چار بنیادی اصطلاحیں" نامی اپنی تصنیف میں انھوں نے پیش کیا ہے ـــ یہ عاجز پہلے اسی کے بارہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائے اور توفیق دے کہ میں مسئلہ کو اس طرح پیش کر سکوں کہ اوسط درجہ کے اصحاب فہم بھی سمجھ سکیں اور اتمام حجت کا حق ادا ہو جائے۔

مولانا مودودی کی انتہائی خطرناک غلطی

مولانا مودودی صاحب اپنی اس کتاب کے بالکل شروع میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"الٰہ، رب، دین اور عبادت، یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن کی ساری دعوت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اکیلا رب اور الٰہ ہے، اس کے سوا نہ کوئی الٰہ ہے نہ رب اور نہ الوہیت و ربوبیت میں کوئی اس کا شریک ہے، لہٰذا اسی کو اپنا الٰہ و رب تسلیم کرو، اور اس کے سوا ہر ایک کی الٰہیت و ربوبیت سے انکار کر دو، اس کی عبادت اختیار کرو، اور اس کے سوا کسی کی عبادت

کرو، اس کے لیے اپنے دین کو خالص کر لو اور ہر دوسرے دین کو رد کر دو۔"

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص۵)

ان سطروں میں جو کچھ مودودی صاحب نے فرمایا ہے بلاشبہ حق و صحیح ہے۔ قرآن کی بنیادی دعوت یہی ہے، جو مودودی صاحب نے بیان فرمائی، اور بلاشبہ یہ چاروں اصطلاحات ایسی ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہیں —— آگے مودودی صاحب اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں

"عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا، اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ "الٰہ" کے کیا معنی ہیں، اور "رب" کسے کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے، انھیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے، اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا "الٰہ" اور "رب" ہے اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں تو وہ پوری بات کو پا گئے، انھیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہو گیا کہ دوسروں کے لیے کس چیز کی نفی کی جا رہی ہے، اور اللہ کے لیے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے، جنھوں نے مخالفت کی، یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ اس عقیدہ کو قبول کر کے ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہو گا۔

اسی طرح "عبادت" اور "دین" کے الفاظ بھی اُن کی بولی میں پہلے سے رائج تھے، ان کو معلوم تھا کہ "عبد" کسے کہتے ہیں، عبودیت کس حالت کا نام ہے، عبادت سے کون سا رویہ مراد ہے اور "دین" کا کیا مفہوم ہے اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کے صرف اللہ کی عبادت کرو، اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ، تو انھیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی، وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔"

مودودی صاحب اس کے آگے متصلاً تحریر فرماتے ہیں۔

"لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزولِ قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لیے خاص ہو گیا، اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے اُن کے لیے "الٰہ" اور "رب" اور "دین" اور "عبادت" کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے، جو نزولِ قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے، انھیں دو نوں وجوہ سے دورِ آخر کی کتبِ لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے اُن معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے۔ مثلاً لفظ "الٰہ" کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنا دیا گیا، "رب" کو پالنے اور پوسنے والے، یا پروردگار کا مترادف ٹھیرایا گیا۔ "عبادت" کے معنی پوجا اور پرستش کے کیے گئے، دین کو دھرم اور مذہب اور (RELIGION) کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا ــــ طاغوت" کا ترجمہ بُت یا شیطان کیا جانے لگا ــــ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا۔"

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۹-۱۰)

پھر اس تغیر حال کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں :۔

"پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے۔"

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، مطبوعہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند ص ۱۱)

اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کو یہ کمال بڑی فیاضی کے ساتھ عطا فرمایا ہے کہ

ان کی تحریر پرشوکت اور دینی ادب کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ صاف، سیدھی، اور سہل الفہم ہوتی ہے، اس میں ابہام، پیچیدگی اور رمزیت بالکل نہیں ہوتی، اُن کی مندرجہ بالا عبارت بھی ایسی ہی ہے —— اس میں انھوں نے صراحت اور قلم کے پورے زور و قوت کے ساتھ یہ چند علمی اور تاریخی دعوے کیے ہیں۔

اولؔ یہ کہ زمانۂ نزول قرآن کے سب عرب قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحات (الٰہ - ربّ - عبادت اور دین) کا معنی مفہوم صحیح اور بالکل ٹھیک سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے قرآن کی دعوتِ توحید کا مدعا اور اس کے لوازم و نتائج کو بالکل صحیح اور ٹھیک سمجھا تھا، اُن میں سے جنھوں نے قبول کیا (مثلاً صدیق اکبر اور دوسرے صحابہ کرام) انھوں نے سمجھ کر قبول کیا تھا اور جنھوں نے انکار کیا (مثلاً ابو جہل، ابو لہب وغیرہ کفار عرب) انھوں نے سمجھ کر انکار کیا تھا۔

دوؔم یہ کہ زمانۂ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں میں ان بنیادی اصطلاحوں کے معنی بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کا مفہوم نہایت محدود بلکہ مبہم ہو کر رہ گیا۔

سوؔم یہ کہ جو لوگ اسلام کی سوسائٹی میں پیدا ہوئے —— (جن میں اکثر تابعین اور ان کے بعد کے تو سب ہی ائمہ و علماء شامل ہیں) وہ اِن الفاظ کا وہ مفہوم نہیں سمجھ سکے جو زمانۂ نزولِ قرآن میں سمجھا جاتا تھا اور جو صحیح مفہوم تھا۔

چہارم یہ کہ اس تغیر حال کی وجہ سے قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی۔

راقم سطور مولانا مودودی کے اِن علمی اور تاریخی دعووں اور اُن کے دلائل پر اس وقت کوئی بحث و تنقید اور تبصرہ کرنا نہیں چاہتا، تمام قارئین سے صرف اتنا عرض ہے کہ مولانا نے اپنی اس تحریر کے ذریعہ یہ بات پورے زور و قوت کے ساتھ اپنے ناظرین کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن پاک کی ان بنیادی اصطلاحات (الٰہ، ربّ، دین، عبادت) کا مفہوم بس زمانۂ نزول قرآن (یعنی زیادہ سے زیادہ صرف قرنِ اول) میں

تو صحیح سمجھا گیا تھا، اور اس بنا پر اس کے توحید کے پیغام کو بھی اُس زمانہ میں صحیح سمجھا گیا تھا، لیکن اس کے بعد اس کو صحیح نہیں سمجھا گیا، غلط یا ناقص سمجھا جاتا رہا ہے، اور اس تغیر حال کی وجہ سے قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم اور اُس کی روح امت مسلمہ کی نگاہوں سے مستور رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کی یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد قرآن کی ساری تعلیم بلکہ سارا دین غیر مستند، مشتبہ اور ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔ جب الٰہ۔ رب۔ عبادت۔ اور دین جیسے الفاظ، جو قرآن پاک میں یقیناً سیکڑوں جگہ آئے ہیں اور اس کے کم ہی صفحات ایسے ہوں گے جو ان الفاظ سے خالی ہوں، اور قرآنی دعوت و تعلیم میں جن کی وہ بنیادی اہمیت ہے جو یقیناً کسی دوسرے لفظ کی نہیں، جب اُن کے متعلق یہ مان لیا جائے کہ زمانہ نزول قرآن کے بعد کی امت مسلمہ صدیوں سے ان کا جو مفہوم و مدعا سمجھتی رہی ہے وہ صحیح نہیں ہے، غلط ہے یا ناقص ہے اور اس کی وجہ سے دعوتِ توحید سے متعلق قرآنی آیات اور کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کا مطلب و مدعا بھی غلط یا ناقص سمجھا جاتا رہا ہے تو پھر قرآن کی کسی آیت اور اس کے کسی لفظ اور کسی حکم کے متعلق بھی اطمینان کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان کا وہی مطلب و مدعا ہے جو اب تک جمہور امت سمجھتی رہی ہے —— اس کے بعد ملحدین کے لیے دروازہ کھل جاتا ہے کہ وہ لغت کی کتابوں وغیرہ کا سہارا لیکر زبان و قلم کے زور سے سارے دین کو بدل کے رکھ دیں۔

امید ہے کہ ذیل کی چند مثالوں سے ناظرین اس بات کو بآسانی سمجھ سکیں گے۔

(۱)

"رسول" کے معنی و مفہوم کے بارہ میں چکڑالوی حضرات کی بحث:۔

لفظ "رسول" کا مفہوم و مطلب اور اس کی حقیقت امت مسلمہ میں معلوم و معروف ہے، ہر وہ شخص جو کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر ایمان لایا ہے اپنی علمی اور ذہنی سطح کے مطابق "رسول" کا مطلب سمجھتا ہے مگر "منکرین حدیث" میں جو لوگ انتہا پسند رہے ہیں (مثلاً مولوی عبداللہ چکڑالوی صاحب اور ان کے متبعین) وہ دعویٰ کرتے تھے کہ عربی

زبان میں رسول کے معنی بس قاصد اور پیام رساں کے ہیں، اور "رسول" کی حیثیت صرف یہی ہے کہ وہ خدا کا پیام اور حکم اس کے بندوں کو پہنچاتا ہے ــــ "رسول" کے بارہ میں عام مسلمانوں کا جو تصور اور عقیدہ ہے کہ وہ معصوم اور مفترض الطاعہ ہے وغیرہ وغیرہ، یہ سب بالکل بے بنیاد اور مولویوں کی ایجاد ہے ــــ اب سے قریباً پچاس سال پہلے ان لوگوں کا ایک پرچہ "بلاغ" امرتسر سے نکلتا تھا، اس میں اس موضوع پر مستقل مضامین ہوتے تھے، وہ قرآنی آیات بھی دلیل کے طور پر پیش کی جاتی تھیں جن میں بعض انبیاء علیہم السلام کی زلات کا ذکر ہے (مثلاً "وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ" ــــ اور "فَظَنَّ أَن لَّن نَّقْدِرَ عَلَيْهِ" اور "وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ" وغیرہ) ــــ میرا گمان ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی نظر سے "بلاغ" اور اس کے وہ مضامین ضرور گزرے ہوں گے ــــ ممکن ہے کسی لائبریری میں اس کا فائل بھی محفوظ ہو۔

ظاہر ہے کہ چکڑالویوں کے اس نظریے اور دعوے کی بنیاد اسی پر ہے کہ صدیوں سے امت مسلمہ کے عوام و خواص لفظ "رسول" کا مطلب اور اس کی حقیقت غلط سمجھتے رہے ہیں۔ ــــ کیا یہ بات مودودی صاحب کے اس دعوے سے کچھ زیادہ مختلف ہے جو انھوں نے الٰہ، رب، عبادت اور دین کے معنی مفہوم کے بارہ میں کیا ہے۔

(۲)

"صلوٰۃ" (نماز) کے معنی اور اس کی حقیقت کے بارہ میں بحث:-

قریباً ۳۰-۴۰ سال پہلے کا واقعہ ہے یہ عاجز بریلی رہتا تھا اور الفرقان وہیں سے نکلتا تھا، ایک دن ایک صاحب تشریف لائے، یہ پنجاب کے رہنے والے تھے لیکن کسی کاروباری سلسلہ سے ضلع بدایوں میں مقیم تھے، اچھے خاصے پڑھے لکھے تھے، عربی سے بھی آشنا تھے، عمر ۶۰ کے قریب رہی ہوگی، ــــ انھوں نے پہلے مجھ سے نماز کے بارہ میں بات شروع کی، دریافت کیا آپ جو نماز پڑھتے ہیں کیا کہیں قرآن میں اس کا حکم یا ذکر ہے؟ ــــ میں نے اندازہ کر لیا کہ یہ صاحب چکڑالوی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی روشنی میں ان سے گفتگو کی، ــــ آخر میں انھوں نے اپنا تصنیف کردہ ایک رسالہ نکال کر

لکھ کر دیا، یہ چھوٹے کتابی سائز کے قریباً ۱۰۰ صفحے کا رسالہ تھا، اس کا نام غالباً "قرآنی نماز" یا اس کے قریب المعنیٰ کوئی نام تھا ـــــ جہاں تک یاد رہ گیا ہے اس کی بحث کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان جو نماز پڑھتے ہیں اس کا کہیں قرآن میں حکم یا ذکر نہیں ہے، یہ "غیر قرآنی نماز" ہے "مولویوں کی ایجاد ہے"، "صلوٰۃ" کے لغوی معنی دُعا، مناجات، اور توجہ الی اللہ کے ہیں، اس کے لیے انھوں نے لغت کی کتابوں سے کچھ عبارتیں بھی نقل کی تھیں، قرآنی آیات بھی پیش کی تھیں، خیال ہے کہ اُن میں ایک آیت یہ بھی تھی "صَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صلواتك سَكَنٌ لهم"[1] ـــــ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے الفرقان میں اس کتاب اور اس کے مصنف اور ان کے اس عجیب و غریب دعوے کا اُسی طرح تذکرہ کیا تھا جس کے وہ مستحق تھے۔

ظاہر ہے کہ اس گمراہی کی بنیاد بھی یہی ہے کہ امت مسلمہ کے خواص و عوام "صلوٰۃ" کے جو معنی اور اس کی جو حقیقت اب تک سمجھتے رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، قرآن اور لغت عرب کے خلاف ہے۔

(۳)

"زکوٰۃ" کے بارہ میں ان منکرین حدیث کا دعویٰ :-

ہفتہ وار "ایشیا لاہور" جماعت اسلامی پاکستان کا سرکاری ترجمان ہے۔ اس کے ۱۰ جون ۷۹ء کے شمارہ میں، فتنۂ انکار حدیث کے اس دور کے سب سے بڑے علمبردار غلام احمد پرویز کے ماہنامہ "طلوع اسلام" کے ایک مضمون کا تذکرہ کرتے ہوئے (جو اس میں زیر عنوان "زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم" شائع ہوا تھا) لکھا گیا ہے۔

> "ماہ مئی کے "طلوع اسلام" میں زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ عربی زبان میں نشو و نما کو کہتے ہیں، لہٰذا ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہونگے سامان نشو و نما مہیا کرنا اور یہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ افراد معاشرہ کی نشو و نما کا سامان فراہم کرے، اور یہ سامانِ نشو و نما صرف روٹی، کپڑا،

---

[1] اس آیت میں صلوٰۃ کے معنی دعائے خیر ہی کے ہیں۔

مکان ہی کو شامل نہیں ہے بلکہ اس میں وہ تمام اسباب و ذرائع شامل ہیں جن سے انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی ہے، قرآن کی آیت "الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ" کا بھی مفہوم یہی ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ لوگوں سے زکوٰۃ لیں گے، کہا یہ گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے، افراد معاشرہ کی نشو و نما کا سامان فراہم کریں گے۔"

(ملخص)

ایشیا میں "طلوع اسلام" کا یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد قریباً تین کالم میں اس کی تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس میں "زکوٰۃ" کا جو "قرآنی مفہوم" بیان کیا گیا ہے وہ سراسر تحریف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح اور امت کے اجماع اور تواتر کے خلاف ہے۔ (اور بلاشبہ یہ بات صحیح ہے)۔

ظاہر ہے کہ "رسول"، "صلوٰۃ"، "زکوٰۃ" جیسی دینی اصطلاحات کے بارہ میں ان منکرین حدیث کے ان خرافاتی اور انتہائی گمراہ کن دعووں کی بنیاد یہی ہے کہ ان دینی اصطلاحات کے جو معنی اور جو حقیقت نزول قرآن کے بعد سے امت مسلمہ کے عوام و خواص سمجھتے رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، صحیح وہ ہے جو مولوی عبداللہ چکڑالوی اور پرویز صاحب جیسے نئے محققین نے لغت اور خود قرآنی آیات سے سمجھی ہے ـــــ مولانا مودودی صاحب اور ان کے محبین و متبعین للہ غور فرمائیں کیا یہ بات اس دعوے سے کچھ زیادہ غلط اور عجیب ہے کہ زمانہ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں میں دین کی سب سے اہم بنیادی اصطلاحات (الٰہ، رب، دین، عبادت) کا جو مفہوم سمجھا جاتا رہا ہے وہ صحیح نہیں تھا، غلط یا ناقص تھا۔ صحیح مفہوم وہ ہے جو چودھویں صدی ہجری کے قریباً وسط میں مولانا مودودی صاحب نے لغت اور قرآنی آیات سے سمجھا ہے ـــــ کاش اللہ تعالیٰ مودودی صاحب کو توفیق دے کہ وہ اسکو محسوس کریں کہ انھوں نے یہ بات لکھ کر فتنہ کا کتنا بڑا دروازہ کھول دیا ہے اور ملحدین کے لیے کیسی سند فراہم کر دی ہے۔

چار بنیادی اصطلاحوں سے متعلق مولانا مودودی صاحب کے نقطۂ نظر کے بارہ میں، جو کچھ یہاں تک لکھا گیا ہے وہ عوام یعنی غیر علماء کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے، جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کے علم کی نعمت سے بہرہ ور فرمایا ہے اور جن کا مبلغ علم صرف اردو کی کتابیں نہیں ہیں اور جو علماء کی اصطلاحات سے واقف ہیں وہ حضرات اس مسئلہ پر اس طرح غور فرمائیں کہ مودودی صاحب کی اس تحقیق و ریسرچ کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ "الٰہ" کے معنی اور "لا الٰہ اِلّا اللہ" کے صحیح مفہوم و مدعا کو اُمّت میں تواتر حاصل نہیں رہا، صدیوں سے اس کلمہ شریف کے معنی غلط یا ناقص سمجھے جاتے رہے —— اس نتیجہ کی سنگینی کو ہمارے عوام تو شاید نہ سمجھ سکیں لیکن اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا صرف امکان تسلیم کر لینے سے بھی دین کی پوری بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔ کسی صاحبِ علم کو اس میں شک نہ ہوگا کہ ہم کسی عقیدہ اور حقیقت پر ایمان لانے کے اسی صورت میں مکلف ہیں جبکہ وہ تواتر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت و منقول ہو، —— بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ عہد نبوی یا قرن اول کے بعد کی چند صدیاں یا کوئی ایک صدی یا اس سے بھی کم مدت ایسی گزری ہے جبکہ امت میں "لا الہ الا اللہ" کا مفہوم و مدعا صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا، غلط یا ناقص سمجھا جاتا تھا، تو تواتر باقی نہیں رہتا، تواتر کے لیے بلا انقطاع تسلسل ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "لا الہ الا اللہ" کا مفہوم اور اس کی حقیقت اور اسی طرح دوسرے بنیادی ایمانی حقائق کا علم صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوا تھا اور صحابہ کرام سے وہی علم تابعین نے حاصل کیا اور ان سے ان کے تلامذہ تبع تابعین نے اور یہ سلسلہ اِلیٰ یومنا ھٰذا حاملین قرآن اور حاملین دین میں اسی طرح جاری ہے، الفاظ و تعبیرات کے فرق کے ساتھ وہی کتب تفسیر اور علماء محققین کی کتابوں میں ہے۔ الغرض صحابہ کرام سے ہم تک صرف "لا الٰہ اِلّا اللہ" کے الفاظ ہی نہیں پہنچے ہیں بلکہ ان کا مفہوم و مدعا بھی تواتر کے ساتھ پہنچا ہے جس طرح "صلوٰۃ" و "زکوٰۃ" کے صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ اُن کی حقیقت اور ان کا مفہوم بھی تواتر کے ساتھ پہنچا ہے۔ ——

واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ اِلٰہ و رب اور دین و عبادت کے معنی

اور کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کا صحیح مفہوم و مدعا زمانہ نزولِ قرآن کے بعد کی صدیوں میں نہیں سمجھا گیا، غلط یا ناقص سمجھا جاتا رہا" پورے دین کو غیر مستند اور نامعتبر قرار دینا اور ملحدین کے لیے دینی حقائق کی نئی نئی تشریحات و تحریفات کا دروازہ کھول دینا ہے ـــــــ لیکن مودودی صاحب کو جتنا کچھ میں جانتا ہوں اس کی بنا پر میرا گمان ہے کہ انھوں نے سوچ سمجھ کے اور جان بوجھ کے یہ انتہائی غلط اور گمراہ کن بات نہیں کہی ہے "اُن سے یہ غلطی غیر شعوری طور پر ہوئی ہے ـــــــ خود راقم سطور کا واقعہ یہ ہے کہ جن دنوں میں چار بنیادی اصطلاحوں سے متعلق مولانا مودودی صاحب کا یہ مقالہ "ترجمان القرآن" میں قسط وار چھپ رہا تھا جو بعد میں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا، یہ" جماعت اسلامی کا پہلا سال تھا تو میں نے مودودی صاحب کی اس تحقیق و تشریح سے اختلاف کیا تھا جو انھوں نے اس مقالہ میں کی تھی، اور اس اختلاف کا ذکر اپنے اُس مضمون میں بھی کر دیا تھا جو مولانا محمد علی کاندھلوی کے اعتراضات اور خدشات کے جواب میں میں نے لکھا تھا، جس کا عنوان تھا "جماعت اسلامی کی حقیقت اور ہمارے کام کی نوعیت ـــــــ بعض شبہات کا جواب" (میرے اس جوابی مضمون کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) یہ پہلے الفرقان میں شائع ہوا تھا اس کے بعد رجب یا شعبان ۶۱ھ کے "ترجمان القرآن" میں بھی شائع ہوا تھا ـــــــ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ میرا قیام مولانا مودودی صاحب کے ساتھ اُس وقت کے جماعت کے مرکز "دار الاسلام" میں تھا ـــــــ اسی سلسلہ کی اور اسی زمانہ کی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن ہم ساتھ بیٹھے تھے میں نے مودودی صاحب سے دریافت کیا کہ "لا الٰہ الا اللہ" کی جو تشریح آپ کرتے ہیں کیا پہلے بھی کسی عالم یا مصنف نے یہ تشریح کی ہے (واضح رہے کہ اُس وقت میرا یہ سوال، اعتراض یا کسی بحث کی نیت سے نہیں تھا بلکہ استفسار ہی کے لیے تھا) موصوف نے فرمایا کہ

"بس شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہیں جو کافی دور تک صحیح چلتے ہیں لیکن قریب پہنچکر مڑ جاتے ہیں۔"

مودودی صاحب کے اس جواب کا آخری خط کشیدہ جملہ (لیکن قریب پہنچکر مڑ جاتے ہیں)

مجھے ایسا یاد ہے کہ میرے لیے اس پر قسم کھانا جائز ہے کہ اُن کے الفاظ یہی تھے۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خود میرا یہ واقعہ ہے کہ میں قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں اور کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کی مودودی صاحب کی خاص تشریح سے متفق نہیں تھا لیکن مجھے اُس وقت بلکہ اس کے بعد بھی ایک طویل مدت تک اس کا احساس و شعور نہیں ہوا کہ یہ صرف علم و تحقیق کی ایک غلطی نہیں ہے بلکہ اس سے ملحدین کے لیے قرآنی نصوص اور دینی اصطلاحات کی ملحدانہ تشریحات و تحریفات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ان کے لیے ایک بڑی سند فراہم ہو جاتی ہے۔

الغرض میرا خیال ہے کہ جس طرح اُس وقت مجھے اس کا احساس و شعور نہیں ہوا اسی طرح غالباً مودودی صاحب کو بھی نہیں ہوا ہو گا ـــــــ لیکن بعد میں جب اس عاجز کو اس غلطی کی اس سنگینی اور خطرناکی کا احساس ہوا تو میرے ہی مشورہ پر "الفرقان" میں بھی اس سلسلہ میں لکھا گیا اور ایک دفعہ سے زیادہ لکھا گیا اور کئی ایک دوسرے حضرات نے بھی لکھا ـــــــ پھر اب سے چند ہی مہینے پہلے رفیق محترم مولانا علی میاں نے بھی اپنے خاص انداز میں بڑی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ اسی سلسلہ میں لکھا، لیکن افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے اس کے بعد بھی اس سنگین غلطی کی اصلاح و تدارک کی ضرورت نہیں سمجھی ـــــــ غالباً اس میں بڑا دخل اس بات کو بھی ہے کہ اُن کے فیض یافتہ فدائیین میں ایسے اصحاب قلم کی اچھی خاصی تعداد ہے جنھوں نے شاید اپنا فریضہ سمجھ لیا ہے کہ جب بھی کوئی شخص مولانا مودودی کی کسی غلطی کی نشاندہی کرے تو وہ اس کا بھرپور جواب دے کر مولانا موصوف کے لیے اطمینان کا سامان فراہم کر دیں اور اپنی قلمی مہارت سے خود اُس آدمی کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیں ـــــ

آخر میں صرف ایک بات اور عرض کر کے "چار بنیادی اصطلاحوں" سے متعلق اس سلسلہ گفتگو کو ختم کرنا ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک تصنیف میں مصلحین و مجددین کے تذکرہ میں حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شاہ اسماعیل شہید، حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ سرسید احمد خاں دہلوی اور مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کا بھی ذکر کیا تھا، مولانا مودودی نے شوال ۱۳۵۹ھ کے ترجمان القرآن میں اُس پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا

"سچ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ابتک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں اُن سب کا شجرۂ نسب بالواسطہ یا بلا واسطہ سرسید کی ذات تک پہنچتا ہے وہ اس سرزمین میں تجدد کے امام اول تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کے دنیا سے رخصت ہوئے —— رہے مولوی عبداللہ چکڑالوی تو اُن کو قرآن کا بڑا عالم کہنا قرآن پر ظلم ہے" (ترجمان القرآن بابت شوال ۱۳۵۹ھ)

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ سرسید احمد خاں کے حالات و خیالات سے جو لوگ واقف ہیں اور جنھوں نے ان کی "تفسیر قرآن" کا مطالعہ کیا ہے وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ اُن کے جس رویّہ کی بنا پر مولانا مودودی صاحب نے اُن پر یہ سخت تنقید کی ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والی ساری گمراہیوں کا ان کو ذمہ دار قرار دیا ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے قرآنی الفاظ و دینی اصطلاحات مثلاً ملائکہ - جنات - جنت - جہنم وغیرہ کی وہ تشریحات کیں اور وہ مطالب و مفاہیم بیان کیے جو اُن سے پہلے علمائے امت اور ائمہ دین میں سے کسی نے بیان نہیں کیے تھے —— گویا انھوں نے بھی ان قرآنی الفاظ و اصطلاحات کی نئی تشریحات کر کے یہی دعویٰ کیا کہ ان کا صحیح مفہوم امت میں صدیوں سے صحیح نہیں سمجھا جا رہا تھا، صحیح مفہوم و حقیقت وہ ہے جو میں دلائل کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ الٰہ، رب، دین اور عبادت جیسی دین کی بنیادی اصطلاحات اور صلوٰۃ، زکوٰۃ، ملائکہ، جنات، جنت، جہنم جیسے قرآنی الفاظ و کلمات سے متعلق یہ سمجھنا اور لوگوں کو سمجھانے اور باور کرانے کی کوشش کرنا کہ صدیوں سے جمہور علماء امت اُن کا جو مطلب سمجھتے رہے ہیں وہ غلط یا ناقص تھا اور ان کی نئی تشریحات کرنا،

ہزاروں گمراہیوں اور دینی فتنوں کی جڑ بنیاد بن سکتا ہے۔[1]

ایسی خطرناک غلطی کیوں ہوئی :-

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ مودودی صاحب سے ایسی خطرناک غلطی کیوں ہوئی؟ تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انھوں نے بیسویں صدی کے اس دور میں جبکہ ساری دنیا میں سیاست اور سیاسی اقتدار کے مسئلہ نے دوسرے تمام مسائل سے زیادہ قیامت اور جنت دوزخ کے مسئلہ سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی اور ہمارے اس برصغیر غیر منقسم ہندوستان میں کانگرس اور مسلم لیگ کی متقابل اور متحارب سیاسی تحریکیں زور شور سے چل رہی تھیں گویا ایک سیاسی جنگ عظیم برپا تھی اور قریباً ہر طبقہ کے دلوں و دماغوں پر سیاست ہی سیاست چھائی ہوئی تھی، تو اس سیاست زدہ فضا اور ماحول میں مودودی صاحب نے اپنی دعوت و تحریک کو خاصکر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں میں وقیع اور مقبول بنانے کے لیے ضروری سمجھا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ اور عقیدۂ توحید کی اور اس طرح اسلام کی ایک نئی سیاسی تشریح کی جائے اور اسی کو دعوت کی بنیاد بنایا جائے ——— اس کے لیے ان کو ضرورت

---

[1] واضح رہے کہ کسی قرآنی آیت یا کلمہ سے متعلق کوئی نیا نکتہ بیان کرنا یا کسی نئے مسئلہ کا استنباط و استخراج کرنا اور بات ہے اور یہ قرآن پاک کی صفت "لا تنقضی عجائبہ" کا تقاضا ہے۔ اور الٰہ، رب، دین عبادت جیسی بنیادی اصطلاحات اور کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کی حقیقت اور قرآن کی دعوتِ توحید یا صلوٰۃ وزکوٰۃ جیسے اصطلاحی قرآنی کلمات کے بارہ میں یہ دعویٰ کرنا کہ زمانہ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں میں اُن کا مفہوم صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اور اب چودھویں صدی میں جو بیان کیا جارہا ہے وہ صحیح مفہوم ہے بالکل دوسری بات ہے اور اس سے یقیناً اہل زیغ کے لیے ملحدانہ تحریفات کا دروازہ کھلتا ہے۔

[2] انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں دماغوں پر سائنس، مغربی فلسفہ اور نیچر چھایا ہوا تھا تو سرسید احمد خاں نے اس کو اسلام کی خدمت سمجھا کہ قرآن کی تفسیر اور اسلام کی تشریح اُس کے مطابق کی جائے، پھر اسی پر انھوں نے اپنی ذہانت اور قابلیت صرف کر دی جس کا نمونہ ان کی تفسیر ہے۔

محسوس ہوئی کہ عقیدۂ توحید سے تعلق رکھنے والی خاص بنیادی اصطلاحوں (الٰہ، رب، عبادت، دین) کی وہ نئی سیاسی تشریح کریں ــــــ یہ واقعہ ہے کہ مودودی صاحب بڑے ذہین اور بہت محنتی آدمی ہیں، انھوں نے عربی لغت کی کتابیں کھنگال کے اور قرآن سے بھی بہت سی آیتیں نکال کے اِن بنیادی اصطلاحات کی نئی سیاسی تشریح پر ایک پورا مقالہ لکھ کر اپنے نزدیک اپنا مدعا ثابت کر دیا ــــــ اسی کے ساتھ انھیں خود خیال آیا یا کسی نے توجہ دلائی کہ اِن بنیادی اصطلاحوں کا جو نیا مفہوم انھوں نے بیان کیا ہے وہ کسی دور کے کسی مفسر قرآن، کسی شارح حدیث اور کسی محقق عالم و مصنف نے نہیں لکھا ــــــ اور تنہا یہ بات عام مسلمانوں کے لیے اُن کے اس دعوے اور اس تشریح کو ناقابل قبول قرار دینے کے لیے کافی ہے، تو انھوں نے اس کے دفعیہ اور پیش بندی کے لیے اس مقالہ یا رسالہ کا ایک طویل مقدمہ تحریر فرمایا (جس کا بڑا حصہ انہی کے الفاظ میں آپ پڑھ چکے ہیں) جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحات کا مفہوم و مطلب اور اس کی دعوتِ توحید کو زمانۂ نزول قرآن میں تو صحیح طور پر سمجھا گیا تھا لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ اِن اصطلاحات کے معنی بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ اِن کا مفہوم نہایت محدود بلکہ مبہم ہو کر رہ گیا ــــــ اس طرح مودودی صاحب نے گویا اپنے ناظرین کو مطمئن کر دینے کی کوشش کی کہ جو مفہوم و مطلب انھوں نے بیان کیا ہے وہی صحیح ہے اور تفسیر و شرح حدیث وغیرہ کی کتابوں میں اس سے مختلف جو لکھا گیا ہے وہ غلط یا ناقص یا مبہم و محدود ہے۔ کیونکہ وہ سب کتابیں بعد کی صدیوں میں لکھی گئی ہیں جب اِن اصطلاحوں کا مفہوم و مطلب صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ محدود و مبہم ہو کر رہ گیا تھا۔

اور بلاشبہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تفسیر قرآن اور شرح حدیث وغیرہ اسلامی علوم و فنون کی ساری کتابیں بعد کی انہی صدیوں میں لکھی گئی ہیں جن میں بقول مولانا مودودی الٰہ، ربّ، دینؔ اور عبادت جیسی بنیادی اصطلاحات کا مفہوم بھی صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا ــــــ ہمارے تفسیری کتب خانہ کی قدیم ترین تفسیر جو مطبوعہ اور متداول ہے وہ

حافظ ابن جریر طبری کی ہے جن کا زمانہ تیسری اور چوتھی صدی کا ہے۔ باقی ساری تفسیریں جن کو کسی درجہ میں مستند کہا جاسکتا ہے سب اس کے بعد کی صدیوں کی ہیں۔ جیسے امام محی السنہ بغوی کی "معالم التنزیل" اور علامہ علی بن محمد بغدادی کی 'لباب التاویل'، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تفسیری رسائل (خاصکر تفسیر سورۂ اخلاص)، حافظ ابن کثیر دمشقی کی "تفسیر القرآن العظیم"، قرطبی، امام رازی، ابوالسعود، علامہ بیضاوی اور نسفی کی تفاسیر، خطیب شربینی کی "السراج المنیر" اور آخری دور کی تفسیروں میں "مظہری"، "روح المعانی" اور قاضی شوکانی کی تفسیر 'فتح القدیر'۔

اسی طرح حدیث شریف کی قدیم شروح میں ابن عبدالبر اور خطابی کی شروح، اور بعد کے دور میں حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ بدرالدین عینی اور قسطلانی کی صحیح بخاری کی معروف و مقبول شروح، امام نووی کی شرح مسلم، علامہ طیبی کی شرح مشکوٰۃ، پھر دور آخر میں علامہ علی قاری کی 'مرقاۃ' اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی 'لمعات' یہ سب بھی بعد کی انہی صدیوں میں لکھی گئی ہیں۔

علیٰ ہذا امت کے ممتاز و محقق مصنفین مثلاً امام غزالی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، اُن کے شاگرد رشید حافظ ابن القیم، پھر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی —— ظاہر ہے کہ یہ سب حضرات بعد کی بلکہ بہت بعد کی صدیوں ہی کے ہیں —— ان حضرات نے اپنی تصانیف میں توحید کی حقیقت پر اور اس سلسلہ میں الٰہ، الوہیت، رب، ربوبیت، عبادت اور عبودیت کے معنی مفہوم پر خاص طور سے اور بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ لیکن مذکورہ بالا مفسرین قرآن اور شارحین حدیث کی طرح اِن میں سے بھی کسی نے اِن بنیادی اصطلاحات کی وہ تشریح نہیں کی اور توحید کی وہ حقیقت نہیں بتلائی جو مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں بتلائی ہے۔

بہر حال راقم سطور کا یہی خیال ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے ان بنیادی اصطلاحات کے یہ نئے سیاسی معنی اور قرآن پاک کی دعوتِ توحید کی یہ نئی سیاسی تشریح اس دور کی خاص سیاست زدہ فضا سے متاثر ہو کر اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو پیش نظر رکھ کر کی، اور

چونکہ یہ تشریح اُن سے پہلے کسی مفسر قرآن، کسی شارح حدیث اور اُمت کے کسی مسلم و معتمد عالم و مصنف نے نہیں کی تھی اس لیے انھوں نے یہ کہکر کہ ــــــ زمانۂ نزول قرآن سے بعد کی صدیوں میں ان بنیادی اصطلاحات کا مفہوم اور دعوتِ توحید کا مدعا صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا، اور جو لوگ اسلام کی سوسائٹی میں پیدا ہوئے وہ اِن الفاظ کا وہ مفہوم نہیں سمجھ سکے، جو زمانۂ نزول قرآن میں سمجھا جاتا تھا ــــــ تمام مفسرین، شارحین حدیث اور علماء و مصنفین کو (خاصکر ان اصطلاحات اربعہ اور دعوتِ توحید کے فہم کے بارہ میں) ناقابل اعتماد قرار دیدیا اور اس طرح اپنے لیے اس کا جواز پیدا کر لیا کہ اِن اصطلاحات اور قرآن کی دعوتِ توحید کی وہ تشریح کریں جو اُن سے پہلے کسی نے نہیں کی ــــــ

جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، مولانا مودودی کو میں جتنا کچھ جانتا ہوں اس کی بنا پر میرا یہ گمان ہے کہ اس کے لکھتے وقت اُن کو اس کا شعور و احساس نہیں ہوا کہ میں یہ لکھکر اہل زیغ اور ملحدین کے لیے دین میں تحریف اور فتنہ کا کیسا چوپٹ دروازہ کھول رہا ہوں اور سرسید احمد خاں اور مولوی عبداللہ چکڑالوی اور علامہ مشرقی اور پرویز صاحب کی جیسی ملحدانہ تحریفات کے لیے کتنی زبردست سند جواز فراہم کر رہا ہوں۔

اگر میرا یہ حسن ظن صحیح ہے تو قدیم تعلق کی بنا پر میں مولانا سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اس سے رجوع کا اعلان کر کے فتنہ کے اس دروازہ کو خود ہی بند کر دیں ــــــ واللہ الموفق

واضح رہے کہ دین کی اِن بنیادی اصطلاحات اور عقیدۂ توحید کی اس نئی سیاسی تشریح سے دین میں جو گہری معنوی تحریف اور اس کی روح و حقیقت اور اس کے فلسفہ میں جو غیر معمولی تبدیلی ہو جاتی ہے اور اس کا نصب العین تک بدل جاتا ہے، اس پر راقم سطور نے یہاں بالکل گفتگو نہیں کی ہے۔ کیونکہ بعض دوسرے حضرات اس موضوع پر بقدر کفایت لکھ چکے ہیں، خاصکر مولانا وحید الدین خاں صاحب نے اپنی کتاب "دین کی سیاسی تعبیر" میں اس پر جو روشنی ڈالی ہے وہ "قلب سلیم" رکھنے والوں کے لیے کافی ہے ــــــ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو انشاء اللہ الفرقان میں بھی اس پر تفصیل سے لکھا جائے گا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝

چند گزارشیں

(۱) اس مضمون کا صرف اسی قدر حصہ (جو ناظرین نے ملاحظہ فرمایا) اس شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے اس کے آگے مولانا مودودی صاحب مرحوم کی چند اور ایسی ہی سنگین غلطیوں کی نشاندہی اور ان پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے جو امت کے لئے خصوصاً اُن کے متبعین کے لیے فتنہ اور ضلال کا سبب بن سکتی ہیں ــــــ ناظرین کو جیسا کہ نگاہ اولین سے معلوم ہو چکا ہے یہ پورا مضمون انشاء اللہ اب کتابی شکل میں شائع ہوگا۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کی تیاری اور اشاعت میں زیادہ دیر نہ ہو ـ تیار ہو جانے پر انشاء اللہ الفرقان ہی سے آپ کو اس کی اطلاع مل جائے گی۔

(۲) اگر کسی صاحب کو محسوس ہو کہ اس مضمون میں کوئی بات غلط اور خلاف واقعہ لکھی گئی ہے تو وہ از راہ عنایت (حتی الوسع اختصار کے ساتھ) اس عاجز کو تحریر فرما دیں، اگر میں محسوس کروں گا کہ ان کی بات صحیح ہے اور مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو اُن کے شکریہ کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف اور اُس سے رجوع کر لوں گا ــــــ زندگی میں مجھ سے بے حساب غلطیاں ہوئی ہیں، اور جب بھی از خود یا کسی بندۂ خدا کے توجہ دلانے سے اُس کا علم و احساس ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اعتراف اور رجوع کی توفیق دی ہے۔

(۳) کوئی محترم اس مضمون پر تنقید و تبصرہ کے طور پر کچھ تحریر فرمانا چاہیں تو بہتر یہ ہوگا کہ وہ اس کا انتظار فرمالیں کہ پورا مضمون اُن کے ملاحظہ سے گزر جائے۔

(۴) ایسے خطوط لکھنا جن کا مقصد صرف اظہار غیظ و غضب ہو اپنے وقت کی بھی اضاعت ہے اور یہ عاجز اس طرح کے خطوط کا جواب، بلکہ اطلاع رسید بھی اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔

محمد منظور نعمانی

ایک ضروری اعلان

اس شمارہ میں جو کاغذ لگایا جا رہا ہے وہ بہ مشکل دستیاب ہو سکا ہے اور سو روپئے فی رم کے حساب سے ملا ہے (حالانکہ یہ معمولی قسم کا کاغذ ہے)، جب تک کاغذ کی کمیابی اور گرانی کا یہ حال ہے الفرقان صرف چالیس صفحات پر شائع ہو سکے گا، امید ہے کہ ناظرین کرام اس میں ہم کو معذور سمجھیں گے۔

ناظم دفتر الفرقان لکھنؤ

عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

یہ کتاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بانی جماعت اسلامی کی مشہور کتاب "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں" پر خصوصیت کے ساتھ اور ان کی دینی تفہیم و تشریح پر عمومیت کے ساتھ ایک متوازن اور سنجیدہ علمی تبصرہ ہے۔

کتاب نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، نہ فقہ و فتاویٰ کی زبان میں بلکہ ایک اندیشہ کا اظہار اور "الدین النصیحہ" (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے حکم پر عمل کرنے کی مخلصانہ کوشش ہے، اسکی کوئی سیاسی غرض ہے نہ کوئی جماعتی مقصد ...... اس ناخوشگوار کام کو محض عند اللہ مسئولیت و شہادت حق کے خیال سے انجام دیا گیا ہے۔

معیاری کتابت و طباعت، قیمت پانچ روپئے، چھ روپئے پچاس پیسے پیشگی آنے پر کتاب رجسٹرڈ بک پیکٹ ــــــ روانہ کی جائے گی

ملنے کا پتہ

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

دیگر اداروں کی مطبوعات

ہمارے یہاں اپنی مطبوعات کے علاوہ ہندوستان کے دیگر اداروں کی علمی، دینی، اصلاحی و تبلیغی مطبوعات کا ذخیرہ بھی رہتا ہے۔ اس مختصر فہرست میں ہم کچھ اہم کتابوں کا تذکرہ کریں گے مزید کتابوں کے بارے میں معلومات کے لیے صرف ۲۵ پیسے کا ڈاک ٹکٹ بھیج کر ہماری فہرست کتب طلب فرمائیں ——— منیجر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی اہم تصانیف اور تقریریں

نبی رحمت ۳/-
سیرت سید احمد شہیدؒ مکمل ۴۰/-
کاروان مدینہ ۱۲/-
نقوش اقبال ۱۴/-
ارکان اربعہ ۱۵/-
دریائے کابل سے یرموک تک ۱۴/-
پرانے چراغ ۱۶/-
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں ۶/-
تاریخ دعوت و عزیمت مکمل ۵۳/-
جب ایمان کی بہار آئی ۱۳/-
دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں ۶/-
نئی دنیا امریکہ میں } صاف صاف باتیں ۶/-
معرکۂ ایمان و مادیت ۶/-

مشرق اوسط کی ڈائری ۱۵/-
ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں ۵/-
تحقیق و انصاف کی عدالت میں } ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ ۲/۵۰
تذکرہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ ۴/-
ذکر خیر ۳/-
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے } عروج و زوال کا اثر ۱۲/-
قادیانیت مطالعہ اور جائزہ ۶/-
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب } امیدوں اور اندیشوں کے درمیان ۶/-
ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں } اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے؟ ۱/-
آنکھوں کی سوئیاں -/۵۰

اسلام مکمل دین مستقل تہذیب -/۸۵
انسان کی تلاش -/۵۰
اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں ۱/-
خواص۔ مسلمان کی ذمہ داری -/۵۰
دو انسانی تصویریں قرآنی مرقع میں -/۷۵
سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں ۱/-
صورت و حقیقت -/۷۵
عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب -/۸۵
محبت فاتح عالم -/۲۵
مقام انسانیت ۲/-
محسن عالم ۱/۵۰
مذہب یا تہذیب -/۵۰
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ ۱/-
نشان راہ -/۷۵

قرآن پاک اور حمائلیں

معریٰ قرآن مجید و حمائلیں

حوالہ ۳۱ قرآن مجید عکسی

سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۸۴۸ مجلد ریگزین -/۲۵

حوالہ ۳۱ قرآن مجید عکسی

ریگزین کی خوبصورت جلد مع پلاسٹک کور -/۲۸

حوالہ ۵۳ قرآن شریف عکسی

یوگلہ کاغذ مجلد اسکرین پرنٹنگ -/۱۸

حوالہ ۲۳ قرآن عظیم عکسی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۸۴۸

مجلد ریگزین -/۱۸ مجلد پلاسٹک کور -/۲۰

حوالہ ۶۲ قرآن مجید معریٰ

سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۴۳۲

مجلد اسکرین پرنٹنگ ۱۴/۵۰

حوالہ ۱۰۷ حمائل شریف عکسی

سائز ۲۰×۳۰/۳۲ مجلد پلاسٹک کور -/۷

حوالہ ۱ حمائل شریف عکسی

سائز ۲۰×۳۰/۳۲ مجلد پلاسٹک کور ۸/۵۰

مترجم قرآن مجید

حوالہ ۸۱ اشرفی قرآن مجید عکسی

مترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ

صفحات ۳۲، سائز ۲۰-۳۰/۸

ریگزین کی خوبصورت جلد سے مزین ۷۲

حوالہ ۵۵۵ معجزنما عکسی قرآن مجید

۵۵ خوبیوں والا بدو ترجمہ

ترجمہ اول۔ شاہ رفیع الدین دہلویؒ

ترجمہ دوم۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ

ہدیہ -/۴۰

حوالہ ۲ حمائل شریف اشرفی عکسی

ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانویؒ

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ دو رنگی طباعت -/۲۱

کچھ پاکستانی مطبوعات

مآثر الامراء تین جلدوں میں مکمل -/۷۵

تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ ۲/۵۰

مقدمات و بیانات اکابر -/۲۵

فرحت الناظرین -/۵

قاضی احسان احمد شجاع آبادی -/۲۰

باقیات صالحات -/۲۰

مجلۃ الاحکام -/۱۸

مولانا محمد احسن نانوتوی -/۵

مختلف موضوعات پر بہترین کتابیں

حیات خلیل مکمل
مرتبہ مولانا محمد ثانی حسنی -/۲۰

صحبتے با اولیاء
مرتبہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری ۷/۵۰

تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ
ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی -/۳

سیرت مولانا محمد علی مونگیری رحؒ
از مولانا محمد الحسنی مرحوم -/۱۲

ہمارے حضورؐ
محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ -/۴

زاد سفر مکمل
ریاض الصالحین کا سلیس ترجمہ -/۳۵

الانور
(سوانح علامہ انور شاہ کشمیری رحؒ) -/۴۰
از عبدالرحمن کوندو

معاشرتی مسائل
مرتبہ مولانا برہان الدین سنبھلی -/۱۲

اسلام اور غیر اسلامی تہذیب
تالیف: شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ -/۹

فریب تمدن
(مغربی تہذیب اپنے آئینہ میں) -/۱۰

عربی نعتیہ کلام -/۱۰
مولانا عبداللہ عباس ندوی

آپ بیتی مولانا عبدالماجد دریا بادی رحؒ
(خود نوشت سوانح حیات) -/۲۵

وفیات ماجدی
مرتبہ حکیم عبدالقوی دریا بادی -/۱۵

خطبات ماجدی - یا ہدیۂ زوجین
مرتبہ محمد صدیق دریا بادی -/۱۰

معاصرین
از مولانا عبدالماجد دریا بادی رحؒ -/۲۰

حکیم الاسلام اور ان کی مجالس -/۲۵

عربی علوم و فنون کے ممتاز علماء
اور ان کی علمی خدمات
(از ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی) -/۱۵

از حکیم الامت حضرت تھانوی رحؒ -/۳۶

تقویۃ الایمان مع تذکیر الاخوان -/۱۸

تجرید بخاری
کامل اردو -/۱۶

فیوض یزدانی
(مجالس حسنہ شیخ جیلانی رحؒ) -/۳۶

اپنی ذاتی لائبریری کے لیے مفید کتابوں کا انتخاب کیجیے

المنجد (عربی اردو لغت) ۷۵/-
امت کے لیے لمحۂ فکریہ ۱/-
اصلاحی تقریریں ۳/-
آپ تقریر کیسے کریں مکمل ۵/-
اصلاح المسلمین ۱/۷۵
ارشاد الملوک ۳/۵۰
انگشت بوسی سے پائیل بوسی تک ۲/۵۰
ارکان اسلام ۴/-
اسلام کی باتیں ۴/-
ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ۳/۵۰
الفوز العظیم ۱/۵۵
الفاروق ۱۵/۷۵
اہل کتاب صحابہ و تابعین ۴/۷۰
اسلام کا سیاسی نظام ۹/۷۰
المامون ۷/۸۰
افکار عصریہ ۹/۴۰
امت مسلمہ کی مائیں ۳/۲۵
اخلاق محسنی ۹/۵۰
اورادِ کاملہ -/۷۵

ایضاح البخاری فی حصہ ۵/-
اکابر کے خطوط ۸/-
الخطبات الحنفیہ ۱۰/۵۰
اقبال کامل ۱۲/۵۰
اسوۂ صحابیات ۳/-
اسوۂ صحابہ اول، دوم ۲۲/-
اسلام اور عربی تمدن ۱۳/۷۵
بزم مملوکیہ ۱۱/-
بزم تیموریہ ۱۴/۳۰
بیماری اور اس کا روحانی علاج ۱۰/-
بہشتی زیور عکسی (کشیدہ کاری والا) ۲۵/-
تفسیر ابن کثیر اردو مکمل ۲۰۰/-
تفسیر حقانی اردو مکمل ۱۷۵/-
تفسیر ماجدی اول ۱۸/-
" " دوم ۱۷/-
" " پارہ ۱ ۵/-
تفسیر مظہری ۳۳۵/-
ترجمان السنہ مکمل ۱۰۰/-
تذکرۃ الخلیل ۱۸/-

تقریر بخاری
اول ۱۲/۵۰ دوم ۱۳/۵۰
تابعین ۱۶/-
تذکرہ علماء اعظم گڑھ ۱۸/-
تذکرہ مولانا اویس ندویؒ ۱۰/-
تجلیات منظوم ۵/-
تحقیق لاثانی ۱۰/-
تاریخ مشائخ چشت ۱۳/-
تعلیم الدین ۲/۵۰
تبلیغی نصاب ریگزین ۲۰/-
تبلیغ کیا ہے؟ ۶/-
تاریخ گجرات ۱۵/-
جواہر حسنہ ۱۵/-
چراغ سنت ۴/-
حیات امام ابوداؤد سجستانیؒ ۳/-
حیات امام بخاریؒ ۳/-
حیات فخر الاسلام ۵/۶۰
حیرۃ الفقہ ۱/۵۰
حق السماع ۱/-
حرمت مصاہرت ۲/-
حمد باری ۸/۶۰

کتاب	قیمت
حقوق والدین	۲/۵۰
خطبات مدراس	۶/۲۵
حیات شبلی	۴/۷۰
خلافت امویہ اور ہندوستان	۳۰/-
خلافت راشدہ کا اقتصادی جائزہ	۱۵/-
خطب شہید	۱/۵۰
داڑھی اور انبیاء کی سنتیں	۳/۷۵
دین رحمت	۱۰/-
رہبر نماز	۲/۵۰
روضۃ الصالحین	۵/-
راہ نجات	۱/-
رحمت عالم	۶/۲۵
زلزلہ در زلزلہ	۶/۵۰
سیر الصحابیات رض	۴/۷۰
سیرت عائشہ رض	۱۱/-
سبیل النجات	۹/-
شہید اعظم	۳/-
شریعت و تصوف مکمل	۱۵/-
شان مصطفیٰ	۴/-
صحائف معرفت	۶/-
صفائی معاملات	۱/۲۰
ضیاء القرأت	۱/۵۰
طریقۂ فاتحہ	-/۹۰
عشرۂ کاملہ	۸/۵۰
علوم عرب غیر مسلموں کی نظر میں	۲/۲۵
عقائد الاسلام	۹/۷۵
عورت اور پردہ	۱/۲۵
عرش	۱/-
عربی زبان کے دس سبق	۱/-
غزالی انسائیکلوپیڈیا	۶/-
فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمان	۲/-
فضائل اخلاق و اخلاص	۱/۷۵
فضائل نکاح	۱/۵۰
فتاویٰ دار العلوم دیوبند مکمل	۱۹۹/۵۰
فتاویٰ عالمگیری (۲۹ قسطیں)	۱۳۵/-
فتاویٰ رحیمیہ	۴۰/-
قرائن خاتم نبوت	۱/-
قرآن مجید کی پہلی کتاب	۲/۴۰
کلام صوفی	۲۵
کشکول باطن	۶/-
گوہر علم جوہر سیرت	۱/۲۵
گلدستۂ توحید	۳/۵۰
ماحی شرک و بدعت	۱/۲۵
مفتاح التبلیغ	۶/۵۰
مسند امام اعظم رح	۲۰/-
مکتوبات حضرت علی رض	۱۰/-
مکتوبات علمیہ	۷/۵۰
مکاتیب حضرت مولانا الیاس رح	۳/۵۰
مواعظ حسنہ	۱۵/-
مودودی صاحب اکابر امت کی نظر میں	۸/-
مودودیت بے نقاب (آپ بیتی کی روشنی میں)	۵/-
نقش سلیمانی مکمل	۱۵/-
نظم انسائیکلوپیڈیا	۱۲/-
نسرین و نسترن	۵/-
وہابی کی پہچان	-/۴۰
ہماری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟	۳/-

ملنے کا پتہ:- الفرقان بکڈپو نظیر آباد (۳۱ نیا گاؤں مغربی) لکھنؤ